دائرۃ المعارف

یعنی

معارف اعظم گڑھ

کی

۱۳۶ ویں جلد

ماہ جولائی ۱۹۸۵ء تا ماہ دسمبر ۱۹۸۵ء

مرتبہ

سید صباح الدین عبد الرحمٰن

معارف پریس اعظم گڑھ

فہرست

مضمون نگارانِ معارف

جلد ۱۳۶

ماہ جولائی ۱۹۸۵ء تا ماہ دسمبر ۱۹۸۵ء

(بہ ترتیب حروف تہجی)

فہرست مضامین معارف

جلد ۱۳۶

ماہ جولائی ۱۹۸۵ء تا دسمبر ۱۹۸۵ء

(بہ ترتیب حروف تہجی)

رجسٹرڈ نمبر اے۔ زیڈ۔ ایم۔ این۔ پی۔ ۱۶۰ — جولائی ۱۹۸۵ء

معارف

مجلس دار المصنفین کا ماہوار علمی رسالہ

مرتبہ

سید صباح الدین عبد الرحمٰن

قیمت تیس روپیے سالانہ

دفتر دار المصنفین اعظم گڈھ

(پن ۔ ۲۷۶۰۰۱)

مجلسِ ادارت

ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کی مذہبی رواداری

تاریخ ہندوستان کا سلسلہ اب تک اٹھائیس کتابوں تک پہونچ چکا ہے، اس ضمن میں ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کی مذہبی رواداری کا بھی ایک سلسلہ شروع کیا گیا ہے، جس کی اب تک تین جلدیں شایع ہو چکی ہیں۔

جلد اوّل

اس میں مغل دور سے پہلے کے مسلمان حکمرانوں کی مذہبی رواداری، فراخ دلی اور وطن دوستی رعایا پروری کے دلچسپ واقعات مستند ماخذوں کی مدد سے پیش کیے گئے ہیں، قیمت ۱۲ روپیے

جلد دوم

اس میں مغل فرماں روا بابر، ہمایوں، سوری خاندان کے شیر شاہ اور اسلام شاہ، پھر مغل شہنشاہ اکبر، جہانگیر اور شاہجہان کی مذہبی رواداری، فراخ دلی، وطن دوستی، رعایا پروری کے سبق آموز واقعات پیش کیے گئے ہیں، قیمت ۲۳ روپیے۔

جلد سوم

اس میں جدو ناتھ سرکار کی کتاب کا جواب خود اس کی کتاب کے حوالوں سے اس طرح پیش کیا گیا ہے کہ اورنگ زیب عالمگیر اور اسکے بعد کے مغل بادشاہوں کی مذہبی رواداری، فراخ دلی، وطن دوستی اور رعایا پروری کی تفصیلات آگئی ہیں مرتبہ سید صباح الدین عبدالرحمٰن۔ قیمت ۳۰ روپیے۔

جلد ۱۳۶ ماہ شوال المکرم ۱۴۰۵ھ مطابق ماہ جولائی ۱۹۸۵ء عدد ۱

(۶۶)

مضامین

مقالات

وفیات

بسم اللہ الرحمن الرحیم

شذرات

گذشتہ مہینہ معارف کے شذرات میں مسلمانوں کی مطلقہ عورتوں کو نان نفقہ دینے کے فیصلہ اور کلکتہ ہائی کورٹ میں قرآن مجید کی اشاعت پر پابندی لگانے کی درخواست کے دو دھماکوں کا ذکر آیا تھا۔

اب تیسرا دھماکہ اتر پردیش کی حکومت کے ایک وزیر کا وہ بیان ہے جو نہ صرف اس ریاست کی اردو اکاڈمی کے عہدیداروں بلکہ اردو بولنے والوں کے لیے بھی نہایت اہانت آمیز سمجھا جا رہا ہے، ان تمام دھماکوں سے مسلمانوں کو ذہنی اور نفسیاتی طور پر مجبور کیا جا رہا ہے کہ وہ سوچیں کہ وہ اپنی مذہبی حمیت، ملی غیرت اور لسانی خودداری کو برقرار رکھ کر اس ملک میں کس طرح باعزت اور باوقار زندگی بسر کر سکتے ہیں، جو ان کے دستوری اور جمہوری حقوق کا لازمی جزء ہے، لیکن ملکی مفاد کی خاطر یہ بھی سوچنا ضروری ہے کہ ایسے اقدام اور بیانات ملک کے لیے کہاں تک مفید ہیں؟

اس وقت پنجاب جوالا مکھی بنا ہوا ہے، کشمیر میں بڑی بے چینی ہے، آسام میں برسوں سے بغاوت ہے، تری پورہ اور میزورام درد سر ہیں، گجرات میں خون کی ہولی کھیلی جا رہی ہے، جنوبی ہند اور مرکزی حکومت میں بے اعتمادی اور لا اعتباری کی خلیج حائل ہے، اونچی ذات اور ہریجنوں میں سخت آویزش ہے، جا بجا بلوے فسادات ہوتے رہتے ہیں، اونچی ذات کے ہندوؤں کے مختلف گروہوں کے باہمی نفاق سے حکومت کی کارکردگی میں جو انتشار پھیلا ہوا ہے اس پر پردہ نہیں ڈالا جا سکتا ہے، ان ناسازگار حالات میں مسلمانوں اور اردو بولنے والوں کے ذہن اور دماغ پر ایٹم بم گرا کر ان کو ہیروشیما اور ناگا ساکی بنا دینے کی کوشش کہاں تک صحیح ہے؟

یہ جو کچھ ہو رہا ہے وہ نیشنلزم کے نام پر ہی کیا جا رہا ہے، نیشنلزم ملک کی قومی یکجہتی اور جذباتی ہم آہنگی کے لیے بہت ضروری ہے، اس میں عاقبت اندیشانہ روشن ضمیری، مصالحانہ فراخدلی اور

ہمہ پراہ رواداری ہو تو یہ ملک کے لیے رحمت ہے، اور اسی سے ہندوستان جنت نشان ہو سکتا ہے، لیکن جب یہ بگڑ جائے اور اس میں جارحیت، سامراجیت اور فرعونیت پیدا ہو جائے تو یہ ملک کے لیے رحمت کے بجائے اذیت ہے، اس سے بیزار ہو جانے والوں کو شورش پسند، شرانگیز، ملک دشمن اور غیر وفادار قرار دے کر ان کو دبا کر رکھنا اچھی نیشنلزم اور حکمرانی کی دلیل نہیں، دلوں کو تسخیر کر کے اُن پر حکومت کرنے ہی میں اچھی نیشنلزم اور حکمرانی کا ثبوت دیا جا سکتا ہے۔

اردو ملک کے دستور میں ایک تسلیم شدہ زبان ہے، یہ صحیح ہے کہ یہ کسی علاقہ کی اکثریت کی زبان نہیں، انگریزی بھی یہاں کسی علاقہ کی زبان نہیں، مگر اس کو ہمارے ملک کے اسکولوں، کالجوں، یونیورسٹیوں اور سرکاری دفتروں میں اپنے حق سے زیادہ باعزت جگہ دی جا رہی ہے، محض اس لیے کہ یہ ایک بین الاقوامی زبان ہے، اگر تعصب کی عینک آنکھوں پر نہ ہو تو اس سے کون انکار کر سکتا ہے کہ اردو ملک گیر، یعنی آل انڈیا بلکہ بین الملکی زبان نہیں ہے، اب تو اس میں بین الاقوامیت بھی پیدا ہو چکی ہے، اور سب سے بڑھ کر تو یہ ہندو مسلمان کے میل ملاپ کی زبان ہے، اور یہ بھی حقیقت ہے کہ انگریزی زبان نے ہمارے ملک کو اونچا کیا ہے تو اردو نے اس کو مہذب بنایا ہے، انگریزی زبان یہاں معزز جگہ پا سکتی ہے تو پھر اردو اس سے زیادہ باعزت جگہ پانے کی مستحق ہے۔

اردو بولنے والوں کے مطالبات کو غیر معمولی بلکہ حقارت آمیز اعصابی جنگ کے ذریعہ جس طرح اب تک ٹھکرایا گیا ہے، اس کا نفسیاتی تجزیہ بھی کرنے کی ضرورت ہے، اس سلسلہ میں ہمارے وطن کے بہت بڑے سیکولرسٹ اور محب وطن رہنما مولانا ابوالکلام آزاد ہماری رہنمائی کر چکے ہیں، ۱۹۵۲ء میں لوک سبھا میں ہندی کے بڑے پریمی پرشوتم داس ٹنڈن نے ان پر اردو نوازی کا الزام رکھا تو انھوں نے اسی ایوان میں ایک بہت ہی پر زور اور جاندار تقریر میں فرمایا کہ اردو زبان کسی ایک مذہبی گروہ کی زبان نہیں ہے، اس کے بولنے والوں میں ہندو بھی ہیں مسلمان بھی ہیں، عیسائی بھی ہیں اور سکھ بھی ہیں، اور یہاں یہ سمجھے کہ صرف مسلمان ہی اردو بولتے ہیں

گو کہ یہ صحیح نہیں، پھر بھی جو کروڑوں مسلمان یہاں بستے ہیں ان کی خاطر اس زبان کی کوئی خدمت کی جائے تو کون ایسی چیز ہے جس کو بہت زیادہ محسوس کیا جائے۔

اسی سلسلہ میں مولانائے محترم نے یہ بھی فرمایا کہ جو لوگ اردو کی مخالفت کرتے ہیں وہ اس لیے نہیں کرتے کہ ان کو ہندی سے محبت ہے بلکہ اس لیے کہ وہ یہ نہیں دیکھنا چاہتے کہ کوئی اور دوسری زبان بڑھے، یہ جذبہ صحیح نہیں، ہندی بولنے والے زیادہ سے زیادہ اپنے قد کو اونچا کرلیں لیکن وہ کیوں چاہتے ہیں کہ دوسرا ٹھگنا ہو جائے، انھوں نے یہ بھی فرمایا کہ جہاں تک ہندی کا تعلق ہے کوئی ایک آدمی بھی شمالی ہند میں ایسا نہیں ہے جو ہندی کی ترقی نہ چاہتا ہو، یا ہندی کا مخالف ہو، جو لوگ ہندی نہیں جانتے وہ بھی اپنے بچوں کو ہندی پڑھا رہے ہیں مگر ہندی کی ترقی کے راستہ میں کوئی رکاوٹ ہے تو ایسے دماغوں کی طرف سے ہے جو دوسری زبانوں کو آگے بڑھنے کا موقع دینا نہیں چاہتے بلکہ وہ یہ چاہتے ہیں کہ وہ باقی نہ رہے، اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ ہندی کی ترقی نہیں چاہتے بلکہ دوسری زبانوں کی گراوٹ چاہتے ہیں، یہ جذبہ غلط ہے، پھر اسی تقریر کو ختم کرتے ہوئے بڑی آزردگی کے ساتھ یہ بھی فرمایا کہ میں بہت صاف صاف کہوں گا کہ ہندوستان پر جو مصیبت ٹو نیشن تھیوری کی آئی یا پاکستان بنانے کے پوائنٹ آف دیو اور پاکستان بننے کی جو مصیبت آئی اس کی جتنی ذمہ داری گمراہ مسلمانوں اور مسلم لیگ پر ہے اتنی ہی ذمہ داری اس طرح کے دماغوں پر بھی ہے"

ان دلائل سے ہمارے وطن کا وہ طبقہ ضرور متاثر ہوگا جو سیکولرزم، قومی یکجہتی اور وطن دوستی کا قائل سچے دل سے ہے، ایسے ہی فراخ دل محبان وطن کی نیشنلزم سے ہمارے ملک میں محبت کی گنگا، یگانگت کی جمنا اور موانست کی برہم پتر بہنے کی امید ہے، مگر اسی ملک میں ایک انتہا پسند، تنگ نظر اور ناعاقبت اندیش طبقہ ایسا بھی ہے جو ہندوستان کو ہندو استھان تصور کرتا ہے، اس کی نیشنلزم کا تخیل یہ ہے کہ یہاں غیر ہندو اسی کے رحم و کرم پر زندگی بسر کرنے پر اکتفا کریں، اگر وہ بھکاری بن کر بھی بھیک مانگیں تو ان کی زاری اور بے مقداری کے پیالہ میں جو کچھ ڈال دیا جائے اسی پر قناعت کریں، سوچنا یہ ہے کہ کیا ایسی ہی نیشنلزم میں وطن کا مفاد ہے جس سے تفرقہ کا سیلاب، اختلاف کا طوفان اور نفاق کا جھکڑ امنڈ پڑنے کا خطرہ ہو؟۔

مقالات

سرسید احمد خان اور مستشرقین

از
عبید اللہ کوٹی ندوی رفیق دارالمصنفین

(۶)

سرسید احمد خان ناسخ و منسوخ کی تشریح کرتے ہوئے یہ بھی واضح کرتے ہیں کہ عیسائی عالموں نے ان لفظوں کی حقیقت سمجھنے میں غلطی کی ہے، وہ یہ سمجھتے ہیں کہ ناسخ آیتوں نے منسوخ آیتوں کو اس وجہ سے کہ ان میں کچھ نقص یا کسی قسم کا اشتباہ تھا بیکار کر دیا ہے، مگر ان کا یہ خیال غلط ہے، مسلمانوں میں تو اس بات پر ایمان رکھنا ایک مذہبی فریضہ ہے کہ خدا تعالیٰ علام الغیوب ہے، یعنی اس کو ماضی، حال اور مستقبل کا یکساں علم ہے، اس لیے اگر یہ سمجھا جائے کہ خدا تعالیٰ کے پہلے حکم میں کوئی نقص تھا جو بعد کو ظاہر ہوا اور پھر دوسرا حکم دیا گیا تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ خدا تعالیٰ کے کمال علمی میں نقص تھا، اور ایسا عقیدہ اسلام کی رو سے کفر ہے، اس لیے مسلمانوں میں ناسخ و منسوخ کا مطلب وہ نہیں ہے جو عیسائی علماء سمجھتے ہیں۔

ناسخ و منسوخ کے ایک معنی تو یہ ہیں کہ زمانہ اور حالات میں تبدیلی کی وجہ سے انبیاء کی شریعتوں میں بھی تبدیلی کی گئی، جس کی مثالیں بائبل میں بھی ملتی ہیں، مثلاً حضرت موسیٰ کی شریعت سے پہلے

ایک مرد اپنی بیوی کی زندگی میں اس کی بہن یعنی اپنی سالی سے شادی کر سکتا تھا، حضرت موسیٰؑ نے اس حکم کو منسوخ کر دیا، اور فرمایا کہ کوئی آدمی اپنی بیوی کی زندگی میں اس کی بہن سے شادی نہیں کر سکتا لیکن اس کے مرنے کے بعد کر سکتا ہے، حضرت موسیٰؑ نے مرد کو کامل اختیار دیا تھا کہ جب چاہے اپنی بیوی کو طلاق دے دے، اور گھر سے باہر نکال دے، اس حکم کو بقول عیسائیوں کے حضرت عیسیٰؑ نے تبدیل کر دیا اور حکم دیا کہ مرد اپنی بیوی کو کسی صورت سے طلاق نہیں دے سکتا جب تک کہ اس نے کسی سے زنا نہ کیا ہو، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی طلاق دینے کو مرد کے اختیار میں رکھا، لیکن یہ قید لگائی کہ اگر کسی شدید ضرورت اور معقول وجہ کے بغیر شوہر طلاق دے گا تو وہ ایک گناہ کا مرتکب ہوگا، ناسخ و منسوخ کی اس تشریح کی روشنی میں قرآن مجید کی آیتوں پر لفظ منسوخ کا اطلاق نہیں ہو سکتا، کیونکہ اس کے بعد کوئی ایسی شریعت نازل نہیں ہوئی اور نہ نازل ہوگی، البتہ پچھلی شریعتیں منسوخ ہوئیں، مگر اس مفہوم میں نہیں جو عیسائیوں کے یہاں جانا جاتا ہے، یعنی خدا کے علم میں تغیر یا نقص واقع نہیں ہوا، بلکہ نئے حالات اور نئی ضرورتوں کی وجہ سے اس نے نیا حکم دیا، اور پچھلی شریعت خدا کے علم میں پچھلے زمانہ ہی کے لیے تھی، قرآن مجید کی آیت (مَا يَوَدُّ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ اَهْلِ الْكِتَابِ...... مَا نَنْسَخْ مِنْ آيَةٍ اَوْ نُنْسِهَا... قَدِيْرٌ - بقرہ: آیت ۹۹ - ۱۰۰) سے کسی طرح یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ قرآن مجید کی ایک آیت دوسری آیت کو منسوخ کرتی ہے، بلکہ اس میں صاف طور پر اہل کتاب کا ذکر ہے، جن کی شریعت کے احکام میں شریعت محمدی سے کسی قدر کمی و بیشی ہوگئی ہے، ان کے بارے میں خدا نے فرمایا کہ ہم جب آیت یعنی اہل کتاب کی شریعت کے کسی حکم کو منسوخ کرتے یا بھلاتے ہیں تو اس سے بہتر یا اسی کے مانند حکم بھیج دیتے ہیں۔

ناسخ و منسوخ کے دوسرے معنی ایک فقہی اصطلاح کے طور پر ہیں اور فقہاء کی اس اصطلاح کا اطلاق قرآن و حدیث پر بھی ہوتا ہے، لیکن اس مفہوم میں نہیں جو عیسائی سمجھتے ہیں، قرآن مجید اور

احادیث نبوی میں ایسے احکام ہیں جن کا تعلق ایک ہی معاملہ سے ہے، مگر وہ احکام مختلف حالات اور مواقع پر صادر ہوئے ہیں، جب وہ حالت باقی نہیں رہتی تو اس حکم کی تعمیل واجب نہیں رہتی اور دوسرا حکم جو تبدیل شدہ حالت کے مطابق ہو، نافذ ہوجاتا ہے، اگرچہ پہلے حکم کو منسوخ اور دوسرے کو ناسخ کہیں گے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ اگر پہلی حالت پھر واپس آجائے تو اس کا حکم بھی دوبارہ نافذ کرنا ہوگا، نہ کہ دوسرا حکم، مثلاً جب شراب کی ممانعت ہوئی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سبز رنگ کے پیالوں کے استعمال کو بھی جن کا خاص طور پر عربوں میں رواج تھا ممنوع قرار دیا، مگر جب یہ حکم سب لوگوں کو معلوم ہوگیا اور شراب پینے کا رواج بھی ختم ہوگیا تو آپ نے ان پیالوں کے استعمال کی اجازت دے دی، اسی طرح جب مکہ میں کفار قریش کی حکومت تھی اور مسلمان محکوم تھے تو مسلمانوں کو ہر قسم کی تکلیفوں اور سختیوں کو صبر اور استقلال کے ساتھ برداشت کرنے کا حکم دیا گیا، اور جب یہ مسلمان دوسرے ملک چلے گئے تو اس وقت جہاد کے احکام دیے گئے، ان دونوں مثالوں میں پہلے حکم کو منسوخ اور دوسرے حکم کو ناسخ کہیں گے، یہ فقہار کی اصطلاح ہے، لیکن اگر پہلے والے حالات دوبارہ پیش آئیں تو وہ حکم بھی دوبارہ نافذ ہوجائے گا، جسے فقہار نے منسوخ کہا ہے، اور ناسخ پر عمل درآمد نہ ہوگا۔

ان بیانات سے واضح ہوتا ہے کہ یہ الفاظ صرف اصطلاحات ہیں، جو علمار نے مقرر کی ہیں، محققین علمائے اسلام کا عقیدہ ہے کہ ناسخ و منسوخ کے الفاظ اپنے اصلی اور لغوی معنوں میں قرآن مجید کی نسبت استعمال نہیں کیے گئے، عمرو بن شعیبؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کچھ لوگوں کو سنا کہ قرآن مجید میں جھگڑا کرتے ہیں، تو فرمایا کہ تم سے پہلے جو لوگ ہلاک ہوئے وہ اس لیے کہ انھوں نے خدا کی کتاب کے ایک حصہ کو دوسرے حصہ سے لڑایا، (رد کیا) خدا کی کتاب تو اس لیے اتری ہے کہ بعض سے بعض کی تصدیق ہو، پس

بعض کی بعض سے تکذیب مت کرو، اس میں سے جو جانو وہ کہو، اور جو نہ جانو اس کو اس کے واقف کار پر چھوڑ دو۔ (مسند احمد؛ ابن ماجہ) (خطبات احمدیہ: ص ۴۲۲-۴۲۳)

سر ولیم میور نے یہ جو لکھا ہے کہ "قرآن میں کم سے کم دو سو پچیس آیتیں منسوخ ہیں" یہ محض بے سند خیال ہے، البتہ یہ ممکن ہے کہ نزول قرآن کے دور اول میں کچھ لوگوں نے اپنی غلطی سے قرآن و حدیث میں تمیز نہ کی ہو، بہت سی حدیثوں کو غلطی سے قرآن کا جزو سمجھ لیا ہو، اور قرآن مجید میں وہ حصے نہ پاکر یہ گمان کیا ہو کہ بعض آیتیں منسوخ ہوگئی ہیں، اور قرآن مجید میں مندرج نہ ہوئیں، مگر ظاہر ہے کہ ایسا خیال جس کو ہوا خود اس کی غلطی ہے۔ (ایضاً ص ۴۴۷)

سر ولیم میور نے آیتوں کے منسوخ ہونے کے بارے میں جو طویل بحث کی ہے وہ قواعد اسلام کی رو سے درست نہیں ہے، اور اس کی تائید میں کوئی شہادت بھی نہیں ہے، مثلاً ان کا بیان ہے کہ "اکثر حصہ قرآن کا صرف عارضی مقصد کے لیے تھا جو عارضی حالات کی وجہ سے سامنے آیا، اور جن کی عظمت بہت جلد جاتی رہی، یہ بات مشتبہ معلوم ہوتی ہے کہ پیغمبر صاحب کے نزدیک اس قسم کی آیتوں سے ان کی عام عظمت یا ان کو رائج کرنا مقصود تھا یا نہیں، قرینہ سے تو یہ بات معلوم نہیں ہوتی کہ ان حصوں کی حفاظت کی انھوں نے کوشش کی ہو"

سر ولیم کسی دلیل یا شہادت کے بغیر کہنا یہ چاہتے ہیں کہ قرآن مجید میں کچھ حصے ایسے بھی شامل ہوگئے ہیں جن کی حیثیت عارضی تھی، یعنی وہ منسوخ ہو چکے ہیں، لیکن بقول سرسید احمد خان: "یہ غلطی جو سر ولیم میور کو ہوئی اکثر عیسائی مصنفوں کو لفظ منسوخ کے معنی نہ سمجھنے کے سبب یا غلط معنی سمجھنے کی وجہ سے ہوئی ہے، اور ہم کہہ سکتے ہیں کہ لفظ منسوخ کے جو معنی عیسائی مصنف سمجھتے ہیں ان معنوں میں قرآن مجید کی کوئی آیت بھی منسوخ نہیں ہے، اور اگر اس لفظ کے وہ معنی لیے جائیں جن میں مسلمان فقہاء نے اس لفظ کو اصطلاحاً استعمال کیا ہے تب بھی کوئی آیت (عارضی مدت یا) محدود

مقصد کے لیے قرآن مجید میں موجود نہ تھی، اور سب سے دائمی ترویج مقصود تھی۔"

(خطبات احمدیہ ص ۴۶۹)

قرآن مجید اور حضرت عثمانؓ

مسٹر گاڈفری ہیگنز عموماً قرآن، اسلام اور سیرت رسولؐ کے بارے میں اچھی رائے رکھتے ہیں، مگر وہ اپنے اچھے خیالات کے باوجود ایک جگہ قرآن کے بلند اور صاف کا ذکر کرتے ہوئے ایک جملہ یہ بھی لکھ جاتے ہیں کہ "یہ امر اس کے (یعنی قرآن مجید کے) مصنف کی لازوال نیک نامی کا سبب ہے، خواہ وہ محمدؐ عرب کے نامی پیغمبر ہوں، یا اس کے تیسرے خلیفہ عثمانؓ" (خطبات احمدیہ: ص ۴۶۳) یہ ایک ایسی رائے ہے جو قرآن کے بارے میں دانستہ طور پر غلط بیانی کہی جا سکتی ہے، اور غلط فہمی پھیلانے کے لیے لکھی گئی ہے، قرآن کے صفحات گواہ ہیں کہ اس کا مصنف کون ہے، اور تاریخ سے بھی یہی ثابت ہے، حضرت عثمانؓ کے پاس تلاوت کے لیے جو قرآن تھا وہ وہی تھا جو تمام مسلمانوں کے نزدیک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر خدا کی طرف سے اتارا گیا، اور جسے تمام صحابۂ رسول کے اتفاق سے اور ان کی نگرانی میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایت اور رہنمائی کے مطابق اسی ترتیب کے مطابق جو مسلمانوں میں پہلے سے معروف تھی، اور جس کو قرآن کے حافظ اپنے سینوں میں اسی کے مطابق پاتے تھے، ایک جلد میں اکٹھا کیا گیا تھا، اور حضرت عثمانؓ نے اسی کی نقلیں دنیائے اسلام میں بھجوا دی تھیں، اس لیے گاڈفری ہیگنز کا یہ الزام غلط بیانی کی ایک بری اور افسوسناک مثال ہے، پیغمبرؐ صاحب قرآن کے مصنف نہ تھے، مسیحی علماء قرآن کی الہامی حیثیت کو سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے، مگر ان میں جو اہل انصاف ہیں، وہ جانتے ہیں کہ قرآن کا ایک ایک لفظ اس بات کی گواہی دیتا ہے کہ اس کا سرچشمہ وہی ہے جو تورات و انجیل کا ہے اور قرآن کی زبان اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثوں کی زبانوں میں جو فرق ہے، قرآن کا جو دعویٰ ہے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا چالیس برس تک اس کے علوم و معارف سے

ناواقف رہنا، آپؐ کا امی ہونا، قرآن کی فصاحت، اس کا اسلوب بیان اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے قرآن کا انداز تخاطب، یہ تمام باتیں اس بات کا واضح ثبوت ہیں کہ قرآن اپنے لفظ و معنی دونوں میں خدا کی طرف سے ایک ہدایت نامہ ہے، مگر تعصب اور جہالت کا کوئی علاج نہیں۔

(خطبات احمدیہ ص ۲۱۔۲۴ وغیرہ)

قرآن کی فصاحت اور صحیفۂ ایوب: گبن کا اعتراض

گبن نے اپنی تاریخ میں ایک بات یہ لکھی ہے کہ "قرآن کے بلند ترین خیالات صحیفۂ ایوب کی شان دار سادگی کے سامنے جو اسی ملک میں اور اسی زبان میں بہت مدت پہلے لکھا گیا تھا پست ہیں۔" لیکن سرسید احمد خان کے بقول گبن میں اس قدر علمی قابلیت اور صلاحیت نہیں ہے کہ وہ قرآن مجید اور صحیفۂ ایوب کا باہمی فرق بتا سکیں:

"ہم کسی اعتراض کا اندیشہ کیے بغیر یہ کہہ سکتے ہیں کہ نہایت ذی علم عربی دانوں نے قرآن مجید کو فصاحت و بلاغت میں بے مثل قرار دیا ہے اور اس بات پر متفق ہیں کہ کوئی تحریر اس سے فائق نہیں، نہ پہلے اور نہ اس کے بعد۔ لبید جیسا بڑا شاعر قرآن مجید کی سورۂ بقرہ کی چند آیتوں کو سن کر حیرت زدہ رہ گیا، اور اس کی بلاغت کو انسانی قوت سے برتر ہونے کا اقرار کیا، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کو قبول کر لیا، مسٹر کارلائل کا بیان ہے کہ سب سے اول اور سب آخر جو بھی خوبیاں ہیں وہ قرآن میں موجود ہیں، وہ ہر قسم کے اچھے اوصاف کا بانی ہے، بلکہ دراصل ہر قسم کے وصف اور خوبی کی بنا صرف اسی سے ہو سکتی ہے۔" (ایضاً ص ۴۶۲)

سرسید نے مسٹر سیل کا یہ اعتراف بھی نقل کیا ہے کہ "یہ بات مسلم ہے کہ قرآن قریش کی زبان میں جو اقوام عرب میں شریف ترین اور مہذب ترین قوم ہے، نہایت لطیف اور پاکیزہ زبان میں لکھا گیا ہے، اور وہ بے شبہہ عربی زبان کا نمونہ ہے، اس کتاب سے بھی ثابت ہے کہ کوئی انسان

اس کا مثل نہیں لکھ سکتا وہ لازوال معجزہ ہے جو مردہ کے زندہ کرنے سے بڑھ کر ہے اور تمام دنیا کو اپنے بارے میں رب کی طرف سے ثبوت دینے کے لیے اکیلا کافی ہے، اس کتاب کی خوبی تحریر کی ان لائق لوگوں نے تعریف کی جن کا اس کام میں مبصر ہونا تسلیم کیا جاتا ہے، جس کی بے شمار مثالوں میں سے ایک مثال یہ ہے کہ لبید بن ربیعہ کا ایک قصیدہ جو محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے زمانہ میں سب سے بڑے زبان آوروں میں تھا، خانہ کعبہ کے دروازہ پر چسپاں تھا (جو عربوں میں کسی اعلیٰ تصنیفی کارنامہ کے لیے ایک بڑی عزت کی بات تھی) کسی شاعر کو اس کے مقابلہ میں اپنی کسی تصنیف کو پیش کرنے کی جرأت نہ ہوتی تھی، لیکن کچھ دنوں کے بعد قرآن کی دوسری سورۃ کی چند آیتیں کسی نے اس کے مقابلہ میں لگا دیں تو خود لبید (جو اس زمانہ میں مشرکوں میں تھا) شروع ہی کی آیت پڑھ کر حیرت زدہ رہ گیا، اور فوراً مذہب اسلام کو قبول کر لیا، اور اس نے یہ بیان کیا کہ ایسے الفاظ صرف نبی ہی کی زبان سے برآمد ہو سکتے ہیں، یہ کسی انسان کا کلام نہیں۔ (خطبات احمدیہ ص ۵ـ۴۶۴)

قرآن مجید کے ساتھ ناشائستہ طرز عمل

یورپ کی زبانوں میں عیسائیوں نے قرآن مجید کے جو ترجمے کیے گاڈفری ہگینز کا تبصرہ ان کی حقیقت کو واضح کرنے کے لیے کافی ہوگا، وہ لکھتا ہے کہ:

"اگر عبرانی توریت کا ترجمہ اس طرح شایع ہوتا کہ ہر لفظ کو متین اور شائستہ معنی کے بجائے ذلیل اور غیر مہذب معنی میں بدل دیا جاتا اور ہر آیت کا مضمون جوڑ توڑ ناقابل برداشت غلط ترجمہ اور غلط تاویلوں کے ساتھ مصنف کے سر معیوب معنی ڈالنے کا ذریعہ بنایا جاتا اور ایک بے قدر اور خراب شرح اس کے ساتھ لگی ہوتی تو اس ذریعہ کا کسی قدر تصور کیا جا سکتا ہے جس کے ساتھ یورپ میں قرآن مجید کی اشاعت ہوئی" (ایضاً ص ۴۶۶)

مگر اسی کے ساتھ سرسید احمد خان چند عیسائی مصنفوں خصوصاً مسٹر سیل کے ممنون ہیں جنھوں نے بڑی کوشش سے قرآن مجید کا انگریزی میں ترجمہ کیا، اور اگرچہ وہ کہیں کہیں صحیح اور غلط تفسیر میں تمیز قائم

رکھنے میں پوری طرح کامیاب نہیں ہوئے تاہم ان کی کوشش قابل قدر ہے۔

بے سروپا حکایات | ان عیسائی عالموں اور مستشرقوں نے عجیب عجیب خیالات جن کی کچھ بنیاد نہیں قرآن مجید کی نسبت ظاہر کیے ہیں، چنانچہ ہمفری پریڈیو ڈین آف ناروچ نے لکھا ہے کہ :

" محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) لوگوں کو سکھلاتے تھے کہ اس کتاب کا اصلی نسخہ آسمانی دفتر میں رکھا ہوا ہے' اور جبرئیل میرے پاس ایک ایک سورہ کی نقل جس کی لوگوں میں حسب موقع شایع کرنے کی ضرورت ہوا کرتی ہے' لایا کرتے ہیں ۔"

لیکن بقول سرسید " یہ بیان ایک ایسا بیہودہ بیان ہے جس کی تردید لکھنی بھی بے فائدہ ہے' جب کبھی مسلمانوں کی نظر سے ایسا بیان گذرتا ہے تو وہ حیرت اور تعجب میں پڑ جاتے ہیں کہ یہ کہاں سے اور کیونکر لکھا گیا ۔" مشہور مورخ مسٹر گبن نے اسی طرح کی جہالت کی باتیں لکھنے میں کچھ تامل نہیں کیا ہے' جو لکھتے ہیں کہ " وجود قرآن بقول آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) یا ان کے تبعین کے غیر مخلوق اور ابدی ذات الٰہی میں موجود ہے، اور نور کے قلم سے لوح محفوظ پر لکھا ہوا ہے' اس کی ایک نقل کاغذ پر لکھی ہوئی ریشم اور جواہرات کی جلد میں حضرت جبرئیل فلک اول پر لے آئے تھے ۔" لیکن سرسید مرحوم کے خیال میں " لوح محفوظ کا نام مسٹر گبن نے انگریزی ترجمہ میں دیکھ لیا اور اس کی حقیقت کچھ بھی نہیں سمجھی اور یہ بات کہ قرآن مجید مخلوق ہے یا غیر مخلوق' ایک فلسفیانہ مسئلہ ہے جس کے سمجھنے تک مسٹر گبن کا خیال بھی نہیں پہونچا ۔" ڈین پریڈو کی دلچسپ اور انوکھی باتیں جو بقول سرسید کچھ کم تعجب انگیز اور تحیر آمیز نہیں ہیں، وہ بھی یہاں درج کی جاتی ہیں، ان کا بیان ہے کہ " محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے پاس کاغذ پر لکھی ہوئی پوری نقل قرآن مجید کی لائی گئی تھی، اور انھوں نے اس کو ایک صندوق میں رکھا جس کا نام صندوق رسالت تھا، اور ابوبکرؓ نے جو ان کے جانشین ہوئے سب سے اول اس کو جمع کیا، کیونکہ جب مسیلمہ نے ان ہی کی طرح اخیر زمانہ میں نبوت کا

دعویٰ کیا تھا تو ایسی ہی کامیابی کی امید میں اسی طرح اس نے ایک قرآن مرتب کیا اور اس کی ایک کتاب بنا کر اپنے پیروؤں میں شایع کی، اس وقت ابو بکرؓ نے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے قرآن کو بھی اسی طرح مشہور کرنا ضروری سمجھا"۔ مگر جیسا کہ سرسید نے تحریر کیا ہے کہ :

"مذکورۂ بالا یہ چند مثالیں ان سیکڑوں بیہودہ باتوں میں سے ہیں جو عیسائی مصنفوں کی تمام تحریروں میں اسلام کے بارے میں پائی جاتی ہیں، سر ولیم میور نے اپنے استدلالوں میں مسلمانوں کی مذہبی باتوں سے کسی قدر واقفیت ظاہر کی ہے، لیکن اس بات کا افسوس ہے کہ انھوں نے بحث کیلئے صرف ان روایتوں کا انتخاب کیا ہے جن کو خود مسلمان بھی سب سے زیادہ ضعیف، سب سے زیادہ کمزور اور سب سے زیادہ مشکوک اور سب سے زیادہ ناقابل اعتبار خیال کرتے ہیں، یا ان کے مطلب اور مقصد کے بارے میں مختلف الراے ہیں..... سر ولیم اپنی کتاب کے حاشیہ میں ارگسی وردیلس سے یہ روایت نقل کرتے ہیں کہ "عبد اللہ ابن مسعودؓ نے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی زبانی ایک آیت کو لکھ لیا اور صبح کو اس کاغذ پر سے اڑا ہوا پایا جس کے بارے میں پیغمبرؐ صاحب نے بیان کیا کہ وہ آسمان پر اڑ گئی، اس کے بعد کی روایتوں میں اس واقعہ میں یہ معجزاتی مضمون اور بڑھا دیا گیا کہ اس آیت کا اڑ جانا بہت سے مسلمانوں کے قرآنوں میں آن واحد میں واقع ہوا تھا" ہم کہتے ہیں کہ یہ روایت جس کے راوی کا نام بھی معلوم نہیں گو دیتھی کے کبوتر کی طرح بے بنیاد اور صریح ایجاد ہے، اور ہم اس بات سے خوش ہیں کہ سر ولیم میور نے بھی کہا ہے کہ "اس روایت کی کچھ اصلیت نہیں ہے اور وہ بے شبہہ ایک بناوٹ ہے"۔

(خطبات احمدیہ : ص ۴۶۸-۷۰)

سر ولیم کی "وحی کامل" سر ولیم نے ایک نئی اصطلاح "وحی کامل" کی مسلمانوں کے مذہب میں استعمال کی ہے، اور لکھتے ہیں کہ یہ مسلمانوں کے محاورہ کے مطابق ہے اور پھر اس کی تشریح اس طرح کرتے ہیں کہ "وحی کامل سے میری مراد اس وحی سے ہے جو محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے اخیر زمانہ میں موجود اور رواج پائی ہوئی تھی"

جو شاید ضایع یا غارت یا غیر مستعمل ہو گئی ہو، لیکن سرسید فرماتے ہیں کہ :

"اس اصطلاح سے ہم لوگ واقف نہیں ہیں، شاید آیات محکم کا ترجمہ سر ولیم میور نے وحی کامل کیا ہو لیکن آیات محکم کے وہ معنی نہیں ہیں جو سر ولیم میور نے کیے ہیں، لیکن اگر ہم ان کی اس اصطلاح کو تسلیم کر لیں، تو وحی کامل کا لفظ وحی کی اس کامل مقدار پر بولا جائے گا جو جناب پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئی تھی اور ہم اس بات کا یقین دلاتے ہیں اور آگے چل کر ثابت بھی کریں گے کہ کبھی کوئی وحی ضایع یا غارت، یا غیر مستعمل نہیں ہوئی۔" (خطبات احمدیہ، ص ۴۷۰)

قرآنی آیتوں میں ربط اور ترتیب | قرآن مجید کی ترتیب کے بارہ میں سر ولیم میور فرماتے ہیں کہ قرآن جس طرح ہمارے زمانہ تک چلا آتا ہے اپنے مختلف حصوں کی ترتیب اور بندش میں مضمون یا وقت کی کسی معقول ترتیب اور نظام کا پابند نہیں ہے اور یہ قیاس میں نہیں آتا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اس کو ہمیشہ اسی تسلسل کے ساتھ پڑھنے کے لیے فرمایا ہو، مضامین کی اختلاط، زمانہ اور معنی کے لحاظ سے جا بجا بے ربطی، کسی جزو کا جو مدینہ میں نازل ہوا ہو، بعض اوقات اس آیت سے پہلے درج ہونا جو اس سے کافی عرصہ پہلے مکہ میں نازل ہو چکی ہو، کسی حکم کا ایسے حکم کے بعد ہونا جس کی اس پہلے حکم سے تنسیخ یا ترمیم ہوتی ہو یا کسی دلیل کا کسی ایسے درمیانی فقرہ کی وجہ سے منقطع ہو جانا جو اپنے مقصد اور مدعا میں اس سے کوئی مناسبت نہ رکھتا ہو، یہ سب باتیں ہم کو اس امر کے یقین سے باز رکھتی ہیں کہ ترتیب موجودہ یا درحقیقت کوئی اور کامل ترتیب محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی حیات میں مستعمل اور رائج تھی۔" سرسید مرحوم نے سر ولیم میور کے کلام میں بے ربطی کے باوجود آیات قرآنی کی ترتیب اور ان کے درمیان باہمی ربط پر درج ذیل لفظوں میں اظہار خیال کیا ہے :

"ہم مسلمانوں کا عقیدہ ہے کہ موجودہ قرآن مجید کی ترتیب اسی طرح جیسا کہ قرآن مجید ہے ایسی بلحاظ ہے اور معنوی اعتبار سے اپنی طرز خاص میں اس قدر مربوط اور مسلسل ہے کہ اس سے زیادہ ہونا ممکن نہیں ہے

بہت سی کتابیں آیتوں کے درمیان اس معنوی رشتہ تعلق کی تشریح کی غرض سے تصنیف ہوئی ہیں جو سب سورتوں اور آیتوں کے درمیان موجود ہے، قرآن مجید کی عبارت میں ایسا ایجاز اور اختصار ہے کہ وہ آیتوں کے باہمی تعلق کی جن کے معنی بظاہر ایک دوسرے سے بیگانہ معلوم ہوتے ہیں، کسی قدر تشریح کی ضرورت معلوم ہوتی ہے، اور ان لوگوں کو جو اس سے ناواقف ہیں گو بخنے والی اور سامعہ خراش، ابتر، خام، بے سُری، مکرر بیانی، طول کلامی، الجھانے والی، خام اور مہمل" جیسا کہ سر ولیم میور نے بیان کیا ہے معلوم ہوتی ہیں۔

اس بات کو سمجھنا چاہیے کہ قرآن مجید کسی مصنف کی تصنیف کی ہوئی کتاب نہیں ہے، وہ خدا کا کلام ہے اور بجنسہٖ یہی الفاظ لکھ لیے گئے ہیں کلام جب مخاطبین سے کیا جاتا ہے تو بہت سے امور مخاطبین کے ذہن میں موجود ہوتے ہیں اور متکلم اپنے کلام سے ان کو محذوف رکھتا ہے، مگر جو شخص کوئی کتاب تصنیف کرتا ہے وہ ایسا نہیں کرتا، عیسائی مصنف اس باریکی پر خیال نہیں کرتے اور نہ آیتوں کی شان نزول ان کے ذہن میں ہوتی ہے، اس لیے ان کو آیات کے ربط میں مشکل پڑتی ہے گو مسلمانوں کو ایسی دشواری نہیں ہوتی" (خطبات احمدیہ: ص ۲۷۱)

اس موقع پر سرسید افسوس کے ساتھ یہ بھی بیان کرتے ہیں کہ "سر ولیم میور کے اعتراضات اس قدر عام ہیں کہ جواب کے قابل نہیں، اگر وہ چند مخصوص آیتوں کا نشان دیتے جن میں ان کے نزدیک زمانہ اور معنی کے اعتبار سے جا بجا بے ربطی ہو تو اس وقت ہم یقیناً موصوف کی دقتوں کو حل کر دیتے اور آیتوں کے درمیان باہمی علاقہ کا نشان دینے کی ذمہ داری اپنے اوپر لیتے۔ (ایضاً ص ۲۷۲)

تدوینِ قرآن | ترتیب قرآن تو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایات کے مطابق پہلے سے معلوم اور مشہور تھی صحابۂ کرام میں جو لوگ حافظ قرآن تھے ان کے سینوں میں قرآن مجید اسی ترتیب سے محفوظ تھا جو انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے حاصل کی تھی، پھر صحابۂ کرامؓ کے اجماع و اتفاق سے

حضرت ابو بکرؓ کے عہد میں ایک نسخہ تیار کر لیا گیا، جس کی مختلف نقلیں حضرت عثمانؓ نے اپنے عہد خلافت میں تمام عالم اسلام میں تقسیم کر دا دیں، سر ولیم میور نے قرآن مجید کی ترتیب، اس کی تدوین اور پھر اس کی نقلوں کی تقسیم کے بارے میں بھی شبہات پیدا کرنے کی کوششیں کی ہیں، انھوں نے مذکورۂ بالا کارروائیوں کو اپنی چابکدستی سے ایسے لفظوں میں بیان کیا ہے جن سے ان کے اغراض و مقاصد بے نقاب ہو جاتے ہیں، سر ولیم میور لکھتے ہیں کہ:

"اصلی جلد جو پہلی دفعہ مرتب ہوئی، حفصہ کے گھر میں دستیاب ہوئی، اور غور و فکر کے بعد اس پر نظر ثانی کی گئی، اگر زید اور اس کے ساتھیوں میں اختلاف پایا گیا تو ساتھیوں کی رائے کو ترجیح دی گئی، اس وجہ سے کہ وہ محاورۂ قریش سے واقف تھے، اور اس نے 'مجموعہ' کو اس طرح کی زبان سے تطبیق دی جس میں کہ پیغمبر صاحب نے اپنے الہامات کو بیان کیا تھا۔" (سر ولیم میور۔ خطبات احمدیہ ص ۳، ۴)

سر سید احمد خان نے مذکورۂ بالا اعتراض کا قدرے تفصیل سے جائزہ لیا ہے، وہ کہتے ہیں کہ سر ولیم میور نے جو کچھ بیان کیا ہے اس کا ماخذ دریافت کرنے میں ہم نہایت حیرت زدہ ہیں، مسلمانوں کے ہاں تو کسی کتاب میں ایسی حدیث یا کوئی روایت نہیں ہے، سر ولیم میور کے اعتراض میں تین جملے واضح طور پر قابل اعتراض ہیں، "نظر ثانی"، "اس طرح سے تطبیق دی"، اور "نیا مجموعہ"، کسی بھی قسم کی روایت سے ہم کو اس بات کا ثبوت نہیں ملا کہ زیدؓ بن ثابت کے جمع کیے ہوئے قرآن مجید میں کبھی نظر ثانی ہوئی ہو، جس حدیث میں اس کا تذکرہ ہے، اسکے الفاظ یہ ہیں: "فنسخوها في المصاحف" یعنی اس کی چند نقلیں انھوں نے کرلیں مگر اس روایت میں کسی مصرعہ نظر ثانی کا تو ذکر ہی نہیں ہے، اس روایت میں یہ عبارت بھی ہے کہ "اذا اختلفتم انتم و زيد بن ثابت في شيء من القرآن" یعنی جب تم میں اور زید بن ثابت میں قرآن مجید کی کسی چیز میں اختلاف ہو جائے، یہاں لفظ اختلاف سے کئی مفہوم پیدا ہو سکتے تھے، لیکن روایت کے آئندہ لفظوں نے اس کی تعیین کر دی ہے، چنانچہ یہ بیان کیا گیا ہے کہ "فاكتبوه بلسان قريش" یعنی اس کو قریش کی زبان میں لکھو، اس لیے روایت میں لفظ اختلاف سے

اختلاف تلفظ کے سوا اور کچھ مراد نہ تھی، بخاری کی روایت میں اس مراد کو اور زیادہ واضح کر دیا گیا ہے، اس میں یہ ہے کہ "فی عربیة من عربیة القرآن" یعنی قرآن کے کسی لفظ کی عربی ہیئت میں اختلاف ہو، اور جو لفظ مد، ادغام اور نون تنوین سے متعلق باتیں ہیں جو عرب کے مختلف قبیلوں میں رائج ہیں، سر ولیم میور کا یہ جملہ کہ" اور اس طرح سے کی زبان سے تطبیق کر دی" یہ غلط فہمی پیدا کرتا ہے کہ جامعین قرآن میں کچھ اختلافات پیدا ہوئے تھے، جن کی وجہ سے انھوں نے پچھلی تحریر میں کچھ تبدیلیاں کر دیں، حالانکہ حدیث سے اس بات کی تائید نہیں ہوتی، جامعین سے اگر یہ ہی کہا گیا تھا کہ اگر تم میں کچھ اختلاف ہو تو قریش کے محاورہ میں لکھو، لیکن اس بات کا ثبوت نہیں ہے کہ ان میں درحقیقت کوئی اختلاف رونما ہوا تھا، اس لیے سر ولیم میور کا یہ کہنا کہ" انھوں نے کی زبان سے تطبیق کر دی" صحیح نہیں ہے۔

سر ولیم میور کی طرف سے "نیا مجموعہ" کا لفظ بھی محض غلط ہے، جس پر وہ اپنی کتاب کے حاشیہ میں لکھتے ہیں کہ" اس معاملہ کی خرابی اور ناموزونیت سے بچنے کے لیے کہا گیا ہے کہ قرآن مجید اپنے بیرونی لباس کے لحاظ سے عربی کے سات مختلف لہجوں میں نازل ہوا تھا، یہ بات بعید از قیاس نہیں ہے، کہ خود محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہی اس قسم کے خیال کے بانی اور مؤید ہوئے ہوں، تاکہ ایک ہی آیت قرآنی میں لفظوں میں اختلاف کی دقت رفع ہو جائے۔ بقول سر سید:

" یہ (مذکورۂ بالا) عبارت ایک ایسے طرز اور تعصب سے لکھی گئی ہے جس پر ہم افسوس کرتے ہیں، ایسے لوگوں پر جو تقویٰ، نیکی، صداقت، صفائی باطنی اور راست بازی کے لیے ممتاز ہوں، دغا، فریب اور ریاکاری کا الزام لگانا صحیح دلیل و برہان کے معینہ قوانین اور اخلاق و تہذیب کے تسلیم شدہ اصول کے خلاف ہے، ہم اس بات کو اس کتاب کے پڑھنے والوں کی رائے پر چھوڑتے ہیں، اور اس سے زیادہ بحث نہیں کرتے، کیونکہ ہمارا عقیدہ ہے کہ وہ لوگ جو سچے پاکباز اور تقویٰ شعار ہیں وہ کسی مذہب اور ملت کے کیوں نہ ہوں مگر وہ ویسی ہی تعظیم اور تکریم کے مستحق ہیں جیسے کہ خود اپنے یہاں کے بزرگ

اور مقدس لوگ، پھر کیا سر ولیم میور اس بات سے بھی ناواقف ہیں کہ عربی زبان میں الفاظ کو مد یا بغیر مد کے، ادغام یا بغیر ادغام کے اور تنوین نون کے ساتھ یا بغیر نون کے پڑھنے سے جو عرب کے مختلف قبیلوں میں مختلف طریقے سے رائج تھے تلفظ میں کس قدر فرق ہو جاتا ہے، لیکن لفظاً یا معنًا میں کچھ فرق نہیں ہوتا، یا کوئی لفظ اپنے اصلی مادہ میں تبدیلی کے بغیر مختلف صورتوں سے پڑھا جا سکتا ہے، جیسے کہ سورۂ فاتحہ میں مَالِكِ کا لفظ ہے، جو قدیم طرز تحریر میں ملك لکھا جاتا تھا، اور اسے مَلِكِ ، مَلَّاكِ ، مَالِكِ بھی پڑھا جا سکتا ہے، چنانچہ عرب میں مختلف قبیلوں میں اس لفظ کے تلفظ میں فرق تھا، اور اس کے باوجود اس لفظ کے مادہ یا معنی میں کوئی فرق واقع نہیں ہوتا لیکن قریش کی زبان میں مَالِكِ کا تلفظ جاری تھا، اس کا قرآن مجید میں قائم رکھنا کیونکر اعتراض کا مستحق ہو گیا۔

سر ولیم میور نے جو کچھ لکھا ہے اس میں در اصل ان اغراض و مقاصد کی تکمیل کرنی تھی جن کیلئے انھوں نے یہ کتاب لکھی ہے مگر سب سے زیادہ سچی بات جو ان کے قلم سے نکلی ہے وہ یہ ہے کہ "دنیا میں غالباً کوئی اور ایسی کتاب نہیں ہے جو بارہ سو برس تک ایسے خالص متن کے ساتھ رہی ہو، اور ہم مسلمانوں کا تو یہ عقیدہ ہے کہ وہ ہمیشہ ایسی ہی رہے گی، اس بات کی تصدیق اس پیشین گوئی سے ہوتی ہے جو قرآن مجید میں موجود ہے، خدا فرماتا ہے: "اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ" (ہم نے قرآن مجید کو اتارا ہے، اور ہم یقیناً اس کی حفاظت کریں گے") (خطبات احمدیہ ص ۶، ۴)

سر ولیم میور نے عہد عثمانی میں قرآن مجید کی نقلیں کیے جانے کے واقعہ کی یہ عجیب توجیہ کی ہے کہ "اگر ابو بکرؓ کے قرآن کا متن خالص ہوتا تو اس قدر جلد وہ کیونکر خراب ہو جاتا کہ اپنے اختلافات کی وجہ سے ایک کامل نظر ثانی کا محتاج ہو گیا" لیکن سرسید کہتے ہیں کہ:

"ہم نہایت صاف طور پر یہ ثابت کر چکے ہیں کہ حضرت ابو بکرؓ کا قرآن نہ خراب ہوا تھا اور نہ اس میں

کسی نظر ثانی کی ضرورت پڑی، اور نہ ہی اس میں نظر ثانی کی گئی تھی، بلکہ صرف اس کی نقلیں کی گئی تھیں"

(خطبات احمدیہ ص ۴۰۶)

تبدیلی آیات | سر ولیم میور لکھتے ہیں کہ "اس دعوے کے واسطے کہ خود پیغمبر صاحب ہی نے بعض آیات کو جو ایک مرتبہ وحی ظاہر کی گئی ہوں' بعد کو تبدیل یا خارج نہ کر دیا ہو کوئی دلیل نہیں ہے" وہ اپنے دعوے کے ثبوت میں دو مثالیں بھی پیش کرتے ہیں، جو واقدی کی بیان کردہ ہیں، خود سر ولیم میور کے بیان کے مطابق "ایک روایت تو یہ ہے کہ حضرت عمرؓ نے ابی ابن کعبؓ کی تعریف کی اور فرمایا کہ وہ قرآن مجید کا سب سے کامل قاری ہے، ابی کی قرارت میں شامل بعض آیتوں کو ہم چھوڑ دیا کرتے ہیں کیونکہ ابی کہتے ہیں کہ میں نے پیغمبر صاحب کو یوں فرماتے سنا ہے، اور میں ایک لفظ بھی جو پیغمبر صاحب نے قرآن مجید میں درج کیا ہے نہیں چھوڑتا ہوں مگر اصل یہ ہے کہ قرآن مجید کے وہ حصے ابی کی عدم موجودگی میں نازل ہوئے تھے، جو بعض آیتوں کو جن کو وہ پڑھتا ہے نسخ یا ترمیم کرتے ہیں" سرسید نے اس روایت پر مندرجہ ذیل تبصرہ کیا ہے:

"جو کچھ سر ولیم میور نے بیان کیا ہے اس اصل حدیث کے مضمون سے جو حضرت عمرؓ سے منقول ہے سراسر خلاف ہے، اور اس عبارت کا کہ "بعض آیات کو جو ابی کے پڑھنے میں شامل ہیں چھوڑ دیا کرتے ہیں" اس حدیث میں پتہ بھی نہیں ہے اصل حدیث (بخاری کتاب التفسیر عن ابن عباس) یہ ہے (ترجمہ) حضرت عمرؓ نے کہا ہم لوگوں میں ابیؓ بڑے قاری ہیں اور علیؓ بڑے قاضی ہیں، اور ہم لوگ ابی کا قول چھوڑ دیتے ہیں بات یہ ہے کہ ابی کہتے ہیں کہ میں کوئی چیز جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سن چکا ہوں نہ چھوڑوں گا حالانکہ اللہ تعالیٰ نے کہا ہے: "مَا نَنْسَخْ مِنْ اٰيَةٍ اَوْ نُنْسِهَا"۔

اس حدیث سے ظاہر ہے کہ کسی جگہ اس میں یہ ذکر نہیں ہے کہ حضرت عمرؓ بعض آیات قرآنی کو جو ابی پڑھا کرتے تھے چھوڑ دیا کرتے تھے، یہ حدیث قرآن مجید سے احکامات مستنبط کرنے سے متعلق ہے، ابی قرآن مجید کی ہر آیت سے

حکم کا استخراج کرتے تھے، اور جملہ احکام کو صحیح خیال کرتے تھے، ان کی رائے میں ظاہر آیات سے جو معنی یا احکام نکلتے ہوں ان کے استخراج میں دوسری آیت پر نظر رکھنا ضروری نہیں جیسا کہ اہل ظواہر کا مسلک ہے، لیکن حضرت علی مرتضیٰ کی رائے اس کے برعکس معلوم ہوتی ہے، اس پر حضرت عمرؓ نے کہا کہ اُبی سب اچھا قرآن پڑھنے والے ہیں، اور حضرت علیؓ ہم میں سب سے بڑے قاضی یعنی سب بہتر حکم دینے والے ہیں اور ہم سب سے زیادہ قرآن مجید سے احکام و قوانین مستنبط کر سکتے ہیں، اس لیے ہم اُبی کے قول کو یعنی جو حکم انھوں نے قرآن سے نکالا ہے چھوڑ دیتے ہیں اور حضرت علیؓ سے اتفاق کرتے ہیں، ہماری اس تشریح کی تصدیق، دوسری باتوں کے علاوہ اس بات سے بھی ہوتی ہے کہ بخاریؒ نے جو مسلمانوں میں نہایت ناموز مقدس اور مستند محدثین میں سے ہیں اس حدیث کو اس مقام پر بیان کیا ہے جہاں کہ احکام ناسخ و منسوخ سے بحث کی گئی ہے، نہ کہ اس جگہ جہاں کہ انھوں نے مختلف قراءتوں کو بیان کیا ہے، بخاریؒ نے اسی حدیث کو کسی قدر ترمیم شدہ صورت میں قاریوں کے باہمی اختلاف کی بحث (باب القراء) میں بھی بیان کیا ہے، اور اس میں قراءت کے بجائے "لحن" کا لفظ ہے، جس کے معنی یہ ہوئے کہ حضرت عمرؓ نے حضرت علیؓ کے لحن کو (یعنی قراءت کے طریقہ کو) اُبی کے لحن پر ترجیح دی، بہرحال سر ولیم میور نے یہ معنی جو نکالے ہیں کہ حضرت عمرؓ نے کہا کہ ہم بعض آیتوں کو جو اُبی کے پڑھنے میں شامل ہیں چھوڑ دیا کرتے ہیں" یہ محض زبردستی کی ایک بات ہے، (روایت کے الفاظ میں اس معنی کی کوئی گنجائش نہیں)

(خطبات احمدیہ: ص ۴۷۷-۴۸۰)

(باقی)

حضرۃ العلامہ سید سلیمان ندویؒ کا مسلک طریقت

از ، ڈاکٹر نثار احمد فاروقی صدر شعبۂ عربی دہلی یونیورسٹی، دہلی ،

نہ من تنہا دریں میخانہ مستم ❖ جنید و شبلی و عطار شد مست

قرآن کریم میں حضرت سلیمان علیہ السلام کے ابتلاء و آزمائش میں ڈالے جانے اور قبول توبہ کے بعد اُن پر عنایات الٰہی کا ذکر اِن الفاظ میں کیا گیا ہے :

وَلَقَدْ فَتَنَّا سُلَيْمٰنَ وَاَلْقَيْنَا عَلٰى	ہم نے سلیمانؑ کو آزمائش میں ڈالا ، اور ان کے
كُرْسِيِّهٖ جَسَدًا ثُمَّ اَنَابَ قَالَ	تخت پر ایک بُھلا جسم (دھڑ) ڈال دیا ، پھر
رَبِّ اغْفِرْ لِيْ وَهَبْ لِيْ مُلْكًا	انھوں نے توبہ کی اور التجا کی : یارب مجھے
لَّا يَنْۢبَغِيْ لِاَحَدٍ مِّنْۢ بَعْدِيْ ۚ اِنَّكَ	معاف کر دے اور ایسا ملک عطا کر جو میرے بعد
اَنْتَ الْوَهَّابُ فَسَخَّرْنَا لَهُ الرِّيْحَ	کسی اور کو نصیب نہ ہو ، تو یقیناً بڑا بخشش
تَجْرِيْ بِاَمْرِهٖ رُخَآءً حَيْثُ اَصَابَ	کرنے والا ہے ، تو ہم نے اس کے لیے ہوا کو
وَالشَّيٰطِيْنَ كُلَّ بَنَّآءٍ وَّغَوَّاصٍ ،	مسخر کر دیا کہ وہ اس کے اشاروں پر چلنے لگی ،
وَّاٰخَرِيْنَ مُقَرَّنِيْنَ فِي الْاَصْفَادِ ،	اور سارے شیطان جن میں معمار اور غوطہ خور اور کچھ
هٰذَا عَطَآؤُنَا فَامْنُنْ اَوْ اَمْسِكْ	دوسرے زنجیروں میں بندھے ہوئے تھے سب
بِغَيْرِ حِسَابٍ وَاِنَّ لَهٗ عِنْدَنَا لَزُلْفٰى	اسی کے لیے مسخر کر دیے ، تو یہ ہے ہماری عطا ، اس پر

وَحُسْنَ مَآبٍ۔ تم شکر گذاری کرو، یا اسے بغیر حساب اپنے
پاس رکھو، اور اس کے لیے ہمارے پاس
(۳۸ ص ۳۴۔ ۴۰) حسن خاتمہ اور قربتوں کی نعمت بھی ہے۔

ان آیات کو سرنامہ بنانے سے مقصود یہ ہے کہ اگر توبہ و انابت کرنے والا ایک اولوالعزم پیغمبر ہو اور بے حساب بخشش کرنے والا ایک کریم مطلق تو اسے نہ ہم اپنی پوری توبہ پر قیاس کر سکتے ہیں، نہ عطایائے ربانی کو اپنی محدود اور ناقص فہم کے پیمانوں سے ناپ سکتے ہیں، یہ بے حساب بذل و عطا اتنی عام اور بیکراں ہو جاتی ہے کہ کبھی صرف ہم اسمی کی نسبت سے بھی ان فیوض و برکات کا مشاہدہ کیا جا سکتا ہے، چنانچہ دیکھ لیجیے کہ شمالی ہند کی مسلم سوسائٹی نے ماضی قریب میں کئی سلیمان پیدا کیے، جن کے قومی، مذہبی یا علمی کاموں کو دیکھ کر یقین ہوتا ہے کہ ان پر بھی دعائے پیغمبری هَبْ لِي مُلْكًا لَّا يَنبَغِي لِأَحَدٍ مِّنۢ بَعْدِي کا سایہ پڑا تھا، اور یہ بھی امید ہے کہ ان کے حق میں وعدۂ صادقۂ الٰہی إِنَّ لَهُ عِندَنَا لَزُلْفَىٰ وَحُسْنَ مَآبٍ بھی ضرور پورا ہوگا۔

پنجاب میں شاہ محمد سلیمان تونسوی چشتی نظامی (۱۷۷۰ء۔ ۱۸۵۰ء) نے شمع روحانیت کو روشن کیا، اور نہایت نامساعد حالات میں تونسہ جیسے غیر معروف قصبہ کو اشاعت دین اور اصلاح و تربیت کا مرکز بنا دیا، تو بہار میں شاہ محمد سلیمان پھلواروی نے اشاعت علوم اور تربیت و ارشاد کے شاندار کارنامے انجام دیے، میرے استاد و پیر و مرشد حضرت شاہ سلیمان احمد چشتی امروہوی (م یکم جنوری ۱۹۶۲ء) سجادہ نشین حضرت شاہ عبد الہادی چشتی و حضرت شاہ عبد الباری چشتی رضوان اللہ علیہم اجمعین بھی ایسے باکمال بزرگ تھے کہ اب ان کے ظاہری و باطنی اوصاف کو یاد کر کے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اب یہ آنکھیں کسی ایسے کو نہ دیکھیں گی۔

حضرت نظام الدین اولیاء محبوب الٰہی کی انگوٹھی کے عقیق پر بھی یہی دعائے سلیمانی کندہ تھی:
رَبِّ اغْفِرْ لِي وَهَبْ لِي مُلْكًا لَّا يَنبَغِي لِأَحَدٍ مِّنۢ بَعْدِي اور ظاہر ہے کہ سلطان المشائخ کے بوریائے فقر

پر بھی کوئی ایسی شان والا پھر نہ بیٹھ سکا۔

حضرۃ العلامہ سید سلیمان ندوی علیہ الرحمۃ علم و دانائی کے ہفت اقلیم کے تاجدار تھے۔ تفسیر، حدیث، فقہ، سیرۃ، منطق، کلام، تاریخ اور تصوف ہر قلمرو میں ان کا سکہ چلتا تھا، سلیمان پیغمبر کی طرح اللہ نے ان کے لیے بھی شہرت و ناموری کی ہواؤں کو مسخر کر دیا تھا اور خواہ وہ معاند مستشرقین ہوں، یا خامکار محققین سب ان کی پیشی میں مُقَرَّنِيْنَ فِي الْاَصْفَادِ نظر آتے ہیں۔

ہر ظاہر کا ایک باطن ہے تو علم بھی الفاظ کے وسیلہ سے جہان معنی تک پہونچنے کا نام ہے، ظاہر علم کا رشتہ گہرائیوں سے گذر کر باطن علم سے جڑتا ہے، یہاں سطح ظاہر سے اوپر اٹھنا نہیں ہے، سطح کے نیچے اور لفظوں کی تہ میں معانی حاصل کرنا ہے، یہ توفیق ہر ایک کو نہیں ملتی اور جنھیں یہ سعادت ملتی ہے وہ ظاہر علم کی ماہیت اسی طرح بدل دیتے ہیں جیسے خدا کی ایک ننھی سی مخلوق شہد کی مکھی پھولوں اور پھلوں کو شہد میں تبدیل کر دیتی ہے۔ جسے قرآن نے شِفَاءٌ لِّلنَّاسِ کہا ہے علم ظاہر بھی ایک مرحلہ میں معرفت کا شہد بن جاتا ہے جس میں ہماری روحانی شفا ہے۔

کہتے ہیں کہ علم کی ابتداء حیرت ہے اور فلاسفہ کیلیے اس کا انجام بھی حیرت کے سوا کچھ نہیں ہے، لیکن جو علماء، جویائے حق ہیں اور کہتے ہیں: رَبَّنَا اَرِنَا حَقِيْقَةَ الْاَشْيَاءِ كَمَا هِيَ ان کا علم منزل معرفت وحقیقت کا راستہ بن جاتا ہے۔ حضرت مولانا سید سلیمان ندویؒ کو اللہ نے وہ علم نہیں دیا تھا جو شہرت یا رزق کمانے کے کام آتا ہے، اس علم سے نوازا تھا جو معارف کا زینہ ہے اور جو لا انتہا کی سیر بے نہایت تک پہونچا دیتا ہے، اس منزل پر عالم خود ایک روشنی بن جاتا ہے جو دوسروں کی راہیں اجالتی ہے، مشہور مقولہ ہے موت العالِم موت العالَم، لیکن عموماً اس کا مفہوم غلط سمجھا گیا ہے، ایک فرد کی موت ساری دنیا کی موت کیسے ہو سکتی ہے؟ یہاں عالَم دنیا کے معنی میں نہیں ہے، بلکہ علم کا اسم آلہ ہے بر وزن فاعَل، مراد یہ کہ عالِم کی موت صرف ایک صاحب علم کی موت ہی نہیں، ایک وسیلہ علم کا فقدان بھی ہے، یہ تو ایک جملہ معترضہ تھا، میں اس علم کی بات

کررہا تھا جو لفظوں سے پرے اور کتابوں سے ماورا ہو کر ملتا ہے، اسی کو عارف رومی نے یوں کہا ہے:

صد کتاب و صد ورق در نار کن سینہ را از نور حق گلزار کن

ان راہوں سے اس منزل تک ایسی سبک روی اور سرخ روئی کے ساتھ پہونچنے کی مثالیں بہت ہی کم ہیں، چھٹی صدی ہجری میں امام محمد غزالیؒ ہیں، جنھوں نے علم کی پستی سے اوپر اٹھ کر اور ہی کی اہمیت میں نیچے اتر کر معرفت کی منزل اعلیٰ تک جانے کا اپنا سفرنامہ المنقذ من الضلال میں لکھا ہے، ساری عمر درس و تدریس اور شغل کتاب و تصنیف میں منہمک رہنے والے کا ضمیر جب اچانک جاگ اٹھتا ہے اور علم و فضل کا سارا طمطراق ہکا بکا ہو کر سنتا ہے کہ یہ کیا آواز آرہی ہے:

فصارت شهوات الدنيا تجاذبني	خواہشات دنیا نے مجھے اپنی زنجیروں میں
بسلاسلها الى المقام ومنادى	باندھ کر کھینچنا شروع کیا کہ میں قیام کر دوں،
الايمان ينادى: الرحيل الرحيل	اور ایمان کی ندا دینے والا کوچ کی صدا لگا
فلم يبق من العمر الا قليل و	رہا تھا عمر تھوڑی رہ گئی ہے اور تیرے سامنے
بين يديك السفر الطويل و	طویل سفر ہے اور جن چیزوں میں تو پھنسا
جميع ما انت فيه من العمل	ہوا ہے علم اور عمل یہ سب ریا و تخییل ہیں، اگر
والعلم رياءٌ وتخييل، فان	آج آخرت کے لیے تیاری نہیں کرے گا تو پھر
لم تستعد الآن للآخرة فمتى	کب کرے گا؟ اور آج ان بندھنوں سے
تستعد وان لم تقطع الآن هذه	دامن نہیں چھڑائے گا تو پھر کب چھڑائے گا۔
العلائق فمتى تقطع؟	

. . .

آخر تلاش و تحقیق اور علم و تدقیق کا یہ اضطراب ایک ایسی سکینۃ و طمانینت کے عالم تک لے گیا جس کی

تمنا تو بہتوں نے کی ہے مگر اسے کم ہی خوش نصیبوں نے پایا ہے :

اے خدا بنما تو جاں را آں مقام کاندراں بے حرف می روید کلام

اس مقام سکینت کے طلبگار تو ہمیں ہزاروں نظر آجاتے ہیں مگر ان حدود تک پہونچ جانے والوں کی پرچھائیں کا بھی ہم ادراک نہیں کر سکتے، بس عارف رومی ہی اس کا کچھ بیان کر سکتا ہے :

من ز تن عریاں شدم او از خیال می خرامم در نہایات الوصال

ہماری صفوں میں عالموں، محققوں، دانشوروں اور مفکروں کی کمی نہیں ہے، علم کا ایک حصہ وہبی ہے، اور خدا کی بخشش بے حساب و لازوال ہے وہ آج بھی ہے اور کل بھی رہے گی، دوسرا حصہ کسبی و اختیاری ہے، اس میں بھی انسان کی جد و جہد کا عمل بقدر توفیق جاری رہتا ہے، لیکن وہ علم جو سبب معرفت بنتا ہے اور جو خود ایک منزل پر پہنچ کر ہیچ معلوم ہونے لگتا ہے وہ اخص خواص ہی کو ملتا ہے، صوفیا علم کو بھی حجاب ہی کہتے ہیں، العلم حجاب اکبر، ان کا قول ہے کہ معاصی حجابات ظلمانی ہیں اور علم حجاب نورانی ہے، روشنی کے وفور میں بھی انسان حقیقت اشیاء کو نہیں پہچان سکتا، تصوف کی راہ میں سب سے افضل مرتبہ سالک مجذوب کا ہے جسے دوسرے لفظوں میں "فقیہ صوفی" بھی کہا جا سکتا ہے، یہ وہ منزل ہے جہاں خورشید حقیقت طلوع ہوتا ہے تو علم کے قطرات دیر تک تاب مقاومت نہیں لا سکتے، اور آخر علم مغلوب ہو جاتا ہے۔

حضرت نظام الدین اولیاؒ جب حضرت بابا فرید الدین مسعود گنج شکرؒ سے بیعت ہوئے تو انھوں نے شیخ سے عرض کیا کہ میں ایک طالب علم ہوں، ابھی سلسلۂ تعلیم جاری ہے، اسے یوں ہی جاری رکھوں یا چھوڑ کر اوراد و وظائف میں لگ جاؤں؟ شیخ نے فرمایا: "میرا یہ طریقہ نہیں کہ کسی کو تحصیل علم سے باز رکھوں، تم دونوں شغل جاری رکھو اور پھر دیکھو کہ کون سا غالب رہتا ہے"۔ حضرت نظام الدینؒ نے ایک زمانہ کے بعد اپنی مجلس میں فرمایا کہ میں نے نہ کسی کو غالب دیکھا نہ مغلوب پایا، کہنے کو یہ ایک تمثا

چھوٹا سا جملہ ہے، مگر ایک انتہائی دشوار مقام کی طرف اشارہ کر رہا ہے جہاں ظاہر و باطن میں ایک توازن پیدا ہو جاتا ہے اور وہ استقامت ملتی ہے جسے "فوق الکرامۃ" کہا گیا ہے، یہی توازن ہمیں مولانا سید سلیمان ندوی کی شخصیت میں نظر آتا ہے، وہ ایسے "فقیہ صوفی" ہیں جنھوں نے علم ظاہر و باطن میں توازن پیدا کیا اور اسے مستقیم بھی رکھا۔

سید صاحبؒ کا یہ سفر حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ کے آستانہ پر تمام ہوتا ہے:

آں دل کہ رم نمودے از خوبرو جواناں   دیرینہ سال پیرے بُرد ش بیک نگاہے

(وہ دل جو خوبصورت جوانوں سے بھی بھاگتا تھا اسے ایک بوڑھے نے ایک نگاہ میں چھین لیا)

تھانہ بھون جیسے چھوٹے سے قصبہ میں پہونچ کر وہ پکار اٹھتے ہیں:

من کہ در ہیچ دیارے نزدم خیمۂ عشق   پیش تو رخت بیفگندم و سر بنہادم

(میں نے کسی شہر میں خیمۂ عشق نہیں لگایا تھا، مگر تیرے سامنے آیا تو اپنا رخت سفر ڈال دیا، اور سر جھکا دیا)

وہ مرید جو قرآن کی حکمتوں کا جاننے والا، اسرار حدیث کا شناسا، اور اسلامی فکر کے قاموس کا شناور تھا اس نے اپنے مرشد روحانی کا انتخاب کرنے میں کیسی کچھ چھان بین نہ کی ہوگی، خود کہتے ہیں کہ:

"کامل دس برس تک چپکے ہی چپکے ہندوستان سے عرب تک نظر دوڑاتا رہا، لیکن کوئی ہستی ایسی نظر نہ آتی تھی جو میرے درد کی درمانی کر سکے، بعض بزرگ ملے بھی تو طبیعت کو ان سے مناسبت نہیں ہوئی، بار بار یہی خیال آتا تھا کاش حاجی امداد اللہ صاحب حیات ہوتے۔"

حضرت حاجی امداد اللہ فاروقی مہاجر مکی علیہ الرحمۃ (م ۱۳ جمادی الثانیہ ۱۳۱۷ھ، مطابق ۱۹ اکتوبر ۱۸۹۹ء) اپنے زمانہ میں آیۃ من آیات اللہ تھے، آج ہر طرف اُن ہی کا

روحانی فیضان ہے جس نے دین و دانش کی محفلوں کو اجال رکھا ہے، وہ دارالعلوم دیوبند ہو یا مظاہر العلوم سہارن پور، ندوۃ العلماء ہو یا مدرسہ صولتیہ (مکہ معظمہ) جامعۂ نظامیہ (حیدرآباد) ہو یا جامعہ اشرفیہ لاہور، سب کی نسبت ان کی ذات سے جڑی ہوئی ہے، سرسید احمد خان پر بھی ان کی چشم عنایت تھی اور انھوں نے فرمایش کرکے سرسید سے ایک رسالہ کا ترجمہ بھی کرایا تھا، پچھلی صدی میں کوئی ممتاز عالم دین، کوئی درویش، کوئی خانقاہ ایسی نہیں ہے جس تک بالواسطہ یا بلاواسطہ حضرت حاجی امداد اللہ صاحب کا فیضان عمیم نہ پہونچا ہو۔

یک خرقہ، غمت درست نگذاشت　　　در صومعۂ کبود پوشان

(تیرے غم نے خانقاہوں میں ایک خرقہ بھی سالم نہیں چھوڑا ہے)

وہ سلسلۂ نقشبندیہ میں حضرت شاہ نصیرالدین نقشبندیؒ سے بیعت ہوئے، پھر چشتیہ سلوک کی تکمیل میاں جی نور محمد جھنجھانوی (م ۴ رمضان ۱۲۵۹ھ) سے کی، میاں جی کو نعمت باطنی حضرت سید عبدالرحیم فاطمی شہید بالاکوٹ (۲۴ ذی قعدہ ۱۲۴۶ھ مطابق ۶ مئی ۱۸۳۱ء) سے ملی تھی، جنھیں خلافت و اجازت قیوم زمانی حضرت شاہ عبدالباری چشتی امروہوی (م ۱۱ شعبان ۱۲۲۶ھ مطابق ۱۳ اگست ۱۸۱۱ء) سے حاصل تھی، حضرت عبد الرحیم فاطمی امروہہ سے مجاہدین کا ایک مختصر دستہ لیکر حضرت سید احمد شہیدؒ رائے بریلوی کے ساتھ جہاد میں شامل ہوئے تھے اور ان کے ساتھ ہی شہید ہوئے ؂

بنا کردند خوش رسمے بخاک و خون غلطیدن　　　خدا رحمت کند ایں عاشقان پاک طینت را

(انھوں نے خاک و خون میں لوٹنے کی کیا ہی اچھی رسم ایجاد کی ہے، خدا ان عاشقانِ پاک طینت پر رحمت کرے)

وہ مجاہدۂ فنا کی دشوار گذار منزلوں سے یوں چشم زدن میں گذر گئے کہ آج بس آوازۂ نیکنامی

رہ گیا ہے، نشانِ قبر تک باقی نہیں۔

بعد از وفات تربت ما در زمیں مجوے در سینہ ہائے مردم عارف مزارِ ما

(ہماری موت کے بعد ہماری تربت زمین پر تلاش نہ کرنا، کیونکہ ہمارا مزار عارفوں کے سینوں میں ملے گا۔)

مولانا سید سلیمان ندویؒ کا دل اگر حاجی صاحب کی طرف کھنچتا تھا تو یہ خود اخلاص اور طلبِ صادق کی دلیل ہے، اشتیاق کی آگ برسوں سے سلگ رہی تھی، ۱۹۲۹ء میں انھوں نے حضرت حاجی صاحبؒ کو خواب میں دیکھا تو سید صاحبؒ نے اپنے اور پھر حاجی صاحبؒ کے سینے کی طرف انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے عرض کیا کہ "اس کو ایسا کر دیجئے"، حاجی صاحبؒ نے مسکراتے ہوئے فرمایا کہ "اب تو میں ایسا نہیں کر سکتا"، اشارہ واضح تھا کہ شیخ کا عالمِ ظاہر میں ہونا ضروری ہے اور اب وہی ان مقامات کی سیر کرا سکتا ہے جسے باطنی نعمت کے ساتھ اجازت حاصل ہو، تھانہ بھون میں حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ خانقاہ امدادیہ میں رونق افروز تھے، وہ ظاہر و باطن کی خوبیوں کے علاوہ ایک ممتاز عالمِ دین، فقیہ، مفسر، متکلم، مصلح و مجدد بھی تھے اور امراضِ نفسانی و خباثتِ روحانی پر گہری نظر رکھتے تھے، جس طرح ایک طبیب امراضِ جسمانی کی تشخیص اور ان کا بتدریج علاج کرتا ہے، اسی طرح مولانا تھانویؒ کا روحانی مطب چلتا تھا، ان کے مواعظ اور ملفوظات بھی اتنی کثرت سے اور ایسے اہتمام سے جمع ہوئے ہیں کہ اور کسی کے مواعظ و ملفوظات کی گرد آوری کا وہ اہتمام کبھی نہیں ہوا، مگر مولانا تھانوی ایسے جغرافیائی علاقہ میں، ایسے تاریخی سیاق میں اور ایک ایسی زوال آمادہ سوسائٹی میں پیدا ہوئے کہ انھیں پہچاننے کا حق ادا نہ ہو سکا، جسے دقائقِ شریعت سے، فکرِ اسلامی سے، نظامِ عبادات اور تصوفِ اسلامی کے علمی و نظری مسائل سے دلچسپی ہو اور انھیں سمجھنے کے علاوہ استقامتِ فکر کا طلبگار ہو، اس کے لیے یہ مواعظ و ملفوظات نہایت

گرانقدر سرمایہ ہیں، میں ان کے مسلک سے لازماً ہر جگہ اتفاق نہ کرنے پر بھی مولانا تھانویؒ کا احترام کرتا ہوں۔

مولانا تھانویؒ حضرت حاجی صاحبؒ سے ان کے آخری زمانۂ حیات میں مستفید ہوئے تھے اور یہ فرماتے تھے کہ "ہم نے حاجی صاحبؒ کے پکے پھل کھائے ہیں"، اور خود مولانا تھانویؒ کے شجرِ معرفت پر پکے ہوئے پھل مولانا سید سلیمان ندویؒ کو نصیب ہوئے، مقاماتِ سلوک تو سید صاحبؒ طے کرکے ہی وہاں پہونچے تھے، کسی ریاضت یا مجاہدہ کی ضرورت تو انھیں ہوتی ہے جو خامی میں پختہ ہوجاتے ہیں، سید صاحبؒ کو تو پاک باطن درویشوں کے اس سلسلۃ الذہب میں شامل ہونا تھا اور اس نسبت کا حصول ہی کرنا تھا، کہتے ہیں کہ شیخ بہاء الدین زکریا ملتانی صرف ۱۷ دن شیخ شہاب الدین سہروردی کی خانقاہ میں رہے، اور خلافت سے مشرف ہوکر رخصت کردیے گئے، بعض درویش برسوں سے مجاہدات کر رہے تھے، انھوں نے شیخ سہروردی سے دبے لفظوں میں شکایت کی ہوگی کہ یہ امتیازی سلوک کیوں؟ تو انھوں نے فرمایا کہ "زکریا سوکھی لکڑیاں لایا تھا میں نے آگ دکھادی، تم ابھی گیلی لکڑیاں لیے بیٹھے ہو"۔ سید صاحبؒ تو شاید آگ بھی خود ہی لگا چکے تھے بس کسی کے دامن کی تھوڑی سی ہوا درکار تھی، اور یہ مقصد "خانقاہ امدادیہ" میں حاصل ہوگیا،

خام بدم پختہ شدم و سوختم۔

حضرت تھانویؒ کو بھی اپنے مسترشد سے ایسا قلبی لگاؤ تھا کہ کبھی جوشِ محبت میں استقبال کے لیے کھڑے ہوجاتے ہیں، کبھی فرماتے ہیں کہ آدھی رات کو آنکھ کھل جاتی ہے تو بے اختیار جی چاہتا ہے کہ مولوی سید سلیمان کو بلالوں اور ان سے باتیں کروں، کبھی اپنا عصائے خاص یہ کہکر مرحمت فرماتے ہیں کہ "راحتِ جان، راحتِ جسم کا سامان بھیج رہا ہوں"، اور سید صاحبؒ جواباً عرض کرتے ہیں کہ اس عطائے خاص سے میں نے استقامۃ فی العمل کی تعبیر لی۔ تو شیخ سیکڑوں دعاؤں سے

سرفراز کرتے ہیں، کبھی سید صاحب کی مدح میں اشعار موزون کرنے لگتے ہیں :

اے دلت معمور از اسرارِ حق اے دلت مغمور از آثارِ حق

اے دلت پر نور از انوارِ حق اے دلت مسرور از اخبارِ حق

اور خلافت دے کر شیخ نے حاضرین سے فرمایا کہ "الحمد للہ اب مجھے کچھ فکر نہیں، میرے بعد ایسے ایسے لوگ موجود ہیں"، ظاہر بینوں کے ایک حلقہ نے اس وقت بھی چہ میگوئیاں کی تھیں کہ سید صاحبؒ نے علم و تحقیق کا میدان چھوڑ دیا اور ذکر جہر کرنے لگے ہیں، اب بھی کچھ لوگوں کو یہ کہتے سنا جاتا ہے کہ وہ دنیائے علم کو بہت کچھ دے سکتے تھے، مگر خود کو معطل کر کے بیٹھ گئے، میں کہتا ہوں کہ سید صاحبؒ خوش نصیب تھے کہ انھوں نے علم کی شمعیں جلا کر دوسروں کو بھی راہ دکھائی اور خود بھی منزل عرفان تک پہونچ گئے، جو ان سے مزید علمی کاوشوں کا مطالبہ کرتے ہیں وہ پہلے تو کوئی ایسی دوسری شخصیت بتائیں جس نے اتنا اور ایسا عظیم الشان کام کیا ہو، پھر یہ بتائیں کہ سید صاحبؒ نے جو کچھ علمی سرمایہ چھوڑا ہے کیا انھوں نے واقعی اس کی اہمیت اور قدر و قیمت کو پہچان لیا ہے ؟

ایسے ہی ایک علمی مذاق رکھنے والے بزرگ حضرت بابا فرید گنج شکر سے بیعت ہو گئے تھے، اور اپنے مدرسہ کے ساتھیوں سے طعنے سنتے تھے، بابا صاحب نے ان سے کہا تھا کہ اب تمھیں کوئی طعنہ دے تو کہہ دینا :

نہ ہمراہی تو مرا راہ خویش گیر و برو ترا سعادتے بادا مرا نگونساری

صوفیاء کے ہاں خلافت کی بھی کئی قسمیں ہیں، ان میں سب سے افضل خلافت رحمانی ہے جو اشارۂ غیبی سے کسی کو دی جاتی ہے، حضرت نظام الدین اولیاء کو یہی خلافت ملی تھی اور پہلی بار انھیں دیکھ کر بابا فریدؒ نے یہ شعر پڑھا تھا :

اے آتشِ فراقت دلہا کباب کردہ سیلاب اشتیاقت جانہا خراب کردہ

اور یہ عجیب امتیاز ہے کہ سلسلۂ چشتیہ صابریہ امدادیہ کے اکثر بزرگوں کو یہی خلافت رحمانی باشارۂ غیبی عطا ہوئی، سید عبدالرحیم فاطمی ایک خواب دیکھ کر افغانستان سے چلے اور بیسیوں خانقاہوں کو دیکھتے بھالتے امروہہ پہونچ گئے، جہاں انھیں حضرت شاہ عبدالباری سے نعمت باطنی حاصل ہوگئی' حضرت حاجی امداد اللہؒ نے بھی خواب میں دیکھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا ہاتھ میاں جیؒ نور محمد جھنجھانوی کے ہاتھ میں دے دیا ہے، ایسی اور بھی مثالیں ہیں، سید صاحبؒ کو بھی یہی خلافت رحمانی عطا ہوئی تھی، ایک بار انھوں نے لکھا: "مجھے فخر یہ ہے کہ لوگوں نے مولانا تھانویؒ کو اپنی طرف کھینچا، اور مجھے خود مولانا تھانویؒ نے بار بار اپنی طرف کھینچا (عالم رویا) یہ اسی خلافتِ رحمانی کی کشش تھی۔

حضرت مولانا سید سلیمان ندویؒ کی نسبت تمام تر نسبت عشقی ہے، ان کا باطن چشتی انوار سے معمور ہے لیکن نور علم نے اس کو حب عقلی بنا دیا ہے جو زیادہ پائدار ہوتی ہے، چشتیہ کے یہاں سلوک کا کوئی نصاب مقرر نہیں اور لطائف کی چھان بین بھی نہیں ہے، ان حضرات کا سب سے اہم لطیفہ "قلب ہے" اور یہی عین قرآنی سلوک ہے: مَنْ اَتَى اللّٰهَ بِقَلْبٍ سَلِيْمٍ۔

سید صاحبؒ نے فرمایا کہ حضرت تھانویؒ کا سلسلہ نقشبندی و چشتی کا سنگم ہے، ذوق و شوق چشتی ہے اور اتباع کا ذوق نقشبندی، حضرت حاجی صاحب دونوں سلسلوں کا قرآن تھے' اگرچہ غلبہ چشتی نسبت ہی کو تھا، سید صاحب میں بھی اس جامعیت کے آثار پوری طرح ظاہر ہیں۔

علمی حلقوں سے ایک اعتراض یہ بھی اٹھا کہ بیعت کے بعد سید صاحب نے اپنی تمام تصانیف پر نظر ثانی کی، اور بعض اعتقادی باتوں سے رجوع کر لیا، اس سلسلہ میں یہ وضاحت کر دینا ضروری ہے کہ اس طرح کی نظر ثانی یا مراجعت کے لیے مولانا تھانویؒ نے کبھی صراحتًہ یا اشارتًہ کوئی مطالبہ نہیں کیا تھا، تصوف میں ارادت "اتحاد مطلب" کا نام ہے، جب یہ مقام حاصل ہوگیا تو فطری

بات تھی کہ عمل اور عقائد میں جہاں جہاں شیخ کے مسلک سے اختلاف پایا جائے اس پر نظرِ ثانی کی جائے، اور سید صاحب نے یہ مراجعت بھی پوری علمی شان اور دلائل کے استناد کے ساتھ کی تھی تصوف میں "اتحادِ مطلب" کا وہی مرتبہ ہے جو شریعت میں "اتباعِ سنت" کا ہے، جو امور مختص بالنبوۃ ہیں انھیں چھوڑ کر باقی تمام امور میں شیخ نبی کا قائم مقام ہوتا ہے، سید صاحبؒ نے اس طرح کے اعتراضات سن کر ایک بار کہا تھا "لوگ مجھ کو کہتے تو محقق اور علامہ ہیں مگر درحقیقت بے عقل جانتے ہیں" اور اگر کبھی کسی نے زیادہ احسان جتایا تو صاف یہ جواب لکھ دیا کہ جن کمالات کی بنا پر آپ نے مجھے اپنا قبلہ بنایا تھا ان ہی کمالات نے مجھے مولانا تھانویؒ کے آگے جھکا دیا، میں نے اپنے انجام کی فکر کرلی اب آپ کو اختیار ہے اپنا قبلہ کوئی اور تجویز کرلیں۔"

تربیت سالک کیلیے مولانا تھانویؒ نے بڑی دقیقہ سنجی اور باریک بینی سے پورا نصاب تیار کیا تھا اس لیے ان کا تربیت یافتہ کندن ہو کر نکلتا تھا، پھر بھی انھوں نے بیعت و خلافت کیلیے گنے چنے لوگوں ہی کو مجاز کیا اکثر کو صرف "مجازِ صحبت" بنانے پر ہی اکتفا کیا، سید صاحبؒ کو اگر اجازت بیعت" ملی تو یہ چنداں تعجب کا مقام نہیں جس طرح انھوں نے علامہ شبلیؒ کے علمی کاموں کو اسی شان کے ساتھ پایۂ تکمیل تک پہنچایا ایسے ہی مولانا تھانوی کا انداز تربیت اگر کہیں پورا پورا رچا ہوا ملتا ہے تو وہ سید صاحبؒ ہی کے ہاں ملتا ہے، اور اس کی تفصیل مولوی غلام محمد صاحبؒ کی کتاب "تذکرہ سلیمان" میں دیکھی جاسکتی ہے، مرشد اور مسترشد کے ربط کی ایسی واضح، مدلل، بدیع اور مفصل تصویر دوسری جگہ ملنی بہت ممتنع ہے، حضرت بابا فریدنے شیخ نظام الدین اولیاء کو خلافت دیتے ہوئے فرمایا تھا کہ "خدا نے تمھیں علم، عقل اور عشق تینوں جوہر عطا کیے ہیں اور جس میں یہ تینوں جوہر ہوں اس سے مشائخ کی خلافت خوب ہوتی ہے" سید صاحبؒ پر بھی یہی بات صادق ہے، جب سید صاحبؒ مولانا تھانویؒ کے مرید ہوگئے تو ایک محفل میں مولانا ابوالکلام آزاد نے ان سے پوچھا: "سنا ہے آپ مرید ہوگئے ہیں" انھوں نے متانت سے جواب دیا: "جی ہاں" مولانا آزاد نے دوسرا چبھتا ہوا سوال کیا "اخراس تصوف میں ملتا کیا ہے؟" اس کا سید صاحبؒ نے ٹالنے والا جواب دیا کہ "اب یہاں کیا بتاؤں کچھ کبھی بتاؤں گا" مگر دل میں سوچا ہوگا کہ ؎ لطف مے تجھ سے کیا کہوں زاہد ہائے کمبخت تو نے پی ہی نہیں

(نوٹ) یہ مقالہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے مولانا سید سلیمان ندوی سیمینار میں پڑھا گیا۔

حضرت مخدوم قاری نظام الدین شیخ بھکاری کاکوروی رحمۃ اللہ علیہ

از

مسعود انور علوی کاکوروی ریسرچ اسکالر شعبۂ عربی مسلم یونیورسٹی علیگڑھ

نام و نسب | مخدوم زادگان علوی، کاکوری کے مورث اعلیٰ حضرت مخدوم نظام الدین قاری قادری رحمۃ اللہ علیہ کا شمار عہد اکبری کے نامور مشاہیر علماء و ارباب فضل میں ہوتا ہے، دربار اکبری سے ۹۸۲ھ / ۱۵۷۴ء میں جاری شدہ ایک فرمان میں ان کے نام نامی کے ساتھ "قاری آبائی نظام الدین شیخ بھیکہ دانشمند" لکھا ہے، اسی وجہ سے اہل کاکوری اور آپ کی اولاد کی زبان پر شیخ بھیکہ ہے، لیکن ان کے خلفاء کے مریدین کے شجرۂ طریقت میں بھکاری درج ہے، مرزا شمس الدین خان کوکا نے بھی اسی طرف اشارہ کیا ہے، چنانچہ اپنی مثنوی میں شیخ رحمۃ اللہ علیہ کی شان میں یوں رطب اللسان ہیں:

شاہے کہ نبیرۂ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہست — شاہے کہ نبیرۂ علی رضی اللہ عنہ ہست
ہادی رہ جناب باری تعالیٰ — آں شاہ نظام الدین رحمۃ اللہ علیہ بھکاری

حضرت مولانا عبد الرشید ملتانی رحمۃ اللہ علیہ خلیفہ و مسترشد حضرت مخدوم رحمۃ اللہ علیہ و استاذ حضرت شیخ مجدد الف ثانی سرہندی رحمۃ اللہ علیہ "زاد الآخرۃ"[1] میں رقمطراز ہیں:

---

[1] حضرت موصوف رحمۃ اللہ علیہ، حضرت مخدوم کے محبوب شاگرد و خلیفہ تھے "زاد الآخرۃ" نامی ایک کتاب اپنے شیخ کے حالات میں لکھی تھی، حضرت مجدد الف ثانی نے تفسیر بیضاوی کا درس آپ ہی سے لیا تھا، ملاحظہ ہو کشف المتواری فی حال نظام الدین قاری، حضرت مولانا شاہ تراب علی قلندر علوی ۱۱۲ – ۱۱۹، زاد الآخرت قلمی، کتب خانہ انوریہ خانقاہ کاظمیہ، کاکوری، ۱۲ منہ۔

نسب شریف آں برگزیدۂ خدا و جگر بند مرتضیٰ
علوی است، از اولاد امجاد محمد
بن حنفیہ بن امام الاولیاء علی
شیر خدا کرم اللہ وجہہ، و اسمائے
متبرکہ بہ تحریر می آرم، اوّل از
زبان حضرت پیر و مرشد و نیز از
زبان فیض ترجمان حضرت جد امجد
قاری امیر سیف الدین رحمہ اللہ مستند
نمودم، بعدہٗ چوں تذکرۂ حمیدی بہ نظر
در آمد ہماں اسمائے متبرکہ از حضرت
محمد بن حنفیہ تا مولانا شمس الدین
محقق بن قاری عبد المجید بہ مقابلہ
در آوردم، سرمو تفاوت نہ یافتم
ما بقی اسمار را بہ موجب بیان
حضرتین سند صحیح بلکہ اصح دانستہ
داخل کتاب نمودم و مجموع اسمار
از اسم مبارک حضرت پیر و مرشدنا
حضرت محمد بن حنفیہ بست و یک اسم
یافتم مفصل بریں گونہ، مولانا قاری

اللہ تعالیٰ کے ان برگزیدہ اور حضرت علیؓ
مرتضیٰ کے جگر گوشہ کا نسب شریف علوی ہے،
حضرت محمد بن حنفیہ بن امام الاولیاء علی
شیر خدا کرم اللہ وجہہ کی بزرگ اولاد میں سے
ہیں، سلسلۂ نسب کے یہ اسمائے متبرکہ جو میں
لکھ رہا ہوں سب سے پہلے حضرت پیر و مرشد
اور حضرت جد امجد قاری امیر سیف الدین
رحمۃ اللہ علیہ کی زبان فیض ترجمان سے سن کر
مستند قرار دیے، اس کے بعد جب تذکرۂ حمیدی
(مولفہ آقا حمید الدین بدخشی از اصحاب خاص
و شاگرد رشید قاری عبد المجیدؒ) کا مطالعہ کیا
تو حضرت محمد بن حنفیہ سے مولانا شمس الدین محقق
بن قاری عبد المجید تک کے تمام مبارک نام
مقابلہ کیے، سرمو فرق نہ پایا، بقیہ ناموں کو
دونوں حضرات کے بیان کے مطابق درست
بلکہ سب سے درست جان کر کتاب میں شامل
کر لیا، حضرت پیر و مرشد سے حضرت محمد
بن حنفیہؒ تک کے تمام اکیس ۲۱ ناموں کو
اس طرح تفصیل سے پایا (۱) مولانا قاری

نظام الدین بھیکہ المعروف بہ شاہ
بھکاری بن قاری امیر سیف الدین بن قاری
حبیب اللہ نظام الدین المعروف
بہ امیر کلاں بن قاری امیر نصیرالدین
دلیل اللہ بن قاری محمد صدیق المعروف
بہ ابومحمد خانی بن قاری عبیداللہ بن
قاری عبدالصمد بن قاری امیر شمس الدین
خورد المعروف بہ قاری محقق جامع جمع الجوامع
کبیر لغت احادیث وتفاسیر بن قاری عبدالمجید
دربان آستانۂ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
بن حاجی حرمین سلطان حسین بن قاری امیر
ابراہیم نبیرۂ خلیفہ سید عبدالرزاق
خلف وخلیفہ حضرت غوث الثقلین رضی اللہ
عنہما بن قاری سلطان عبداللطیف بن
امیر عبیداللہ خانی بن مولانا شمس الدین
صابر بن قاری مجیدالدین خانی
بن قاری امیر سلیمان مفسر کہ از
سن سیزدہ ۱۳ سالگی تا نود ودو ۹۲ سالگی
بجز درس تفاسیر بہ علوم غیر دینیہ

نظام الدین بھیکہ المعروف بہ شاہ
بھکاری (۲) بن قاری امیر سیف الدین
(۳) بن قاری حبیب اللہ نظام الدین
امیر کلاں (۴) بن قاری امیر نصیرالدین دلیل اللہ
(۵) بن قاری محمد صدیق معروف بہ ابومحمد
خانی (۶) بن قاری عبیداللہ (۷) بن قاری
عبدالصمد (۸) بن قاری امیر شمس الدین خورد
معروف بہ قاری محقق جامع جمع الجوامع کبیر
لغت احادیث وتفاسیر (۹) بن قاری عبدالمجید
دربان آستانہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔
(۱۰) بن حاجی حرمین سلطان حسین (۱۱) بن
قاری امیر ابراہیم نواسہ وخلیفہ سید عبدالرزاق
خلف وخلیفہ حضرت غوث الثقلین شیخ
عبدالقادر جیلانی رضی اللہ عنہما (۱۲) بن قاری
سلطان عبداللطیف (۱۳) بن قاری امیر
عبیداللہ خانی (۱۴) بن مولانا شمس الدین صابر
(۱۵) بن قاری مجیدالدین خانی (۱۶) بن قاری امیر
سلیمان مفسر جنھوں نے تیرہ ۱۳ سالہ عمر سے بانوے ۹۲
سال تک سوا تفسیر کے درس کسی دوسرے علم کی عمر بھر

نگاہے ہم نہ فرمود، بن مولانا وجیہ الدین احمدؒ
بن قاری محمد بن قاری احمد بن علی بن محمد
حنفیہ بن جناب مبارک حضرت
علی مرتضیٰ شیر خدا کرم اللہ وجہہ ورحمہم
اجمعین

نگاہ بھی نہ ڈالی (۱۷)، بن مولانا وجیہ الدین احمد
(۱۸)، بن قاری محمد (۱۹)، بن قاری احمد،
(۲۰)، بن علی (۲۱) بن محمد حنفیہ (۲۲)، بن
حضرت علی مرتضیٰ شیر خدا کرم اللہ وجہہ ورحمہم
اجمعین۔

(یہاں پر حضرت قاری امیر سیف الدین کے نام گرامی سے ابتداء کرنے سے اکیس ۲۱ پشتیں ہی ہوتی ہیں)

حضرت مخدوم شیخ بھکاریؒ اسی سلسلۃ الذہب کی ایک کڑی تھے جس کا ہر فرد حضرت علی مرتضیٰ سے لے کر حضرت قاری امیر سیف الدین تک علم و فضل، تقویٰ و پرہیزگاری، صفائی باطن، حفظ شریعت اور دوسرے تمام محامد کا حامل اور آیۃ من آیات اللہ فی الارض تھا، چنانچہ صاحب زاد الآخرۃ تحریر کرتے ہیں:

بعد از تحقیق و تدقیق دریافتم و بمطالعۂ کتب
اسمائے رجال و قرائے کلام الٰہی و محدثین
احادیث رسالت پناہی شناختم کہ
بایں بزرگواران اللہ تعالیٰ شانہ جدا
جدا عطا فرمودہ است، کمتر کہ از اینہا
گذشتہ کہ حافظ کلام اللہ و قاری
ہفت قراءت و عالم و علامہ
و اہل معانی نہ باشد، و از اینہا
عجائب قدرت پروردگار

میں نے بڑی چھان بین، اسماء الرجال کی
کتابوں کے مطالعہ نیز قرآن پاک کے قاریوں
اور رسولؐ کی احادیث بیان کرنے والے
محدثین کو پہچاننے کے بعد یہ معلوم کیا ہے
کہ اللہ نے ان تمام بزرگوں کو الگ الگ
شان کا حامل بنایا ہے، ان میں سے شاید ہی
کوئی ایسا گذرا ہو جو کلام پاک کا حافظ، سات
قراءتوں کا قاری، عالم، علامہ اور اہل معانی
نہ ہو، ان کے ذریعہ پروردگار کی قدرت کے

بظہور آمدہ خصوصاً در طریقۂ استتار باطن قدم بقدم بر طریقۂ محمدیہ ازیں عالم ظاہر بآں عالم معنی رفتہ اند و ہیچ یکے از علماء و فضلائے عصر زبان اعتراض بر اقوال و احوال اینہا نکشادہ۔ الخ

عجائبات ظاہر ہوتے ہیں، خاص طور پر باطنی معاملات کی پوشیدگی میں تو رسولؐ کے طریقہ پر قدم بہ قدم اس عالم ظاہر سے عالم معنی تک گئے (ان کی ساری زندگیاں شرع شریف کے تابع رہیں) کسی زمانہ میں کسی بھی عالم و فاضل نے ان کے اقوال و احوال پر کبھی نکتہ چینی نہیں کی۔ الخ۔

آگے چل کر اس خاندان عالی شان کی فضیلت و بزرگی کو یوں بیان کرتے ہیں:

می گوید فقیر راقم حقا کہ ایں خاندان عالی شان را طرزے خاص عجیب است۔ دولت حفظ کلام اللہ از زمان حضرت ابن حنفیہ تا ایں زمان جاری است و تحقیقات علوم قرآنیہ و درس و تدریس علم تجوید و تصحیح قراءت از عہد مولانا قاری احمد کہ خود نبیرۂ خاص محمد بن حنفیہ ہست بدقت و تحقیق تمام رونق و رواج گرفت الخ

فقیر راقم سطور (عبدالرشید ملتانی) کہتا ہے کہ یقیناً اس خاندان عالی شان کا ایک خاص اور عجیب طرز ہے، حضرت محمد بن حنفیہ سے اس زمانہ تک حفظ کلام مجید کی دولت جاری و ساری ہے، قرآنی علوم کی تحقیقات، درس و تدریس، علم تجوید صحت قراءت مولانا قاری احمد کے زمانہ سے جو حضرت محمد بن حنفیہؒ کے خاص پوتے تھے، اب تک جاری اور ترقی پر ہیں۔

نفحات النسیم فی تحقیق احوال اولاد عبدالکریم“ کے مؤلف حضرت مخدومؒ کے اخلاف کے صحیح النسب رہنے کے سلسلہ میں لکھتے ہیں:

نگاہے ہم نہ فرمود بن مولانا وجیہ الدین احمد	نگاہ بھی نہ ڈالی (۱۷) بن مولانا وجیہ الدین احمد
بن قاری محمد بن قاری احمد بن علی بن محمد	(۱۸) بن قاری محمد (۱۹) بن قاری احمد،
حنفیہ بن جناب مبارک حضرت	(۲۰) بن علی (۲۱) بن محمد حنفیہ (۲۲) بن
علی مرتضیٰ شیر خدا کرم اللہ وجہہ ورحمہم	حضرت علی مرتضیٰ شیر خدا کرم اللہ وجہہ ورحمہم
اجمعین	اجمعین؛

(یہاں پر حضرت قاری امیر سیف الدین کے نام گرامی سے ابتدا کرنے سے اکیس[۲۱] پشتیں ہی ہوتی ہیں)

حضرت مخدوم شیخ بھکاریؒ اسی سلسلۃ الذہب کی ایک کڑی تھے جس کا ہر فرد حضرت علی مرتضیٰ سے لے کر حضرت قاری امیر سیف الدین تک علم وفضل، تقویٰ و پرہیزگاری، صفائی باطن، حفظ شریعت اور دوسرے تمام محامد کا حامل اور آیۃ من آیات اللہ فی الارض تھا، چنانچہ صاحب زاد الآخرۃ تحریر کرتے ہیں:

بعد از تحقیق و تدقیق دریافتم و بمطالعۂ کتب	میں نے بڑی چھان بین، اسماء الرجال کی
اسمائے رجال و قرائے کلام الٰہی و محدثین	کتابوں کے مطالعہ نیز قرآن پاک کے قاریوں
احادیث رسالت پناہی بشناختم کہ	اور رسولؐ کی احادیث بیان کرنے والے
بایں بزرگواران اللہ تعالیٰ شانے جدا	محدثین کو پہچاننے کے بعد یہ معلوم کیا ہے
جدا عطا فرمودہ است، کمتر کر از ایشاں	کہ اللہ نے ان تمام بزرگوں کو الگ الگ
گذشتہ کہ حافظ کلام اللہ و قاری	شان کا حامل بنایا ہے، ان میں سے شاید ہی
ہفت قرات و عالم و علامہ	کوئی ایسا گذرا ہو جو کلام پاک کا حافظ سات
و اہل معانی نہ باشد، و از ایشاں	قراتوں کا قاری، عالم، علامہ اور اہل معانی
عجائب قدرت پروردگار	نہ ہو، ان کے ذریعہ پروردگار کی قدرت کے

بظہور آمدہ خصوصاً در طریقۂ استتار	عجائبات ظاہر ہوتے ہیں، خاص طور پر باطنی
باطن قدم بہ قدم بر طریقۂ محمدیہ	معاملات کی پوشیدگی میں تو رسولؐ کے طریقہ پر
ازیں عالم ظاہر بآں عالم معنی رفتہ اند	قدم بہ قدم اس عالم ظاہر سے عالم معنی تک گئے
و ہیچ یکے از علماء و فضلائے عصر زباں	(ان کی ساری زندگیاں شرع شریف کے تابع
اعتراض بر اقوال و احوال	رہیں) کسی زمانہ میں کسی بھی عالم و فاضل نے
اینہا نہ کشادہ۔	ان کے اقوال و احوال پر کبھی نکتہ چینی
الخ	نہیں کی۔ الخ۔

آگے چل کر اس خاندان عالی شان کی فضیلت و بزرگی کو یوں بیان کرتے ہیں:

می گوید فقیر راقم حقا کہ ایں خاندان عالی	فقیر راقم سطور (عبدالرشید ملتانی) کہتا
شان با طرزے خاص عجیب است	ہے کہ یقیناً اس خاندان عالی شان کا ایک
دولت حفظ کلام اللہ از زمان حضرت	خاص اور عجیب طرز ہے، حضرت محمد بن
ابن حنفیہ تا ایں زمان جاری ست	حنفیہ سے اس زمانہ تک حفظ کلام مجید کی
تحقیقات علوم قرآنیہ و درس	دولت جاری و ساری ہے، قرآنی علوم کی
و تدریس علم تجوید و تصحیح قراءت از	تحقیقات، درس و تدریس، علم تجوید صحت قراءت
عہد مولانا قاری احمد کہ خود نبیرۂ خاص	مولانا قاری احمد کے زمانہ سے جو حضرت محمد
محمد بن حنفیہ ہست بہ دقت و تحقیق تمام	ابن حنفیہؒ کے خاص پوتے تھے، اب تک
رونق و رواج گرفت الخ	جاری اور ترقی پر ہیں۔

"نفحات النسیم فی تحقیق احوال اولاد عبدالکریم" کے مؤلف حضرت مخدومؒ کے اخلاف کے صحیح النسب رہنے کے سلسلہ میں لکھتے ہیں:

" ان ہی چند منتخب قصبات میں قصبہ کاکوری ضلع لکھنؤ کا بھی شمار ہے جس میں بہت سے عربی النسل خاندان آباد ہیں، جن میں سب سے بڑی تعداد سادات علویہ کی ہے، جو حسب و نسب میں اپنے دیگر ہم وطنوں سے ممتاز ہیں، اور نہایت فخر سے دعویٰ کرتے ہیں کہ جس گراں بہا امانت کی حفاظت ان کے دیگر بنی اعمام کو عربستان کے حدود سے چار قدم آگے بڑھ کر دشوار ہو گئی تھی، حتیٰ کہ خلفائے بغداد میں سے صرف ایک فرمانروا[1] کے متعلق یہ دعویٰ کیا جا سکتا ہے کہ وہ نجیب الطرفین تھا، یہ اپنے وطن سے ہزاروں میل دور اور ایک اجنبی ملک اور غیر مانوس سرزمین میں اپنے پاک عربی خون کو ویسا ہی صاف اور نوہ بچائے ہیں جیسا کہ وہ نضرؓ بن کنانہ کی رگوں میں تھا۔[2]

"سخنوران کاکوری" کے مؤلف رقمطراز ہیں:

" مخدوم زادگان کاکوری براہ راست امام محمد بن حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی اولاد میں ہیں، محمد بن علیؓ کو سیادت نسبی کے علاوہ سیادت مذہبی اپنے پدر بزرگوار سے جو مجمع العلم تھے، ورثہ میں ملی اور ان کا شمار علم و تقویٰ کے لحاظ سے کبار تابعین کے فاضل ترین لوگوں میں ہوتا ہے، جہاں تک ہم کو علم ہے اس برصغیر میں سوا علویان کاکوری کے دوسرا کوئی خاندان بلا آمیزش محمد بن علیؓ کی اولاد میں باقی نہیں ہے، علویان کاکوری کے اسلاف نسب کے بارے میں غیر معمولی طور پر محتاط رہے۔"[4]

مؤلف موصوف کا یہ دعویٰ خود ان کے لیے، نیز ان علویان کاکوری کے لیے جو ہندوستان اور خصوصاً کاکوری میں موجود ہیں، ایک حد تک درست ہے، تقسیم ہند کے بعد یہاں کے اکثر افراد نے غریب الوطنی کو حب الوطنی پر ترجیح دے کر پاکستان میں اپنی الگ دنیا بسالی، وہاں غیر خاندانوں میں

---

[1] خلیفہ امین الرشید۔ [2] ایک مورخ کا قول ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اجداد میں سے نضر بن کنانہ ہی وہ شخص ہیں جن کی اولاد نے قریش کا ہر دلعزیز نام حاصل کیا [3] نفحات نسیم، مولوی سمی علی علوی کاکوروی (شام اودھ لکھنؤ سنہ ۱۳۲۰ھ): ۸ [4] سخنوران کاکوری مولوی حکیم نثار احمد علوی کاکوروی (کراچی سنہ ۱۹۷۰ء): ۴۰۰۔

بیاہ شادیاں کیں، اس وجہ سے بیشتر گھرانوں میں نسب کے سلسلہ میں وہ خصوصیت و امتیاز جو علویان کاکوری کا تقریبًا پانچ سو سال سے طرۂ امتیاز تھا باقی نہ رہا۔

ہندوستان میں اہل خاندان کی آمد کسی تاریخ میں اس بات کی صراحت نہیں ملتی ہے کہ حضرت مخدومؒ کے اسلاف کرام میں کس نے حجاز مقدس کی سرزمین کو چھوڑا اور کب بغداد و خراسان کے درمیان قصبہ صحرام میں اقامت گزیں ہوئے، "مقدمہ زاد الآخرت" نیز "کشف المتواری فی حال نظام الدین القاری" میں بالتفصیل درج ہے کہ کن وجوہ سے ان کے اسلاف کرام ہندوستان آنے پر مجبور ہوئے، ذیل میں اس عبارت کا ملخص ترجمہ پیش ہے۔

حضرت مخدوم صاحبؒ کے اسلاف قصبہ صحرام کے جو بغداد و خراسان کے درمیان واقع ہے، رہنے والے تھے، یہاں کے اعیان و اشراف ہمیشہ سے علم و فضل اور وجاہت و لیاقت میں ممتاز تھے، یہ لوگ کٹر قسم کے سنی المذہب تھے، ایرانی حکمرانوں کا شیعیت میں غلو اور صحابۂ کرامؓ پر سب و شتم پر مجبور کرنے اور ایسا نہ کرنے پر مظالم ڈھانے کی وجہ سے اور جان کے خوف سے خواص اور صحرام کے اکثر خاندان مجبورًا شیعہ ہو گئے، رفتہ رفتہ اس اختلاف سے معاشرت اور باہمی اتحاد و اتفاق میں بڑا خلل پیدا ہو گیا، پھر جب حضرت مخدوم صاحبؒ کے جد امجد (پانچویں پشت) قاری محمد صدیق المعروف بہ ابو محمد خانی بن قاری عبید اللہ کا زمانہ آیا تو ایرانیوں کا مذہب میں تشدد اور مظالم اس قدر بڑھ چکے تھے اور خود اعیان قوم اور خاندان کے دوسرے اعزہ کا غلو، بے رحمی اور سنگدلی اس مرتبہ کو پہونچ چکے تھے کہ الاقارب کالعقارب سچ ثابت ہونے لگا، ننگ و ناموس اور جان و مال کی حفاظت مشکل نظر آنے لگی، بالآخر قاری موصوف برخاستہ خاطر اور دل شکستہ ہو کر جلاوطنی پر آمادہ ہوئے، اپنا گھر بار چھوڑا، اہل و عیال اور بعض اعزہ کو لے کر قصبہ صحرام کو ہمیشہ کے لیے خیرباد کہا، چند ماہ ہرات میں رہے، پھر ملتان آئے اور سال بھر قیام کیا، لیکن وہاں بھی دل نہ لگا تو لاہور آئے اور پانچ سال

قامت گزین رہے، یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ باوجود ان پریشانیوں، دقتوں اور غریب الوطنی کے باطنی تعلیم اور حدیث و تفسیر کے درس کا کام نہ چھوڑا، جہاں رہے اپنے علم و عرفان سے نہ معلوم کتنی شمعیں جلائیں، ابھی لاہور میں قیام پذیر تھے کہ حاجی محمد خان تاجر نے جو ملک التجار کے نام سے مشہور تھے، اور ابتدا سے ان کے اسلاف اور خاندان کے بڑے ارادت مند و معتقد تھے تجارت کے سلسلہ میں ہندوستان آنے کا ارادہ کیا، لاہور پہونچے تو حضرت کے قیام کا پتہ چلا، بڑی نیازمندی سے حاضر خدمت ہوئے، تمام واقعات معلوم کرنے پر عرض کیا کہ میرے ہمراہ "پٹیالہ" چلیں، وہاں کچھ عرصہ قیام کریں، اس دوران میں ہندوستان کے مشرقی حصہ میں سامان تجارت فروخت کر کے واپس آکر جیسا کچھ ہوگا عرض کروں گا، حضرت ان کی درخواست پر مع کنبہ کے پٹیالہ آ گئے، اس قصبہ کے لوگوں نے ان کی تشریف آوری کو بڑا غنیمت تصور کیا، حاجی محمد خاں پٹیالہ سے مشرقی اضلاع ہند کی جانب روانہ ہوئے، کچھ عرصہ بعد یہاں سے ایک عریضہ مع زاد راہ اور سفر خرچ کے ارسال خدمت کیا کہ "جہاں تک میں نے چھان بین کی ہے اور پتہ چلایا ہے اس سرزمین پر ملک اودھ سے بہتر مقام شریفوں کی مستقل سکونت کے لیے کہیں نہ ملے گا، جو سلاطین وقت کے مظالم سے محفوظ ہو، مظفر خاں صوبہ دار اودھ جو نہایت نیک و صالح، نیازمند ہے آپ کی ملازمت و ملاقات کا بہت مشتاق ہے۔" جب حضرت نے وہاں سے چلنے کا ارادہ کیا تو وہاں کے شرفاء نے یہ درخواست کی کہ وہ اپنے چھوٹے صاحبزادہ مولانا نجم الدین کو ان کے درمیان رہنے دیں، اور سادات میں سے ایک سید زادی سے نکاح کی پیش کش کی، انھوں نے منظور فرما کر ان کا نکاح کر دیا، چند ہمراہیوں اور صاحب زادہ موصوف کو وہیں چھوڑا اور اپنے بڑے صاحبزادہ حافظ نصیر الدین ولیل اللہ اور دوسرے متعلقین کے ہمراہ اودھ آئے، اور مختلف مقامات پر مقیم رہے۔

کاکوری میں مستقل سکونت | بالآخر ان کے صاحبزادہ امیر نصیر الدین ولیل اللہ کے نبیرہ حضرت قاری

امیر سیف الدین (سنہ ۸۶۶ھ/ ۱۴۶۲ء تا سنہ ۹۵۹ھ/ ۱۵۵۲ء) مع اپنے کل افرادِ خاندان کے سلطان بہلول لودی (سنہ ۸۵۵ھ/ ۱۴۵۱ء تا سنہ ۸۹۴ھ/ ۱۴۸۸ء) کے عہد میں کاکوری میں مقیم ہوگئے، اس وقت سے آج تک ان کی اولاد کا وطن یہی قصبہ رہا۔

مولانا عبدالرشید ملتانی مقدمہ زادالآخرۃ میں قاری امیر سیف الدینؒ کی آمد اور قیام کے سلسلہ میں لکھتے ہیں:

آخرکار در زمانِ قبلۂ دین و ایمان امام المرشدین	آخرکار اسی زمانہ میں قبلۂ دین [illegible]
والعارفین حضرت قاری امیر سیف الدین	والعارفین حضرت قاری امیر سیف الدینؒ نے
با استقلال تمام و اطمینان دائمی در قصبۂ کاکوری	قصبۂ کاکوری میں فارغ البالی اور کشادہ بالی
بہ فراغ حالی و کشادہ بالی صورتِ استقامت	کے ساتھ مستقل سکونت اختیار کی اور اسلافِ کرام
قرار گرفت، و مثل زمانۂ ماضیۂ اسلاف درس	کے دورِ ماضی کی یاد تازہ کردی، طلباء، اہلِ علم
طلبہ و تعلیم طالبان رونق پذیر گردیدہ از	اور سالکین کی تعلیم و تلقین اور درس و تدریس کی
دور دور مرداں بنا بر تحقیق علوم	خوب رونق و ترقی ہوئی، دور دور سے لوگ
قرآنیہ حاضر آمدند و فوائد کثیر بر داشتند،	علومِ قرآنیہ کی تحقیق کے سلسلہ میں حاضر ہوتے،
چوں آفتاب جہاں تاب نظامیہ	اور بے شمار فوائد اخذ کرتے، جب آفتاب
از مطلع غیب ظہور فرمودہ عالمے را از	عالم تاب نظامیہ غیب کے افق سے ظاہر
ضیائے انوار احسانیہ و خلقے را از	ہوا تو عالم کو اپنے نورِ احسان کی تابانیوں اور
روشنئ جاویدِ غوثیہ منور ساخت	مخلوق کو اپنی دائمی نصرت و تائید کی ضیا پاشیوں
و غلغلۂ جعفری و شورِ جنیدی	سے منور کردیا، اور پھر سے ہفت اقلیم میں غلغلۂ
با قالیم سبعہ انداخت،	جعفری اور شورِ جنیدی کے جھنڈے گاڑ دیے،

ہر امرے بجائے خود و ہر نسبتے بہ مقام خود
بروش صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین متمکن
گشت، اللّٰہم زد فزد ولا تنقص بحرمۃ
النبی الامی وآلہ واصحابہ وبارک وسلم۔

معلوم ہوتا تھا کہ ہر کام اپنی جگہ اور ہر
نسبت اپنے مقام کے اعتبار سے صحابہ
رضوان اللہ علیہم اجمعین کی روشس
اور اتباع پر متمکن ہے۔

ولادت اور تعلیم | حضرت مخدومؒ حضرت قاری امیر سیف الدینؒ کے سب سے بڑے بیٹے تھے[۱] ۸۰۹ھ / ۱۴۰۵ء کو کاکوری میں متولد ہوئے۔

حضرت رسالت مآب ارواحنا فداہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خواب میں بشارت فرمائی کہ تمھاری تعلیم و تکمیل شات کاملین سے ہوگی، پانچ کاملین سے عالم ظاہر میں اور دو سے عالم ارواح میں چنانچہ ایسا ہی ہوا۔

(۱) سب سے پہلے انھوں نے جملہ علوم درسیہ: علوم تفاسیر قرآن، علم تجوید و قرأت اور اذکار و اعمال اپنے والد ماجد سے اکتساب کیے۔

(۲) حضرت مولانا ضیاء الدین محدث مدنی سے حدیث شریف پڑھی اور اس درود پاک کی اجازت حاصل کی جس سے حضور پُرنور صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت سے مشرف ہوئے اور آپؐ نے بشارات عطا فرمائے۔

(۳) حضرت حاجی عبداللطیف ہراتی، ان کی خدمت میں بیس سال رہ کر باطنی تعلیم حاصل کی ذکر پاس انفاس کی تعلیم پائی اور ان ہی کی توجہ سے اسرار باطن کھلے۔

(۴) حضرت امیر سید ابراہیم ایرجی بن معین الدین ایرجی، یہ حضرت مخدومؒ کے پیر بیعت و اجازت و خلافت ہیں، ان ہی کی خدمت میں رہ کر سلوک کے مراحل طے کیے اور دوسرے فوائد حاصل کیے۔

---

[۱] آپ کے دو چھوٹے بھائی اور تھے، انھوں نے صغر سنی میں وفات پائی۔ ایک کا نام رشید الدین اور دوسرے کا قطب الدین تھا۔

(۵) حضرت حافظ سید محمد ابراہیم ابن احمد ابن حسن بغدادی :۔ یہ حضرت مخدوم کے پیر طریقت تھے جن سے انھوں نے اذکار واشغال تعلیم پائے، مثنوی غوثیہ کی تعلیم حاصل کی، وحدت الوجود اور وحدت الشہود کے باہمی نزاع کو دور کیا۔

(۶) حضرت غوث الاعظم شیخ محی الدین عبدالقادر جیلانی رضؓ

(۷) حضرت شیخ شہاب الدین ابوحفص عمر سہروردیؒ، ان دونوں عظیم ہستیوں سے آپ نے اویسی فیوض حاصل کیے۔

ان کے ایک دوسرے خلیفہ حضرت میر شرف الدین ترکار پوریؒ نے اپنی بیاض میں ان ہی مذکورۂ بالا ساتوں کاملین کے نام اسی طرح تحریر کیے ہیں،

مؤلف زاد الآخرۃ تحریر کرتے ہیں کہ :

"حضرت مخدومؒ فرماتے تھے کہ میں اکثر حضرت غوث الاعظم رضؓ کی زیارت سے مشرف ہوا ہوں مگر میں نے نہ کبھی تنہا حضرت ہی کو دیکھا اور نہ حضرت شیخ شہاب الدین سہروردی کو بلکہ دونوں کو ہمیشہ ساتھ ساتھ دیکھا، گفت گو کرتے وقت بھی حضرت شیخ مذکور کو حضرت غوث الاعظمؒ کے کلام کی اتباع کرتے دیکھا، کبھی انھوں نے خود کلام نہ فرمایا، مجھے اس بات پر تردد تھا، ایک روز اپنے والد (حضرت امیر سیف الدینؒ) سے عرض کیا، انھوں نے فرمایا "پریشانی کی کیا بات ہے، حضرت غوث الاعظم رضؓ کو اہل کشف ذوالجناحین (دو بازوؤں والے) کہتے ہیں، جناح اول شیخ شہاب الدین سہروردی اور جناح دوم شیخ اکبر محی الدین بن عربی ہیں، چونکہ اس زمانہ میں علم شرائع اور اتباع سنت کی طرف تمھاری ہمت متوجہ ہے، لہٰذا حضرت شیخ سہروردیؒ حضرت غوث الاعظم کے ہمراہ نظر آتے ہیں، حضرت غوث الاعظم رضؓ فرماتے تھے کہ میں نے علم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دو حصے کر دیے، علم شرائع و اتباع سنت شیخ شہاب الدین سہروردی کو اور علم حقایق و معارف شیخ محی الدین بن عربی کو دیا۔

حضرت مخدوم صاحبؒ فرماتے تھے کہ "ایک مرتبہ ماہ رمضان المبارک میں مجھے خیال آیا کہ ایک عرصہ سے حضرت غوث الاعظمؓ کی زیارت نہ ہوئی، تراویح کے بعد سو گیا، دیکھا کہ حضرت تشریف لائے ہیں اور دو شخص اور ساتھ ہیں، ان میں سے ایک شیخ سہروردی ہیں اور دوسرے کو جن پر مستی کا غلبہ تھا، میں نہ پہچان سکا، حضرت سے استفسار کی غرض سے عرض کیا، انھوں نے ان بزرگ سے میری طرف اشارہ کرکے فرمایا ان سے مصافحہ کرو، یہی نظام الدین ہیں جن کے تم مشتاق تھے، یہی تمھارے کلام کی حمایت کرتے ہیں، انھوں نے ہوشیار ہوکر بڑے تپاک سے مجھ سے مصافحہ اور معانقہ کیا، اور کہا کہ اگر یہ لوگ میرے کلام کی حمایت نہ کریں گے تو کون کرے گا، اور لوگ اس کی قدر کیا جانیں، یہ قادری ابراہیم بغدادی کے پوتے ہیں، تب حضرت غوث الاعظمؓ نے مجھ سے ارشاد فرمایا کہ یہی شیخ محی الدین بن عربی ہیں، اس کے بعد حضرت غوث الاعظمؓ بیٹھ گئے، داہنی سمت حضرت شیخ سہروردی اور بائیں سمت حضرت شیخ ابن عربی بیٹھے اور مجھے اپنے سامنے بٹھایا، حضرت شیخ اکبرؒ نے مجھ سے کہا کہ تمھارے جد نے معترضین کے جواب میں اچھا رسالہ لکھا ہے، اور تم نے بھی ان سے کم نہیں لکھا، میں نے اس کا جواب حال کے مطابق دیا، اس واقعہ کو میں نے اپنے والد ماجد سے عرض کیا، انھوں نے فرمایا کہ الحمدللہ تم کو مشغول غوثیہ سے بہت اچھا فائدہ ہوا، اس کو جاری رکھو، اس کے طفیل میں حقیقت مراتب غوثیہ سے بھی آگہی ہوگی۔"

بیعت اور عنایات مرشدی | جیسا کہ مذکور ہو چکا ہے ان کو بیعت حضرت امیر سید ابراہیم ایرجی بن[1]

---

[1] حضرت امیر سید ابراہیم ایرجی اپنے عہد کے سرآمد روزگار عالم اور صاحب باطن تھے، بہ کثرت علوم کی مشکل کتابوں کی شرح فرمائی، ان کے عہد میں دہلی میں کوئی ان کا ہم پایہ نہ تھا، حضرت شیخ بہاء الدین شطاری قادری سے بیعت تھے، کہا جاتا ہے کہ شیخ موصوف نے رسالہ درطریق شطاریہ انہی کے واسطے تصنیف کیا تھا، حضرت شیخ نظام الدین اولیاء محبوب الٰہیؒ سے معاملہ میں خرقہ حاصل کیا، ۹۲۰ھ / ۱۵۱۴ء میں دہلی تشریف لائے، ۹۵۳ھ / ۱۵۴۶ء میں دہلی میں وفات پائی اور حضرت محبوب الٰہیؒ کی درگاہ میں پائیں حضرت امیر خسروؒ آسودۂ خواب ہیں، راقم الحروف اکثر حاضر ہوتا رہتا ہے، سادہ وا کھڑکی ہے جس سے مزار شریف نظر آتا ہے، جناب حسن ثانی نظامی صاحب کی تحویل میں ہے ۱۲ منہ

سید معین الدین ایرجی حسنی حسینی سے تھی، اذکار و اشغال صوفیہ کی تعلیم انھوں نے اپنے والد ماجد سے پائی تھی اور ان ہی کے حسب ارشاد حضرت میر سید ابراہیم ایرجی سے بیعت کی۔

حضرت مخدوم صاحبؒ فرماتے تھے کہ جب میں حضرت امیر ابراہیم ایرجی سے فیروزآباد میں بیعت ہوا تو حضرت نے ایسے عنایات فرمائے جو بیان سے باہر ہیں، چند ماہ خدمت اقدس میں رہا، روزانہ کوئی نہ کوئی نیا انکشاف ضرور ہوتا تھا، درس و تدریس اور گذشتہ اذکار و اشغال وغیرہ کو دریافت فرماتے اور احادیث کے درس کے وقت بھی مجھ کو یاد فرماتے، نماز بھی مجھ ہی سے پڑھواتے، اور فرماتے کہ تم سے قراءت خوب ادا ہوتی ہے، آواز بھی عمدہ ہے، تمھارے آنے سے مجھے بڑی خوشی ہوتی ہے۔ فرماتے تھے کہ ایک روز مجھ سے دریافت فرمایا کہ انما الاعمال بالنیات[1] کے کیا معنی ہیں؟ میں نے بیان کیے، اس وقت حضرت پر ایک کیفیت طاری ہوگئی، فرمایا پھر کہو اور اپنے سر مبارک سے ٹوپی اتار کر میرے سر پر رکھ دی اور فرمایا کہ حدیث کے معنی بیان کرنے کے لیے ایسا ہی اچھا منھ چاہیے پھر روزانہ کے وظائف دریافت کرکے اپنی کتاب اوراد اور حضرت سید احمد بغدادیؒ کا پیرہن عطا فرمایا۔

چند روز فیروزآباد میں مقیم رہ کر حضرت مخدومؒ وطن تشریف لائے اور والد ماجد سے سارا حال بیان کیا، انھوں نے سن کر بہت دعائیں دیں، پھر تھوڑے دنوں بعد معلوم ہوا کہ حضرت ابراہیم ایرجی فیروزآباد سے چرکھاری تشریف لائے ہیں، اور وہاں سے دہلی جائیں گے، والد ماجد کے حکم سے آپ چرکھاری گئے، دو ماہ پیر و مرشد کے ساتھ قیام کیا، اس مرتبہ بھی حسب سابق بہت عنایات ہوئے ایک روز آپ نے ان سے شغل ارسال غوثیہ کے متعلق عرض کیا، انھوں نے ارشاد فرمایا کہ میرا ارادہ خود بتانے کا تھا، مجھے تم سے جس قدر تعلق ہے وہ تم خود جانتے ہو، جو کچھ میں نے اپنے پیر و مرشد

---

[1] اعمال کا دار و مدار نیتوں ہی پر ہے، ۱۲ منہ۔

شیخ بہاء الدین انصاری سے حاصل کیا وہ سب تم کو بتلا دیا اور دے دیا، اب تک صرف دو چیزیں ملتوی رکھی ہیں، ایک مثال، دوسری مشغولی، یہ اس مصلحت سے کہ اس کو اپنے مرشد کے مخدوم زادہ حضرت حافظ سید ابراہیم بغدادی کے ہاتھ سے دلوانا چاہتا ہوں اور اپنی دستخطی مثال تم کو بوقت رخصت دے دوں گا، تمھاری تکمیل ان ہی سے ہوگی، چونکہ تمھارا اسم عالم معانی میں بارہواں ہے جیسا کہ حضرت غوث الاعظم رضؓ کا بہ وساطت شجرۂ آبائی بارہواں اسم تھا لہٰذا نعمت غوثیہ تم کو ان ہی کے ہاتھ سے ملے گی، اور وہ عنقریب ہندوستان آنے والے ہیں، تم ان کی تشریف آوری کے منتظر رہو، میرا ارادہ دہلی جانے کا ہے، تم کو وطن رخصت کر کے دہلی چلا جاؤں گا، دوسرے روز انھوں نے کتبہ مع دعا یا مثال مہری عطا کر کے وطن جانے کی اجازت دے دی، چنانچہ وہ وطن تشریف لائے، اور اپنے والد ماجد سے کل کیفیت بیان کی، وہ بہت خوش ہوئے، اور فرمایا کہ اس طرف میں نے سید عبدالرحیم مجذوب کو خواب میں دیکھا تھا، انھوں نے مجھ سے کہا کہ ایک سید مغرب سے آئے گا اور تمھارے لڑکے کو بارہ[12] آم دے گا، تنہا خوری نہ کرنا، پھر کہا کہ جیسا تمھارا لڑکا ویسا میرا لڑکا۔

اس بشارت سے حضرت سید ابراہیم ایرجیؒ کے کلام کی تصدیق ہوئی، حضرت غوث الاعظم رضؓ کے اسم مبارک کی طرف اشارہ بھی امر واقعی تھا جسے حضرت سید عبدالرزاق نے اپنے رسالہ "لمعات قادریہ" میں وضاحت کے ساتھ بیان کیا ہے، نیز مشغولی ارسال غوثیہ کے متعلق بھی حضرت غوث الاعظم رضؓ سے تحقیق کر کے لکھا ہے کہ وہ فرماتے تھے حضرت خضرؑ سے مجھے اس مشغولی کی تلقین ہوئی، اسی وجہ سے اس کو مشغولی ارسال بھی کہتے ہیں،

سید ابراہیم بغدادیؒ سے ملاقات | حضرت مخدومؒ اپنے پیر و مرشد کے ارشاد اور سید عبدالرحیم مجذوب کی بشارات کے بعد سے برابر سید ابراہیم بغدادی کی آمد کے منتظر رہتے، مغرب کی جانب سے ہر آنے والے سے دریافت فرماتے رہتے، جب حضرت موصوف کا لاہور سے آگرہ وغیرہ ہوتے ہوئے جانسی تشریف لے جانا معلوم ہوا

تو وہ بھی کاکوری سے دس بارہ ساتھیوں کے ہمراہ جھانسی تشریف لے گئے، وہاں سید صاحب کی یہ حالت تھی کہ ہر شخص سے حضرت مخدومؒ کے خاندان کا حال دریافت کرتے رہتے کیونکہ بغداد سے چلتے وقت حضرت سید احمد بغدادیؒ نے اُن سے فرمادیا تھا کہ ہندوستان پہونچ کر قاری امیر ابراہیم نواسہ حضرت سید عبدالرزاق ابن غوث الاعظمؓ کی اولاد کا حال ضرور دریافت کرنا، اگر ان میں کوئی ملاقات معلوم ہو تو ملاقات کرنا۔

حضرت مخدوم صاحب اسی حالت انتظار میں سید ابراہیم بغدادی کی خدمت میں جھانسی پہونچے، ملتے ہی حضرت سید صاحبؒ نے بڑی مسرت سے معانقہ کرکے فرمایا ع

یار در خانہ و من گرد جہاں می گردم

غور سے دیکھ کر فرمایا کہ والد ماجد کا کیا نام ہے؟ انھوں نے بتایا، سید صاحب موصوف نے حاضرین محفل (جن میں وہاں کے عمائدین بھی تھے) کے استعجاب وحیرت کو ملاحظہ کرکے اُن کے خاندانی خصوصیات بیان فرمائے۔ اکثر حاضرین نے یہ سن کر نیازمندانہ دست بوسی کی، سید صاحب نے ان کے قیام کے لیے ایک مکان اپنی قیام گاہ کے متصل تجویز فرمایا، وہاں انھوں نے قیام کیا، سید صاحبؒ نے مہمان داری میں کوئی دقیقہ نہ اٹھا رکھا، دوسرے روز نماز اشراق کے بعد تمام گذشتہ واقعات وحالات دریافت کیے، انھوں نے تمام واقعات بیان کیے، انھوں نے فرمایا کہ عنقریب کالپی پہونچ کر اعتکاف کی جگہ مقرر کرکے مشغولی ارسالِ غوثیہ کی اجازت دی جائے گی کیونکہ مقررہ ضابطہ اعتکاف کی شرائط کے ساتھ مشروط ہے، بالفعل رسالۂ طہات قادری دیکھو۔

دوسرے ہی روز کتاب عطا ہوئی، انھوں نے دیکھنا شروع کیا، سب سے پہلے مشغولی ارسالِ غوثیہ ہی کا ذکر تھا، پھر اور بہت سے اسرار ورموز اور نکات تصوف تھے، خود فرماتے تھے کہ اس کتاب کے مطالعہ کے وقت جو انوار وبرکات نازل ہوتے تھے ان کا بیان ممکن ہی نہیں،

حضرت سید صاحبؒ کے ہمراہ بیس روز جھانسی میں مقیم رہے، اس عرصہ میں اس رسالہ اور اس سے ہونے والے فوائد و مکاشفات کے سلسلہ میں خود فرماتے کہ

تا مدت بست روز کہ تشریف بہ مقام جھانسی	حضرت نے بیس روز جھانسی میں قیام فرمایا،
ارزانی داشتند، فقیر را جز مطالعہ آں رسالہ	اس عرصہ میں فقیر کے سوا اس رسالہ (طیبات قادری)
کارے دیگر نہ بود، چوں خوب غور	کے مطالعہ کے اور کوئی کام نہ تھا، جب خوب
می نمودم با ایں ہمہ نارسائی ذہن البتہ	غور و فکر کیا تو باوجود اس نارسائی ذہن کے
ایں قدر سراغ می بردم کہ مقام حضرت	اس قدر پتہ چلا کہ حضرت غوث پاک کا علوم
غوث پاک بہ علوم عرفانیہ بالاتر از مقام	عرفانی میں تمام عارفین سے بلند و برتر مقام
جمیع عرفا است، و بلندی مراتب جمیع صوفیہ	ہے، تمام صوفیہ صاف باطن کے مراتب کی
صافیہ از مطالعہ و ملاحظہ کلمات طیبات	بلندی اس رسالہ کے مطالعہ و ملاحظہ سے
غوثیہ عیاں و آشکارا می دیدم۔	میں نے واضح طور پر دیکھی۔

ایک روز استفسار کیا کہ "عوالم المعالم" بھی دیکھی ہے، عرض کیا کہ عرصہ ہوا جب حضرت والد ماجد سے شرح ابراہیمی جو قاری امیر ابراہیمؒ نے اس کتاب پر لکھی ہے وہ بھی اور عوالم المعالم بھی پڑھی تھی، ارشاد فرمایا کہ "شرح ابراہیمی" بھی میرے ساتھ ہے، کالپی پہونچ کر درس ہوگا، میرے والد حضرت سید احمد صاحبؒ کا ارشاد ہے کہ جس نے عوالم المعالم بہ غور نہ پڑھی اس کو طیبات کے سمجھنے میں دقت ہوگی، الحمد للہ کہ تم عوالم المعالم پڑھ چکے ہو، انھوں نے عرض کیا کہ کتاب کے مطالب سمجھنے کے لیے ذہن عالی درکار ہے، جب تک ان کی توجہ نہ ہو مجھ میں ایسی قابلیت نہیں، وہ بہت خوش ہوئے اور فرمایا کہ اس راہ ہستی میں نیستی ہی راہبر ہے، جس شخص کا سرمایہ نیستی ہے اس کے لیے ہستی حق دم نقد ہے۔

کچھ روز بعد حضرت کے ہمراہ کالپی تشریف لائے، سید صاحبؒ نے ایک پرانی مسجد اعتکاف کے لیے

تجویز فرمائی، اعتکاف کا حکم دیا، اور اعتکاف کے شرائط ایک پرچہ پر لکھ کر مرحمت فرمائے، یکم ذی قعدہ سے اعتکاف شروع ہوا، سید صاحبؒ روزانہ رات کو پیادہ پا جائے اعتکاف پر تشریف لاتے جو جائے قیام سے ایک میل کے فاصلہ پر تھی، اور واقعات دریافت فرماتے، جب عیدالاضحیٰ کے روز اعتکاف سے فراغت ہوگئی تو اس روز ان کی مسرت کی انتہا نہ رہی جو پاس آتا اسے فوراً حضرت مخدومؒ کے پاس بھیجتے، اور نذر دلواتے، اعتکاف سے فراغت کے بعد اپنے مکان سے متصل ایک مکان قیام کے واسطے تجویز فرمایا۔

سید صاحب روزانہ بعد نماز صبح مشغولی تلقین فرماتے، پھر شرح عوالم جنیدی مع لمعات کا درس دیتے، بعد نماز ظہر تفسیر معالم و بخاری شریف سنتے، اور بعد عصر سبعات عشر قادری پڑھواتے اور پھر مغرب تک خاموشی کے ساتھ پاس انفاس اور اسم ذات کے ذکر خفی کا حکم فرماتے، اور بعد مغرب تا عشاء کلام مجید کی تلاوت کراتے تھے،

حضرت شاہ تراب علی قلندر کاکورویؒ نے کشف المتواری میں مذکورہ بالا تمام واقعات درج فرمائے ہیں۔

غرضیکہ حضرت مخدوم صاحبؒ چھ مہینہ حاضر خدمت رہے، اس کے بعد وطن آنے کی اجازت چاہی، انھوں نے مجبوراً حضرت قاری امیر سیف الدینؒ کی پیرانہ سالی اور ضعف کا لحاظ کرکے دو ماہ کی اجازت عطا فرمائی، مگر اس کے بعد واپسی کی تاکید بھی فرمائی، رخصت کرتے وقت حضرت سید احمد کی کلاہ مبارک اور اجازت نامہ اپنے دست مبارک سے لکھ کر عطا کیے۔

حضرت مخدومؒ رخصت ہوکر کاکوری پہنچے، والد ماجد کی قدم بوسی کے بعد سفر و حضر کے تمام حالات و واقعات عرض کیے، سن کر فرمایا: نظام الدین! راہ سلوک میں سب سے علٰحدہ اور حق سے ملا رہنا چاہیئے دو ماہ کے بعد ہی فوراً حضرت سید صاحبؒ کی خدمت میں واپس جاؤ، اور ایسے جوان مبارک کی شرکت

کی صحبت کو اپنے حق میں کبریت احمر سمجھو، میری دلی تمنا ہے کہ اللہ تم کو میری حسب منشا میری زندگی ہی میں اس منصب عالی پر فائز کرے۔

وہ دو[۲] مہینے سے بیشتر ہی سید صاحب کی خدمت میں واپس پہونچے اور مزید عنایات سے سرفراز ہوئے، اسی مکان میں قیام کا حکم ہوا، ہر روز نئی نئی کرامتوں کا ظہور ہوتا، اسی اثنا میں انھوں نے حسب الحکم حضرت سید صاحبؒ کی کتاب ملہمات قادری کا فارسی ترجمہ شروع کیا، دوران ترجمہ اکثر سید صاحبؒ اسے ملاحظہ کرتے، بعد میں فرماتے کہ اس قدر دقیق اسرار و رموز ہونے کے باوجود تمھارے لیے اس کا ترجمہ ایسا آسان ہے کہ قلم برداشتہ عربی سے فارسی منتقل کرتے جاتے ہو، دو ماہ میں ترجمہ ختم کرکے سید صاحب کی خدمت میں پیش کیا، انھوں نے بہت پسند کیا، پھر وطن آئے، اور پھر دو[۲] ماہ تین[۳] ماہ بعد سہ بارہ اسی طرح حاضر خدمت ہوئے۔

چوتھی مرتبہ کی حاضری میں سید صاحبؒ نے فرمایا کہ ان بزرگان ہند کے آثارات (مزارات وغیرہ) کی زیارت جو اس ضلع میں جنوب کی جانب واقع ہیں کرنا چاہیے، پھر ملک دکن گئے، وہاں اور دیگر بزرگوں کے علاوہ چالیس[۴۰] ابدالوں سے ملاقات ہوئی، جنھوں نے بہت سی بشارتیں دیں، وہاں سے واپسی پر ارشاد ہوا کہ شب میں کلام مجید کے دورہ کے بعد معالم التنزیل اور جامع الاصول کا درس بہت ضروری ہے، ایک روز حاضری کی مدت کے متعلق دریافت کیا کہ کتنے عرصے حضرت والد ماجد کی خدمت میں حاضر نہ ہوئے، انھوں نے عرض کیا، فرمایا تمھاری جدائی ایک ماہ سے زیادہ نہیں چاہتا، چار ماہ یہاں اور ایک ماہ والد ماجد کے پاس، اچھا آج اخلاص و محبت کی احادیث بیان کرو، کیونکہ اس عالم کی پیدائش کا مقصد ہی اکتساب محبت و تحصیل اخلاص ہے، تمام محققین کی تصانیف کا اگر بغور مطالعہ کیا جائے تو مذکورہ بالا دو چیزوں کے علاوہ کچھ نہ ملے گا، آپ نے بیان کرنا شروع کیں، حاضرین محفل پر ناقابل بیان کیفیت طاری ہوگئی، خود سید صاحبؒ پر ایسا استغراق ہوا کہ تمام محفل بیہوش ہوگئی، بعد استغراق انھوں نے

کمر بند غوثیہ آپ کو عطا فرمایا اور فجر کی نماز آپ ہی کے اقتدا میں پڑھی اور فرمایا کہ "تم کو اپنے جد حضرت ابراہیمؒ کا منصب ملا ہے، جس روز میرے جد حضرت عبدالرزاقؒ نے قاری امیر ابراہیم کو مسند خلافت پر بٹھایا تھا تو وہ عید اضحیٰ کا دن تھا، پہلے نماز عید کی امامت کا حکم ہوا، اس کے بعد مندیل اور کمر بند غوثیہ دے کر مسند خلافت پر بٹھایا، حاضرین کو حکم دیا کہ قاری کو نذر دیں، آج تم اپنے جد کی وراثت سے ان کے قائم مقام ہوئے ہو، اس لیے تم ہی امامت کرو، انھوں نے عرض معروض کی، فرمایا: خاکساری خدا کے یہاں مقبول و پسندیدہ ہے، خدا انجام بخیر کرے گا، مگر نماز پڑھاؤ، آپ نے حسب ارشاد نماز پڑھائی، نماز کے بعد انھوں نے خدام سے فرمایا کہ وہ خوان لاؤ جو دو روز قبل سے اسی لیے میں نے رکھے تھے، چنانچہ پچاس خوانوں میں مصری کے کوزے حاضر کیے گئے، ارشاد فرمایا کہ ان پر حضرت رسول مقبول سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم اور تمام پیرانِ سلسلہ کا فاتحہ ہو، چنانچہ فاتحہ کے بعد پانچ خوان ان کو کاکوری میں تقسیم کے واسطے عطا کیے، باقی نصف حاضرین مجلس اور نصف رؤسائے کالپی کو تقسیم کیے گئے۔

سید صاحب کی کاکوری آمد | جب وہ رخصت ہونے لگے تو مہر شدہ مثال ارسال غوثیہ کے ضوابط اور اوراد و وظائف کا مجموعہ بہت خوشخط خط نسخ میں عطا فرمائے، اور معانقہ و مصافحہ کر کے رخصت فرمایا، کاکوری آکر آپ نے سید صاحبؒ کا کاکوری آنے کا ارادہ اور (جد الماجد) قاری امیر سیف الدینؒ سے ملاقات کے اشتیاق کا ذکر کیا، وہ بہت خوش ہوئے، اور مہمان داری کے انتظامات شروع کر دیے، چنانچہ حضرت مخدومؒ کالپی حاضر ہو کر ان کو اپنے ہمراہ لائے، قاری امیر سیف الدین نے آمد کی خبر سن کر حضرت مخدوم کے بیٹے اور اپنے پوتے حافظ شہاب الدین المعروف بہ شیخ سوندھن کو مع دیگر اشخاص پیشوائی کی غرض سے بھیجا، سید صاحبؒ نے صاحبزادہ پر بہت شفقت فرمائی اور کاکوری تشریف لا کر قاری امیر سیف الدین سے ملاقات کی، سید صاحبؒ کی آمد کی خبر سن کر حضرت مخدوم صاحبؒ کے

مریدین مختلف مقامات سے آنے لگے، قرب وجوار کے بہت سے عمائدین جمع ہوئے اور سب نے بزرگوں کے آداب کے موافق نذریں پیش کیں، منعم خان، نجیب خان داروغہ اصطبل شاہی مرزا یعقوب خان، محمد شریف خاں سمرقندی اور قیام الدین خان جیسے مریدینؒ حضرت مخدوم نے خدمت گذاری میں کوئی دقیقہ نہ اٹھا رکھا۔

سید صاحب بیشؔ روز کاکوری میں مقیم رہے، اس کے بعد قاری امیر سیف الدین سے اجازت چاہی، آپ نے جواب میں کہا کہ اگرچہ اہل کالپی آپ کی آمد اور بابرکت صحبت کے بڑے مشتاق ہیں لیکن یہاں بھی ایک عالم کو آپ اپنی ذات سے بہرہ مند فرما رہے ہیں، میری خواہش ہے کہ ابھی آپ مزید قیام کریں، سید صاحبؒ نے جواب میں فرمایا بہتر ہے، آپ کا فرمان میرے لیے بمنزلہ میرے والد ماجد کے فرمان کے ہے، چنانچہ پانچ روز اور مزید قیام فرما رہے۔

حضرت مخدوم کا سفر کالپی | سید صاحب جب تک کالپی میں مقیم رہے سال میں ایک دو بار حضرت مخدومؒ تشریف لے جاتے اور مہینوں ان کی صحبت میں رہتے، ایک مرتبہ سید صاحبؒ کا ایک مکتوب گرامی اس مضمون کا پہونچا کہ رمضان شریف کا ایک ماہ باقی ہے، بغداد شریف کے چند قاری اور قاری محمد شریف مدنی یہاں آئے ہوئے ہیں، تمھاری ملاقات کے مشتاق ہیں، حضرت مخدومؒ حسب الطلب کاکوری سے مع مولانا عبدالرشید ملتانی، شیخ بدیع الدین مانک پوری، مولوی نصیر الدین سنبھلی اور حافظ محب اللہ خیرآبادی تشریف لے گئے، راستہ میں کچھ روز قاضی ضیاء الدین المعروف بہ قاضی جیا نیوتنوی کے مکان پر قیام فرمایا، پھر وہاں سے روانہ ہو کر چھٹے روز میں کالپی پہونچے، چونکہ مخدوم صاحبؒ قراءتِ کلام مجید میں بھی یکتائے زمانہ تھے اس لیے سید صاحب نے رمضان شریف کے دنوں کی اس طرح تقسیم فرمائی کہ پہلے عشرہ میں آپ پڑھیں، دوسرے میں قاری محمد شریف مدنی اور تیسرے عشرہ میں قاری حمید الدین بغدادی اور بعد مغرب اوابین میں ایک پارہ قاری مبارک اللہ بغدادی پڑھیں،

چنانچہ آپ نے حسب الحکم پڑھنا شروع کیا، ایک سَو ستر سامعین تھے، نماز کی حالت میں سامعین پر وہ استغراقی اور بے خودی کی کیفیت طاری ہوئی کہ اگر فرض الٰہی اور سنن نبویؐ کی ادائیگی میں ادب شرط نہ ہوتا تو شاید وفور بے خودی میں اپنے کپڑے پھاڑ دیتے، اور مسجد کی دیواروں سے سر پھوڑ دیتے' تر دیکھ کے وقت قاری محمد شریف مدنی نے اپنی جگہ سے کھڑے ہوکر آپ سے مصافحہ کیا اور فرمایا: مولانا قاری نظام الدین کون کہہ سکتا ہے کہ تم ہندی ہو، تم تو فخر اہل مدینہ ہو، تجوید کے دقائق کی جیسی رعایت شد و مد اور خوش الحانی تم میں ہے وہ کسی میں نہیں، حق یہ ہے کہ تم اپنا مثل نہیں رکھتے۔

ایک روز قاری محمد شریف مدنی نے سید صاحب سے عرض کیا کہ میں نے سنا ہے کہ مولانا (قاری نظام الدین) کو حضرت شیخ اکبر ابن عربی کی تصنیفات پر بڑا عبور ہے، اگر رمضان شریف کے بعد فصوص الحکم کا بیان کسی وقت مقررہ پر ہوا کرے تو بہت اچھا ہے، سید صاحبؒ نے ان سے فرمایا کہ مولانا! مہمان کی خاطر ضرور کرنا چاہیے، دوسری شوال سے حسب الحکم ظہر کے بعد پہلے تبرکاً جامع الاصول کا درس اور اس کے بعد فصوص الحکم کا بیان شروع ہوا، پہلے ہی روز انہوں نے ایسی بسیط و جامع تقریر فرمائی کہ سامعین حیران و ششدر رہ گئے، ایک جملہ کتاب مذکور کا اور دس بارہ قرآنی آیات اور اسی قدر احادیث سے اس کی (فصوص الحکم کی عبارت) ایسی تطبیق فرمائی' جس سے تمام لوگ اور خود سید صاحب موصوف بہت مسرور ہوئے۔

حضرت قاری محمد شریف مدنی جب اپنے وطن واپس ہوئے تو راستہ میں حضرت خواجہ امکنگیؒ سے بیان کیا کہ میں نے اس سفر میں ایک بزرگ سے ملاقات کی جو جامع صفات ہے، جسے سید الطائفہ جنید بغدادیؒ کا ادب، امام ابو حنیفہؒ کا تقویٰ اور تجوید قرائے سبعہ سابقین دیکھنا منظور ہو تو وہ مولانا قاری نظام الدین کو دیکھے، ان سب کمالات کے باوجود بجز نشان عبودیت اور کچھ نہیں، اس واقعہ کو حضرت خواجہ باقی باللہ دہلویؒ نے اپنے پیر حضرت خواجہ امکنگیؒ سے سن کر

حضرت ملا عبدالکریم نبیرۂ حضرت مخدوم نظام الدین قارئیؒ سے اپنے خلیفۂ خاص حضرت شیخ مجدد الف ثانی سرہندیؒ کے مواجہہ سے بیان فرمایا تھا۔

حضرت مخدومؒ ابھی کالپی ہی میں تھے کہ ان کے والد ماجد کا مکتوب گرامی پہونچا جس سے ان کی علالت کا پتہ چلا، چنانچہ سید صاحب نے حضرت مخدومؒ کو رخصت فرمایا۔ (یہ واقعہ ۲۹ شوال ۹۵۹ھ کا ہے) واپسی پر راستہ میں شاہ عبدالرحیم مجذوبؒ سے جو ان کے والد ماجد کے احباب میں سے تھے، ملاقات کی، اپنے والد ماجد کے حسب ارشاد راستہ میں ان مجذوب صاحبؒ کے متعلق لوگوں سے دریافت کرتے رہے، معلوم ہوا کہ قریب میں ایک بزرگ ہیں تو مگر ان کا سارا وقت جنگل کے گشت میں گذرتا ہے، کبھی گاؤں میں آکر باب اللہ تکیہ دار کے مکان پر قیام کرتے ہیں، یہ سن کر وہ مرزا شمس الدین خان کوکا اور مولانا عبدالرشید ملتانی کے ہمراہ مکان مذکور پر پہونچے، دیکھا ایک برہنہ شخص بیٹھے ہوئے بڑ مار رہے ہیں، بالکل قریب جاکر سلام کیا، انھوں نے نہایت ہی کڑک کر جواب دیا اور پھر فرمایا: آؤ بھتیجے! پھر کہا: نظام! مسئلہ شیر مادر صوفیان تو پڑھ چکا، اچھا بڑھا حضرت نے کھڑے ہوکر سلام کیا پھر بیٹھ گئے، انھوں نے پھر کہا تو نے عرب کے قاریوں کے سامنے کتاب فصوص الحکم بھی خوب پڑھی، اب میرے پاس سامنے فص محمدی پڑھو، انھوں نے پڑھنا شروع کیا مطالب کسی کی سمجھ میں نہ آئے، تقریر کے اختتام کے بعد انھوں نے ہاتھ اٹھا کر دعا مانگی کہ "جو کچھ سنت ہے، فرض ہو، اور جو فرض ہے وہ سب کچھ ہو، آمین آمین آمین، اس کے بعد فرمایا: نظام! میرا بھائی تیرے انتظار میں ہے، جلد جا، میرا سلام کہنا اور کہنا کہ جو کچھ میرے پاس تھا وہ میں نے تیرے لڑکے کو دے دیا۔

حضرت مخدومؒ ان سے رخصت ہوکر روانہ ہوئے، مرزا شمس الدین خاں کوکا کو یہ کہہ کر کہ تم کو بہت روز لگ گئے آگرہ روانہ فرمادیا، ۵ ذی قعدہ ۹۵۹ھ کو کاکوری پہونچے اور والد ماجد سے

تمام سفر کی کیفیتیں بیان کیں، انھوں نے یہ دعا دی کہ

یارب العزت! ہر نعمتے کہ باسلاف اوادی	اے رب العزت! تو نے جو نعمتیں ہمارے
امید دارم کہ اولاد ما نیز از ان نعمت	بزرگوں کو عطا کیں، امید کرتا ہوں کہ ہماری
بہرہ ور باشند۔	اولاد بھی اُن سے بہرہ ور ہوگی۔

اسی روز ان کے والد ماجد نے وصال فرمایا، اس طرح شاہ عبدالرحیم مجذوبؒ کا وہ قول کہ اے نظام جلد برو، برادرم بہ انتظار تو نشستہ است الخ (نظام جلدی جاؤ میرا بھائی تمھارے ہی انتظار میں بیٹھا ہے) بالکل درست نکلا۔

ارشادات | ان کے ارشادات بہت عالی ہیں، جن سے ان کے مقام ارشاد کا بھی اندازہ ہوتا ہے، ان میں سے کچھ وہ ہیں جن کا تعلق خود ان کی ذات مقدس سے متعلق ہے، اور جن کو انھوں نے بطور حکایت بیان فرمایا، حضرت شاہ تراب علی قلندر علوی نے ان ارشادات کو بالتفصیل بیان کیا ہے۔

فرماتے تھے کہ دس سال کی عمر میں میں نے کلام مجید حفظ کر کے درسی کتابیں پڑھنا شروع کیں، چودہ برس میں فارغ التحصیل ہوگیا، اس کے بعد مولانا ضیاء الدین محدث مدنی سے حدیث پڑھی، انھوں نے ایک روز اثنائے درس میں درود شریف کی اجازت دی جس کے پڑھنے سے مجھے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت نصیب ہوئی۔

وہ وفور اخلاق اور کمال اتباع خصائل محمدی کی وجہ سے ہر شخص سے تعظیمی الفاظ سے مخاطب ہوتے، اکثر فرمایا کرتے کہ وہ لوگ قابل افسوس ہیں جو اپنے اخلاق سے لوگوں کے قلوب کو خوش نہیں رکھتے، حالانکہ قلوب کا خوش رکھنا از روئے نصوص اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کی دلیل ہے۔

فرماتے تھے کہ ایک روز لڑکپن میں میں نے کہا کہ مجھے اُن لوگوں پر سخت تعجب ہوتا ہے، جو

حرمین شریفین جاتے اور وہاں سے واپس آجاتے ہیں، اگر مجھے یہ سعادت نصیب ہو تو میں مدت العمر واپس نہ آؤں، اس کا جواب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خواب میں یہ دیا کہ تم جو زیارت کعبہ شریف کرکے پھر واپس جانا نہیں چاہتے، تو ایسا نہ کرو، تم کو ہندوستان میں رہنا چاہیے، تاکہ تم سے لوگ استفادہ کریں، تم وہاں جو عقد کروگے اس سے صالح، نیک اور باخدا اولاد پیدا ہوگی، یہ فرما کر میرے سر پر ہاتھ رکھا، جس سے میرا دماغ ایسا معطر ہوا کہ میں بے خود ہوگیا، پھر دست مبارک سے سر کو حرکت دے کر فرمایا کہ بے خود ہونا آسان اور باخود و باخدا ہونا مشکل ہے، بندۂ ساقط الخدمت سے معبود کا کام ٹھیک نہیں بنتا، خدا کا شکر کرو جس نے تم کو اس قدر قوی استعداد عطا کی ہے، صرف ہمت رجال سبعہ کاملین (وہی ساتوں کاملین مذکور) سے تمھاری تکمیل ہوگی، اور اسی وقت مرتبۂ احسان کی حقیقت تم پر منکشف ہوگی، پھر دست مبارک سینہ پر رکھ کر فرمایا کہ اس کی تفصیل دوسرے وقت پر موقوف ہے، اس کے بعد سینہ پر سے دست مبارک داہنی جانب اور داہنی جانب سے بائیں جانب پھیر کر کلمۂ سابقہ مکرر فرمایا، اس کے بعد دست مبارک اٹھا کر یہ آیت پڑھی:

سُبْحَانَ رَبِّكَ رَبِّ الْعِزَّةِ عَمَّا	تمھارے عزت و بزرگی والے رب کو
يَصِفُوْنَ وَسَلَامٌ عَلَى الْمُرْسَلِيْنَ	کافروں کی باتوں سے پاکی ہے، پیغمبروں پر
وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ۔	سلام اور تمام عالم کے پالنے والے اللہ کے لیے ہی تعریف ہے۔

میں نے صبح کو یہ واقعہ حضرت مولانا ضیاء الدین محدث مدنی ؒ سے بیان کیا، وہ مجھے اپنے ساتھ والد ماجد کی خدمت میں لے گئے، اور ان سے بیان کیا، انھوں نے اٹھ کر دوگانہ ادا کیا، پھر فرمایا کہ میں نے اس کے حق میں بہت سی بشارتیں بزرگوں سے سنی ہیں، جن میں سے ایک یہ ہے جو آپ کی توجہ سے ظاہر ہوئی، والحمد للہ علیٰ ذلک۔

(باقی)

وفیات

مولانا سعید احمد اکبر آبادیؒ کی یاد میں

آہ! ع جو بادہ کش تھے پرانے وہ اٹھتے جاتے ہیں

از سید صباح الدین عبد الرحمن

مولانا سعید احمد اکبر آبادی دنیا کے بکھیڑوں، زندگی کے ہنگاموں اور اپنے علمی جھمیلوں سے آزاد ہوکر اب وہاں ہیں جہاں اکرامِ الٰہی کی سلسبیل سے کوئی سیراب ہو جائے تو پھر اس کے لیے وہاں مغفرت کے مینا اور رحمت کے ساغر چھلکتے رہتے ہیں، بارگاہ ایزدی میں ان کے اعمال کی کتاب کھولی جائے گی تو یقین کرنے کو جی چاہتا ہے کہ عدل خداوندی کی میزان میں ان کی نیکیوں اور نیکوکاریوں کا پلڑا بھاری رہے گا، اس جہانِ فانی میں ان کی رحلت پر علم سوگوار ہوا، فضل غمناک ہوا اور وہ لمحات بھی مغموم ہوئے جن میں وہ اپنے قلم کی سیاہی سے اپنے داغ دل کو داغ لالہ بنا دیتے تھے، میری طرح ان کے بہت سے قدردان ان کو اب یاد کرکے اپنے خشک آنسوؤں کے ساتھ بے چین ہوں گے، اور آیندہ ان پر بہت کچھ لکھا جائے گا ؎

دریں آشوبِ غم عذرم بنہ گر نالہ زن گریم
جہانے را جگر خون شد ہمیں تنہا نہ من گریم

دل کے اس شیون کے ساتھ سمجھ میں نہیں آتا کہ ان کی یادوں کا جلوس کہاں سے شروع کرکے

کہاں پر ختم کیا جائے، اپنی کج مج بیانی حائل ہو رہی ہے، پھر بھی جو سطریں یہاں پر لکھی جا رہی ہیں، وہ محض ایک دیرینہ نیاز مند اور عقیدت مند کے بارِ غم کو ہلکا کرنے کے لیے ہیں۔

ان کی پیدائش ۱۹۰۸ء میں آگرہ میں ہوئی، ان کا آبائی وطن بچھراوں ضلع مراد آباد تھا، ان کے والد بزرگوار ڈاکٹر تھے، اپنی سرکاری ملازمت کی وجہ سے ان کا آخری زمانہ آگرہ میں گذرا تو وہیں سکونت پذیر ہو گئے، اور یہیں مولانا سعید احمد کی ولادت ہوئی، اسی مناسبت سے اکبرآبادی لکھتے تھے، ان کے نام کے اس جزو کے ساتھ پرانے اکبرآباد کی بہت سی روایتیں ان کی طبیعت اور روزمرہ زندگی میں پیوست ہو گئی تھیں، اکبرآباد کی تاریخ کی طرح ان کی زندگی میں بھی بڑی رنگارنگی رہی۔

اپنی ابتدائی تعلیم کے بعد دار العلوم دیوبند میں داخل ہوئے، وہاں سے سند حاصل کر کے دہلی یونیورسٹی میں اعلیٰ تعلیم پائی، پھر اسی کے اسٹیفن کالج میں عربی کے استاد مقرر ہوئے، یہاں ان کی مختلف صلاحیتوں کا اندازہ لگایا گیا، تو کلکتہ کے مدرسۂ عالیہ کے پرنسپل مقرر ہوئے، وہاں ان کی شہرت کو اور چار چاند لگے تو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ دینیات کے صدر کی حیثیت سے بلا لیے گئے، یہاں سے ریٹائر ہوئے تو ہمدرد نگر تغلق آباد نئی دہلی میں ان کی علمی خدمات حاصل کی گئیں، وہیں سے ترپوتی یونیورسٹی میں وزیٹنگ پروفیسر کی حیثیت سے بلا لیے گئے، پھر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے اسلامک اسٹڈیز میں بھی کچھ دنوں پروفیسر رہے، آخر میں دار العلوم دیوبند کی شیخ الہند اکادمی کے ڈائرکٹر تھے، اس اثنا میں ان کا علمی سفر کینڈا، نیویارک، پرنسٹن، لندن، مصر، سعودی عرب اور جنوبی افریقہ وغیرہ کا بھی ہوتا رہا، پاکستان تو خدا جانے کتنی بار، وہاں کی علمی کانفرنسوں میں بلائے گئے، ہندوستان کی کوئی اہم علمی کانفرنس ایسی نہ ہوتی جس میں وہ مدعو نہ ہوتے، پھر اپنے سیاسی ذوق کی وجہ سے آل انڈیا مسلم کنونشن کے صدر بھی منتخب ہوئے، ان کو

جمہوریۂ ہند کے صدر کی طرف سے عربی میں سند اعزاز بھی ملا، کلکتہ کی ایک ادبی انجمن کی طرف سے دس ہزار کا انعام بھی پیش کیا گیا۔

وہ جہاں رہے، اگل رعنایں کرتے، کسی علمی کانفرنس میں شرکت کرتے تو اس کے گل سرسبد بن جاتے، کسی سے ملتے تو گل نیلوفر کی طرح کھلے ہوئے نظر آتے، مجلس میں بیٹھ کر باتیں کرتے تو علم وفضل شعر اور ادب کا گلدستہ بنے ہوئے دکھائی دیتے۔

اس برصغیر کے بڑے اچھے مقرروں میں شمار کیے جاتے، تقریر کرتے وقت اپنی علمیت زبان کی فصاحت، طرز ادا کی بلاغت اور خطابت کی پوری شان دکھاتے، مگر اس میں الفاظ کی بہتات اور خطابت کا تصنع نہ ہوتا، بلکہ ان کو سنتے وقت ایسا معلوم ہوتا کہ کوئی اہل علم اپنی بصیرت سے اپنے سامعین کے ذہن میں ضیاء پاشی کر رہا ہے، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں اپنے فن خطابت سے وہاں کے اساتذہ اور طلبہ کو برابر متاثر رکھا، وہ اردو، عربی اور انگریزی تینوں زبانوں کے مقرر تھے، حضرت مولانا ابوالحسن علی ندوی اس وقت دنیا کے بہترین خطیبوں اور مقرروں میں شمار کیے جاتے ہیں، لیکن مولانا سعید احمد اکبرآبادی جب کبھی دارالعلوم ندوۃ العلماء پہونچ جاتے تو ان کی تقریر کو سننے اور سنانے کے لیے ضرور کوئی مجلس منعقد کراتے، وہ بولتے تو حضرت مولانا کے چہرے سے ظاہر ہوتا کہ وہ ان کی قوت گویائی سے متاثر ہو رہے ہیں اور تحسین بھری نظروں سے حاضرین کو بھی دعوت دے رہے ہیں کہ وہ بھی حظ اٹھائیں۔

گذشتہ سال مارچ میں وہ سندھ کے ایک سمینار میں تشریف لے گئے، یہ راقم بھی اس میں مدعو تھا، اس کا افتتاح کراچی میں جنرل ضیاء الحق نے کیا، بڑا اچھا مجمع تھا، پورا ہال اکابر سے بھرا ہوا تھا، مولانا اس مجلس کے مہمان خصوصی بنائے گئے، اس میں ان کو سندھ کی علمی اور ثقافتی حیثیت پر کچھ اظہار خیال کرنا تھا، جب وہ بولنے لگے تو سارا مجمع متاثر نظر آیا، مختصر بولے مگر بہت ہی پیارے انداز میں

بولے، جنرل ضیاء الحق کے ساتھ ہر شخص کی زبان پر تھا کہ ایسی پیاری تقریر بہت دنوں کے بعد سننے میں آئی۔

پاکستان میں ان کی مقبولیت راقم نے اپنی آنکھوں سے دیکھی، ۱۹۸۰ء میں پندرہویں صدی ہجری کے آغاز پر اسلام آباد میں ایک بہت بڑی بین الاقوامی کانفرنس تھی، وہ وہاں بلائے گئے تھے، یہ خاکسار بھی مدعوئین میں تھا، اس کا افتتاح جنرل ضیاء الحق نے کیا، جس کے بعد چائے کا وقفہ ہوا، تو جنرل ضیاء الحق کی نظر مولانا پر پڑی، بہت بے تکلفانہ انداز میں ان سے مخاطب ہو کر بولے حضرت آپ کا ایک شاگرد آپ کے سامنے کھڑا ہے، اس کو سینٹ اسٹیفن کالج میں آپ کی شاگردی کی سعادت حاصل ہوئی تھی، خود مولانا کو اس وقت کے ضیاء الحق کی صورت یاد نہ تھی، دونوں نے بڑی گرم جوشی سے معانقہ کیا، مجمع اس قران السعدین سے محظوظ ہو رہا تھا، جنرل ضیاء الحق نے رخصت ہوتے وقت ان سے وعدہ لیا کہ وہ ان کے یہاں آکر کچھ دنوں مہمان رہیں گے۔

۱۹۸۴ء کے مارچ میں سندھ کے مذکورۂ بالا سیمینار میں بھی جنرل ضیاء الحق کی نظر مولانا پر پڑی تو بڑی محبت سے ان کو ڈائس پر بلا کر اپنے بغل میں بٹھایا، اور پھر اپنی تقریر میں ان کی تعلیم و تربیت کا بھی ذکر کیا، اس مرتبہ بھی مولانا کو اسلام آباد میں اپنے یہاں مدعو کیا۔

پاکستان میں ان کے ساتھ ایک دلچسپ لیکن عجیب و غریب علمی سفر کی یاد بھی اس وقت بے اختیار آرہی ہے، ۱۹۷۶ء میں وہاں کی پہلی بین الاقوامی سیرت کانفرنس میں ہم دونوں مدعو تھے، جب اس کی ایک نشست کراچی میں ہوئی تو حیدرآباد سندھ سے کچھ لوگ مولانا قاری محمد طیب مرحوم سابق مہتمم دارالعلوم دیوبند کو اپنے یہاں کے سیرت کے جلسہ میں مدعو کرنے آئے تو مولانا سعید احمد اکبرآبادی کو بھی دعوت دی، پھر مجھ سے بھی شرکت کرنے کو کہا گیا، میں تو جانے کے لیے تیار نہیں ہوا، کیونکہ سیرت کی کانفرنس میں مقالے تو پڑھ لیتا ہوں، مگر کوئی لمبی تقریر کرنے کا عادی نہیں ہوں، وہاں جانے سے انکار کیا، لیکن مولانا نے یہ کہہ کر چلنے پر مجبور کیا کہ مولانا قاری محمد طیبؒ کا وعظ اتنا لمبا

ہو جائے گا کہ ہم لوگوں کے بولنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوگا ان کی اس ضمانت پر چلنے کو تیار ہو گیا، دوسرے دن موٹر ہم لوگوں کو لے کر مولانا قاری محمد طیبؒ کی قیام گاہ پر پہونچی تو انھوں نے جانے سے معذرت کی، مولانا سعید احمد اکبرآبادی پریشان ہوئے، اور میری سراسیمگی کی تو کوئی حد نہ تھی ہم لوگ واپس بھی نہیں ہو سکتے تھے، پریشانی میں جلسہ گاہ پہونچے تو ہزاروں کا مجمع دیکھا جو مولانا طیبؒ کو سننے کے لیے بے چین تھا، نعرۂ تکبیر کی بار بار صدا بلند ہو رہی تھی، ہم لوگوں کے پہونچتے ہی جلسہ شروع کر دیا گیا، مولانا مائک پر بلائے گئے، موٹر کے لمبے سفر سے ہم لوگ بالکل تھکے ہوئے تھے، مولانا پر بھی تکان کا اثر تھا، وہ بولنے کے لیے تیار ہو کر بھی نہیں آئے تھے، انھوں نے بجوراً تقریر شروع کر دی، لیکن یہ جم نہیں رہی تھی، میں پریشان تھا کہ اتنے بڑے مجمع میں میرا تو بولنا اور بھی مشکل ہوگا، یکایک ایک صاحب میرے پاس آئے، وہ میری کتاب بزم صوفیہ پڑھ چکے تھے، میرے کان میں کہنے لگے کہ صوفیائے کرام کے واقعات سے مجمع کا رنگ بدل جائے گا، کیونکہ یہاں کے لوگ ان کے واقعات بہت شوق سے سنتے ہیں، جب مائک پر پہونچا تو ان بزرگان دین کی باتیں یاد آتی گئیں، دو چار واقعات سنائے ہوں گے کہ تکبیر کے نعرے بلند ہونے لگے، میرا حوصلہ بڑھا اور مجمع کے ذوق کے مطابق ان بزرگوں کے واقعات دیر تک سناتا رہا، تائید ایزدی بھی ساتھ دیتی رہی، جب بول کر مولانا کے پاس بیٹھا تو انھوں نے یہ کہہ کر گلے لگا لیا کہ ہندوستان کی اچھی نمایندگی ہو گئی، مگر میں نے عرض کیا کہ آپ نے تو یہاں لا کر تختۂ دار پر چڑھا دیا تھا، خیریت ہوئی کہ اس پر سے صحیح سالم اتر آیا،

وہ ایک بہت ممتاز اہل قلم کی حیثیت سے بھی مشہور ہوئے، ان کی زبانی بارہا سنا کہ وہ شروع سے مولانا شبلیؒ اور دار المصنفین کی تصانیف سے متاثر رہے، دیوبند کی طالب علمی کے زمانے میں ان کے پاس ان کتابوں کو دیکھ کر وہاں کے طلبہ اور اساتذہ کو تعجب ہوتا تھا، اور یہ

کہنے میں تامل نہیں کہ ان کی ذات اور ان کی تحریروں پر دبستان شبلی کا بڑا اثر رہا، جس کا ایک کھلا ہوا ثبوت یہ بھی ہے کہ جب دہلی میں مولانا حفظ الرحمٰن اور مولانا مفتی عتیق الرحمٰن نے مل کر ایک ادارہ قائم کیا اور اس کی تاسیس میں ان کی بھی شرکت ہوئی تو دارالمصنفین ہی کی تقلید میں اس کا نام ندوۃ المصنفین رکھا گیا اور پھر ان کی ادارت میں رسالہ 'برہان' ندوۃ المصنفین سے نکلنا شروع ہوا تو اس میں معارف ہی کی طرح خاص خاص عنوانات رکھے گئے، ان کا بس چلتا تو ندوۃ المصنفین کو دارالمصنفین ہی کی طرح ایک علمی ادارہ بنا دیتے مگر بعض ناگزیر اسباب کی بنا پر یہ اشاعتی ادارہ بن کر رہ گیا، پھر بھی اس کی طرف سے اب تک جتنی کتابیں شایع ہوئی ہیں ان سے اردو زبان کے مذہبی اور تاریخی لٹریچر میں بڑا قابل قدر اضافہ ہوا ہے، مولانا کا رسالہ 'برہان' اس کے لیے اس حیثیت سے مفید رہا کہ اس کی وجہ سے یہ علمی ادارہ ہی سمجھا جاتا رہا۔

مولانا نے اس رسالہ کی ادارت کے فرائض جس شان سے انجام دیے' وہ اردو زبان کی تاریخ میں جلی حروف سے لکھے جائیں گے، ان کا کوئی معاون نہیں رہا، وہ خود ہی اس کے مضامین کے حک و اصلاح اور ترتیب میں لگے رہتے، اس کے لیے لمبے لمبے مضامین بھی لکھتے، اس میں ریویو کے لیے جو کتابیں آتیں' ان پر ریویو بھی قلمبند کرتے، البتہ اس کی کتابت اور طباعت کی ذمہ داری مولانا مفتی عتیق الرحمٰن پر ہوتی، ورنہ سینتالیس[۴۷] سال کی طویل مدت تک ادارت کا سارا کام تنہا ان ہی کے ذریعہ سے انجام پاتا رہا، کسی مہینہ اس کی اشاعت نہیں رکی، جو ان کا زبردست علمی کارنامہ ہے، اس میں 'نظرات' کے عنوان سے ان کی ادارتی تحریریں ہوتیں جن میں ملک کے ہر قسم کے مسائل پر اپنے خیالات کا اظہار کر کے اپنے قلم اور علم کا جو جوہر دکھاتے رہے' اس کی طرف پورے علمی حلقہ کی نظر اٹھتی رہی، بعض اوقات اپنی رائے کا اظہار بڑی جرأت اور بے باکی سے کرتے، نظری حیثیت سے وہ نیشنلسٹ مسلمان تھے لیکن حق بات میں ان کی نیشنلزم ان کے قلم پر روک نہیں لگاتی، نظرات میں کبھی وہ اپنے

مذہبی خیالات کے مرد ارید بکھیرتے، کبھی اپنے جذبات کے تلاطم سے اپنی تحریر کو پُرشور کر دیتے، کبھی علمی نکتہ آفرینیوں سے اپنے ناظرین کو محظوظ کرتے، کبھی مشاہیر کی وفات پر اپنے غمناک تاثرات کا اظہار کر کے دوسروں کو بھی اپنا شریکِ غم بنالیتے، کبھی اس میں ادب وانشا کا سحر دکھا کر اپنی تحریر سے مسحور کرتے، اگر ان کے نظرات کتابی صورت میں مرتب کیے جائیں تو یہ بہت سا جلدوں میں منتقل ہو کر نظر، فکر، روشن ضمیری، خود اعتمادی اور تبحرِ علمی کے قیمتی راس المال ثابت ہوں گے۔

وہ بہت سی کتابوں کے مصنف بھی ہوئے، جن میں کچھ یہ ہیں: فہمِ قرآن، غلامانِ اسلام، وحی الٰہی، صدیقِ اکبر، مسلمانوں کا عروج و زوال، اکابر مقالات، تفتہ المصدور اور ہندوستان کی شرعی حیثیت، مولانا عبیداللہ سندھی اور ان کے ناقد، حضرت عثمان غنی ذی النورینؓ اور خطباتِ اقبال پر ایک نظر، ان کی تمام تصانیف پر ایک مستقل کتاب لکھ کر ان کے تصنیفی اور علمی کارناموں کو خراجِ عقیدت پیش کرنے کی ضرورت ہے، یہاں پر ہم ان کی دو تصانیف وحی الٰہی اور صدیقِ اکبر کی کچھ جھلکیاں دکھانے پر اکتفا کریں گے، وحی الٰہی میں وحی کی ضرورت، وحی کی مختلف صورتیں، قرآن اور وحی، خدا کی صفات، وحی اور محققین یورپ، تسلسلِ وحی اور نزولِ جبرئیل، قرآن مجید وحی الٰہی کیوں ہے؟ قرآن مجید کا اسلوبِ بیان اور بعض عیسائی مصنفین پر ان کے جو مباحث ہیں، ان کو پڑھ کر ان کی علمی فضیلت اور جلالت کا بڑا اثر پڑتا ہے، جس ایمانی حرارت اور مذہبی راسخ العقیدگی سے یہ لکھی گئی ہے اس کے بعض مباحث بارگاہِ ایزدی میں بھی ضرور مقبول ہوئے ہوں گے، اس کی وجہ تصنیف جس دلچسپ انداز میں بتائی گئی ہے اس کو پڑھ کر اس کتاب کی نوعیت کا نہ صرف اندازہ ہوگا، بلکہ ناظرین کے ایمان میں نور اور دل میں سرور پیدا ہو کر ان کے بہت سے شکوک و شبہات کافور ہو جائیں گے، لکھتے ہیں:

"دنیا میں سیکڑوں سوالات ہیں جن کے جواب میں انسان سب کچھ کہنے کے بعد آخر میں ایک ایسے

مرحلے پر پہونچتا ہے کہ پھر اس کے لیے جواب کی کوئی گنجائش نہیں رہتی، ہاتھی اس قدر قوی اور توانا کیوں ہے؟ چیونٹی کیوں اتنی نحیف و زار ہے، آم کے درخت پر آم ہی کیوں لگتے ہیں جامنیں کیوں نہیں پیدا ہوتیں؟ غم سے رونا اور خوشی سے ہنسا ہی کیوں آتا ہے؟ اس کے برعکس کیوں نہیں ہوتا؟ یہ اور اس کی طرح سیکڑوں سوالات ہیں، جن کے جواب کا آخری رتبہ یہ ہے کہ ان تمام اشیاء کے طبعی خواص اور ان کی نوعی مختصات پر محمول کر دیا جائے، پھر اگر اس کے بعد بھی یہ سوال کیا جائے کہ اس شے کی طبیعی خاصیت کیوں ہے؟ اور یہی کیوں ہے؟ اور چیز کیوں نہیں، تو اس کے جواب میں ایک ملحد کہے گا کہ مادہ کی ترکیب اسی طرح ہوئی ہے، لیکن موحد جواب دے گا کہ خدا نے ہر شے کی صورت نوعیہ میں ایک الگ خاصیت رکھی ہے، جواب دونوں کے مختلف ہوں گے، لیکن ہر ایک کا یہ جواب ایک آخری جواب ہوگا کہ اگر اس کے بعد میں سائل کیوں سے سوال کرے تو اس کے جواب میں کچھ نہیں کہا جا سکتا۔

وحی کا مسئلہ اسی طرح کے مسائل میں سے ہے، اس کی حقیقت کے سمجھانے میں ہم بتا سکتے ہیں کہ خدا کلام کرتا ہے، خاص خاص انسان (انبیاء) اس کا کلام سنتے اور سمجھتے ہیں، اور ہم یہ بھی کر سکتے ہیں کہ ان دونوں دعووں پر جو عقلی اعتراضات کیے جائیں ان کو رفع کر دیں، لیکن اس کے بعد بھی اگر کوئی شخص "ایسا ہی کیوں ہوتا ہے" کہہ کر ہم سے سوال کرے گا تو اس کا سیدھا جواب یہ ہے کہ اچھا پہلے تو ہمارے ہزاروں کیوں کا جواب دے دو، پھر ہم بھی تمھیں سمجھا دیں گے کہ خدا انبیاء میں ہی کیوں کلام ربانی کو سمجھنے کی استعداد رکھتا ہے؟ ہم تم میں کیوں یہ صلاحیت نہیں ہوتی؟ زیر نظر کتاب میں وحی الٰہی پر جو بحث کی گئی ہے اس کا مقصد ان ہی سوالات کا جواب دینا ہے جو واقعی ایک طالب تحقیق کے دل میں اس مسئلہ پر غور کرنے کی راہ میں پیدا ہو سکتے ہیں، ان کے علاوہ جو لوگ از راہ بغض و عناد اپنے کیوں کا سلسلہ کہیں ختم نہیں کرتے وہ اس کے مخاطب نہیں۔

مولانا کی اس پر کیف تحریر کو پڑھنے کے بعد اس کے ناظرین کے بہت سے مذہبی خیالات میں

پیدا ہو سکتی ہے۔

ان کی کتاب صدیقِ اکبرؓ بہت مقبول ہوئی، انھوں نے اس کے دیباچہ میں اس کے ماخذوں پر جو بحث کی ہے اس کے مطالعہ سے اندازہ ہوگا کہ اس کی تدوین کرنے میں کیسی محنت شاقہ کی گئی ہے پھر جس دلنشیں پیرایہ میں یہ شروع سے آخر تک لکھی گئی ہے وہ اس کی اصلی خوبی ہے۔ اس میں ان کے ابرِ قلم کے جو رشحات ہیں ان کے دو چار نمونے یہاں پر پیش کرنے کو جی چاہتا ہے تاکہ ناظرین میری طرح تھوڑی دیر کے لیے ان کے اسلوب اور طرزِ بیان سے بھی لطف اٹھائیں، حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی سیرت پر تبصرہ کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:

"تاریخ کا ایک طالب علم کہہ سکتا ہے کہ دنیا میں سکندرِ اعظم، ہنی بال، چنگیز خاں، تیمور اور بھی بڑے بڑے فاتح گذرے ہیں، جنھوں نے نہایت عظیم الشان فوجی کارنامے انجام دیے، لیکن سوال یہ ہے کہ دنیا میں کوئی عظیم الشان فاتح ایسا بھی گذرا ہے جس نے دنیا کی تاریخ کا ورق الٹ دیا، لیکن اس کے باوجود اس کے سر پہ تاجِ زرنشاں ہو اور نہ اورنگِ سلطانی ہو، معمولی سے معمولی آدمیوں کی طرح رہتا سہتا ہو، اس میں اور دوسرے لوگوں میں شان و شوکت اور وجاہت و سطوت کے اعتبار سے کوئی فرق نہ ہو، وہ محلہ کی بکریوں کا دودھ بھی دوہ دیتا ہو، رات کے وقت چھپ چھپ کر نابینا عورت کے گھر کا سارا کام بھی کرتا ہو، معمولی کپڑے پہنتا ہو، موٹا جھوٹا کھاتا ہو، اس کے پاس نہ خدم و حشم ہوں اور نہ محلات و قصور، نہ خزانے ہوں، اور نہ زر و سیم کے انبار، نہ چوکیدار، نہ دربان، نہ ملٹری گارڈ اور نہ پولیس کا حفاظتی دستہ، ایک معمولی سے معمولی انسان بھی برملا اس کو سرِراہ ٹوک سکتا ہو، ایک ادنیٰ حیثیت کا شخص بھی بھرے مجمع میں اس سے بازپرس کر سکتا ہو۔"

کیسی موثر اور پاوقار تحریر ہے۔ اس کا سلسلہ جاری رکھتے ہوئے لکھتے ہیں:

"جب وہ اپنی فوج کو کسی مہم پر روانہ کرنے کے لیے دور تک مشایعت کے لیے جاتے تو اسی

شان ہے کہ وہ خود پاپیادہ ہوتے اور اس کا نوعمر و نوجوان امیر فوج گھوڑے پر سوار ہوتا، اس کی بیٹی اپنے شوہر کے گھوڑوں کا دلیہ خود دلتی ہو اور پھر نو میل اسے سر پر رکھ کر پیدل چلتی ہو اور خود اس کا اپنا حال یہ ہو کہ وہ کپڑوں کا گٹھر اپنے سر پر رکھ کر بازار میں پھرتا ہو، بتاؤ فوجی وحسن کارگزاری کے ساتھ جمہوریت اور یہ مساوات و برابری، یہ تواضع و فروتنی پوری تاریخ عالم میں کہیں اور بھی نظر آتی ہے؟ اس میں شبہ نہیں کہ جمہوریت اور مساوات کی جو مثال حضرت عمرؓ نے اپنے عہد خلافت میں قائم کی وہ اپنی جگہ بے نظیر ہے، لیکن حضرت ابوبکرؓ کی اس بے نفسی اور انتہائی سادگی کو دیکھ کر حضرت عمرؓ بھی کہہ پڑے: اے ابوبکر! تم نے اپنے بعد میں آنے والوں کے لیے بڑی مشکلات پیدا کر دیں، یعنی تمہارے نقش قدم پر چلنا کسی کے بس کی بات نہیں۔"

حضرت ابوبکرؓ کی سیرت کو نمایاں کرنے کے لیے جس دلنواز طرز ادا کی ضرورت تھی اس کو مولانا نے اپنی تحریر کے ذریعہ سے فراہم کیا، پھر ان کو یہ سب کچھ لکھنے میں ایسی لذت ملی کہ ان کا قلم روکے نہیں رُکا، بے ساختہ طور پر ان کے قلم سے یہ تحریر بھی نکل پڑتی ہے:

"پھر فاتحین و کشور کشایان عالم میں کتنے ہیں جو کے لشکروں نے شہروں کو نہ اجاڑا ہو، آبادیوں کو ویرانہ میں تبدیل نہ کر دیا ہو، بوڑھوں، بچوں اور عورتوں پر ترس کھایا ہو، کھیتوں کو آگ نہ لگائی ہو، درختوں کو نہ کاٹا ہو، لیکن یہاں کیا عالم تھا، فوج روانہ ہوتی تھی تو بڑی تاکید سے ان امور کی نسبت ہدایات دی جاتی تھیں اور کسی کی مجال نہ تھی کہ فرمان خلافت سے ذرا سرتابی کر سکے، ان سب چیزوں کا اثر یہ تھا کہ جو لوگ میدان جنگ میں شمشیر آزمائی کرتے تھے جب ہوا کا رخ پلٹتا تھا تو ان ہی کی زبانیں فاتحین کے لیے دعائیں کرتی تھیں، جنگ کے ختم ہونے کے بعد جنگ کی ہولناکیوں کا نام و نشان جنگ سے باہر نہیں نظر آتا تھا، اور ملک میں پہلے سے زیادہ خوشحالی اور آسودگی پیدا ہو جاتی تھی۔"

جو باتیں اوپر لکھی گئی ہیں وہ کچھ ایسی نئی نہیں وہ پہلے کبھی نہ لکھی گئی تھیں لیکن مولانا مرحوم نے ان کو اپنے قلم کی جس گرمی سے لکھا ہے وہی اس تحریر کی جان ہے، ان کو حضرت ابوبکرؓ سے جو والہانہ عقیدت تھی، اس کو والہانہ انداز ہی میں اپنی تحریر میں منتقل کر دیا ہے، اور جب وہ یہ لکھتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ لکھ نہیں رہے ہیں بلکہ بول رہے ہیں اور کانوں میں امرت گھول رہے ہیں:

"جو کام آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں تکمیل کو نہ پہونچا تھا، خلیفۂ اول کے ہاتھوں اس کی تکمیل ہوئی، پوری عرب قوم کو متحد کرنے کے علاوہ قرآن مجید کو جمع کرنا اور اس کو ضیاع سے بچا لینا بے شبہہ ایک پیغمبرانہ کارنامہ ہے جس کی وجہ سے خود اللہ تعالیٰ کا وعدہ اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ پورا ہوا قرآن جس پر اسلامی شریعت کی اساس قائم ہے، اس کو جمع کر کے ہمیشہ کے لیے محفوظ کر دینا، زکوٰۃ و صدقات کے احکام کی تبلیغ و اشاعت اور ان کی تفصیل و تشریح، جیش اسامہ کی روانگی مرتد اور باغیوں کی سرکوبی، مدعیان نبوت کا استیصال، ایران اور روم کی ان کے اسلام دشمن منصوبوں کی بنا پر گوشمالی، اسلام کی تبلیغ و اشاعت، قبائل عرب کا باہمی اتحاد و اتفاق، اسلام کا عربوں کے لیے قومی مذہب بن جانا، یہ سارے اہم کام جو کل سوا دو برس کی مدت میں حضرت ابوبکر صدیقؓ کے ہاتھوں انجام پذیر ہوئے ان سب کو سامنے رکھو اور بتاؤ کہ کیا ان سے صاف طور پر ثابت نہیں ہوتا کہ حضرت ابوبکرؓ پیغمبر نہیں تھے اور نہ ہو سکتے تھے، لیکن ان کے یہ تمام کارنامے پیغمبرانہ تھے چنانچہ حضرت ابوہریرہؓ نے ایک مرتبہ فرمایا: اگر ابوبکرؓ نہ ہوتے تو خدا کی عبادت نہ کی جاتی، گویا ثَانِيَ اثْنَيْنِ اِذْ هُمَا فِي الْغَارِ کہہ کر پیغمبر آخر الزماںؐ کے ساتھ جس کی جسمانی معیت و رفاقت پر مہر تصدیق ثبت کی تھی ازل میں اس کے لیے یہ سعادت بھی مقدر کر دی گئی تھی کہ جسمانی رفاقت کے ساتھ معنوی اشتراک عمل اور باطنی رفاقت کا بھی اس سے مظاہرہ ہو۔" (صدیق اکبرؓ، شائع کردہ ندوۃ المصنفین دہلی ص ۸، ۴ - ۴۷)

اس ایک پیراگراف میں حضرت ابوبکرؓ کے سارے کارنامے سامنے آجاتے ہیں مولانا نے جس بے ساختگی کے ساتھ ان کو قلمبند کیا ہے اس کی داد ان کو کیسے نہیں مل سکتی ہے، ان ہی ساری باتوں کا اطناب اس کتاب میں ملے گا، اردو میں حضرت ابوبکرؓ پر اتنی مفصل اور سیر حاصل کتاب پہلی دفعہ لوگوں کے ہاتھوں میں آئی، جس میں اس دور کے اہم دینی، سیاسی، فقہی اور تاریخی واقعات اور کوائف پر بڑی جامعیت کے ساتھ مفید مباحث بھی ہیں۔

ان کی یہ کتاب ان کے دستار علم کی ایک بہت ہی تابدار اور زریں کلغی ہے۔

مولانا سے جو عقیدت رہی اس کا تقاضا تو یہ تھا کہ ان کی تمام کتابوں پر کچھ نہ کچھ لکھ کر لطف اٹھاتا، مگر زیر نظر تحریر تو محض تعزیتی اور تاثراتی ہے، اس لیے اس میں اس کی گنجائش نہیں، اوپر کی کچھ باتیں غیر ارادی طور پر قلم سے نکل پڑی ہیں ان کے عام طرز تحریر کا جب تجزیہ کیا جائے گا تو یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ اس میں جہاں ادب و انشا کا جمال ہے، وہاں ان کے اسلوب میں عالمانہ وقار، منطقیانہ وزن اور ماہرانہ استدلال کی متانت بھی ہے، وہ عالم بھی تھے، انگریزی تعلیم یافتہ بھی تھے، اس لیے قدیم و جدید رنگ کی آمیزش سے ان کا قلم بعض اوقات اس مصور کا موئے قلم ہو جاتا جو مختلف رنگوں کے حسین امتزاج سے اپنے آرٹ کو دیدہ زیب اور جاذب نظر بنا دیتا ہے، ان کو قرآن مجید، احادیث اور فقہ کا ادراک و فہم حاصل تھا، اکابر اسلام سے بے پناہ عقیدت تھی، مسلمانوں کے ماضی کی عظمت کا احساس تھا، اس لیے ان کے قلم میں ایمانی حرارت بھی ہوتی، تب و تاب زندگی بھی، دعوت اصلاح بھی، درس عمل بھی، سلف صالحین کی قدروں کا احترام بھی اور موجودہ دور کی حریت فکر بھی، روشن ضمیری بھی، اور تھمے ہوئے جذبات کی لہریں بھی، ان اجزائے ترکیبی سے ان کی تحریریں جہاں کہیں بھی چھپی ہوئی دکھائی دیتیں ممکن نہ تھا کہ وہ پڑھی نہ جاتیں، اس طرح ان میں مقناطیسیت بھی تھی۔

راقم سے ان کے ملنے ملانے کی روداد بڑی طویل ہے، پہلی بار ان سے دہلی میں مولانا مفتی عتیق الرحمٰن کے یہاں ملاقات ہوئی، کلکتہ میں جب وہ مدرسۂ عالیہ کے پرنسپل ہوئے تو اس بنگلہ میں بھی حاضری دی جہاں ان سے پہلے بہت سے انگریز پرنسپل رہ چکے تھے، وہ علی گڑھ گئے تو جب جب وہاں گیا ان کے در دولت پر یا ان کے شعبہ میں جاکر ان سے ضرور ملا، ۱۹۶۳ء میں وہ دارالمصنفین کی طلائی جوبلی کے موقع پر اعظم گڈھ تشریف لائے، ۱۹۶۹ء میں یہاں علی گڑھ کے اسلامک اسٹڈیز کی ایک کانفرنس ہوئی، تو اس میں بھی شرکت کی، ۱۹۸۲ء میں اسلام اور مستشرقین پر یہاں جو سیمینار ہوا، تو اس موقع پر بھی آکر اس کی رونق بڑھائی، ایک بار اعظم گڈھ کے قصبہ بلریاگنج کے مدرسہ کے طلبائے قدیم کو مخاطب کرنے گئے، تو یہاں بھی تشریف لاکر ہم لوگوں کی عزت افزائی کی، وہ کہتے کہ اور لوگ تو دارالمصنفین پاؤں کے بل آتے ہیں، مگر وہ یہاں اپنی پلکوں کے بل آتے ہیں، اس برصغیر کی علمی کانفرنسوں میں تو برابر ملاقاتیں ہوتی رہیں، دارالعلوم ندوۃ العلماء کی مجلس انتظامیہ کے سالانہ جلسہ میں یا اس کی کسی اور تقریب میں لکھنؤ آتے تو یہ راقم بھی موجود ہوتا، ہم دونوں جب اور جہاں ملتے تو وہ دیکھتے ہی ایسی تواضع کرتے جو قلاقند سے زیادہ شیریں ہوتی، شاداں و فرحاں ہو کر گفتگو شروع کر دیتے، تو معلوم ہوتا کہ ان کی بذلہ سنجیوں کی سے ارغوانی

چھلک رہا ہے، اچھل رہا ہے، پیے ہوئے ہیں، پلا رہے ہیں

معارف کے کسی مضمون یا شذرات کا ذکر خیر کرنے لگتے تو کہتے کہ تم اپنی نثر میں شاعری کرتے ہو، میں عرض کرتا کہ کاش میں آپ کی طرح ملک الشعرائی کرتا، کبھی کہتے کہ تم جیسے جیسے بوڑھے ہو رہے ہو تمہاری تحریر جوان ہوتی جا رہی ہے، میں جواب دیتا کہ لکھتے وقت آپ کی عمر رفتہ کو آواز دیتا رہتا ہوں، کبھی کہتے کہ میری قدسیاں تمہاری تحریر کو میری تحریر سے زیادہ پسند کرتی ہیں، میں کہتا اس لیے کہ آپ نے اپنے پُرتکلف دسترخوان پر ان کو اپنے یہاں کے مرغ مسلم کو دال برابر سمجھنے کی تربیت دی ہے

پھر کہتے کہ کیا یہ تصور کرنا صحیح نہیں کہ ہم دونوں کو عالم کے دربار عام میں بقائے دوام حاصل ہوگی، بہرحال کہ تاکہ اس میں تو آپ کے لیے آپ کی ولادت باسعادت سے پہلے ہی جگہ متعین کر دی گئی ہے۔ میری زندگی میں بہت سی محرومیاں رہی ہیں، یہ محرومی بھی پہلے سے مقدر ہو چکی ہے، وہ اپنی اس قسم کی باتوں کو میری تصانیف پر رسالۂ برہان میں تبصرہ کرتے وقت لکھ بھی جاتے۔

اب وہ نہیں ہیں تو ان کی تمام باتوں کو اپنی یادوں کے شیش محل میں فانوس فروزاں کی طرح بھار جگمگاتا ہوا دیکھتا رہوں گا۔

ان کو استاذی المحترم حضرت مولانا سید سلیمان ندویؒ سے بڑی گہری عقیدت رہی، وہ جب دارالعلوم دیوبند میں تعلیم پا رہے تھے تو ان کی خواہش تھی کہ دو تین سال ان کے زیر تربیت رہ کر اپنے تصنیف و تالیف کے ذوق کی تکمیل کریں، لیکن یہ ممکن نہ ہو سکا تو مراسلت کے ذریعے استفادہ کرتے رہے، ایک بار اپنی ایک نظم معارف میں چھپنے کے لیے ان کے پاس بھیجی تو انھوں نے اس کو واپس کرتے ہوئے یہ تحریر فرمایا کہ آپ اس نظم نویسی کے چکر میں کہاں پڑ گئے، آپ کے رتبہ سے گری ہوئی چیز ہے، کچھ محنت کیجیے، اور مقالہ نویسی پر توجہ کیجیے، قوم کو آپ سے اسی کی توقع ہو سکتی ہے، اور یہی ہونی چاہیے، اس تحریر کا اثر ان کے ذہن پر گہرا پڑا، اور انھوں نے اس کے جواب میں یہ شعر لکھ بھیجا ؎

کون ہوں، کیا ہوں، کہاں ہوں، سب حقیقت کھل گئی ٭ تو نے وہ ٹھوکر لگائی چشم علت کھل گئی

وہ حضرت سید صاحبؒ کے اعلیٰ رتبہ اور بلند پایہ کے بڑے قائل تھے، اور جب ان کی وفات کے بعد معارف کا سلیمان نمبر نکلا تو اس کے لیے بڑی دلسوزی کے ساتھ ایک بہت ہی عمدہ مضمون لکھا جس کی ابتداء انھوں نے اس طرح کی ہے:

"مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی نسبت یہ کہنا کہ وہ ایک بہت بڑے محقق، نامور مصنف، بلند پایہ عالم اور صاحب طرز انشاء پرداز تھے، ایک عام اور معمولی پیرایۂ بیان ہے جس سے مولانا

اصل مقام اور رتبہ متعین نہیں ہوتا، اور نہ ان کا صحیح حق ادا ہوتا ہے، حقیقت یہ ہے کہ بیسویں صدی میں ہندوستان کی اسلامی سوسائٹی کے ذہن و فکر اور یہاں کے تعلیم یافتہ طبقہ میں خواہ وہ طرز قدیم کا ہو یا طرز جدید کا، نصف صدی کے اندر مذاق تصنیف و تالیف، طریق فکر و استدلال اور تہذیبی احوال و عوامل کے اعتبار سے جو عظیم الشان انقلاب ہوا ہے، مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی شخصیت اور ان کے علمی و عملی کارناموں کو اس میں بڑا دخل ہے۔"

مولانا کی اس تحریر کی روشنی میں حضرت سید صاحبؒ پر بڑا کام کیا جا سکتا ہے، ان کو دارالمصنفین سے جو لگاؤ رہا اس کا اظہار اپنی ایک تحریر میں اس طرح کیا ہے:

"دارالمصنفین اعظم گڈھ، برصغیر ہند و پاک کا ایک مشہور اور نہایت وقیع ادارہ ہے، جو گذشتہ نصف صدی سے اردو زبان میں اسلامی علوم و فنون کی اہم خدمات انجام دے رہا ہے، اس ادارہ نے سیرت، اسلامی تاریخ، شعر و ادب، فلسفہ و تصوف اور تذکرہ و تراجم پر جو کتابیں شائع کی ہیں، وہ مواد، ترتیب اور زبان و معانی کے لحاظ سے کسی بھی زبان کے ادب کے لیے سرمایۂ فخر ہو سکتی ہیں، آج ہند و پاک میں اسلامی علوم و فنون پر ریسرچ اور تحقیق کا جو سنجیدہ ذوق پایا جاتا ہے، کوئی شبہ نہیں کہ اس کی آبیاری میں اور چیزوں کے ساتھ اس ادارہ کی کوششوں کا بھی بڑا دخل ہے، اس ادارہ نے خود کام کیا اور دوسروں کو کام کرنے کی راہ دکھائی اور اس کا ہی یہ نتیجہ ہے کہ آج اردو زبان میں اسلامیات پر ایسا قیمتی اور وسیع لٹریچر پیدا ہو گیا ہے کہ آپ کسی اسلامی موضوع پر ریسرچ اردو زبان کے جانے بغیر مکمل ہی نہیں ہو سکتی۔" (برہان، اکتوبر ۱۹۶۴ء)

پھر اس گہرے لگاؤ کی وجہ سے اس کے ہر فرد سے بڑی محبت کرتے تھے، جناب شاہ معین الدین احمد ندوی سابق ناظم دارالمصنفین کی وفات ہوئی تو بہت ہی دلگیر ہو کر لکھا:

"ان کی وفات کی خبر اچانک سنی تو قلب و دماغ پر بجلی گر پڑی، شاہ صاحب ندوۃ العلماء کے

مگر یہ سب یہ نہایت پختہ قلم مصنف، تاریخ اسلام کے وسیع النظر محقق اور دونوں زبانوں کے ادیب،
اور سو باتوں کی ایک بات یہ کہ مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ کے صحیح جانشین اور ان کے قائم مقام
تھے، اور اس میں شک نہیں کہ تقسیم ہند کے بعد آج تک انھوں نے دار المصنفین کے علمی وقار اور مرتبہ کو قائم رکھا،
اور ملک کے نہایت سخت طوفانی دور میں بھی اس باغیچۂ علم و ادب کی جس طرح حفاظت کی اور دل و جان سے اس کی
آبیاری کی وہ ان کی تنہا فضل و کمال کا کافی ثبوت ہے، علم و فضل اور تحقیق و تصنیف کے علاوہ وہ اخلاق و عادات
اور کردار و عمل کے اعتبار سے بھی وہ سلف صالحین کا نمونہ تھے، نہایت مخلص، بے لوث، عابد، زاہد، خندہ جبین،
شگفتہ طبع، ملنسار، متواضع اور مرنجاں مرنج تھے۔" (برہان، جنوری ۱۹۷۵ء)

ان کے دل میں حضرت سید صاحبؒ، دار المصنفین، اور یہاں کے لوگوں کے لیے جو انتہائی نرم گوشہ تھا اس کے
بعد ان کی ذات گرامی کی طرف کیوں نہ کشش ہوتی، وہ محبوب بھی تھے اور حبیب بھی، دلبر بھی، اور دلربا بھی تھے

تصور چاہیے رونے میں ان کے روئے خنداں کا

جب میری کوئی کتاب شائع ہوتی تو اس کو اصرار کر کے ضرور منگواتے اور رسالہ برہان میں اس پر تبصرہ
کرتے، میری حقیر تصانیف بزم تیموریہ، بزم صوفیہ، ہندوستان کے عہد وسطیٰ میں فوجی نظام، ہندوستان کے مسلمان
حکمرانوں کے عہد کے تمدنی جلوے، غالب مدح و قدح کی روشنی میں، اور صوفی امیر خسرو پر اس رسالہ میں جو کچھ لکھ دیا
ہے اس سے ان کے وزن اور اہمیت میں ضرور اضافہ ہو گیا ہے، لیکن بعض اوقات ایسی باتیں لکھ جاتے جن کا مستحق
اپنے کو نہ سمجھتا، مثلاً میری کتاب ہندوستان کے عہد وسطیٰ کے فوجی نظام پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا کہ :

"اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اردو تو اردو کسی زبان میں بھی اس خاص موضوع پر اس قدر عظیم مواد اور
وہ بھی اس ترتیب کے ساتھ کہیں یکجا نہ ملے گا، مولانا سید سلیمان ندویؒ کی کتاب عرب و ہند کے تعلقات
کے بعد اس پایہ کی دوسری کتاب ہے، جو تاریخ ہند کے ایک بالکل نئے موضوع پر اردو میں پہلی مرتبہ
شائع ہوئی ہے اور جس نے اردو لٹریچر کو چار چاند لگا دیے ہیں۔" (رسالہ برہان، دسمبر ۱۹۶۰ء ص ۳۳۰)

اس کو پڑھ کر اس حیثیت سے انقباض کی کیفیت پیدا ہوئی کہ میری اس کتاب کا ذکر حضرت الاستاذ کی بے مثال تصنیف کے ساتھ نہ کیا جاتا، اس کے بعد مولانا سے فوراً ہی ملاقات ہوئی تو میں نے ان سے احتجاجاً کہا کہ خاک کو عالم پاک سے کیا نسبت جو آپ نے یہ لکھ دیا ہے، کہنے لگے کہ ان پر جو اثر ہوا وہ لکھ دیا ہے، لیکن اپنے متعلق ان کی ایسی تحریروں سے کوئی غلط فہمی یا خوش فہمی کبھی پیدا نہیں ہوئی، البتہ ان کی کریم النفسی اور قلبی فیاضی کے بارے دبا رہا۔

نومبر ۱۹۸۴ء میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کی طرف سے حضرت سید صاحبؒ پر ایک سیمینار تھا، جس نشست میں مجھ کو اپنا مقالہ پڑھنا تھا اس کی صدارت مولانا ہی نے کی، اپنی صدارتی تقریر میں میرے مقالہ پر اپنی محبت میں بہت کچھ کہہ رہے تھے کہ یکایک رک گئے، پھر ہنسے اور ہنس کر اپنی تقریر کا رخ دوسری طرف موڑ دیا، جیسے کوئی خاص بات ان کی نوک زبان پر آگئی تھی، وہ کہنا چاہتے تھے لیکن کہہ نہ سکے، جلسہ ختم ہوا تو تنہائی میں مجھ سے کہا کہ تمہارے متعلق ایک دلچسپ جملہ زبان پر آگیا تھا لیکن کہنا مناسب نہیں سمجھا، پوچھا وہ کون سا جملہ تھا؟ برملا کہہ دیا، وہ بھی ہنسے مجھ کو بھی ہنسی آگئی، لیکن میں نے اپنی بے تکلفی میں ان سے عرض کیا کہ وہ یہ کہہ دیتے تو میں اسی وقت صدارت کی کرسی کے پاس پہونچ کر گریبان گیر ہونے کی جرأت تو نہ کرتا لیکن دامن گیر ضرور ہو جاتا۔

اس کے دوسرے دن اپنے گھر پر مدعو کیا، علی گڑھ میں ایک بہت ہی آرام دہ بنگلہ بنا لیا تھا، جس کو اپنی خوش سلیقگی سے سجائے رکھتے تھے، وہ بڑی اچھی رہائش کے عادی رہے، اپنے خورد و نوش کا بھی بڑا اہتمام کرتے، کھانے پر مدعو کرتے تو ان کے دسترخوان کی آرائش دیکھنے کے لائق ہوتی، ان کا بس چلتا تو کھانے کے تمام اقسام سے اس کو سجا دیتے، بہت عمدہ باورچی اپنے یہاں ملازم رکھتے، ان کی دعوت قبول کرنے میں ہچکچاتا، ان کے ساتھ دسترخوان پر بیٹھ کر اپنے کام و دہن کی لذت کی تسکین تو خوب ہو جاتی، لیکن ان کو اس کے لیے جھمیلوں کا جو سامنا کرنا پڑتا اس کو

سبب کر ترود ہوتا، مگر ان کی زندگی کی ایک بڑی لذت یہی تھی کہ وہ اپنے دوستوں کے ساتھ دسترخوان پر بیٹھ کر اچھا وقت گذاریں۔

یہ میری ان سے آخری ملاقات تھی، اس موقع پر ان کی باتوں میں پہلے جیسی شگفتگی اور رعنائی نہ تھی، کچھ عرصہ پہلے ان کی رفیقۂ حیات کی رحلت ہوگئی تھی، ان کی دائمی جدائی پر برہان کے نظرات میں جو اپنے غم ناک جذبات ظاہر کیے تھے وہ سوگوارانہ رومانی ادب کا ایک شہ پارہ ہے، ان کے بڑے لڑکے کی وفات بھی ہوگئی تھی، ان کے ہمدم اور غم گسار مفتی عتیق الرحمٰن بھی حال ہی میں ان سے جدا ہوگئے تھے، پھر وہ یکایک یرقان میں مبتلا ہوگئے، ایک کتے نے بھی ان کو کاٹ لیا تھا، ان امراض سے وہ جان بر تو ہوگئے تھے، لیکن صحت گر رہی تھی، اپنی ایک لڑکی کی پریشانیوں سے بھی پریشان تھے، مگر دلگیر اور دل فگار ہونے کے باوجود اپنی خوش طبعی کا کچھ نہ کچھ اظہار کرتے رہے، ان کی دو نواسیاں یونیورسٹی میں تعلیم پا رہی تھیں، وہ وہاں سے واپس آئیں تو ان کو دیکھتے ہی پکارا کہ آؤ! معارف کے شذرات یہاں بیٹھے ہیں ان سے مل لو، ان سب کے ساتھ میں بھی ہنس پڑا۔

کچھ دنوں کے بعد خبر ملی کہ وہ اپنے علاج کے لیے پاکستان چلے گئے ہیں، ان کی خیریت ان کے داماد ڈاکٹر محمد اسلم شعبۂ تاریخ پنجاب یونیورسٹی لاہور سے معلوم کرتا رہا، ۲۴ مئی ۱۹۸۵ء کو یکایک ریڈیو سے سننے میں آیا کہ وہ اللہ کو پیارے ہوگئے،

اس خبر کو سنتے ہی آنکھوں کے سامنے فلمی پردہ کی طرح وہ آتے جاتے رہے، وہ آرہے ہیں، وہ جا رہے ہیں، قدم قدم پر نئے نئے گل کھلا رہے ہیں، سیمینار میں بول رہے ہیں، کانفرنس میں مقالہ پڑھ رہے ہیں، اپنے دسترخوان پر طرح طرح کی چیزیں کھلا رہے ہیں، آہ! ان کی ملاقاتیں کیسی پرکیف ہوتیں، ان میں گلاب کی پنکھڑیوں کی طرح رنگینی اور عطر مجموعہ کی طرح شامہ نوازی ہوتی، ان کے قہقہے، چہچہے، برجستہ اشعار، علمی نکات، ادبی مطائبات اور دلچسپ مذاکرے اب کہاں سننے میں آئیں گے،

ان کے ساتھ جو ساعتیں گذریں اب وہ کسی اور جگہ کہاں میسر ہوں گی، مگر اب ان کی یادوں کی جو تربت میرے دل میں بن گئی ہے، اس کے لوح تعویذ پر ان کی ساری باتیں کندہ ضرور نظر آئیں گی۔

آہ! ان کے بربط ہستی کا سرود اب خاموش ہے، علم کا ایک طائر ملکوتی عالم بقا کی فضائے بسیط میں پرواز کر گیا، اس برصغیر کا علمی حلقہ ایک باوقار اہل علم، ایک شگفتہ قلم اور ایک باوزن انداز بیان سے محروم ہو گیا، معاشرہ سے ایک خاص آب و رنگ کی شخصیت کی دلآویزی اور رعنائی چھین لی گئی، ان کے دوستوں کی بزم سے ان کے تفردات کی شیوہ بیانی اور شیریں گفتاری ختم ہو گئی، ان کے ہم جلیسوں پر ان کی تربت کا جو نشاط تھا وہ جاتا رہا، ان کی جبیں پر ان کی شگفتگی جو رہتی تھی، وہ اب ان کے ملنے والے کہاں دیکھیں گے، سلام علیك ورحمته الی یوم التلاق۔

اے ذوالجلال والاکرام! ان کی علمی خدمات کی بدولت جس سے انھوں نے بعض اسلامی روایات کو سربلند کرنے کی کوشش کی، ان کے ان دینی جذبات کی خاطر جن سے وہ کبھی بے حد مضطرب اور بے چین رہے، ان کی بے نفسی اور پاک طینتی کے بدلے میں جن سے وہ اپنے معاصروں میں مقبول رہے ان کو اپنی عاطفت کے سایے میں لے کر وہی جگہ عطا فرما جہاں تیری بے پناہ رحمت کا لازوال نور تاباں اور درخشاں رہتا ہے۔ آمین ثم آمین۔

بزم رفتگان

یہ مصنف کے بعض بزرگوں، دوستوں، عزیزوں، معاصر دانشوروں، ادیبوں، مصنفوں، شاعروں اور سیاسی و قومی رہنماؤں کی وفات پر تاثراتی مضامین کا مجموعہ ہے، اس کے دو حصے ہیں، حصۂ اول مطبوعہ مکتبہ جامعہ ملیہ قیمت سترہ روپئے، حصۂ دوم مطبوعہ معارف پریس، قیمت سترہ روپئے، از سید صباح الدین عبدالرحمٰن

"منیجر"

"معارف" کی ڈاک

مرادآباد ۲۲ر جون ۱۹۹۶ء

محترمی! السلام علیکم

حضرت اقدس مولانا سید شاہ امان اللہ صاحبؒ پر جون کے معارف میں آپ کی درد و محبت بھری تحریر پڑھ کر جی چاہا کہ بندہ بھی حضرت کے تعلق کی کہانی تحریر کردے، اب سے ۵۰ سال قبل خواجہ حسن نظامی دہلویؒ نے منادی اخبار کے اپنے روزنامچہ میں پھلواری شریف کی حاضری کا حال تحریر کیا تھا کہ اس خانقاہ کے شیخ خانقاہ میں معتکف رہتے ہیں، صرف نماز اور مزارات پر حاضری دیتے ہیں، حج یا جہاد کے لیے صرف باہر سفر کی اجازت ہے، جس حجرے میں قیام رہتا ہے اس میں ایک تختہ داہنی طرف رکھا ہوا ہے جس پر وفات کے بعد ہر شیخ کو غسل دیا جاتا رہا ہے، حجرہ کے ساتھ ہی لگا ہوا چھوٹا سا حجرہ ہے جس میں غسل دیا جاتا ہے، ہر شیخ کا تکیہ ان کی وفات کے بعد حجرہ میں جہاں شیخ تشریف فرما رہتے ہیں ان کی پشت کی طرف وہ تکیے سب جمع ہوتے ہیں، اسے پڑھ کر پھلواری شریف حاضری کا شوق پیدا ہوا، جب تبلیغی کاموں کے سلسلہ میں بہار جانا ہوا تو پھلواری شریف حاضر ہوا، اس وقت حضرت شاہ امان اللہ صاحبؒ گدی نشین ہوگئے تھے، پہلی حاضری کے بعد سلسلۂ تعلق ایسا قائم ہوا کہ بندہ کئی بار حاضر ہوا، حجاز پاک میں بھی حضرت کے ساتھ رہا، خط و کتابت بھی ہوتی رہی، خطوط اگر آپ معارف میں دینا چاہیں تو ارسال کردوں گا، جب بھی حاضری ہوئی ملت کے حالات و مسائل پر خوب تفصیلی باتیں ہوتی رہیں، حضرتؒ کے مزاج میں حد درجہ سادگی، دردمندی اور ملت کی غمخواری چھائی ہوئی تھی، ایک دفعہ بندہ نے عرض کیا حضرت بعض جگہ کے حضرات تبلیغی جماعتوں کو اپنی مسجد سے نکال دیتے ہیں

بڑی غم آمیز کیفیت سے فرمایا خود تو کچھ کرتے نہیں اور جو کر رہے ہیں انھیں کرنے بھی نہیں دیتے، مطالعہ بہت وسیع تھا، جب بھی حاضری ہوئی کسی کتاب کا ذکر نکلا تو حضرت نے یہی فرمایا کہ میں نے اس کا مطالعہ کر لیا، حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی صاحب کی شاید ہی کوئی کتاب ہو جو شاہ صاحبؒ کے مطالعہ میں نہ آئی ہو، موصوف کتاب کے مسودہ کا مطالعہ فرمایا تھا، اس پر تحریر کیا تھا کہ تمھاری والدہ صاحبہ کے حالات بہت خوب ہیں، امریکہ بغرض علاج تشریف لے جاتے ہوئے بھی والانامہ تحریر فرمایا تھا کہ دعائیں کی جائیں ایک دفعہ تو خصوصیت سے طلب فرمایا کہ مجھ سے عرصہ ہوا ملاقات نہیں ہوئی، اس لیے آنے کی کوشش کریں چنانچہ بندہ حاضر ہوا اور خوب مسائل حاضرہ پر باتیں ہوتی رہیں بتیا (چمپارن) کے تبلیغی اجتماع سے واپسی پر حضرت مولانا انعام الحسن صاحب امیر تبلیغ بھی پھلواری شریف تشریف لے گئے تھے، حضرت شاہ صاحب سے خوب ملاقات رہی کھانا بھی خانقاہ میں نوش فرمایا، اس روز حضرت مولانا نے فرمایا تھا کہ جی چاہتا ہے آج خانقاہ ہی میں رہے، مگر اس روز کئی جگہ کا پروگرام قبل سے بن گیا تھا۔

اب امارت شرعیہ کی کہانی سنیے، حضرت مولانا ابوالکلام آزادؒ کے مشورہ سے حضرت مولانا ابوالمحاسن سجاد صاحبؒ نے جب بہار میں امارت کا نظام قائم فرمایا تو امیر شریعت کے منصب کے لیے مولانا محمد علیؒ مونگیری بانی ندوہ سے درخواست کی گئی، حضرت مونگیریؒ نے حضرت مولانا سید شاہ بدرالدینؒ کا نام تجویز کیا حضرت کی وفات کے بعد ان کے صاحبزادے سید شاہ محی الدین صاحبؒ امیر بنائے گئے، ان کی وفات کے بعد ان کے چھوٹے بھائی سید شاہ قمرالدین صاحبؒ کو امیر بنایا گیا تھا، خانقاہ مجیبیہ نے تین امیر شریعت ملت بہار کو عطا فرمائے اور امارت کا مرکز بھی پھلواری شریف ہی میں قائم کیا گیا جو آج بھی ملت ہندیہ کی سب سے زیادہ عجیب وغریب اور گرانی نعمت ہے۔

حضرت سید شاہ بدرالدین صاحبؒ نے اپنے بزرگوں کی وصیت کے مطابق تحریک خلافت کے دور میں سفر بھی فرمائے دعوت جہاد کے جذبے اور تقاضے۔

حضرت سید الملت کا ذکر خیر جب بھی حضرت شاہ صاحبؒ کے یہاں ہوا تو وہ اسی کیفیت کے ساتھ ہوتا تھا جیسے اپنے گھر کے بزرگوں کا ہوتا ہے۔

دیوبندی بریلوی کے المناک افتراق میں جس طرح ملت ہندیہ مبتلا ہے اس کی صحیح رہبری کا روشن مینارہ خانقاہ مجیبی ہے آج بھی حضرت سید شاہ عون احمد صاحب جمعیۃ علماء ہند کی مرکزی کمیٹی کے رکن رکین ہیں ملت ہندیہ کے اکابر میں سے جو بھی جب کبھی خانقاہ مجیبی تشریف لے گئے، وہاں سے خوب متاثر ہوئے اور محبت کی خوشبو لیکر آئے، خانقاہ کے شیخ حاضر ہونے والے مہمانوں کی مدارات خوشبو سے بھرے ہوئے عطر سے کرتے ہیں۔

خانقاہ کی عمارت اور اس کا سارا ماحول دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جب خانقاہ کی تعمیر کی گئی ہوگی ایسی حالت میں قائم ہے کوئی تغیر کوئی اضافہ اس میں نہیں کیا گیا، وہ اپنی قدیم دلآویزی کو خوب ظاہر کر رہی ہے، خدا کرے صاحبزادے مولانا رضوان اللہ صاحب سلمہٗ اپنے بزرگوں کے نقش قدم پر چلیں،

حضرت شاہ صاحبؒ کے یہاں مدرسہ صولتیہ مکہ معظمہ، دارالعلوم ندوہ، دارالمصنفین، امارت شرعیہ کا ذکر اپنے عزیزوں کی طرح ہوتا تھا۔

والسلام افتخار فریدی

کلکتہ ۳۰ رجون ۱۹۸۶ء

محترمی! السلام علیکم! کلکتہ ہائی کورٹ میں کلام مجید کے خلاف جو درخواست پڑی تھی اس پر آپ کے شذرات بہت ہی عمدہ اور طاقتور ہیں آپ نے مسلمانوں کے جذبات کی صحیح ترجمانی کی ہے، اس مقدمہ کی پیروی مغربی بنگال کی حکومت کی طرف سے میں نے سینیر گورنمنٹ ایڈووکیٹ کی حیثیت سے مغربی بنگال کے ایڈووکیٹ جنرل مسٹر ایس. کے. اچاریہ کے ساتھ کی، حکومت کی طرف سے سارے کاغذات میں نے ہی تیار کیے۔

کلکتہ ہائی کورٹ میں اسی قرآن کے مقدمہ کے سلسلہ میں ایک اور مقدمہ پیش ہوا، ۱۰ رجون ۱۹۸۶ء کو چندمل چوپڑا نے ایک درخواست اسی کورٹ میں پھر دی کہ اس کے اس مقدمہ پر نظر ثانی کی جائے جس کا فیصلہ ۱۷ مئی کو دیا گیا ہے، اسی روز مغربی بنگال کے ایڈووکیٹ جنرل کا ایک سفر انگلستان کا تھا، مجھ کو تنہا مغربی بنگال کی حکومت کی طرف سے اس مقدمہ کی پیروی کرنی پڑی، اس دوسری درخواست پر ۲۱ رجون کو فیصلہ دیکر اسکو نامنظور کر دیا گیا، اب خبر ہے کہ چندمل چوپڑا کی طرف سے کچھ روز میں ایک اور درخواست پڑے گی، یہ معاملہ یقیناً سپریم کورٹ تک جائیگا۔

آپ کا خواجہ محمد یوسف

مطبوعات جدیدہ

نورستان: از جناب حکیم محمد سعید صاحب، تقطیع کلاں، کاغذ، کتابت و طباعت نہایت عمدہ

صفحات ۳۴۴، مجلد مع حسین گرد پوش، قیمت اعلا ایڈیشن ۱۵۰ روپیے، عام ایڈیشن ۵۰ روپیے

پتہ:۔ ہمدرد فاؤنڈیشن پریس، ہمدرد سینٹر ناظم آباد، کراچی ۱۸۔

جسمانی امراض کے ماہر اور حاذق طبیب کی حیثیت سے حکیم حافظ محمد سعید کی شہرت تعارف سے مستغنی ہے، اس کتاب سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ روحانی امراض کے طبیب اور ملک و قوم کے مسیحا بھی ہیں، جو اپنی بیمار قوم و ملت اور مریض ملک و وطن کے لیے سخت فکرمند اور بے چین ہیں، چنانچہ انھوں نے اس میں قوم و ملک کی صحت و توانائی اور فلاح و بہبود کے لیے وہی پرانا نسخہ تجویز کیا ہے جس نے دورِ جاہلیت کے شرک و بت پرستی اور ظلمت و جہالت کا خاتمہ کر دیا تھا، ان کے خیال میں اس دور کے تمام مسائل کا حل بھی قرآن و سنت ہی سے ہو سکتا ہے، یہ کتاب حکیم صاحب کی نشری تقریروں کا مجموعہ ہے، جس کو مناسب ترتیب دے کر بہت قرینہ سے شایع کیا گیا ہے، اس میں وہ سب مفید اور ضروری باتیں بہت اچھے پیرایے اور دلکش انداز میں تحریر کی گئی ہیں، جو ملک و قوم کی روحانی، اخلاقی اور مادی ترقی کی ضامن ہیں، پہلے ایمانیات کے ضمن میں عقیدۂ توحید و آخرت، قرآن مجید اور رسالت محمدیؐ کا ذکر ہے، پھر عبد و معبود کے تعلق اور اللہ کے بندوں پر حقوق کا تذکرہ ہے، اس کے بعد رمضان المبارک کی اہمیت و خصوصیت اور قرآن مجید سے اس کی مناسبت بتائی گئی ہے، ایک حصہ میں علم و حکمت کی فضیلت کا

بیان ہے، پانچویں حصہ میں نفس و عمل کے تزکیہ، نیت و عمل کے اخلاص اور عمل کے محاسبہ پر بحث کی ہے، چھٹے عنوان کے تحت اسلامی تہذیب کے بنیادی عناصر بتائے ہیں اور اتحادِ امت، تعاون علی الخیر، امن، حریت، فلاحی ریاست کے تصور، انفاق فی سبیل اللہ اور اسلام کے نظامِ تعزیرات پر گفتگو کی ہے، ساتویں حصہ میں اسلام میں اجتماعیت کی اہمیت، معاشرتی آداب، لباس اور حقوق العباد کے متعلق اسلامی تعلیم و ہدایت پیش کی ہے، اور زکوٰۃ کی معاشرتی و معاشی حیثیت واضح کی ہے، ایک حصہ میں اخلاق کی اہمیت کے علاوہ بعض فضائل اخلاق کو بڑے موثر انداز میں پیش کیا گیا ہے، اس کے بعد کے حصہ میں سماجی برائیوں اور رذائل اخلاق کا تذکرہ ہے، ایک حصہ مردِ مومن کے کردار اور خصوصیات کے لیے مخصوص ہے، آخر میں جسمانی صحت و تندرستی کی اہمیت کا ذکر ہے، اس سلسلہ میں بتایا ہے کہ صفائی اور پاکیزگی کی اسلامی تعلیم کا مقصد حفظانِ صحت بھی ہے۔

ریڈیائی تقریریں مختصر ہوتی ہیں، تاہم مصنف نے ہر موضوع سے متعلق اہم، ضروری اور مفید باتیں قلمبند کر دی ہیں، انھوں نے عام فائدہ اور تمام افرادِ ملت تک اپنی بات پہونچانے کی غرض سے زبان اور پیشکش کا دلچسپ اور آسان انداز اختیار کیا ہے، اور کہیں کوئی ایسی بات نہیں تحریر کی ہے جس میں کوئی ایچ پیچ ہو یا وہ عام لوگوں کی فہم سے بالاتر ہو، پوری کتاب سے حکیم صاحب کے دین و مذہب، قوم و ملت اور ملک و وطن سے پُرخلوص ہمدردی اور خیر خواہی کا پتہ چلتا ہے، کاش ان کی قوم ان کی اس دردمندانہ پکار پر لبیک کہہ کر اپنی اصلاح و ترقی کی طرف مائل ہو، یہ کتاب واقعی اسم با مسمّٰی ہے، اس کو پڑھ کر امت مسلمہ اس وقت جس ظلمت و تاریکی میں گھری ہوئی ہے، اس سے نکل کر روشنی اور اجالے میں آ سکتی ہے، کتاب معنوی کی طرح صوری حیثیت سے بھی حکیم صاحب کی خوش مذاقی کی آئینہ دار ہے۔

"ض"

حیات سلیمان

یعنی جانشین شبلی مولانا سید سلیمان ندوی کی سادہ سوانح عمری ہی نہیں ہے بلکہ ان کے گوناگوں مذہبی، علمی، قومی، ملی، سیاسی حالات اور کارناموں کا ایک دلآویز مرقع ہے جس میں سید صاحبؒ کے دور کی نصف صدی کی ملی وقومی سیاسی وعلمی، ادبی ولسانی تحریکوں مثلاً ہنگامۂ مسجد کانپور، تحریک خلافت تحریک ترک موالات، جنگ آزادی، مسئلۂ ملوکیت حجاز وغیرہ کی تفصیل بھی ضمناً آگئی ہے، اسی کے ساتھ دارالمصنفین جو سید صاحبؒ کی زندگی کا سب سے بڑا کارنامہ ہے اس کی تاسیس، سال بہ سال اس کی ترقی کی روداد کے ساتھ ان کے قیام بھوپال، سفر پاکستان، قیام پاکستان کے دوران کی علمی خدمات کا تذکرہ اور پھر مختلف وفود کے رکن وصدر کی حیثیت سے سفر یورپ، سفر حجاز، سفر افغانستان وغیرہ کی مفصل روداد بھی سید صاحبؒ کے خطوط اور تحریروں کی روشنی میں قلمبند ہوگئی ہے، یہ کتاب اپنے اسلوب وطرز انشاء کے لحاظ سے بالکل حیات شبلی کا مثنیٰ ہے، ویسی ہی دلکش، دلچسپ اور دلنشین۔

مولفہ مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی قیمت ۳۲ روپیے

سلوک سلیمانی

مولانا سید سلیمان ندویؒ کے عزیز ترین پاکستانی مسترشد مولانا سید سلیمان اشرف خان صاحب سلیمانی صدر شعبۂ عربی پشاور یونیورسٹی نے "سلوک سلیمانی پر ایک اجمالی نظر" کے عنوان سے ایک طویل مقالہ لکھا تھا جو معارف میں ستمبر ۱۹۵۵ء سے جنوری ۱۹۵۶ء تک مسلسل نکلتا رہا، یہ علمی حلقوں میں بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھا گیا، اسی مضمون کو مزید اضافوں کے ساتھ مولانا اشرف صاحب نے کتابی صورت میں سلوک سلیمانی کے نام سے دو جلدوں میں شائع کیا ہے، اس میں حضرت سید صاحبؒ کی سلوک ومعرفت سے متعلق تعلیمات کو مرتب کی توضیحات وتعبیرات کی روشنی میں پیش کیا گیا ہے، ان دونوں جلدوں کو افادۂ عام کی خاطر دارالمصنفین نے بھی چھاپ کر شائع کیا ہے۔

قیمت جلد اول ۳۰ روپیے　　　قیمت جلد دوم ۲۵ روپیے

مصنفات مولانا سید سلیمان ندوی

۱۔ سیرۃ النبی ... ات، وآپ پر عام ... اور قرآن مجید کی روشنی میں مفصل بحث قیمت ۴۴/-

۲۔ سیرۃ النبی جلد چہارم: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیغمبرانہ فرائض۔ 〃 ۴۸

۳۔ سیرۃ النبی جلد پنجم: فرائض خمسہ نماز، زکوٰۃ، روزہ، حج، جہاد پر سیر حاصل بحث۔ 〃 ۲۲

۴۔ سیرۃ النبی جلد ششم: اسلامی تعلیمات، فضائل ورذائل اور اسلامی آداب کی تفصیل۔ 〃 ۴۸

۵۔ سیرۃ النبی جلد ہفتم: معاملات پر مشتمل متفرق مضامین ومباحث کا مجموعہ۔ 〃 ۱۷

۶۔ رحمت عالمؐ: مدرسوں اور اسکولوں کے چھوٹے بچوں کے لیے سیرت پر ایک مختصر اور جامع رسالہ۔ ۵

۷۔ خطبات مدراس: سیرت پر آٹھ خطبات کا مجموعہ جو مسلمانان مدراس کے سامنے دیے گئے تھے۔ 〃 ۱۱

۸۔ سیرۃ عائشہؓ: حضرت عائشہ صدیقہؓ کے حالات ومناقب وفضائل۔ 〃 ۱۹

۹۔ حیات شبلیؒ: مولانا شبلیؒ کی بہت مفصل اور جامع سوانح عمری۔ 〃 ۴۸

۱۰۔ ارض القرآن ج۱: قرآن میں جن عرب اقوام وقبائل کا ذکر ہے ان کی اثری اور تاریخی تحقیق۔ 〃 ۱۸

۱۱۔ ارض القرآن ج۲: بنو ابراہیم کی تاریخ، قبل از اسلام عربوں کی تجارت اور مذاہب کا بیان۔ 〃 ۱۳

۱۲۔ خیام: خیام کے سوانح وحالات اور اس کے فلسفیانہ رسائل کا تعارف۔ 〃 ۳۴

۱۳۔ عربوں کی جہاز رانی: بمبئی کے خطبات کا مجموعہ۔ 〃 ۱۲

۱۴۔ عرب وہند کے تعلقات: ہندوستان اکیڈمی کے تاریخی خطبات (طبع دوم عکسی) 〃 ۴۰

۱۵۔ نقوش سلیمانی: سید صاحبؒ کے منتخب مضامین کا مجموعہ، جن کا انتخاب خود موصوف نے کیا تھا۔ 〃 ۳۴

۱۶۔ یاد رفتگاں: ہر شعبۂ زندگی کے مشاہیر کے انتقال پر سید صاحبؒ کے تاثرات۔ (طبع دوم عکسی زیر طبع) ....

۱۷۔ مقالات سلیمان اول: ہندوستان کی تاریخ کے مختلف پہلوؤں پر مضامین کا مجموعہ۔ 〃 ۲۶

۱۸۔ مقالات سلیمان دوم: تحقیقی اور علمی مضامین کا مجموعہ۔ 〃 ۳۳

۱۹۔ مقالات سلیمان سوم: مذہبی وقرآنی مضامین کا مجموعہ (بقیہ جلدیں زیر ترتیب ہیں) 〃 ۲۳

۲۰۔ برید فرنگ: سید صاحب کے یورپ کے خطوط کا مجموعہ۔

۲۱۔ دروس الادب حصہ اول ودوم: جو عربی کے ابتدائی طالب علموں کے لیے مرتب کیے گئے۔ 〃 ۲-۳

رجسٹرڈ نمبر اے۔ زیڈ۔ ایم۔ این۔ پی۔ ۱۲

اگست ۱۹۸۵ء

معارف

مجلس دار المصنفین کا ماہوار علمی رسالہ

مرتبہ

سید صباح الدین عبد الرحمن

قیمت تیس روپیے سالانہ

دفتر دار المصنفین اعظم گڈھ

(یوپی ۲۷۶۰۰۱)

ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کی مذہبی رواداری

تاریخ ہندوستان کا سلسلہ ابتک اٹھائیس کتابوں تک پہونچ چکا ہے، اس ضمن میں ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کی مذہبی رواداری کا بھی ایک سلسلہ شروع کیا گیا ہے، جس کی اب تک تین جلدیں شائع ہو چکی ہیں۔

جلد اوّل

اس میں مغل دور سے پہلے کے مسلمان حکمرانوں کی مذہبی رواداری، فراخ دلی اور وطن دوستی، رعایا پروری کے دلچسپ واقعات مستند ماخذوں کی مدد سے پیش کیے گئے ہیں، قیمت ۱۲ روپیے

جلد دوم

اس میں مغل فرماں روا بابر، ہمایوں، سوری خاندان کے فرماں روا شیر شاہ اور اسلام شاہ، پھر مغل شہنشاہ اکبر، جہانگیر اور شاہجہان کی مذہبی رواداری، فراخ دلی، وطن دوستی، رعایا پروری کے سبق آموز واقعات پیش کیے گئے ہیں، قیمت ۲۳ روپیے۔

جلد سوم

اس میں جدو ناتھ سرکار کی کتاب کا جواب خود اس کی کتاب کے حوالوں سے اس طرح پیش کیا گیا ہے کہ اورنگ زیب عالمگیر اور اسکے بعد کے مغل بادشاہوں کی مذہبی رواداری، فراخدلی، وطن دوستی اور رعایا پروری کی تفصیلات آگئی ہیں　مرتبہ سید صباح الدین عبدالرحمٰن۔ قیمت ۳۰ روپیے۔

جلد ۱۳۶ ماہ ذی قعدہ وذی الحجہ ۱۴۰۵ھ مطابق ماہ اگست ۱۹۸۵ء عدد ۲

مضامین

شذرات

سپریم کورٹ کے فاضل ججوں نے مسلمان مطلقہ عورت سے متعلق جو فیصلہ دیا ہے اس کا پورا متن جون ۱۹۸۵ء کے کریمنل جرنل میں شایع ہوا ہے، وہ پیش نظر ہے۔

اس فیصلہ کے دو۲ جزو ہیں، ایک میں مسلمان مطلقہ عورت کو اس کی دوسری شادی تک نان نفقہ کا حق دلایا گیا ہے، دوسرے میں مشترکہ سول کوڈ پر زور ہے، مطلقہ عورت کی ہمدردی میں جو فیصلہ ہے اس میں ایک فاضلانہ اور محققانہ علمی مقالہ کا رنگ پیدا ہوگیا ہے، لیکن اس پر اصحاب تحقیق اور ارباب نظر ہی اچھی طرح غور کرسکتے ہیں، بنیادی بات تو یہ ہے کہ اس قسم کے مذہبی معاملات میں ایڈورڈ ولیم لین، آرتھر آربری حتی کہ طیب جی اور ملا کی تحریروں کے حوالے مسلمانوں کے لیے قابل قبول نہیں ہوسکتے، سر ظفر اللہ کی رائے بھی مستند نہیں مانی جاسکتی جن کا مسلمان ہونا ہی متنازعہ فیہ بن گیا ہے، عبد اللہ یوسف علی اور مارما ڈیوک پکتھال کے ترجمے ضرور مستند ہیں، لیکن قرآن فہمی کا اصول یہ ہے کہ جب کسی آیت کے مفہوم میں دو۲ رائے پیدا ہوجانے کا احتمال ہو تو پھر ان مفسرین کی طرف رجوع کرنا ضروری ہے جو رجوع کرنے والوں کے مسلک کے ہوں۔

فاضل ججوں نے قرآن مجید کی اس آیت پر اپنا فیصلہ صادر کردیا ہے:

وَلِلْمُطَلَّقٰتِ مَتَاعٌۢ بِالْمَعْرُوْفِ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِيْنَ

(بقرہ: ۲۴۱)

اس کے مختلف ترجمے دے دیے گئے ہیں، اور کچھ تفسیریں بھی پیش کی گئی ہیں، ان میں آرتھر آربری کی تصریح بھی شامل ہے، جو مسلمانوں کے لیے قابل اعتنا نہیں۔

مسلم پرسنل لا بورڈ کے مستند علماء نے اس آیت کے جو معانی اور مطالب پیش کیے، ان کو فاضل ججوں نے رد کردیا، اس لیے کہ ان کے نزدیک یہ قابل قبول نہیں تھے، لیکن فیصلہ میں جن حوالوں کا سہارا لیا گیا، ان کو

مسلمانوں کا سواد اعظم غیرمستند قرار دے کر رد کر دے تو کیا یہ فاضل ججوں کے لیے قابل قبول ہوگا ؟

اس آیت میں متاع بالمعروف سے کیا مراد ہے، اور کلام مجید میں کس موقع اور کس کے لیے کہا گیا ہے، وہ غور طلب ہے، کلام مجید میں ہر قسم کی طلاق کے احکام کا ذکر کرنے کے بعد یہ آیت درج ہے، مولانا ابوالکلام آزاد بہت ہی روشن خیال اور فراخ دل مفسر قرآن سمجھے گئے ہیں، وہ اس آیت کا ترجمہ یہ کرتے ہیں کہ (یاد رکھو) جن عورتوں کو طلاق دے دی گئی ہو تو چاہیے کہ انھیں مناسب طریقہ سے فائدہ پہونچایا جائے، متقی انسانوں کے لیے ایسا کرنا لازمی ہے "۔ وہ اس کی یہ بھی تشریح کرتے ہیں کہ "یعنی ان کے ساتھ جس قدر حسن سلوک کیا جا سکتا ہے کیا جائے "۔ (ترجمان القرآن ج ۱ ص ۲۹۰) متاع بالمعروف سے مراد حسن سلوک ہے، نہ کہ نان نفقہ۔

فتاویٰ عالمگیری میں ہے کہ متاع کی تین قسمیں ہیں، واجب، مستحب، اور نہ واجب نہ مستحب، واجب ایسی مطلقہ کے لیے ہے جس سے خلوت صحیحہ نہیں ہوئی، اور نہ ہی مہر مقرر ہوا، اور مستحب اس مطلقہ کے لیے جس کو خلوت صحیحہ کے بعد طلاق دی گئی، اور نہ واجب اور نہ مستحب اس مطلقہ کے لیے ہے جس سے خلوت صحیحہ نہیں ہوئی، لیکن مہر مقرر تھا، متاع بالمعروف ہی کے سہارے فاضل ججوں نے اپنا فیصلہ صادر فرمایا ہے، لیکن کسی مفسر کے نزدیک متاع بالمعروف سے نان نفقہ مراد نہیں ہے، حسن سلوک کی تو توجیہ کی گئی ہے، مگر حسن سلوک کا درجہ فرض کا نہیں۔

فاضل ججوں نے احادیث کے بھی حوالے دیے ہیں، قرآن مجید اور احادیث مقدسہ کی تفسیر، تعبیر اور تشریح بڑی احتیاط اور ذمہ داری سے کی جاتی ہے، اسی لیے یہ حق صرف جید اور مستند علماء کو دیا گیا ہے، جو چیز نص قرآنی سے ثابت ہو، اس کے خلاف کوئی بات یا رائے یا فیصلہ مسلمانوں کے لیے قابل قبول نہیں، اس کے خلاف اسلامی حکومت کے قاضی القضاۃ کو بھی فیصلہ دینے کا حق نہیں، اسلامی حکومت بھی چاہے تو اس میں ترمیم نہیں کر سکتی، اجماع امت بھی اس کو نظر انداز نہیں کر سکتا، ہماری سیکولر حکومت کے دائرہ سے تو یہ دستوری، قانونی اور اخلاقی لحاظ سے بھی باہر کی چیز ہے۔

مسلمان مطلقہ عورت کی کفالت کی ذمہ داری اس کے بالغ بیٹوں پر عائد ہوتی ہے، اگر اس کے بیٹے بالغ نہ ہوں تو اس کے باپ اور بھائی اس کی کفالت کے ذمہ دار ہوتے ہیں، اور اگر وہ بالکل لاوارث ہو تو پھر اس کی کفالت کی ذمہ داری حکومت پر ہوجاتی ہے، بشرطیکہ اسلامی حکومت ہو، مسلمان عورتوں کی فلاح و بہبود سے متعلق قرآن پاک اور احادیث شریفہ میں ہر قسم کی ہدایتیں موجود ہیں، مسلمان اچھی طرح جانتے ہیں کہ ان کے کیا مدارج اور کیا حقوق ہیں، گذشتہ چودہ سو (۱۴۰۰) سال سے ان ہی ہدایتوں کی بدولت اس کشمکش گاہِ عالم میں مسلمانوں کے لیے یہ عورتیں مرکز لطف و محبت اور مایۂ سکون بنی ہوئی ہیں، اس میں کسی عدالتی فیصلہ اور مشترکہ سول کوڈ کے ذریعہ سے خلل نہ ڈالا جائے۔

ان صفحات میں بارہا کہا گیا ہے کہ قومی یکجہتی ملک کے لیے بے حد مفید ہے، ہر محب وطن اس کا قائل ہے، لیکن اس کو بروئے کار لانے کی مہم ایسی نہ بنادی جائے جس سے بیزاری، بے چینی اور بددلی پیدا ہو جائے، جو ملک کے لیے بالکل مفید نہیں، حکومت تو ایسی ہو جس کے اندر ہر باشندہ چاہے جس مذہب اور عقیدہ کا ہو بہ طیبِ خاطر زبانِ حال سے کہتا نظر آئے کہ

جو دلوں کو فتح کرلے وہی فاتحِ زمانہ

مقالات

سرسید احمد خان اور مستشرقین

از

عبید اللہ کوٹی ندوی، رفیق دارالمصنفین

(۷)

سر ولیم میور واقدی سے ایک اور روایت نقل کرتے ہیں کہ "ابن عباسؓ نے کہا کہ مجھ کو عبداللہ بن مسعودؓ کا پڑھنا پسند ہے، کیونکہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہر رمضان میں ایک مرتبہ قرآن جبرئیلؑ سے پڑھوایا کرتے تھے، اور اپنی وفات کے سال اس کو دو مرتبہ پڑھوایا تھا، اور عبداللہ بن مسعودؓ دونوں مرتبہ حاضر تھے، اور جو چیز کہ منسوخ ہوئی تھی اور جس چیز میں ترمیم ہوتی تھی اس کا مشاہدہ کیا تھا" مگر جیسا کہ سرسید احمد خان نے صراحت کی ہے کہ "اس روایت کے تخریج کرنے کی کوئی معتبر سند نہیں ہے، اور نہ ہی ہم اس کو کسی مستند اور معتبر حدیث میں پاتے ہیں، اور اگر وہ واقدی میں موجود بھی ہو جس میں کہ ہم کو ہمیشہ شک رہے گا، تب بھی وہ اعتبار کے لائق نہیں ہے، کیونکہ تمام نامعتبر اور بے سند روایتیں جو واقدی میں ہیں کچھ زیادہ اعتبار کی مستحق نہیں ہیں، اور اگر ہم اتمام حجت کی غرض سے اس کی اصلیت تسلیم کرلیں تو بھی سر ولیم میور کا یہ قیاس کہ "قرآن مجید میں شاید" بعض ایسی آیتیں نہ موجود ہوں جو ایک زمانہ میں نازل ہوئی ہوں، مگر بعد میں منسوخ ہوگئی ہوں، یا بدل دی گئی ہوں" ایک ایسا قیاس جو "شاید" کے سہارے قائم ہے کیونکر ثابت ہوسکتا ہے، باقی رہی یہ آیت کہ "مَا نَنْسَخْ مِنْ اٰيَةٍ اَوْ نُنْسِهَا نَاْتِ بِخَيْرٍ مِّنْهَآ اَوْ مِثْلِهَآ"

اس پر ہم پہلے بحث کر چکے ہیں اور یہ بتا چکے ہیں کہ اس میں شریعت یہود کے منسوخ کیے جانے کا ذکر ہے، آیات قرآنی کے نسخ سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ (خطبات احمدیہ: ص ۴۸۱)

سر ولیم میور نے اپنی کتاب کے حاشیوں میں قرآن مجید سے بعض آیتوں کا اخراج یا بعض آیتوں کا اندراج نہ کیے جانے کے بارہ میں دو ایک اور روایتوں سے بھی استدلال کیا ہے، وہ لکھتے ہیں کہ "بیر معونہ پر ستر مسلمان شہید ہوئے تو محمد صاحبؐ نے اللہ تعالیٰ کی وساطت سے ان لوگوں کے پیغام کے پہونچنے کا دعویٰ کیا جس کو راویوں نے (کسی قدر اختلاف کے ساتھ) اس طرح نقل کیا ہے کہ" بلغوا قومنا عنا انا لقینا ربنا فرضی عنا ورضینا عنه (واقدی) تمام مسلمان اس کو کچھ مدت تک آیت قرآنی کے طور پر پڑھتے رہے، اس کے بعد یہ منسوخ یا خارج کر دی گئی"۔ لیکن سرسید کے نزدیک:

"اول تو اس روایت کی صحت ہی میں کلام اور انکار ہے، مزید برآں سر ولیم میور کا یہ فرضی بیان کہ "تمام مسلمان اس کو کچھ مدت تک آیت قرآنی کے طور پر پڑھتے رہے، اس کے بعد یہ منسوخ یا خارج کر دی گئی" محض بے بنیاد ہے، اور کسی مستند اور معتبر روایت میں پایا نہیں جاتا، اور اگر بالفرض ہم اس کو صحیح تصور کر لیں تو اس کا نتیجہ صرف یہ ہے کہ مسلمانوں نے اپنی غلطی سے وحی غیر متلو یعنی حدیث کو وحی متلو یعنی قرآن سمجھ لیا تھا، اور درحقیقت وہ قرآن کی آیت نہ تھی۔" (ص ۴۸۲)

دوسری روایت جو سر ولیم میور نے نقل کی ہے، احکام زنا سے متعلق ہے، اور اس میں اہل مدینہ سے گفتگو کرتے ہوئے حضرت عمرؓ کا یہ قول نقل کیا گیا ہے کہ "..... واللہ اگر یہ امر مانع نہ ہوتا کہ لوگ یہ کہیں گے کہ عمر نے ایک نئی بات قرآن میں درج کر دی تو میں قرآن میں یہ آیت درج کر دیتا کیونکہ میں نے اس آیت کو پڑھا ہے کہ والشیخ والشیخة اذا زنیا فارجموهما البتة (واقدی) مذکورہ بالا روایت پر گفتگو کرتے ہوئے سرسید نے یہ رائے دی ہے کہ: اول تو اس بیان میں جو واقدی نے لکھا ہے غلط بیانی اور غلط نمائی ہے، اس سے ہماری مراد یہ ہے کہ یہ فقرہ "والشیخ والشیخة اذا زنیا فارجموها البتة"

بلکہ حجاز میں اسماعیل کی اولاد کی سکونت کا ثبوت ملتا ہے میں یونانی مورخین نے حجاز کی ان قوموں کا ذکر کیا ہے جو اسماعیل کے بیٹوں کے نام سے موسوم تھیں، ان سب واقعی باتوں کو سر ولیم میور کس طرح مسترد کرتے ہیں؟ (خطبات احمدیہ: ص ۵۰۹)

عربوں کی مذہبی رسموں کا حضرت ابراہیمؑ سے تعلق

سرسید کے الفاظ میں سر ولیم میور ازراہ خود پسندی یہ بھی کہتے ہیں کہ:

"اس عقیدہ باطل (یعنی حضرت ابراہیم سے نسبی رشتہ کے خیال) کے کسی اجزاء (رسوم) میں کسی بات کا ایسا کوئی نشان نہیں ہے کہ جو حضرت ابراہیمؑ سے متعلق ہو، حجر اسود کا بوسہ دینا، کعبہ کے گرد طواف کرنا، مکہ اور عرفات اور منی میں رسمیات کا ادا کرنا اور مقدس مہینوں اور مقدس ملک کی تعظیم کرنا ان سب باتوں کو حضرت ابراہیمؑ سے یا ان کے خیالات اور رسموں سے کسی طرح کا کوئی تعلق نہیں ہے جو غالباً ان کی اولاد کو ان سے پہونچیں، یہ باتیں یا تو ٹھیک ٹھیک مقامی نوعیت کی تھیں، یا ان کا بت پرستی کے اس سرچشمہ سے جو جزیرہ عرب کے جنوب میں جاری تھیں، تعلق تھا اور وہاں سے بنی جرہم یا بنی قطورہ، یا از دواجیت یا کوئی اور قوم جو یمن سے منتقل ہو کر مکہ میں آباد ہوئی تھی، اپنے ساتھ لائی تھی۔"

مگر سر ولیم میور کے یہ خیالات دلیل اور ثبوت کے بغیر سچائی سے انحراف کی ایک افسوسناک مثال ہیں، جس پر سرسید نے یوں تبصرہ کیا ہے:

"ہم کو افسوس ہے کہ سر ولیم میور نے بنی ابراہیمؑ یا بنی اسرائیل کی تمام رسمیات سے جو ان کے ہاں جاری تھیں یک لخت چشم پوشی کر لی ہے، ورنہ وہ دیکھتے کہ ان رسمیات میں اور بنی اسرائیل کی رسمیات میں بالکل اتحاد پایا جاتا ہے۔"

سر ولیم میور کی ذکر کردہ رسمیات جن کو وہ حضرت ابراہیمؑ اور ان کی اولاد میں گم پاتے ہیں، وہ سرسید کی بائبل سے نقل کردہ شہادتوں کی بنا پر اس بات کا پتہ دیتی ہیں کہ ان کی اصل حضرت ابراہیمؑ اور ان کے خانوادہ میں موجود تھی، جن کی عربوں نے ایک قیمتی وراثت سمجھ کر حفاظت کی، چنانچہ جیسا کہ سرسید مرحوم نے

نہیں فرمایا ہے۔ حجر اسود وہی نذرگاہ ہے جس کو خدا کے حکم سے ابراہیمؑ، اسحٰقؑ، یعقوبؑ اور موسیٰؑ بناتے تھے، (پیدائش باب ١٢، آیت ٧، ٨ اور باب ١٣، آیت ١٨، باب ٢٦ آیت ٢٥ باب ٢٨ آیت ١٠، ١٩، ٢٢، کتاب خروج باب ٢٠ آیت ٢٥، باب ٢٤ آیت ٤) حجر اسود کو بوسہ دیے جانا اس جگہ سر ولیم میور نے جو ذکر کیا ہے اس سے ایک عام مقصد بیان کرنا معلوم ہوتا ہے یعنی پتھر کی تعظیم، مگر انھوں نے ان پتھروں کی اس تعظیم کو فراموش کر دیا جو ابراہیمؑ، اسحٰقؑ، یعقوبؑ اور موسیٰؑ کرتے تھے، یہ سب بزرگ ایسے پتھروں کو مقدس جانتے تھے، خدا کے نام سے ان کی تعظیم کرتے تھے، یعقوبؑ نے ان پر تیل ڈالا، (دیکھو بائبل کی کتاب پیدائش باب ٢٨، آیت ١٩) یہ اس زمانہ کے دستور کے مطابق انتہائی تعظیم تھی، یعقوب نے کہا کہ یہ جگہ خانۂ خدا ہوگی، (پیدائش باب ٢٨، آیت ٢٢) خدا نے منع کیا کہ اس گھر کے اوپر مت چڑھو تاکہ تمھاری شرمگاہ اس کے اوپر ننگی نہ ہو جائے (خروج باب ٢٠، آیت ٢٦) اب کون سا دقیقہ تعظیم کا باقی رہ گیا ہے، جو اس قسم کے پتھروں کی نسبت اولاد ابراہیمؑ میں جاری نہ تھا جس کے سبب سر ولیم میور، حجر اسود کی اس خفیف تعظیم کو (اگر وہ ہو بھی) اولاد ابراہیمؑ کی رسم سے جدا کر کے عرب کے بت پرستوں کی رسم بتاتے ہیں۔

ایک گھر خدا کے لیے بنانا اور بیت اللہ اس کا نام رکھنا جیسا کہ کعبہ ہے، اگر ابراہیمؑ کی رسومات سے نہ تصور کیا جائے تو وہ کون تھا (یعنی موسیٰؑ) جس نے بمقام گبعون بیابان میں خدا کا گھر بنایا، (خروج باب ٢٠ آیت ٢٤، کتاب اول تاریخ الایام باب ٢١ آیت ٢٩) اور وہ کون تھا (یعنی داؤدؑ) جنھوں نے خرمن گاہ ارنان یبوسی کو خدا کا گھر بنانے کے لیے مول لیا اور پتھر، لکڑی، لوہا اور پیتل اس کے بنانے کے لیے جمع کیا، کتاب اول، تاریخ الایام باب ٢٢) اور وہ کون تھا (یعنی سلیمانؑ) جس نے بعد کو خرمن گاہ ارنان یبوسی میں نہایت عالی شان مکان بنایا جس کو خدا کا گھر اور بیت المقدس نام ملا، (کتاب دوم، تاریخ ایام، باب ٣) ان شواہد کی روشنی میں کعبہ کی تعمیر اور اس کو خدا کا گھر قرار دینے کو ابراہیمؑ کی طرف منسوب نہ کرنا، بلکہ عرب کے بت پرستوں کی رسم بتانا نہایت تعجب کی بات ہے۔

کہ میں خاص کعبہ کے ساتھ جو رسم ادا کی جاتی ہے وہ صرف طواف ہے، سر ولیم میور کے لیے اس رسم کے بارے میں ابراہیمی رسم ہونے سے انکار کرنا اس وقت مناسب تھا جبکہ وہ کسی تاریخ یا توریت مقدس سے پہلے یہ ثابت کر لیتے کہ ابراہیمؑ و اسحٰقؑ و یعقوبؑ نے جو مذبح یا بیت اللہ بنایا تھا ان میں وہ کیا کیا کرتے تھے، کیونکہ توریت سے موسیٰؑ سے بیشتر صرف خدا کے نام یا عبادت کے لیے ان گھروں کا بنانا تو معلوم ہوتا ہے مگر اس سے عبادت کا طریقہ نہیں معلوم ہوتا، اور ہمارے لیے اس بات کے یقین کرنے کا جائز قرینہ ہے کہ اس زمانہ میں خدا کی عبادت کا یہی طریقہ تھا جو طواف کی صورت میں پایا جاتا ہے اور اسماعیلؑ کی اولاد نے اپنے دادا کے اسی طریقہ کو اور اسی ہیئت کو اب تک قائم رکھا ہے، ہم کو امید ہے کہ سر ولیم میور اس بات کو بخوبی جانتے ہیں کہ حج خانہ کعبہ کا نہیں ہوتا، (اس کے ارد گرد جو کچھ ہوتا ہے اس سے مقصود خدا کی ذات ہوتی ہے نہ کہ کعبہ کی عمارت) پس یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ مسلمانوں کے مذہب میں خانہ کعبہ (کی عمارت) کا حج ہوتا ہے۔

عرفات کی رسم کا بھی ابراہیمؑ اور ان کی اولاد سے تعلق رہا ہے، ہزاروں جگہ توراۃ میں آیا ہے کہ خدا ابراہیمؑ کو مرئی ہوا، (یعنی ان کو دیدار الٰہی ہوا) خدا اسحاق کو مرئی ہوا، خدا یعقوبؑ کو مرئی ہوا، خدا موسیٰؑ کو مرئی ہوا، پس ٹھیک یہی معنی عرفات کے ہیں، جس پہاڑ پر (مکہ کے قریب) خدا ابراہیمؑ و اسماعیلؑ کو مرئی ہوا اس پہاڑ کا نام جبل عرفات ہے، معلوم نہیں کہ سر ولیم میور نے عرفات کو کیا سمجھا جو یہ کہا کہ اس کو ابراہیمی رسوم یا حالات سے کچھ تعلق نہیں ہے، وہ ایک ایسی چیز ہے جو دنیا کے بت پرستوں سے کچھ بھی مناسبت نہیں رکھتی، یہ خاص امر ابراہیمؑ کی نسل میں ملتا ہے، یہاں ہم اس بات پر کہ خدا کیونکر دکھائی دے سکتا ہے؟ بحث کرنا نہیں چاہتے، اور ان الفاظ کے مطلب و مراد سے یہاں کوئی بحث کرنا مقصود نہیں، بلکہ صرف یہ ثابت کرنا مقصود ہے کہ عرفات (عرفان الٰہی یا دیدار خداوندی) کا استعمال بجز خاندان ابراہیمی کے دنیا کے اور کسی خاندان یا مذہب میں نہ تھا، اور اسی لیے عرفات یا جبل عرفات کے نام سے اس کا خاص تعلق ابراہیمؑ سے ثابت ہوتا ہے، یہی جگہ ہے جہاں کی حاضری کو حج کہتے ہیں، پہاڑ تلے کا میدان ہے جس میں لوگ جمع ہوتے ہیں، اور خدا کی یاد کرتے ہیں، اس کی

تسبیح کرتے ہیں، اس قدوس کو قدوس قدوس کہہ کر پکارا کرتے ہیں، اس مجمع میں صرف خطبہ پڑھا جاتا ہے، جس میں خدا کی تعریف ہوتی ہے اور خدا کے احکام سنائے جاتے ہیں، ٹھیک اسی طرح جیسا کہ موسیٰ نے کوہ سینا کی تلہٹی تک سنائے تھے پس غور کرنا چاہیے کہ اس رسم کی اصلیت بت پرستوں میں پائی جاتی ہے یا خاص ابراہیمؑ کے یہاں۔

منیٰ کا مقام بھی صرف قربانی کے لیے ہے، اس کے علاوہ وہاں کوئی دوسری رسم نہیں ہوتی، تمام توریت قربانی کی رسم سے بھری ہوئی ہے، جہاں بیت اللہ بنایا تھا وہاں قربانی ہوتی تھی، اور اسی قربانی کی وجہ سے بیت اللہ مذبح کے نام سے پکارا جاتا تھا، منیٰ اور خانہ کعبہ نہایت قریب ہیں، اور اسی لیے قربانی نذر کرنے کے لیے منیٰ کی جگہ مقرر کی گئی، ابراہیمؑ، یعقوبؑ، اسحاقؑ اور موسیٰؑ و داؤدؑ و سلیمانؑ کی قربانی اور اسلام میں قربانی کے درمیان یہ فرق ضرور ہے کہ ان کے یہاں قربانی میں جانور کو مار کر اس کی لاش کو آگ میں جلا دیتے تھے اس خیال سے کہ خدا کو اس کی خوشبو پسند آتی تھی، مذہب اسلام میں وہ قربانی غریب اور محتاج لوگوں میں تقسیم کی جاتی ہے، تاکہ وہ بھوک کی سختی سے محفوظ رہیں، سر ولیم میور اگر اسی وجہ سے منیٰ کی رسموں کو بت پرستی کی رسمیں تصور کرتے ہیں تو کچھ افسوس کی بات نہیں ہے، کیونکہ ہر ذی عقل قربانی کے مذکورۂ بالا طریقوں کے مقابلہ میں اسلام کی قربانی کے طریقہ کو نہایت عمدہ اور بہتر سمجھتا ہوگا۔

اسلام نے کسی ملک کو مقدس نہیں ٹھہرایا، البتہ اس مقدس جگہ کو جو خاص طور پر خدا کی پرستش کے لیے مقدس ہاتھوں سے بنائی گئی تھی مقدس ٹھہرایا گیا ہے، یہ بھی ابراہیمؑ ہی کا طریقہ تھا، اور ان کی اولاد میں رائج چلا آرہا تھا، جہاں انھوں نے خانۂ خدا یا مذبح بنایا اس جگہ کو مقدس سمجھتے تھے، "موسیٰ کو خدا نے کہا کہ سینا پہاڑ کے لیے حد ٹھہرا اور اس کو مقدس کر" (خروج باب ۱۹، آیت ۲۳) خدا کا یہ بھی حکم ہے "مقام مقدس مرا احترام نمائید" (سفر لویان باب ۲۶، آیت ۲) اسی طرح بیت المقدس کو بھی مقدس قرار دیا گیا، اسی طرح اسلام میں بھی خانہ کعبہ کے لیے جب سے وہ بنا ایک حد مقرر

کی گئی، جو حرم کہلاتی ہے، اور اس کو اس مقدس نام کے ادب کے لیے جس کے نام پر وہ پاک جگہ بنائی گئی مقدس ٹھہرایا، یہ بھی اس بات کا ایک نہایت واضح ثبوت ہے کہ بیت اللہ کو مقدس ٹھہرانا، خاص طور پر ابراہیمؑ سے تعلق رکھتا ہے، نہ کہ بت پرستوں کی رسم سے۔ (خطبات احمدیہ ص ۱۴ - ۵۰۹)

سرسید سر ولیم میور کی اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ رجب، ذی قعدہ، ذی الحجہ اور محرم کو مقدس قرار دینے کی رسم کا تعلق دورِ جاہلیت سے تھا، یہ حج کے مہینے تھے، اور انھوں نے آپس میں عہد کر لیا تھا کہ ان دنوں میں لڑائی موقوف رہے گی، تاکہ لوگ بے خطر ہو کر مکہ آئیں اور حج کر سکیں، مگر بقول سرسید:

"سر ولیم میور نے جو غلطی کی ہے وہ یہ ہے کہ مذہب اسلام نے بھی ان کو مقدس مانا ہے، حالانکہ مذہب اسلام نے ان کی تقدیس کو رد کر دیا ہے، اور کوئی مہینہ مذہب اسلام میں (اس طور پر) مقدس نہیں رہا ہے، اسلام نے یہ کہا ہے کہ چار مہینے جو مقدس ٹھہرائے گئے ہیں ان میں تم لڑائی کی ابتدا مت کرو، لیکن اگر کافر لڑیں تو لڑو، خدائے تعالیٰ سورۂ توبہ میں فرماتا ہے (اِنَّ عِدَّةَ الشُّهُوْرِ... کافۃ) کہ ان چار مہینوں کی کوئی خصوصیت نہیں، بلکہ سال کے سب ہی ۱۲ مہینوں میں آپس میں مت لڑو، اور تمام کافروں سے لڑو جس طرح کہ وہ تم سے لڑیں، پس یہ آیت اس بات کی دلیل ہے کہ مذہب اسلام میں اشہر حرم (۴ محترم مہینے) نہیں مانے جاتے، بلکہ بارہ کے بارہ مہینے ایک سے ہیں۔" (ایضاً، ص ۵۱۵)

صابی مذہب سے تعلق سر ولیم میور یہ بھی لکھتے ہیں کہ عرب کے خاص طریقے سیبین ازم (صابی مذہب) اور بت پرستی اور پتھر کی پرستش تھی، اور ان سب کو مکہ کے مذہب سے بڑا تعلق تھا، لیکن اس اعتراض کے جواب میں سرسید یہ لکھتے ہیں کہ:

"ہم کو اس بات سے انکار نہیں کہ زمانۂ جاہلیت میں جو طریقے مکہ میں رائج تھے، ان میں بہت کچھ رسمیں بت پرستی کی شامل ہو گئی تھیں، مثلاً صابئین کا مذہب، اس میں کفر و شرک اور کواکب کی پرستش داخل

ہوگئی تھی، مگر جو خاص باتیں ابراہیمؑ کے مذہب کی ان میں پائی جاتی تھیں ان کو بھی سر ولیم میور بت پرستی سے منسوب فرماتے ہیں، یہ بھی ان کی غلطی ہے، خانۂ کعبہ کو اور ابراہیمی اور اسماعیلی خاندانکے طریقہ کو جس کو اب طواف کعبہ کہتے ہیں سیبین ازم یا بت پرستی سے کچھ تعلق نہ تھا، پتھر یا حجر اسود کی پرستش جس کو سر ولیم میور عرب کا دستور بیان کرتے ہیں (حالانکہ وہ پرستش نہیں بلکہ تعظیم ہے، اور گذشتہ صفحات میں بائبل سے اس کی نظیریں بھی پیش کی جا چکی ہیں) خاص ابراہیمؑ کا طریقہ تھا، یہ طریقہ خاص ابراہیمؑ سے پیدا ہوا، اور یعقوبؑ و اسحاقؑ اور اسمٰعیلؑ و موسیٰؑ نے اس کی پیروی کی، جو بن گھڑے اور ننگے پتھروں کو (موجودہ بائبل کی پیش کردہ شہادتوں کے مطابق) ستون کی مانند کھڑا کرتے تھے، اور ان پر تیل چڑھاتے تھے، خواہ یوں کہو کہ مہادیو کی پنڈے کی طرح ان پتھروں کی پرستش کرتے تھے، (جس کی ذمہ داری موجودہ بائبل پر ہے، اور اس کی روشنی میں جو کچھ چاہو ان کی نسبت کہو، مگر یہ بات کہ وہ طریقہ ابراہیمی نہ تھا، بلکہ خاص عرب کے بت پرستوں کا طریقہ تھا جیسا کہ سر ولیم میور بیان کرتے ہیں تسلیم نہیں ہو سکتا، کیونکہ ان کی غلطی علانیہ ثابت ہے۔"

سرسید نے اس بحث کو تمام کرتے ہوئے مکہ کی تاریخ اور نسب نامۂ نبویؐ پر بڑی تفصیل اور تحقیق کے ساتھ اظہار خیال کیا ہے، اور اس بارے میں سر ولیم میور کے طول طویل بیانات پر تبصرہ کرتے ہوئے یہ لکھا ہے کہ:

"ان تمام قابل افسوس قیاسات اور فرضی قصوں کے بعد سر ولیم میور نے مکہ کی ابتداء اور مکہ کے مذہب کی ایک فرضی تاریخ بیان کی ہے، اور ہر ایک بات کو بے دلیل اور بغیر ثبوت کے فرض کر لینے کے بعد.... اپنے خیال کو جولانی دے کر اپنے قلم کے چند اشاروں سے تمام ناممکن باتوں پر غالب آتے ہیں، مگر وہ باتیں نہ تاریخی واقعات ہیں، نہ عرب کی مقامی روایتیں اور نہ کتاب مقدس (بائبل) کی سچی باتیں، بلکہ صرف سر ولیم کے عجیب و غریب کام کرنے والے خیال کی ایجادیں ہیں، اس وجہ سے

ہم ان کو ذکر کرنا بے فائدہ سمجھتے ہیں۔" (خطبات احمدیہ، ص ۱۱۵)

نسب نامۂ نبوی ﷺ | نسب نامۂ نبوی ﷺ پر سرسید احمد خاں کی تحقیق یہ ہے کہ اسمٰعیلؑ (بن ابراہیمؑ) ۱۹۱۰ سنہ قبل مسیح پیدا ہوئے، اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم ۵۷۰ سنہ بعد مسیح پیدا ہوئے، دونوں میں ۲۴۷۶ برس کا فاصلہ ہے، اور اسمٰعیلؑ سے آنحضرت ﷺ تک اس نسب نامہ کی ستر پشتیں گذری ہیں جو علوم طبیعی کی تحقیقات کی روشنی میں اندر دئے حساب بالکل صحیح ہے، یعنی ایک صدی میں تقریباً تین پشتیں، آنحضرت ﷺ کے ایک جد بعید عدنان اور حضرت اسمٰعیلؑ کے درمیان بیہقی نے بیس[۲۰]، ابن ہشام نے ایک نسخہ کے مطابق نو[۹] اور ایک اور نسخہ کے مطابق گیارہ[۱۱] پشتیں اور ابن الاعرابی نے نو[۹] پشتوں کا ذکر کیا ہے، اسی طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور عدنان کے درمیان سر ولیم میور کے مطابق اٹھارہ[۱۸] پشتیں گذری ہیں، (دیکھیے لائف آف محمد ج ۱، ص ۱۹۴) مگر سرسید نے اس بارہ میں اپنا خیال اس طرح ظاہر کیا ہے کہ:

"سر ولیم میور کو ناموں کے متحد ہونے سے شبہہ پڑا ہے، (مگر) عدنان بھی دو[۲] ہیں اور معد بھی دو[۲] ہیں۔۔۔۔ عک بلا شبہہ معد کا بھائی تھا، مگر پہلے معد کا، نہ کہ دوسرے معد کا، جیسا کہ سر ولیم میور نے تصور کیا ہے۔۔۔۔ یہ یاد رکھنا چاہیے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے عدنان ہمارے مرتبہ شجرہ میں پچاسویں نمبر پر ہے، جو عموماً تسلیم کیا گیا ہے، مگر عدنان سے آگے مورخوں میں اختلاف ہے، (جس کی بنیاد مذہبی نہیں، بلکہ تاریخی ہے)۔۔۔۔ سر ولیم میور کا یہ کہنا کہ ہم دل سے قبول کرتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ کا نسب نامہ عدنان تک خاص عرب کی ملکی روایتوں سے لیا گیا ہے اور عدنان سے آگے یہودیوں سے۔" (خطبات احمدیہ ص ۶۸ - ۵۶۰)

مگر مورخوں نے عدنان سے اوپر شجرۂ نسب کی جستجو میں اگر یہود کی تاریخی روایتوں کی طرف رجوع کر لیا تو اس میں مذہب اسلام کے لیے عیب کی کیا بات پیدا ہو گئی، سرسید فرماتے ہیں کہ:

"آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نسب نامہ کی نسبت کیا بیہودہ گفتگو عیسائیوں نے کی ہے، خدا تعالیٰ کے اس وعدہ کا پورا ہونا جو اس نے بنی اسرائیل سے موسیٰؑ کی زبانی کیا کہ" میں تمہارے بھائیوں یعنی بنی اسماعیلؑ میں سے موسیٰؑ کی مانند ایک نبی پیدا کروں گا (تورات) کچھ اس بات پر منحصر نہ تھا کہ بنی اسماعیل کی نسلیں محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے لے کر اسماعیلؑ تک ہم کو کامل ترتیب اور پوری تعداد سے یاد ہوں، اور نہ اس بات پر اس کا انحصار تھا کہ وہ کرسی نامہ (شجرۂ نسب) ہم عرب کی ملکی روایتوں سے یاد کریں، یا یہود کی روایتوں اور برخیا کاتب الوحی ارمیا نبی کی تحریروں سے، وہ تو اسماعیلؑ کی اولاد میں سے ایک کے لیے ہونا تھا سو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت پورا ہوا، تمام عرب اور یہود اور عرب کے قرب و جوار کی تمام قومیں اور تمام اگلے اور پچھلے مورخ خواہ وہ عرب کے رہنے والے ہوں یا کسی اور ملک کے مسلمان ہوں یا کسی اور مذہب کے، اس بات میں ذرا بھی شبہ نہیں رکھتے، بلکہ بالکل تسلیم کرتے ہیں کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بنی ہاشم، قریش، اسماعیلؑ بن ابراہیمؑ کی اولاد میں ہیں۔ محمد رسول اللہؐ نے قریش کو پکار کر مخاطب کیا کہ "اَبِيْكُمْ اِبْرَاهِيْم" (تمہارے جد امجد ابراہیمؑ ہیں) جس کو سب نے تسلیم کیا، اور کون ایسا شخص ہے جس میں اس قدر جرأت ہو کہ وہ سچ بات کو تسلیم نہ کرے۔"

(خطبات احمدیہ: ص ۵۷۰)

معراج جسمانی پر اعتراضات کا دفاع

سرسید احمد خاں اگرچہ معراج بصورت رویا کے قائل ہیں جیسا کہ بعض صحابۂ کرامؓ، اور بعد کے علماء و اہل تحقیق میں سے ایک طبقہ کی رائے ہے، مگر وہ مستشرقین کی طرف سے معراج جسمانی پر کیے جانے والے اعتراضات کو بھی صحیح

نہیں رکھتے، چنانچہ فرماتے ہیں کہ:

"اب ہم بغرض اتمام حجت (معراج جسمانی کو) واقعی تسلیم کر لیتے ہیں، اور یہ بھی تسلیم کر لیتے ہیں کہ ان تمام قصوں پر اعتقاد رکھنا مسلمانوں کے یہاں ایک خاص امر دینی ہے، اور پھر ہم ان متعصب عیسائیوں سے جو ان روایات کی بنا پر مذہب اسلام پر طعن کرتے ہیں، یہ پوچھتے ہیں کہ وہ کیوں اس قدر شور مچاتے ہیں جب کہ وہ خود اس سے بھی زیادہ عجیب باتوں پر یقین رکھتے ہیں، کیا ان کا یہ اعتقاد نہیں ہے، کہ حضرت الیاسؑ آسمان پر انسانی جسم و شکل کے ساتھ موت کا ذائقہ چکھے بغیر ایک آتشیں گاڑی میں ایک آندھی کے ذریعہ اٹھائے گئے ہیں، اور کیا عیسائی اس بات پر عقیدہ نہیں رکھتے کہ حضرت عیسیٰ مسیحؑ مرنے کے بعد اٹھے اور آسمان پر چلے گئے، اور خدا تعالیٰ کے دست راست کی طرف بیٹھے، یعنی خود اپنے ہی دست راست کی طرف، کیونکہ وہ خود خدا تھے، (متی باب ۲۸، آیت ۷، مرقس باب ۱۶ آیت ۱۹) اس لیے ہم تمام عیسائیوں کو درج ذیل احکام کی پیروی کرنے کی صلاح دیتے ہیں کہ "تو اس ذرہ کو جو تیرے بھائی کی آنکھ میں ہے دیکھتا ہے، اور اپنی آنکھ میں جو شہتیر ہے اس کو نہیں دیکھتا تو اپنے بھائی سے کس طرح کہہ سکتا ہے کہ بھائی تو مجھ سے اپنی آنکھ کا ذرہ نکلوا لے جبکہ تجھ کو خود اپنی آنکھ کا شہتیر نظر نہیں آتا، اے مکار پہلے تو اپنی آنکھ میں سے شہتیر تو نکال لے تب تجھ کو اپنے بھائی کی آنکھ میں ذرہ نکالنے کے لیے صاف نظر آنے لگے گا" (لوقا: باب ۶، آیت ۴۲-۴۱)

ایک مقدس عیسائی نے حضرت عیسیٰؑ کے آسمان پر چلے جانے کے قصے کو نہایت شاعرانہ رنگین بیانی سے نظم کیا ہے، جس کا ترجمہ سرسید کے الفاظ میں یہ ہے کہ "اس نے آسمان کی طرف مراجعت کی، اور

اس کے پیچھے دس ہزار چنگوں کی سریلی آوازیں تھیں، جو زمزمہائے ملکوتی کا سماں باندھ رہی تھیں، زمین اور ہوا ان کی آواز سے گونج رہی تھی، تمام افلاک درجہ بدرجہ صدائے بازگشت آرہی تھی، سیارے اپنے اپنے مقامات پر سننے کے لیے ٹھہر گئے تھے، جبکہ یہ نورانی جلوس شادکامی کے طنطنہ کے ساتھ عالم بالا کو روانہ ہوا، انھوں نے یہ نغمہ گایا: اے لازوال دروازو کھل جاؤ! اے آسمانو! اپنے دروازوں کو وا کر دو اور اس بڑے نجات دہندہ کو جو اپنے کام کو اختتام پر پہونچاکر شان و شوکت کے ساتھ آتا ہے اندر لے لو، اور اب خدا تعالیٰ کی نظر عاطفت سے نیک لوگوں کے مکانوں میں قدم رنجہ فرمائے گا اور اپنی خوشی سے اپنے قاصدان اولی الاجنحہ کو رحمت آسمانی کے پیغام دے کر متواتر وہاں بھیجا کرے گا!" (خطبات احمدیہ ص ۶۷۱-۶۷۳)

سرسید کی طرف سے اس جواب کی روشنی، معراج جسمانی مذہبی نقطۂ نظر سے اہل مذاہب کے لیے قابل فہم ہے اور واقعات معراج میں کوئی ایک پہلو بھی ایسا نہیں ہے جس کے بارہ میں وہ اپنے مذہبی اعتقاد و تصور کو برقرار رکھتے ہوئے یہ کہہ سکیں گے کہ وہ ناممکن ہے یا عالم واقعات میں ایسا نہیں ہو سکتا۔ (باقی)

سلسلۂ مقالات سلیمان

مولانا سید سلیمان ندویؒ نے متعدد بلند پایہ تصانیف کے علاوہ بہت سے علمی، مذہبی، فقہی، تاریخی، ادبی و تنقیدی مضامین بھی لکھے تھے، ان تمام مضامین کو فن وار کتابی صورت میں تین ضخیم جلدوں میں مرتب کر کے شایع کیا جا چکا ہے، پہلی جلد تمام تر ہندوستان کی تاریخ کے مختلف پہلوؤں کے مضامین پر، دوسری جلد خالص علمی و تحقیقی مضامین پر، تیسری جلد قرآنی و مذہبی مضامین پر مشتمل ہے، تیسری جلد میں علامہ کے وہ معرکۃ الآرا مضامین بھی ہیں جو انھوں نے یورپ اور امریکہ کے بعض سرکردہ مستشرقین کے جواب میں لکھے تھے، اور بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھے گئے تھے۔ قیمت علی الترتیب ۲۶ روپے، ۲۳ روپے، ۲۳ روپے، بقیہ جلدیں زیر ترتیب ہیں۔ "منیجر"

حضرۃ الاستاذ کی اہم تصنیف

تاریخ ارض القرآن پر ایک نظر

از

سید صباح الدین عبدالرحمن

یہ حضرۃ الاستاذ مولانا سید سلیمان ندویؒ کی پہلی باضابطہ تصنیف ہے، جو دارالمصنفین کی تاسیس کے پہلے سال سنہ ۱۹۱۵ء میں شایع ہوئی، اس وقت ان کی عمر اکتیس ۳۱ سال کی تھی، دوسری جلد سنہ ۱۹۱۸ء میں شایع ہوئی، اس سے پہلے وہ الندوہ، الہلال اور البلاغ میں اس کثرت سے مضامین لکھ چکے تھے کہ ان کا قلم بڑی حد تک منجھ چکا تھا، اور اس میں بڑی روانی آچکی تھی، لیکن اس کتاب میں انھوں نے اپنی تحقیق و تدقیق کو جس انداز میں سمیٹ کر پیش کیا ہے، اس سے ان کی کاوش فکر، بالغ نظری اور طرز نگارش کا ایک عجیب و غریب نمونہ دکھائی دیتا ہے جو کسی اور مصنف یا اہل قلم کے یہاں کم ملے گا۔

اس میں جو کچھ لکھا گیا ہے وہ دراصل مولانا شبلیؒ کی شہرۂ آفاق تصنیف سیرۃ النبیؐ کے دیباچہ کے لیے لکھا گیا تھا، لیکن یہ تحریر اتنی بڑھتی چلی گئی کہ اس کی دو جلدیں ہوگئیں، اور وہ مستقل تصنیف بن گئی۔

سبب تالیف سید صاحبؒ کو دکھ تھا کہ قرآن مجید میں عرب کی بیسیوں قوموں، شہروں اور مقامات کے نام ہیں، جن کی ہر قسم کی صحیح تاریخ سے نہ صرف عوام بلکہ علما تک ناواقف ہیں، اور گذشتہ تیرہ سو برس میں ایک کتاب بھی اس موضوع پر نہیں لکھی گئی، اسی کے ساتھ ان کو اس پر حیرت تھی کہ جرمن، فرانسیسی،

اطالوی اور انگریز مستشرقین نے تاریخ عرب قبل از اسلام پر محققانہ کتابیں لکھیں، عرب قبل اسلام کے جو حالات یونانی اور رومانی تصانیف میں ہیں، ان کا انتخاب اور خلاصہ پیش کیا، قرآن مجید میں جن اقوام و بلاد کا ذکر آیا ہے ان کے کھنڈروں کا مشاہدہ کیا اور ان کے کتبات کو حل کیا، مگر ان تمام کوششوں میں ان کی نیت صاف نہیں تھی، اس لیے انھوں نے ان کے عجیب و غریب نتائج استنباط کرکے قرآن مجید کے فوائد کو پامال کیا، اور قرآن کی مخالفت میں غلط معلومات پیش کیے، جن قوموں کا ذکر قرآن مجید میں ہے ان کو غیر تاریخی قرار دیا، عرب کے ادعائے نسب سے انکار کیا اور جرأت کے ساتھ یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ قرآن کے پہلے کا عرب قرآن کے بعد کے عرب سے ہزار درجہ بہتر تھا۔ (دیباچہ ارض القرآن)

سید صاحبؒ رقمطراز ہیں کہ جس طرح ایرانی اور یہودی مورخین کے مقابلہ میں ابن حنیفہ دینوری (المتوفی سنہ ۲۸۱ھ) ابن قتیبہ (المتوفی سنہ ۲۷۶ھ) اور ابن جریر (المتوفی سنہ ۳۱۰ھ) نے اسلام اور قرآن کی تحقیق و تطبیق میں کوشش کی، اسی طرح اس زمانہ میں ضرورت ہے کہ یورپین تاریخ کی تطبیق اسلام اور عربوں سے دی جائے، اور یورپین تحقیقات و اکتشافات کی غلطی کا پردہ چاک کیا جائے، اور خود ان ہی کے کارخانوں کے بنے ہوئے ہتھیاروں سے ان کے حملوں کا جواب دیا جائے (ایضاً)

اس مقصد سے انھوں نے تاریخ ارض القرآن دو جلدوں میں لکھی، اس کے سرسری مطالعہ سے اس کا سمجھنا آسان نہیں، اس لیے اس کا جائزہ لینا ضروری ہے کہ کس طرح لکھی گئی، اور اس میں کیا لکھا گیا ہے، اور اس کے لکھنے کا انداز کیا ہے، پھر آخر میں یہ حقیر راقم اپنی بساط کے مطابق اس کی تحقیقی نوعیت اور افادیت پر اپنی رائے کے اظہار کرنے کی جرأت کرے گا۔

کتاب کے ماخذ اس کتاب کی تیاری کے سلسلہ میں سید صاحبؒ نے عبرانی زبان بھی کچھ سیکھنے کی کوشش کی، تاکہ تورات کے ناموں کے تلفظ اور فقروں کو آسانی سے سمجھ سکیں، سبا اور حمیر کے کتبات سے بھی مدد لی، پھر اس کی تدوین کے سلسلہ میں مختلف ماخذوں کو جس طرح کھنگالا ہے وہ علمی و تحقیقی کارنامہ ایک

بے مثال نمونہ ہے، ان کا خود بیان ہے کہ اس کے لکھتے وقت چار ماخذ سامنے رہے: (۱) ادبیات اسلامیہ، (۲) ادبیات اسرائیلیہ، (۳) ادبیات یونانیہ و رومانیہ (۴) اکتشافات اثریہ۔ ان ماخذوں کی نوعیت اور اہمیت پر بیاسی صفحے کا تبصرہ جس دیدہ وری کے ساتھ کیا ہے وہ اردو میں تو بالکل نئی چیز تھی، اور اگر کوئی مستشرق اردو پڑھ کر اس کا مطالعہ کرے تو وہ اس تبصرہ کی کاوش فکر سے ضرور متاثر ہوگا۔

ادبیات اسلامیہ کے سلسلہ میں قرآن مجید، روایات تفسیر، اسرائیلیات، تاریخ عرب اور جغرافیۂ عرب کا ذکر کرتے ہوئے اتنی کتابوں کی فہرست دے دی ہے کہ یہ اچھا خاصہ کیٹلاگ بن گیا ہے، ان سے مصنف کے نام کے ساتھ ان کا سنہ ولادت و وفات اور ان کتابوں کا سنہ تصنیف معلوم ہو سکتا ہے، اور اگر یہ چھپ گئی ہیں تو کہاں اور کب چھپیں ان کی تفصیل بھی ہے۔

ادبیات اسرائیلیہ کا مجموعہ توراۃ، نبییم، کتبیم، ترگوم، مدراش اور تالمود سے عبارت ہے، سید صاحبؒ نے ان سے بھی استفادہ کیا ہے۔

ادبیات یونانیہ و رومانیہ میں انھوں نے ہیروڈوٹس (۴۰۰ برس قبل مسیح) ارا تستھنیس (متوفی ۱۹۶ء ق م) ڈیوڈورس (المتوفی ۸۰ء ق م)، اسٹرابو (۲۴ء ق م) پلینی (المتوفی ۷۹ء ق م) بطلیموس، یوسیفوس اور بر دشوشن وغیرہ کی تصنیفوں اور تحریروں سے بھی کام لیا ہے۔

اکتشافات اثریہ سے بھی انھوں نے پورا فائدہ اٹھایا ہے، یمن، حضرموت، حوران، تدمر، بطرا، علا، مدائن صالح، معنا، حجر، حجاز، عراق اور مصر میں قدیم عربوں کے بہت سے آثار، عمارات اور یادگاریں ہیں جن میں ہزاروں کتبے اور نقوش کھدے ہیں، جو زیادہ تر حمیری، سبائی، آرامی اور نبطی خط میں ہیں، دولت بنی امیہ اور عباسیہ کے دور میں تاریخی مذاق مجتہدانہ حیثیت رکھتا تھا،

اس کے زمانے میں ان آثار قدیمہ کی تحقیقات کی گئیں اور ان تحقیقات کے علاوہ جن عرب اور یورپین مصنفوں، مورخوں،
ماہرین اکتشافات، سیاحوں اور جغرافیہ دانوں نے ان کے متعلق جو کچھ بھی لکھا ہے، سید صاحبؒ نے اس سے
بھی پورا فائدہ اٹھایا ہے، ان اکتشافات کے [illegible] میں ان کو جو مشکلات ہوئیں ان کی تفصیلات کا
پڑھنا صبر آزما ہے، لیکن انھوں نے ان مشکلات پر قابو پاکر اپنی صبر آزما تلاش اور تفحص کا ثبوت دیا ہے، جس کے
بعد انھوں نے اس کی پہلی جلد میں عرب کی قدیم قوموں کے زمانہ کے مقامات اور ان کے باشندوں کے ناموں
کی تطبیق دی ہے، اس کے بعد عرب کے جغرافیہ سے بحث کی ہے، توراۃ کی رو سے ۲۵۰۰ سے ۸۰۰
قبل مسیح تک کے عرب کا جغرافیہ قلمبند کیا ہے، یونان و روما کے مصنفین نے ۵۰۰ سے ۲۰۰ قبل مسیح
تک کے عرب کا جو جغرافیہ لکھا ہے اس کی تفصیل بتائی ہے، پھر عہد قرآن میں عرب کا جو جغرافیہ رہا اس پر
سیر حاصل بحث کی ہے، اس کے بعد اس عہد میں عروض، نجد، یمن، حجاز، جنت، ثمود، تبوک، خیبر، مدین،
شام اور عراق کے جو جغرافیائی اور تاریخی کوائف تھے ان کو قلمبند کیا ہے۔

ارض القرآن کے اقوام کی تفصیلات اس جلد میں سب سے اہم وہ حصہ ہے جس میں ارض القرآن کے اقوام کی تفصیلات
درج کی گئی ہیں، علم الاقوام اور علم الالسنہ کے محققین نے اقوام عالم کی جو تقسیم کی اس کو
سید صاحبؒ نے یہ لکھ کر دہرایا ہے کہ اخلاق، عادات، اعتقادات اور زبان کے اتحاد و تشابہ جسم، اعضاء،
اور دماغ کی مماثلت کے لحاظ سے تین مختلف خاندانوں میں تقسیم کیا گیا ہے 'آریائی، تورانی اور سامی' ان کے
بیان کے مطابق آریائی قوم میں ہندوستان، ایران اور فرنگستان کے باشندے شامل ہیں، تورانی میں
ترکستان، چین، اور منگولیا کے لوگ آتے ہیں، اور سامی میں آرامی، سریانی، کلدانی اور فنیشین شامل ہیں،
سید صاحبؒ نے زیادہ تر امم سامیہ ہی سے بحث کی، جو حضرت نوحؑ کے بیٹے سام کی نسل سے ہیں، اس
سلسلہ میں انھوں نے خود یہ سوال اٹھایا ہے کہ امم سامیہ کا پہلا مسکن کہاں تھا؟ انھوں نے اس کی طرف
توجہ دلائی ہے کہ یورپ کے موجودہ علمائے اقوام و السنہ میں بڑا اختلاف ہے، ایک رائے ہے کہ ان کا

پہلا مسکن [illegible] تھا، جہاں سام کے بھائی حام کی اولاد زمانہ تاریخی میں آباد ملتی ہے، دوسرا نظریہ یہ ہے کہ ان کا مسکن اصل فرات کا حصۂ زیریں تھا، اس کا حامی اطالوی مستشرق پروفیسر گیڈی ہے، چوتھی تھیوری یہ ہے کہ بنو سام کا مسکن اول عرب تھا، اس کے طرفدار یورپ اور امریکہ کے علماء کی ایک کثیر جماعت ہے، جو ڈی خوئی، خریدیا، اسپرنگر، نولدیکی، روبرٹسن سمتھ، سموال لے انگ، ولیم رائٹ اور راجرس وغیرہ ہیں، سید صاحبؒ نے ان چاروں نظریوں پر بڑی فاضلانہ بحث کی ہے، اور خود اس نتیجہ پر وثوق کے ساتھ پہونچے ہیں کہ ان کا پہلا مسکن عرب تھا، کیونکہ عرب کے سوا قدیم الایام میں سے کوئی قوم اس کی مدعی نہیں کہ ان کا ملک بنو سام کا مسکن اول اور امم سامیہ کا مسقط الرأس تھا، اس کی تائید عرب مورخوں میں ابن قتیبہ (المتوفی ۲۷۶ھ) اور یعقوبی (المتوفی ۲۷۹ھ) کے بیان سے کی ہے، (ص ۱۱۵-۱۰۷)

سید صاحبؒ کی تحقیق ہے کہ امم سامیہ اپنے مسکن اول سے دوسرے مقامات پر ہجرت کرتی رہیں، کس طرح ؟ ان ہی کی زبانی سنیے :

"عرب کے ملک میں پانی کا دریا نہیں، لیکن وہاں انسانوں کا دریا ہے، تاریخ نے چار بار اس میں طوفان آتے دیکھا ہے، ایک مسیحؑ سے ڈھائی ہزار یا تین ہزار برس پہلے جب یہاں سے قبائل کا سیلاب موجیں مارتا ہوا بابل اور سیریا، مصر اور فنیشیا (کنعان) میں پھیل گیا، اس سیلاب کا زور کم ہو رہا تھا کہ ۱۵۰۰ق م میں ایک اور طوفان آرومی، عبرانی اور مدیانی قبائل کا تھا، اور پاس کے ملکوں میں پھیل گیا لیکن اس کا دائرہ پہلے سے کم تھا، تیسری بار معینی اور سبائی وغیرہ اٹھے اور پھیلے لیکن سب سے آخری طوفان جو پہلی صدی ہجری میں مسیحؑ سے چھ سو برس بعد اٹھا وہ سب سے زیادہ وسیع الاثر تھا، جو ایک طرف گنگا کے دہانے سے مل گیا اور دوسری طرف بحر محیط سے۔" (ص ۱۱۶)

اپنے اس بیان کی تائید یورپین مورخوں میں سے ولیم راجرس، ہوآرٹ اور شرنڈر کے علاوہ ابن قتیبہ، ابن خلدون، ابن ہشام کلبی اور ابن ندیم صاحب الفہرست کے بیانات سے کی ہے (ص ۱۱۹-۱۱۶)

امم سامیہ | سید صاحبؒ نے امم سامیہ کے انساب کے عنوان سے سامیوں کے بہت سے قبائل کا ذکر کیا ہے، لیکن اپنی اس کتاب میں امم سامیہ اولیٰ، امم سامیہ ثانیہ، بنو قحطان اور بنو ابراہیم کے حالات اور واقعات کی تشریح کو اپنا موضوع بنایا ہے، وہ لکھتے ہیں کہ امم سامیۂ اولیٰ سے مراد وہ قدیم سامی جتھے جو عرب کے سب سے پہلے اور ابتدائی باشندے تھے، اور مختلف اغراض کی بنا پر یہاں سے نکل کر بابل، مصر اور شام وغیرہ کے ملکوں میں پھیلے۔ (ص ۱۲۴)

قوم عاد | امم سامیۂ اولیٰ میں ان کے نزدیک سب سے بڑا قبیلہ عاد کا تھا، وہ لکھتے ہیں کہ تاریخ قدیم کے بعض یوروپین مصنفین عاد کو صرف ایک فرضی اور مذہبی کہانی (میتھالوجی) سمجھتے ہیں، یہ اس لیے کہ قرآن میں اس کا جو ذکر ہے اس کی تکذیب کریں لیکن سید صاحبؒ نے ان کی اس انتہائی غلطی پر پوری بحث کی ہے، وہ لکھتے ہیں کہ تحقیقات جدیدہ نے فیصلہ کیا ہے کہ عرب کے تمام قدیم باشندے (امم سامیہ) کی ایک کثیر الافراد باعظمت جمعیت تھی، جس نے بابل، مصر اور شام میں بڑی بڑی حکومتیں قائم کیں (ص ۱۲۶) ان ہی میں عاد، ثمود، طسم اور جدیس تھے، سید صاحبؒ نے عبری لغت کے ذریعہ عاد کے معنی بلند و مشہور بتایا ہے، (ص ۱۲۸) ان کا زمانہ متعین کرکے بتایا ہے کہ حضرت موسیٰؑ کے عہد سے پہلے عاد کی تباہی عام ہو چکی تھی، قرآن مجید میں عاد کا ذکر ہمیشہ حضرت موسیٰؑ اور فرعون سے پہلے آیا ہے، ان وجوہ سے عاد کی عظمت اور ترقی کا زمانہ دو ہزار دو سو برس قبل مسیحؑ سے سترہ سو قبل مسیح تک ہو سکتا ہے، سید صاحبؒ کی تحقیق یہ ہے کہ عاد کی مرکزی آبادی عرب کے بہترین حصہ یعنی یمن اور حضرموت میں سواحل خلیج فارس سے حدود عراق تک تھی، (ص ۱۳۱) لیکن بیرون عرب میں وہ بابل، مصر، اسیریا، ایران، فینیقیہ، قرطاجنہ، کریٹ اور یونان تک پہونچے اور ان کے یہاں کی حکومتوں کی تاریخ زیادہ سے زیادہ تفصیل، سواء السبیل از پروفیسر ٹی۔ آرنلڈ، العرب قبل الاسلام جرجی زیدان، توراۃ، تاریخ ایام کتاب المعارف ابن قتیبہ، کتاب العبر، تاریخ قدیم از ڈنکر، تاریخ مصر قدیم از جی ڈانسن، تحقیقات آثار نینوی

وبابل، تاریخ بابل ونشود از ساجرس، تاریخ ابن خلدون، تاریخ یعقوبی، اور سائنٹفک ریویو امریکہ وغیرہ کی مدد سے پیش کی ہے، اور اس میں یہ دکھایا ہے کہ عاد کوئی محدود اور مختصر قبیلہ نہ تھا، بلکہ وہ ایک عظیم الشان قوم تھی، جو دنیا کی قدیم ترین تہذیب کی بانی تھی، ایشیا اور افریقہ کا کثیر حصہ اس کے زور وقوت کا تماشہ گاہ تھا، بڑی بڑی اور عظیم الشان عمارتیں اس کے دست صنعت کا نتیجہ تھیں (ص ۱۶۳)

قرآن مجید نے عرب کی اس عظیم الشان قوم کی داستان بار بار دہرائی ہے، اس کی وجہ سید صاحبؒ نے یہ بتائی ہے کہ اس قوم سے زیادہ عبرت وبصیرت کا کوئی دوسرا نمونہ نہ تھا۔ (ص ۱۶۳) کلام پاک میں عاد کے متعلق جتنی آیتیں ہیں، ان سب پر سید صاحب نے بڑی سیر حاصل بحث کی اور یہ دکھایا ہے کہ اس عظیم الشان اور عظیم الجبروت قوم نے اپنے زور اور قوت سے دنیا کو ہلا دیا تھا، مگر ان کے صفات عالیہ اور اخلاق اس قدر پست ہوتے گئے کہ اللہ تعالیٰ کا غضب ان پر نازل ہوا، پہلے تو حضرت ہودؑ کو ان میں مبعوث کرکے ان کو سنوارنے کی کوشش کی، مگر انھوں نے حضرت ہودؑ کو جھٹلایا، ان کو اپنی قوتِ بازو پر ناز تھا، وہ اپنے ممالک مقبوضہ میں اکڑتے پھرتے تھے، خدائے واحد کا انکار کرکے معبودانِ باطل کی پرستش کرتے تھے، یہی چیزیں ہر قوم کی تباہی کا باعث ہوئی ہیں، قوم عاد کو بھی اللہ تعالیٰ نے احقاف کے باہر تلوار سے اور احقاف کے اندر ہوا اور ریگ کے طوفان سے برباد کر دیا (ص ۱۷۳) احقاف سے مراد وہ عظیم الشان ریگستان ہے جو سیکڑوں میل تک پھیلا ہوا ہے، (ص ۱۷۴) عاد کے متعلق سید صاحبؒ نے جتنی معلومات فراہم کر دی ہیں، وہ اردو میں کسی کتاب میں نہیں ملتیں، اور دوسری زبانوں میں بھی شاید اتنی معلومات نہ ہوں۔

قوم ثمود | عاد کے بعد سیاسی جانشینی قوم ثمود کو ملی جو اندرون عرب میں رہی اور مغربی وشمالی عرب پر قابض تھی، اس کا دار الحکومت حجر تھا، جو اس قدیم راستہ پر واقع ہے جو حجاز سے شام کو جاتا ہے، اب عموماً اس شہر کو مداین صالح کہتے ہیں، (ص ۱۸۶) سید صاحبؒ کا بیان ہے کہ اس قوم کے سیاسی حالات

بالکل نہیں معلوم ہیں، ان کو تعجب ہے کہ ثمود کا ذکر توراۃ میں بھی نہیں لیکن سید صاحبؒ نے قرآن پاک اور دوسرے ذرایع سے اس کے متعلق مفید معلومات فراہم کی ہیں، جن سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کو بھی فن تعمیر میں عاد کی طرح کمال حاصل تھا، پہاڑوں کو کاٹ کر مکان بنانا، پتھروں سے عمارات و مقابر تیار کرنا اس قوم کا خاص پیشہ تھا، یہ یادگاریں اب تک باقی ہیں، ان پر آرامی و ثمودی خط میں کتبے منقوش ہیں (ص ۱۰۶) سید صاحبؒ کے خیال کے مطابق اس قوم کی تباہی کا سبب بھی وہی ہوا جس سے اور قومیں تباہ ہوا کی ہیں، انھوں نے اللہ تعالیٰ کی پرستش چھوڑ کر ستاروں کے مادی ہیکلوں کے سامنے سر جھکایا، اللہ تعالیٰ نے ان کو سنوارنے کے لیے حضرت صالحؑ کو بھیجا، مگر انھوں نے ان کی تکذیب کی اور وہ برباد کر دیے گئے، اس قوم کی تباہی سے بھی اللہ تعالیٰ کو عبرت اور بصیرت کا درس دینا تھا، اس لیے اس کی تباہی کا ذکر قرآن مجید میں بار بار کیا ہے، سید صاحبؒ نے قرآن مجید کی ایسی ساری آیتوں کو یک جا کر دیا ہے، تاکہ یہ معلوم ہو کہ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کی وجہ سے ایک قوم کیسے ہلاک کر دی جاتی ہے، یونان اور روم کے مورخوں میں ڈائیڈورس (سنہ ۔۔۔ ق م) پلینی (سنہ ۔۔۔) اور بطلیموس (سنہ ۱۴۰ء) نے ثمود کا جو کچھ بھی ذکر کیا ہے، وہ بھی سید صاحبؒ کے زیر نظر رہا۔

متفرق قبائل عاد اور ثمود کے تفصیلی ذکر کے بعد ارض القرآن کے اور قبائل میں سے جرہم، طسم و جدیس، اہل صیون، بنی لحیان، بنو قحطان، الموداد، شلف، حضرموت، اذال، دقلاہ، عوبال، ابی مائل، اوفر، حویلہ اور یوباب کے متعلق بھی کچھ معلومات فراہم کیے گئے ہیں جو ناظرین تاریخ ارض القرآن کا مطالعہ نہیں کر سکتے ان کے لیے ان قبائل سے متعلق مختصر معلومات سید صاحبؒ ہی کے الفاظ میں یہاں پر بیان کر دیے جاتے ہیں۔

جرہم :- یہ قبیلہ حجاز میں آباد تھا، تقریباً دو ہزار دو سو برس قبل مسیحؑ جب حضرت اسمٰعیلؑ اس ملک میں آئے تو یہ قبیلہ ان ہی اطراف میں موجود تھا، عہد ظہور اسلام میں جرہم کی جمعیت باقی نہ تھی۔

طسم وجدیس: خلیج فارس پر یمامہ، بحرین اور عمان کے نام سے جو شہر آباد ہیں، طسم و جدیس دونوں قبیلوں کی آبادی ان سب پر مشتمل تھی، اس کی سیاسی قوت طسم کے ہاتھ میں تھی، مگر طسم و جدیس میں نااتفاقی ہوئی تو یہ غیروں کے ہاتھ سپرد ہوگئے، آخر میں عنزہ ابن اسد اور کہلان قحطانی کی اولاد نے بحرین پر اور بنو حنیفہ نے یمامہ پر قبضہ کر لیا، اسلام آیا تو بحرین اہل فارس کے قبضہ میں تھا، اور ان کی طرف سے ایک عرب خاندان نائب حکومت تھا، یمامہ بدستور بنو حنیفہ کے ہاتھ میں تھا، بحرین نے خود اپنی رضا و رغبت سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں دعوت اسلام کو قبول کیا، یمامہ ایمان لاکر پھر مرتد ہوگیا آخر حضرت ابوبکر صدیقؓ کے زمانہ میں ایک عظیم جنگ کے بعد مطیع ہوا۔ (ص ۲۰۴-۲۰۱)

اہل معین: جوف یمن میں معین نام کی ایک آبادی تھی اس کے شرق میں حضرموت اور جنوب مغرب میں سبا، موجودہ صنعاء واقع تھا، ان کا ذکر تحریری حیثیت سے سب سے پہلے آٹھویں صدی ق م اسفار یہود میں آتا ہے، ان کا ذکر یونانی مورخین بھی کرتے ہیں، پھر ان کے کھنڈرات کے آثار سے ان کے حالات کا پتہ چلتا ہے، یہ تجارت پیشہ قوم تھی، زیادہ تر خوشبودار لکڑی اور بخورات کی تجارت کرتی تھی، اس کے آثار سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ یہ فتح و جنگ میں بھی حصہ لیتی تھی، علمائے آثار نے ان کے تقریباً پچیس بادشاہوں کے نام دریافت کیے ہیں اور بھی بادشاہ ہوئے ہوں گے، گلازر اور ہومل جرمنی کے محققین آثار ہیں، وہ معین کا عہد حکومت ۱۵۰۰ ق م سے ۹۰۰ ق م تک متعین کرتے ہیں جس کے بعد ان کے بیان کے مطابق سبا نے شمال عرب سے آکر معین کو فتح کر لیا۔ (ص ۱۸-۲۰۴)

بنی لحیان: علمائے آثار کے بیان کے مطابق وہ شمالی عرب میں حدود شام اور خصوصاً العلا کے اطراف میں آباد تھے، بنو لحیان عرب کے ایک قبیلہ کا بھی نام ہے جو اسماعیلی قبائل کی شاخ ہذیل بن کنانہ کی فرع ہے، یہ ظہور اسلام میں نجد کے قریب آباد تھی، مسلمانوں کو اس کے ساتھ ایک غزوہ پیش آیا تھا، ان قبائل کے علاوہ اور بھی قبیلے تھے جن کے نام یہ تھے: عبیل، عبس اولیٰ، رقیم، ارقم، وبار

وغیرہ، یمن ہی کے نام کے ساتھ سید صاحب کو کچھ نہیں معلوم ہو سکا، اس کے بعد حسب ذیل قبائل کا ذکر کرتے ہیں:

بنو قحطان: قحطان قبائل یمن کا جد اعلیٰ تھا، اس کے تیرہ بیٹے تھے اور ان کے نام سے قبیلے آباد ہوئے جو یہ ہیں:

الموداد: مشرقی عرب کے ساحل خلیج فارس پر آباد ہوئے۔

شلف: حجاز میں مدینہ اور کوہ خاس کے مابین آباد تھے۔

ہدورام: ہدورام بھی اسی کے آس پاس اقامت پذیر ہوئے۔

ازال: وسط یمن میں آباد ہوئے، جہاں اب صنعا آباد ہے، یہ حضرت مسیحؑ سے چھ سات سو برس قبل تجارت کی بڑی منڈی تھی۔

دقلاہ: یمن میں آباد تھے۔

عوبال: اس خاندان کا نشان نہیں ملتا۔

ابی مائل: یہی سالف اور حجاز کے مابین اقامت پذیر تھے۔

اوفر: یمن کے ساحل پر جاگزین ہوئے، حضرت سلیمانؑ کے جہاز یہاں آکر لنگر انداز ہوتے تھے، اور اسی کے لیے یہاں سے سونا لے جایا کرتے تھے۔

حویلہ: اس کی اولاد یمن میں شمال کی جانب آباد تھی۔

یوباب: یمن کے جنوب میں آباد تھے۔

ان کے علاوہ بنو یلمح، بنو حضرموت اور بنو سبا بھی قحطان کی الگ شاخیں تھیں، بنو یلمح کے متعلق سید صاحبؒ کچھ معلوم نہ کر سکے، البتہ بنو حضرموت اور سبا کے متعلق تفصیلی معلومات فراہم کی ہیں۔

حضرموت: حضرموت کی اولاد عرب کے انتہائی جنوب میں بحر عرب کے ساحل پر یمن کے مشرق میں آباد تھی، ان کی مستقل حکومت تھی، اس خاندان میں بڑے بڑے بادشاہ گذرے، فرزندان حضرموت

زیادہ تر لوگ ان سے ناواقف ہوں گے اور جو بچے انھوں نے اپنے کو قبیلہ کندہ میں ضم کر لیا، سنہ ۔ میں حجاز و نجد سے فارغ ہو کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علیؓ، معاذ بن جبلؓ اور ابو موسیٰ اشعریؓ کو دعوت اسلام کی غرض سے یمن بھیجا، ایک ہی سال کے اندر تمام ملک مسلمان تھا۔ (ص ۲ ۲۳)
یہاں پر ان قبائل کی تھوڑی سی جھلکیاں دکھانے کا یہ مقصد بھی ہے کہ ہمارے بعض ناظرین کو ان کے نام پڑھنے سے گھبراہٹ ہوگی، لیکن حضرت سید صاحبؒ کو ان پر تحقیق کرنے میں لذت ملی جس سے ان کے تحقیقی ذوق کا اندازہ ہوگا، اس کے بعد سبا کا ذکر ہے۔

سبا کا تفصیلی ذکر | یہ اہم قحطانیہ کی بہت مشہور شاخ تھی، اس لیے سید صاحبؒ نے بڑی تفصیل سے اپنی تحقیقات کو قلمبند کیا ہے، اس میں کوئی پیراگراف ایسا نہیں ہے جس میں ان کی کوئی نہ کوئی تحقیق نہیں پائی جاتی، سبا کے نام، سبا کے مرکزی شہر، سبا کی تقسیم و تنظیم، فرمانروایانِ سبا، سبا کا دائرۂ حکومت، سبا کی شاخیں، سبا کی تجارت، سبا کی عمارتوں، سبا کی آبادیوں، سبا اور قرآن مجید، ملکہ سبا اور قرآن مجید اور آخر میں سبا کے زوال پر بہت ہی محققانہ اور ناقدانہ مباحث ہیں، ان تمام باتوں کے متعلق پہلے کے محققین اور مورخین نے جو کچھ لکھا ہے اس کو آنکھ بند کرکے قبول کرنے کے بجائے سید صاحبؒ نے اس کو خوب اچھی طرح پرکھا ہے، پھر اپنی متعلقہ رائے قائم کی ہے، سبا سے ان کو دلچسپی شاید اس لیے بھی ہوئی ہے کہ اس کا ذکر قرآن مجید میں ہے، قرآن مجید میں جو کچھ اس کے متعلق ہے اس کو کھل کر بیان کیا ہے، اس سلسلہ میں ان کی جن تحقیقات سے ہم جو معلومات حاصل کر سکتے ہیں ان کو مختصر طریقہ پر یہاں اپنے ناظرین کے لیے درج کرتے ہیں:

عربی میں سبا کے معنی شراب کی تجارت اور اس کی خرید و فروخت کے لیے سفر کے ہیں، چونکہ سبا تاجر قوم تھی اس لیے اس لقب سے مشہور ہوئی، حضرت داؤدؑ کی زبور میں شاہانِ سبا کا ذکر صریح موجود ہے، اور زبور کا زمانۂ تصنیف دسویں صدی قبل مسیح کا وسط حصہ ہے، اس لیے سبا کا ابتدائی

زمانہ عروج ۱۱۰۰ سنہ قبل مسیح سے کسی حال میں کم نہیں ہو سکتا، سبا کا اصلی مرکز حکومت جنوب عرب میں یمن کا مشرقی حصہ تھا، اس کا دار الحکومت شہر مارب تھا، لیکن رفتہ رفتہ اس کا دائرہ مغرب میں حضر موت تک وسیع ہوگیا تھا، اور چونکہ یہ ایک تاجر قوم تھی، اس لیے بہت سے بحری اور تجارتی مقامات پر اس کو قبضہ کرنا پڑا تھا، اسی سلسلہ میں شمالی عرب میں سبا کی حکومت قائم ہوگئی، اور افریقہ میں بھی اس کے آثار ملتے ہیں کہ سبا کی حکومت پہلے ایک تھی حقیقی سبا کی تاریخ ۱۰۰۵ برس تک رہی، جس میں تقریباً پچاس بادشاہوں کی پشتیں گذریں، ان کا لقب ملک سبا تھا، دار الحکومت شہر مآرب تھا، مارب کے قصر شاہی کا نام سلحین تھا جو قوی ہوتا تھا وہی بادشاہ بن بیٹھتا تھا وہ کسی قلعہ میں سکونت اختیار کرتا تھا، گاؤں میں بھی قلعے ہوتے تھے، قلعہ والا گاؤں کا حاکم ہوتا تھا، سبا کے باشندے زیادہ تر تاجر تھے، وہ عمدہ خوشبودار چیزیں، جواہرات اور سونے کی تجارت کرتے تھے، وہ اپنی دولت کو زیادہ تر عمارتوں کی تعمیر میں خرچ کرتے تھے، شاہی قصر سلحین کے کھنڈرات اب تک موجود ہیں، وہ پہاڑوں اور وادیوں کے بیچ میں بڑے بڑے بند بھی باندھا کرتے تھے، تاکہ ان کا پانی زراعت کے مصرف میں آئے، ان میں سب سے مشہور سد مارب تھا جو دار الحکومت کے اندر واقع تھا۔

اوپر کی سطروں میں جو خلاصہ ہے وہ سید صاحبؒ کی کتاب کی بہت سی ورق گردانی کے بعد ہی کیا گیا ہے، جس کو انھوں نے خود بہت سے کتبات، پھر زبور، تورات اور قلقشندی، ابو الفداء، ابن خلدون، مسعودی، یونانی مورخ اگاتھرشیڈس، اور اڈ تھینس وغیرہ کی تصانیف کے مطالعہ کے بعد ہی قلمبند کیا ہے

سبا پھر سبا کا جو ذکر کلام مجید میں آیا ہے، اس کی پوری تفصیل لکھی ہے، اس طرح قرآن مجید کو ایک تاریخی ماخذ بھی بنادیا ہے، یونانی مورخوں میں اگاتھرشیڈس ۱۲۰ ق م، آرٹی میڈورس لکھتے ہیں کہ سبا سرسبز و شاداب علاقہ ہے، یہاں تخم ریزی سال میں دو بار ہوتی ہے یہ ملک خوش و خرم ہے (ص ۲۵۲) یہاں بہت اچھے اچھے بے شمار میوے ہوتے ہیں، نہایت خوبصورت درخت ہیں، اندرون ملک

نخلستان، خار چینی اور چھواروں کے نہایت بلند درختوں کے گنجان جنگل ہیں، (ص ۲۵۳) سید صاحبؒ نے قرآن کی سورۂ سبا رکوع ۲ سے بھی یہ دکھایا ہے کہ یہاں باغوں کا سلسلہ دائیں بائیں تھا (ص ۲۵۲)

توراۃ، انجیل اور قرآن میں سبا کی ایک شہزادی کا ذکر ہے، سید صاحبؒ نے اس پر پوری بحث کر کے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ یونانی مورخ یوسیفوس کا یہ خیال غلط ہے کہ وہ مصر کی شہزادی یا شرقیہ جنوب یا حبشہ کی تھی، سید صاحبؒ کا خیال ہے کہ وہ یمن ہی کی تھی (ص ۲۵۶) سید صاحبؒ اس بات کو بھی ماننے کے لیے تیار نہیں کہ ملکہ سبا کا نام بلقیس تھا، (ص ۲۵۷) قرآن مجید کی سورۂ نمل میں ملکہ سبا کا جو ذکر آیا ہے اس کو اس سورہ سے سید صاحبؒ نقل کر کے لکھتے ہیں کہ یہی قصہ اسفار یہود میں بھی مذکور ہے، گو تفصیل اور اجمال میں کسی قدر اختلاف ہے، پھر نبیم کے سفر ایام اور سفر ملوک میں جو قصہ مذکور ہے، اس کے بھی اقتباسات دے دیے ہیں، ترگوم میں جو توراۃ اور نبیم کا آرامی ترجمہ ہے، یہ قصہ زیادہ تفصیل سے ہے، سید صاحبؒ نے اس کے بھی اقتباسات دیے ہیں، لیکن لکھا ہے کہ اس میں بعض لغو باتوں کی آمیزش کر دی گئی ہے، (ص ۲۶۱) ملکہ سبا کے قصہ پر سید صاحبؒ نے بڑی ناقدانہ بحث کی ہے، ترگوم اور قرآن مجید دونوں میں قصہ کی ابتداء ہُدہُد سے ہوتی ہے، بعض نطرت پرست کہتے ہیں کہ مرغ کا بولنا اور اس کی بولی سے مفہوم سمجھنا خلاف عقل ہے، سید صاحبؒ اس کا جواب دیتے ہیں کہ اب جب کہ جانوروں کی عاقلیت کا مسئلہ مسلم ہوتا جاتا ہے، بندروں کی بولیوں کی ابجد تیار کی جارہی ہے تو ہُدہُد کے بولنے پر تعجب کیوں ہے؟ (ص ۲۶۲)

قرآن مجید میں ہے کہ ملکہ سبا اپنے ساتھ ایک تخت بھی لائی تھیں، سید صاحب اس پر بحث کرتے ہیں کہ ملکہ سبا جو تخت ساتھ لائی تھیں اس کی نوعیت کیا تھی؟ ان کی رائے ہے کہ سبا میں صنعت کاری بہت عمدہ ہوتی تھی، اسی کا ایک نمونہ بنا کر ملکہ سبا نے تحفہ کے طور پر تخت حضرت سلیمانؑ کو پیش کیا، قرآن مجید میں عِنْدَهُ عِلْمٌ مِّنَ الْكِتَابِ آیا ہے، کتاب سے مراد بعض مفسرین توراۃ اور بعض مدعی کلام جدید اور جسٹر

مشہور ہو چکے ہیں۔ سید صاحبؒ اس سے خود واقف ہیں۔ (ص ۲۶۶) سید صاحبؒ یہ بھی لکھتے ہیں کہ قرآن مجید میں ہے کہ ملکہ سبا حضرت سلیمانؑ کے ہاتھ پر اسلام لائی، لیکن ضمیم سے اس کا پتہ نہیں ہوتی (ص ۲۶۶) سید صاحبؒ قرآن مجید کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ سبا کے لوگ آفتاب پرست تھے اور جب انھوں نے اللہ تعالیٰ سے سرتابی کی تو اللہ تعالیٰ نے ایک سیلاب کے ذریعہ سے ان کو تباہ و برباد کر دیا، جیسا کہ قرآن مجید کی سورۂ سبا-۲ سے ظاہر ہوگا۔

سید صاحبؒ کی تحقیقات کے مطابق سبا کے مقبوضات تین حصوں میں منقسم تھے، حبش، یمن اور شمالی عرب، ۱۱۵ ق م میں یہ شیرازے بکھر گئے، حبش پر اکسومی خاندان (اصحاب الفیل) قبضہ کر بیٹھا، شمالی عرب میں اسماعیلی عربوں نے خروج کیا، یمن میں حمیر نے ظہور کیا، اور بقیہ قبائل تمام ملک میں تتر بتر ہو گئے" (ص ۲۶۸)

حمیر | اس کے بعد حمیر یعنی سبا کے طبقۂ ثالثہ و رابعہ (۱۱۵ ق م تا ۵۲۵ء) اور قوم تبع و اصحاب الاخدود کی تاریخ قلمبند کی گئی ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ حمیر مغربی یمن میں بحر احمر و بحر عرب کے متصل آباد تھے، (ص ۲۰۵) سبائے حمیر کی تاریخ پہلی صدی ق م کے اوسط سے شروع ہوتی اور ۵۲۵ء میں ختم ہوتی ہے، اس بنا پر حمیر کی کل مدت حکومت تقریباً ۵۵۰ برس قرار پائے گی (ص ۲۰۷) مگر ان کی تاریخ مسلسل نہیں رہی، ان کے بادشاہ بدلتے رہے، لیکن ان کی دولت و ثروت کی شہرت اس قدر ہو گئی تھی کہ رومن لٹریچر میں ان کی دولت ضرب المثل بن گئی تھی، (۲۸۴)

تبع | حمیر کے طبقۂ ثانیہ میں وہ سلاطین تھے، جن کا لقب ملک سبا و ریدان و حضرموت ہے، عرب ان کو تبع کہتے ہیں، قرآن مجید میں ان کا ذکر دو بار آیا ہے، دونوں بار ان کی قوت و زور، جبروت و عظمت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، پہلی آیت میں صرف جبار قوموں میں ان کا بھی نام ہے، دوسری آیت میں قریش کو مخاطب کر کے کہا گیا ہے کہ وہ اس لیے تباہ ہوئے کہ ان کو اپنی توانائی اور زور مندی پر ناز تھا (۲۸۸)

سید صاحبؒ نے تبابعہ کی تعداد ان کے سیاسی اور تمدنی حالات بھی لکھے ہیں، تبابعہ حمیر عیسائیت سے زیادہ یہودیت کو ترجیح دیتے تھے، یہاں تک کہ ان کے ایک فرماں روا ذونواس نے نجران کو فتح کیا تو گڈھوں میں آگ لگوادی اور ایک ایک کرکے عیسائیوں کو بلایا جس نے یہودیت قبول کرنے سے انکار کیا اس کو نذر آتش کیا، قرآن مجید میں اصحاب الاخدود کے نام سے اس واقعہ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ (ص ۲۹۶)

اس جلد کا آخری باب اصحاب الفیل یا ابنائے حبش ہے، اس میں مکہ معظمہ پر ابرہہ کے حملہ کی تفصیل کے ساتھ اس کی نوعیت پر پوری بحث ہے، قرآن مجید کی سورۂ فیل کی بھی پوری تشریح کی گئی ہے۔

اوپر کی سطروں میں تاریخ ارض القرآن کی پہلی جلد کا بہت ہی مختصر خلاصہ ہے جس کے پڑھنے میں ہمارے ناظرین کو شاید زیادہ دلچسپی نہ ہو، اس لیے کہ یہ موضوع بہت ہی خشک اور غیر دلچسپ ہے، لیکن اس موضوع کو اختیار کرکے سید صاحبؒ نے اپنی تحقیقات کی ایک دنیا آباد کر دی ہے، اور اس موضوع سے دلچسپی رکھنے والے جب کبھی اس کو شروع سے آخر تک پڑھنے کی زحمت گوارا کریں گے تو ان کو احساس ہوگا کہ اس میں جو باتیں لکھی گئی ہیں وہ اسی وقت لکھی گئی ہوں گی جب اس کے لکھنے والے نے اپنے جسم کے خون کو پسینہ کر دیا ہوگا، ناظرین کا یہی احساس اس کتاب کی تدوین کا اصلی صلہ ہوگا، راقم نے اس کا خلاصہ اس لیے بھی کیا ہے کہ جو لوگ تاریخ ارض القرآن پڑھنے کی زحمت گوارا نہ کرسکیں ان کو معلوم ہو جائے کہ اس میں کیا چیز لکھی گئی ہے اور کیسی دقت نظر اور کاوش تحقیق سے قلمبند ہوئی ہے۔

آل ابراہیمؑ | ارض القرآن کی دوسری جلد آل ابراہیمؑ کے سلسلہ سے شروع ہوتی ہے، جن کو سید صاحبؒ امم سامیہ کے طبقۂ ثالثہ میں شمار کرتے ہیں، اس کی ابتداء اس طرح کی ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کی تین بیویاں تھیں، سارہ، ہاجرہ اور قطورا، سارہ کے بیٹے حضرت اسحاقؑ تھے، ان کے دو بیٹے تھے، حضرت یعقوبؑ

اور عیسو، حضرت یعقوبؑ بنی اسرائیل کے باپ تھے، عیسو اپنے باپ بھائی سے الگ ہو کر اپنے چچا حضرت اسمٰعیلؑ کے پاس متوطن ہو گئے تھے، ہاجرہ کے بطن سے صرف حضرت اسماعیلؑ تھے، جو عرب ہی میں سکونت پذیر رہے، قطورا کی تمام اولاد بھی عرب ہی میں رہی، ان کے دو بیٹوں کے نام مدین اور ددان تھے،

بنو قطورا، مدین | اتنا لکھنے کے بعد اس دوسری جلد کا آغاز بنو قطورا سے ہوا ہے، ان کی تاریخ زبور، توراۃ، انجیل اور قرآن مجید کے علاوہ تاریخ بنی اسرائیل، برٹن کی گولڈ مائنس، فارسٹر کی تاریخی جغرافیہ تاریخ طبری، معجم البلدان، یاقوت اور کچھ کتابات کی اخذ بنا کر لکھی گئی ہے قطورا کے ایک بیٹے کا نام مدین تھا، اس کے نام سے بنو مدین کا سلسلہ چلا، مدین شہر اور قبیلہ کا نام بھی ہو گیا، مدین کی حد بڑا یا ارقیم، ملک شام کے قریب بحر میت اور خلیج عقبہ کے درمیان تک تھی، (ص ۶) وہ بتوں کی پرستش کرتے اور ان کے لیے قربانی کرتے، (ص ۷) ان کے بتوں کا سردار بعل فور تھا، ان کی اخلاقی حالت اس درجہ پست تھی کہ شرفائے خاندان کی لڑکیاں انسانیت کا بدترین نمونہ تھیں (ص ۷) وہ بنی اسرائیل سے متصادم ہوئے تو حضرت موسیٰؑ نے بارہ ہزار لڑنے والوں کو ان کے مقابلہ کے لیے بھیجا، لڑائی میں مدین کے پانچ سردار مارے گئے اور تمام مرد، بچے اور عورتیں قتل کر دی گئیں، (ص ۸) اس کے بعد شہر مدین اسماعیلی عربوں کے ہاتھ میں آ گیا، قوم مدین کی تباہی کے تقریباً ۱۵۰ برس کے بعد اسماعیلی قبیلہ کے لوگ بنی اسرائیل پر حملہ آور ہوئے، ہر سال وہ ان کے ملک میں آتے اور جو کچھ پاتے لوٹ لیتے، فرزندانِ اسرائیل آبادی چھوڑ کر پہاڑوں اور غاروں میں روپوش ہوئے، آخر میں بنی اسرائیل کے ایک سردار جدعون نامی نے بنی اسرائیل کی قوت کو جمع کیا، (ص ۸) اس کے بعد سید صاحبؒ قرآن مجید کی ان تین آیتوں سے مدد لیتے ہیں جن میں حضرت شعیبؑ کا ذکر ہے، ان سب کو نقل کرنے کے بعد وہ لکھتے ہیں کہ حضرت شعیبؑ مدین کے خاندان سے تھے، (ص ۱۳) حضرت شعیبؑ نے ان کو لڑائی، فتنہ و فساد سے روکا اور ان سے کہا کہ ان کے پاس جو کچھ ہے اس پر قناعت کریں، (ص ۱۵) ان کو بت پرستی سے روکا چاہا، صحیح ناپ تول کی ہدایت دی،

حرام چیزوں سے بچنے کی تلقین کی لیکن اس رشد وہدایت کے باوجود وہ اپنے فتنہ وفساد سے باز نہ آئے، اور آخر میں بنی اسرائیل کے ہاتھوں تباہ ہوئے، (ص ۱۶) ان تمام باتوں کو قلم بند کرنے میں قرآن میں جو کچھ کہا گیا ہے اس کی مطابقت توراۃ سے بھی کی گئی ہے، اور قرآن کی آیتوں کے سمجھنے میں مفسرین نے جو تاویلیں کی ہیں ان پر بھی سید صاحبؒ اپنی رائے کا اظہار کرتے گئے ہیں۔ (ص ۱۵)

اصحاب الایکہ | قطورا کے دوسرے بیٹے کا نام ددان تھا، جو اصحاب الایکہ کہلاتے تھے، جس کے معنی جنگل کے رہنے والے ہیں، سید صاحبؒ کا خیال ہے کہ وہ آٹھ سو برس جنگل میں رہے، (ص ۲۳) ان کے پیغمبر بھی حضرت شعیبؑ تھے، قرآن مجید میں ان کا ذکر چار سورتوں یعنی حجر، شعراء، ص اور ق میں ہے، (ص ۲۴) انھوں نے بھی حضرت شعیبؑ کی تکذیب کی اور وہ بھی تباہ کر دیے گئے، مفسرین کا بیان ہے کہ تمام اصحاب الایکہ ہلاک ہو گئے، لیکن سید صاحبؒ لکھتے ہیں کہ قرآن مجید میں اس قسم کا کوئی بیان نہیں ہے (ص ۲۶)

ادوم | اس کے بعد بنو سارہ کے بنو ادوم اور حضرت ایوبؑ سے متعلق تفصیلات لکھنے میں انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا، گبن کی ڈیکلائن اینڈ فال آف دی رومن امپائر، برٹن کی گولڈ مائنس، فارسٹر، توراۃ اور کلام پاک سے مدد لی گئی ہے، اس میں جو کچھ لکھا گیا ہے اس سے یہ ظاہر ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کی دوسری بیوی سارہؑ کے دوسرے لڑکے عیسو معروف بہ ادوم اپنے بھائی حضرت یعقوبؑ سے روٹھ کر اپنے سوتیلے چچا حضرت اسماعیلؑ کے پاس چلے آئے، ان کی بیٹی سے شادی کی، پھر اور چند شادیوں سے ان کی متعدد اولادیں ہوئیں، جو شام سے انتہائے یمن تک میں آباد ہوتی گئیں، ادوم نے عظیم الشان حکومت سعیر میں قائم کی، ان کا دار السلطنت سلاع (پڑا) تھا، چھٹی صدی ق م میں یہ اسیریا کے ہاتھوں تباہ ہوئے، پھر ان پر اسماعیلی عربوں کا قبضہ ہو گیا جن کا نام تاریخ میں نبط ہے، (ص ۳۱) ادوم کی ایک نسل کا نام عوض تھا، حضرت ایوبؑ جن کا ذکر قرآن مجید اور اسفار یہود دونوں میں ہے، اسی نسل سے تھے

ان کا مسکن بصرہ تھا، ان کا زمانہ سنہ [illegible] اور سنہ [illegible] ق م کے درمیان کا ہے (ص ۳۶) پھر اس کی طرف توجہ دلائی گئی ہے کہ قرآن میں حضرت ایوبؑ کا نام سورۂ نساء، انعام، انبیاء اور ص میں آیا ہے، سورۂ انبیاء اور ص میں ان کا ذکر ذرا تفصیل کے ساتھ ہے، وہ بڑے توانا و تندرست تھے، کثیر الاولاد اور صاحب دولت تھے، مگر اللہ تعالیٰ نے ان کو ابتلاء میں ڈال دیا، کلدانی ان کی ساری دولت کو لوٹ کر لے گئے، ان کے غلاموں کے دستہ پر سبائی قابض ہو گئے، ان کی اولادیں ایک چھت کے نیچے دب کر ہلاک ہو گئیں، تندرستی بھی خراب ہو گئی، تمام بدن خراب ہو گیا، عزیز و اقارب نے کنارہ کشی کر لی، ایک بیوی رفیق حال تھی، اس نے بھی صلاح دی کہ غیر خدا کے سامنے جھکو اور خدا کو برا کہو، مگر حضرت ایوبؑ کی زبان مبارک سے شکر و رضا کے سوا کچھ نہ نکلا، پھر خدا نے ازسرنو دوچند دولت اور اولاد عطا کی (ص ۳۷) حضرت ایوبؑ کی یہ تفصیل اس لیے لکھی گئی ہے کہ جو لوگ بنوسارہ پر تحقیق کرنا چاہیں ان کے لیے قرآن مجید بھی ماخذ کا کام دے سکتا ہے۔

بنو ہاجرہ | اس کے بعد بنو ہاجرہ یعنی حضرت اسمٰعیل علیہ السلام، اصحاب الرس، اصحاب الحجر، اصحاب الایکہ، انصار اور قریش کا ذکر آتا ہے، جس میں قرآن مجید، صحیح بخاری اور توریت کے علاوہ معارف ابن قتیبہ، اخبار الطوال دینوری، ریفیڈ فاسٹر، معجم البلدان یاقوت، مروج الذہب کے حوالے ہیں، اس کے مطالعہ سے معلوم ہوگا کہ حضرت ابراہیمؑ کی بیوی ہاجرہؑ سے حضرت اسمٰعیلؑ پیدا ہوئے، ان کا مسکن حجاز ہی تھا، (ص ۴۹ - ۴۸) ان کے تیرہ اولادیں تھیں، بارہ بیٹے اور ایک بیٹی، بیٹوں کے نام یہ تھے: نبایوط، قیدار، ادبائیل، میشام، مشماع، دوماہ، مشا، حدر، تیما، نفیس اور قیدماہ، یہ بارہوں بیٹے اپنے اپنے خاندان کے رئیس تھے، سب سے بڑا نبایوط اور چھوٹا قیدار تھا، یہ تمام بھائی باپ کے زمانہ میں ایک عرصہ تک حجاز ہی میں رہے، وہ یمن و حجاز سے شام اور مصر تک تجارت کرتے تھے، حضرت موسیٰؑ کے عہد میں تقریباً سنہ [illegible] ق م وہ یمن سے شام تک

پھیل گئے تھے، (ص ۵۰)

اصحاب الحجر | حضرت اسماعیلؑ کے تمام بیٹوں سے جو نسل چلی اس میں سے ہر ایک کے متعلق مفید معلومات کچھ نہ کچھ فراہم کی گئی ہیں، لیکن نیابوط یا نابت یا نبط (اصحاب الحجر) کے بارہ میں زیادہ تفصیلات ہیں، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ پہلے وہ بدویانہ زندگی بسر کرتے تھے (ص ۵۹) پھر وہ صاحب حکومت ہو گئے، ان کا رقبۂ حکومت خلیج عقبہ سے بحر میت تک تھا (ص ۵۹) بادشاہوں کے نام اور مدت حکومت بھی درج کی گئی ہے (ص ۶۲) یونانی اور یورپی مصنفوں کے حوالہ سے ان کے پورے تمدن کی بھی تصویر کھینچ دی گئی ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے آداب معیشت اور ان کا تمدن سب سے بہتر تھا، (۶۳) انباط کے زمانہ کے سیاسی حالات قلمبند کرنے میں بابل، ایران اور یونان کی جو تاریخ سمیٹ کر لکھی گئی ہے، وہ بہت ہی پُر مغز اور قابل مطالعہ ہے، (ص ۶۴-۶۶) انباط کی حکومت رومیوں کے اقتدار میں بالکل چھپ گئی، آخر میں سید صاحب لکھتے ہیں کہ اس عظیم الشان قوم کا عروج و زوال، حیات و موت، زندگی و قاصب ہمقوم عرب کے لیے بہت سبق آموز تھا، اسی لیے قرآن مجید میں ان کا ذکر اس طرح کیا گیا ہے کہ اہل حجر (یعنی اصحاب الحجر) نے پیغمبروں کو جھٹلایا، یعنی گذشتہ اور معاصر پیغمبروں کی ہدایات قبول نہ کیں، ہم نے ان کو اپنی نشانیاں دیں، ان سے منھ پھیر لیا، اور یہ پہاڑوں کو کاٹ کر مکانات بناتے تھے، جن میں امن و آرام کے ساتھ رہتے تھے، ان کو عذاب نے صبح کرتے ہوئے لے لیا، پھر ان کے کارناموں نے ان کو کوئی فائدہ نہ بخشا (سورۂ حجر) (ص ۷۵) قرآن مجید کی ان آیتوں سے ان کی پوری تاریخ سامنے آجاتی ہے، ان کی بڑی حکومت تھی، تمدن بھی اونچا تھا، مگر انھوں نے اپنے معاصر اور گذشتہ پیغمبروں کی تکذیب کی، اس لیے تباہ کر دیے گئے، سید صاحبؒ لکھتے ہیں کہ تمام مفسرین نے اصحاب الحجر سے قوم ثمود مراد لیا ہے، لیکن سید صاحبؒ کو ان سے اتفاق نہیں، اور وہ پورے وثوق کے ساتھ

لکھتے ہیں کہ اصحاب الحجر ثمود کے علاوہ تھے، یعنی اصحاب الحجر انباط ہی کا لقب تھا (ص ۷۵)

آل غسان انباط کے مٹنے کے بعد بہت سے عرب قبائل اندرون ملک سے خالی جگہ کو بھرنے کے لیے نکل آئے، جن میں زیادہ مشہور آل غسان تھے، جو انباط ہی کے ہم نسب تھے، (ص ۷۸) ان کی تاریخ لکھنے میں ایران اور روم کی تاریخوں کے ساتھ عرب کے بعض شعرا اور مورخین میں ابو الفدا، مسعودی، حمزہ اصفہانی اور ابن قتیبہ کے بھی حوالے آئے ہیں، اور آخر میں بخاری شریف کو بھی سند میں پیش کیا گیا ہے،

عام علمائے انساب کی تشریح کی بنا پر آل غسان قحطانی سبا کے خاندان کہلان سے تھے، سید صاحبؒ نے اس پر ناقدانہ تجزیہ کرکے پورے وثوق کے ساتھ بتایا ہے کہ یہ نابت ابن اسمٰعیل کی ایک اور شاخ تھی، (ص ۷۹) ان کی تاریخ سید صاحبؒ نے جو قلمبند کی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے ابتدائے عہد کی تاریخ تو نہیں معلوم ہے لیکن دوسری صدی عیسوی کے وسط میں غسانی تہامہ میں اقامت گزین تھے، اس کے بعد وہ حدود شام میں منتقل ہوگئے، ان اطراف میں ان کی انتہائے حکومت کا زمانہ ۶۳۳ء یعنی حضرت عمر فاروق اعظمؓ کا زمانہ ہے، (ص ۸۰) پھر ان کے بادشاہوں کے کچھ نام بھی درج کیے گئے ہیں، اور ان کی تاریخ بتاتے ہوئے لکھا ہے کہ غسانیوں نے عموماً عیسائی مذہب اختیار کرلیا تھا، اور وہ رومیوں کا ساتھ دیتے تھے، ان کی مدد سے رومی ایرانیوں پر غالب ہوجاتے تھے (ص ۸۳) مگر جب مجوسیت اور عیسائیت میں زور آزمائیاں ہوئیں تو خسرو پرویز کی اولوالعزمیوں کی وجہ سے ۶۱۳ء میں رومیوں کو شام میں شکست فاش ہوئی، جس کے بعد غسانیوں کی بساط بھی الٹ گئی، لیکن دفعۃً ہوا کا رخ بدل گیا، ۶۱۶ء تک رومیوں نے ایک ایک کرکے اپنا ملک واپس لے لیا، غسانیوں نے سنبھالا لیا، حارث بن ابی شمر ایک طاقتور شخص غسانیوں کا بادشاہ ہوا، اور جب اسلام کا نیر تاباں شعاع افگن ہوا، تو ۶۲۹ء میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلام کی دعوت غسانی فرماں روا جبلہ کے پاس بھیجی، مگر اس نے اسلام کے سفیر کو قتل کر ڈالا، اور بدمست ہوکر مدینہ پر حملہ کی تیاری کرنے لگا جس کے

بعد مسلمانوں اور غسانیوں کا تصادم مقام موتہ میں ہوا اور ایک غیر منفصل جنگ ہوئی، پھر سنہ ۶۳۱ء میں مدینہ میں خبر پہونچی کہ ہرقل غسان وغیرہ عرب کے بعض قبیلوں کو لے کر مدینہ پر حملہ کی تیاریاں کر رہا ہے، تو خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تیس ہزار جان نثاروں کے ساتھ شام کا رخ کیا، اور تبوک کے مقام پر پہونچ کر بیس روز تک رومیوں اور غسانیوں کا انتظار کیا، لیکن وہ وہاں نہ پہونچے، پھر سنہ ۶۳۲ء میں حضرت اسامہؓ کی قیادت میں ایک بہت بڑی جمعیت شام کی طرف جانے کو تیار تھی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا وصال ہوگیا، حضرت عمر فاروق اعظمؓ کے زمانہ میں مسلمانوں نے شام پر مسلسل حملے شروع کیے، تو غسانی شہزادہ جبلہ اسلام لے آیا اور پھر نہایت تزک و احتشام سے مدینہ آیا، حضرت عمر فاروقؓ نے اس کی بڑی عزت کی، اتفاق سے حج کا موسم آگیا، تو جبلہ بھی حج کرنے مکہ معظمہ پہونچا، طواف میں اس کی چادر کا ایک گوشہ ایک بدوی عرب کے پاؤں کے نیچے دب گیا، نومسلم شہزادے نے غصہ میں اس کو ایک طمانچہ مارا، بدوی نے حضرت عمرؓ سے فریاد کی، حضرت عمرؓ نے جبلہ سے فرمایا تم کو اس کا قصاص دینا ہوگا، شہزادے نے کہا کہ ایک عامی شخص کے مقابلہ میں بادشاہ کی کوئی عزت نہیں، حضرت عمرؓ نے فرمایا: ہاں! اس بارگاہ میں شاہ و گدا کی کوئی تمیز نہیں ہے اس کے بعد جبلہ چھپ کر شام چل دیا، اور وہاں عیسائی بن کر قسطنطنیہ چلا گیا۔ (ص ۸۴)

اوس وخزرج | اس کے بعد اوس و خزرج کے قبیلوں کا ذکر ہے، وہ مدینہ میں سکونت پذیر تھے، عام طور سے ان کو بھی قحطانی الاصل اور کہلان کے خاندان سے سمجھا جاتا ہے، لیکن سید صاحبؒ کے نزدیک یہ رائے صحت سے تہی مایہ ہے، زبان، مذہب اور اخلاق قومی کے علاوہ روایات کے لحاظ سے بھی ان کے اسماعیلی ہونے کے مستحکم دلائل پیش کیے ہیں (ص ۸۵) پھر ان کی جو تاریخ لکھی گئی ہے اس سے ظاہر ہے کہ اوس اور خزرج کے متعدد فروع اور شاخیں تھیں، ان کی تاریخ ان کے ہم وطن یہودیوں سے مخلوط ہے مدینہ کے اطراف میں یہودی بکثرت آباد تھے، ان کے بڑے بڑے قلعے تھے، جن کا ذکر قرآن مجید کی سورہ حشر میں بھی ہے، ان کے مالی کاروبار کا جال تمام ملک میں پھیلا ہوا تھا، اوس اور خزرج گو بدویانہ قوت میں

ان سے زیادہ تھے، لیکن سامان، دولت، ہنر اور دیگر تمائے معنوی میں ان سے فروتر تھے، اس لیے
وہ یہودیوں سے بہت زیادہ متاثر تھے، ان میں ان کے مذہبی اثرات بھی پائے جاتے تھے، لیکن جب
اوس اور خزرج ان سے تنگ آگئے تو اپنے ہم نسب غسان سے مدد طلب کی، غسانیوں نے آکر یہودیوں
کا زور توڑا، مگر بعد میں یہودیوں سے برابر لڑائیاں ہوتی رہیں، فریقین نے تھک کر مصالحت کر لی،
اور قبیلہ عوف بن خزرج کے سردار عبداللہ ابن ابی کو بالاتفاق اپنا بادشاہ اور یثرب کا تاجدار تسلیم کرنا
چاہا کہ اسی اثناء میں خورشید اسلام طلوع ہوا، اور اوس و خزرج کے بارہ آدمیوں نے موسم حج میں داعی
اسلام کا وعظ سنا اور ایمان و بیعت سے مالامال ہو کر گھر واپس آئے، دوسرے سال اسی موسم میں
ستر آدمی اور فروغ اسلام سے منور ہو گئے، اور آخر نبوت کے تیرہویں سال سنہ ۶۲۲ء میں رحمت عالم
کو یثرب کی شہنشاہی کے لیے لے آئے، اوس اور خزرج نے انصار کے نام کے ساتھ اسلام میں زندگی
جاوید پائی، اور ان ہی کے لیے قرآن مجید میں کہا گیا ہے کہ جن لوگوں نے اسلام کو پناہ دی، نصرت کی
وہی سچے مومن ہیں، ان کے لیے مغفرت اور اچھا رزق ہے (انفال ۱۰) (ص ۸۹)

قیدار: اس کے بعد بنو قیدار کا ذکر ہے قیدار حضرت اسماعیلؑ کا دوسرا بیٹا تھا، لیکن شہرت اور اعزاز
میں تمام بھائیوں سے ممتاز تھا، اس نام کی توضیح اس طرح کی گئی ہے کہ عبری میں قیدار کے معنی سیاہی
اور غم کے ہیں، عربی میں بھی لفظ کدر و کدورت ہے، شاید حضرت اسمٰعیلؑ نے یہ نام باپ سے جدائی اور
اور صحرا نوردی کے غم کی یادگار میں رکھا ہو، (ص ۹۰)

قیدار کی تاریخ لکھنے میں زبور، تورات، اسیریا کے کتبات اور یونان کے جغرافیہ دانوں سے
مدد لی گئی ہے، ان کی اس میں یہ تحقیق ہے کہ قوم ہونے کی حیثیت سے قیدار کا نام سب سے پہلے سنہ ۱۰۰۰ ق م
میں حضرت داؤدؑ کی زبور میں نظر آتا ہے بنو قیدار اس زمانہ میں خیموں میں رہتے تھے، حضرت داؤدؑ بادشاہی سے پہلے بہت دنوں تک
قیدار کے خیموں میں رہے تھے، (ص ۹۱) اس میں جو تفصیلات ہیں ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ بنو قیدار نے رفتہ رفتہ شمالی عرب کے مختلف گوشوں

میں مختلف ریاستیں قائم کرلیں، (ص ۹۳) اشعیا نبیؑ آٹھویں صدی ق م میں تھے، ان کا بیان ہے کہ قیدار ایک شاندار اور بہادر قوم تھی، گاؤں میں بھی ان کی بہت سی آبادیاں تھیں، بھیڑ، بکری ان کی تجارت تھی، (ص ۹۳) اشعیا (سنہ ۸۰۰ ق م) حزقیال (سنہ ۵۹۰ ق م) اور یرمیاہ (سنہ ۶۲۶ ق م) نے بابل کے خونخوار بادشاہوں سے ان کو ہشیار کیا تھا، یرمیاہ نبی نے کہا تھا کہ ان کو بابل کا بادشاہ تباہ کر دے گا (ص ۹۴) اس تباہی سے پہلے قیدار کے متفرق رؤسا میں عربوں کے نزدیک سب سے زیادہ مشہور رئیس عدنان تھا، قیدار کی نسل کی تمام شاخیں شجرۂ انساب میں اسی عدنان تک منتہی ہوتی ہیں (ص ۹۳) پیغمبر عالم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نسل قیدار کی شاخ عدنان ہی سے پیدا ہوئے، (ص ۹) جب بابل کا حکمراں بخت نصر عراق سے لے کر شام، مصر اور عرب تک کی خاک اڑا رہا تھا تو اس وقت عربوں کا رئیس کل معد بن عدنان تھا، (ص ۹۴) اس کے دو بیٹے تھے، ایک کا نام نزار تھا، نزار کے پانچ بیٹے تھے، جن سے پانچ شاخیں قائم ہوئیں، ان میں دو یعنی انمار اور ایاد نے کوئی بڑی قوت حاصل نہیں کی، لیکن تین ربیعہ، قضاعہ اور مضر نے کثرت تعداد، دنیاوی اعزاز اور سیاسی اقتدار میں بڑی ناموری حاصل کی، حجاز، نجد اور عراق میں ان کی بڑی چھوٹی ریاستیں قائم ہوئیں، (ص ۹۵)

قریش | اسی کے بعد قریش کا عنوان قائم کر کے اس کی تاریخ قلمبند کی گئی ہے، اس کا بھی سلسلہ حضرت اسماعیلؑ سے دکھایا گیا ہے، حضرت اسماعیلؑ کے بیٹے قیدار کا بیٹا عدنان تھا، عدنان کا بیٹا نزار اور نزار کا بیٹا مضر تھا، مضر کی شاخ متعدد وسیع خاندانوں میں تقسیم ہوگئی، جن میں سے ایک

خاندان قریش کا تھا، اس خاندان کا بانی فہر تھا، فہر کا لقب قریش تھا، قریش کے متعدد معنے ہیں، ایک معنی اکتساب و تحصیل ہے، خیال ہے کہ چونکہ اس خاندان کا اصلی پیشہ تجارت تھا، اس لیے قریش کے نام سے موسوم ہوا۔ (ص ۹۸)

اس میں قریش کی مختلف شاخیں بتائی گئی ہیں، جن کے نام یہ تھے: ہاشم، امیہ، نوفل، عبدالدار، اسد، تیم، مخزوم، عدی، جمح اور سہم، اور ان کے سلسلۂ نسب کو باضابطہ ایک نسب نامہ مرتب کر کے دکھایا ہے۔ (ص ۹۹)

سید صاحبؒ کی تحقیق یہ بھی ہے کہ طرز زندگی کے لحاظ سے وہ دو جماعتوں میں منقسم تھے، قریش الظواہر اور قریش البطائح، جو آس پاس صحرا میں خانہ بدوشانہ زندگی بسر کرتے تھے، وہ قریش الظواہر تھے، اور جو شہری زندگی کے عادی تھے وہ قریش البطائح تھے، سید صاحبؒ لکھتے ہیں کہ قریش دنیا میں کب ظاہر ہوئے، تاریخوں میں اس کا ذکر نہیں، مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دادا عبدالمطلب سے فہر تک قیاساً دس پشتیں قرار دی ہیں، اور اندازاً ان کی تاریخ ڈھائی سو برس کی مدت تک پھیلی ہوئی بتائی ہے، پھر قریش کے استقلال سیاسی کے سلسلہ میں لکھا ہے کہ حجاز کا صوبہ قریش کا وطن تھا، یہ ہمیشہ بیگانہ اقتدار سے محفوظ رہا، لیکن ہمسایہ حکومتوں کو اس کو فتح کرنے کی آرزو رہی، یمن کی حمیری و حبشی حکومت، ایران کی شہنشاہی اور رومیوں کی دولت عظمیٰ نے عرب کے اس حصہ پر مختلف اوقات میں فوج کشی کی، لیکن ہمیشہ ان کا اختتام ناکامیوں پر رہا۔ (ص ۱۰۱)

(باقی)

حضرت مخدوم قاری نظام الدین شیخ بھکاری کاکوروی ؒ

از

جناب مسعود انور علوی کاکوروی (مسلم یونیورسٹی علی گڑھ)

(۳)

تصنیفات | حضرت مخدوم ؒ کے مصنفات میں سے چار کتابیں ہیں (۱) منہج متعلق بہ اصول حدیث (۲) معارف متعلق بہ تصوف (۳) ترجمہ و شرح کتاب لمعات قادری بزبان فارسی، اس کا فارسی ترجمہ و شرح سید ابراہیم بغدادی شیخ طریقت کے حسب ارشاد کیا تھا، (۴) تحفۂ نظامیہ، تین سوالوں کا جواب ہے۔

ان کی اول الذکر تینوں تصانیف کا کہیں پتہ نہیں چلتا ہے، حد یہ ہے کہ ۱۲۵۴ھ میں جب کشف المتواری تالیف کی گئی تو بھی اس کے مؤلف ؒ کو باوجود تلاش بسیار کے کوئی تصنیف نہ مل سکی، حسن اتفاق کہ ان کی ہی اولاد میں (ان کے نبیرہ کے نبیرہ) فخر اسلاف حضرت مولانا شاہ تقی حیدر قلندر ؒ کو اپنے کتب خانہ میں ایک مختصر سا فارسی رسالہ ملا جس کے اخیر میں یہ عبارت تھی: "تمام شد رسالہ ہذا مصنفہ حضرت مخدوم شاہ بھیکہ قدس سرہ العزیز بدست خاک پائے قلندراں طفیل علی علوی منقول عنہ از دستخط حضرت مخدوم ؒ مزین بود۔"

شیخ طفیل علی صاحب علوی حضرت مخدوم ؒ کی آٹھویں پشت میں تھے، ان کے سلسلہ میں حضرت شاہ تراب علی قلندر کا یہ ارشاد کافی ہے کہ...... "بڑے ظریف الطبع، بذلہ سنج، بزرگ، عقلمند، سمجھدار اور عمدہ عادات و اطوار والے تھے، ظاہری اور باطنی طور پر شریعت و حقیقت سے آراستہ تھے، صورۃً (ظاہراً) دنیا والوں سے اور باطناً حق سے ملے ہوئے تھے، اگرچہ دنیا داری کے لباس میں رہتے، مگر حقیقۃً

تارکانِ دنیا اور دنیا پرستوں میں سے تھے، ان کے حق میں دست بہ کار و دل بہ یار (ظاہری طور پر دنیاوی امور میں مشغول اور باطنی طور پر اللہ تعالیٰ سے) سچ ثابت ہوتا ہے"

مولانا شاہ تقی حیدر قلندرؒ نے اس رسالہ کو ۱۹۲۰ء میں تحفۂ نظامیہ سے موسوم کرکے شائع فرمایا تھا، مگر چونکہ اب نادر الوجود ہے لہٰذا قارئین کی دلچسپی اور معلومات کے لیے اس کے کچھ حصہ کا ترجمہ ذیل میں درج ہے، ان سوالات کے سائل غالباً حضرت مخدومؒ کے کوئی خلیفہ ہی ہیں:

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم، سب تعریفیں اس اللہ کے لیے ہیں جس نے آدمؑ کو اپنی صورت پر پیدا کیا، اور اس کی معرفت کو اپنے نفس کی معرفت و پہچان کا ذریعہ بنایا، جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس نے اپنے نفس کو پہچانا اس نے اپنے رب کو پہچانا، اور درود ہو رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کی اولاد پر جن کی دید کو اللہ نے اپنی دید قرار دیا، (جس نے مجھے دیکھا، اس نے حق تعالیٰ کو دیکھا) بھائی! تم نے تین سوالات لکھے تھے، پہلا یہ کہ جب مرید مرشد کی مدد سے معرفت کے مقام پر پہونچتا ہے تو اپنی ذات سے علیحدہ و باہر کوئی چیز دیکھتا ہے یا سب اپنی ہی ذات میں؟

دوسرا سوال یہ ہے کہ لفظ تمثل جس کا بعض کتب سلوک میں تذکرہ ہے کیا معنی رکھتا ہے؟

تیسرا یہ کہ عاشق کو جب معشوق سے وصل ہوتا ہے تو وہ مرد کی صورت میں یا عورت کی صورت میں؟

اب ہر سوال کا جواب فقیرانہ حسب املائے وقت سننا چاہیے، اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا، توفیق دیتا اور ختم کراتا ہے، میں اسی سے ذلتوں اور غلطیوں سے پناہ مانگتا ہوں،

پہلے سوال کا جواب یہ ہے کہ اہل سلوک کے گروہ کے نزدیک اللہ تعالیٰ کی نہ صورت ہے نہ شکل، نہ زمان ہے، نہ مکان، وہ نہیں نظر آ سکنے سے بزرگ و برتر ہے، اس کی ذات کی معرفت کی کوئی راہ نہیں، اور نہ اس کی حقیقت سے کوئی آگاہ ہے، لیکن جب وہ اپنے جمال و کمال کے ساتھ اپنا جلوہ دکھانا چاہتا ہے تو اپنی کبریائی کی چادر کے پردہ سے انسانی صورت میں دکھاتا ہے، جب اپنے دوستوں

پر خاص تجلی کرنا چاہتا ہے تو انسانی صورت میں تجلی فرماتا ہے، کیونکہ یہی خاص تجلی ہے سے

گر تجلی خاص خواہی صورت انسان بہ بیں   ذات حق را آشکارا اندر و خنداں بہ بیں

بہ صورت بشرم ہاں رہاں غلطہ نہ کنی   کہ عقل سخت ضعیف است و عشق سخت غیور

(ترجمہ) اگر تم خاص تجلی دیکھنا چاہتے ہو تو انسان کی صورت دیکھو، اس کی صورت میں حق کی ذات کو واضح و صاف اور ہنستا ہوا دیکھو۔

خبردار مجھے انسانی شکل میں غلط نہ سمجھنا (صفات عین ذات ہیں اور ذات عین صفات) کیونکہ عقل بہت کمزور ہے، اور عشق نہایت غیرت دار (یعنی مجھے عقل کا چراغ لے کر تلاش نہ کرو، کیونکہ اس کی نارسائی مسلم اور طے شدہ ہے)

تو جب مرید مرشد کی دستگیری اور مدد سے معرفت کے مقام پر پہونچ جاتا ہے، اور بشریت وانسانیت کے معنی حل ہو جاتے ہیں تو وہ اپنی ہی ذات میں اپنا مقصود پاتا اور دیکھتا ہے، پھر اس کی معرفت حاصل کرتا ہے، مَنْ عَرَفَ الخ (جس نے اپنے نفس کو پہچانا اس نے اپنے رب کو پہچانا) اسی مقام سے خبر دیتا ہے جب یہ ذوق سے حاصل ہو جاتا ہے تو انا الحق خود بخود اس کی زبان پر سرًّا وجہرًا جاری ہو جاتا ہے۔

اہل سلوک کہتے ہیں کہ قریب ترین راستہ حق کی طرف دل کا راستہ ہے، تو جو شخص دل کے راستہ سے اللہ کو طلب کرے وہ بہت جلد اور آسانی سے پائے، مومن کا قلب عرش الٰہی ہے، اور یہ یاقت بڑی ریاضت اور بے شمار ذکر کے بعد حاصل ہوتی ہے، ہر چیز کے صاف کرنے والی ایک چیز ہوتی ہے اور قلب کے صاف کرنے والی (پالش کرنے والی) چیز اللہ تعالیٰ کا ذکر ہے سے

سعدی حجاب نیست تو آئینہ صاف دار   زنگار خوردہ کے بنماید جمال دوست

(ترجمہ) سعدی بھلا کوئی پردہ نہیں ہے تو اپنے دل کے آئینہ کو صاف رکھ، زنگ خوردہ بھلا کب دوست کے حسن و جمال کو دکھا سکتا ہے۔

پس دید اور یافت سب اپنی ذات میں ہے، (دید سے مراد معرفت اور یافت سے مراد تحقیق ہے) نہ کہ ذات سے خارج اور علیحدہ، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: وہ تمہارے ہی اندر ہے، اس کو کیوں نہیں دیکھتے،

اہل سلوک کہتے ہیں کہ عالم چار قسم کے ہیں، عالم ناسوت، عالم ملکوت، عالم جبروت، عالم لاہوت، عالم ناسوت کو عالم ظاہر کہتے ہیں، اور عالم ملکوت اس عالم ظاہر کے باطن کو اور عالم جبروت عالم ملکوت کے باطن کو اور عالم لاہوت عالم جبروت کے باطن کو اور عالم ملکوت عالم ناسوت کے باطن کو، عالم جبروت کی کوئی ایسی چیز نہیں ہے جس کے ساتھ عالم لاہوت نہ ہو، اور کوئی چیز عالم ملکوت کی ایسی نہیں ہے جس کے ساتھ عالم جبروت نہ ہو اور کوئی چیز عالم ناسوت کی ایسی نہیں ہے جس کے ساتھ عالم ملکوت نہ ہو، تو جہاں کہیں ناسوت ہے یہ تینوں عوالم بھی ہیں، مرید جب مرشد کی رو سے معرفت کی منزل پر پہونچتا ہے تو یہ سب اپنے میں دیکھ کر گم ہو جاتا ہے، کسی نے کیا اچھا کہا ہے ؎

لاہوت در جبروت بیں جبروت در ملکوت بیں ہر سہ دریں ناسوت بیں گر عاقلی گم شو دریں

(جبروت میں لاہوت دیکھ، ملکوت میں جبروت دیکھ، ان تینوں ہی میں ناسوت دیکھ، اگر تو عقلمند ہے تو اس میں گم ہو جا۔)

پس مرید کو دید اور یافت درحقیقت اپنی ذات میں ہوتی ہے، نہ ذات سے باہر، اہل سلوک کہتے ہیں کہ عالم دو قسم پر ہے، عالم کبیر اور عالم صغیر، عالم صغیر انسان کو کہتے ہیں، اور انسان عالم کبیر میں جو کچھ ہے، اس کا ایک نمونہ ہے کہ جو کچھ عالم کبیر میں موجود ہے وہ سب انسان میں موجود ہے، جب مرید یعنی انسان، انسانیت کے معنی سمجھتا ہے تو جو کچھ عالم کبیر میں ہے اپنے میں موجود پاتا ہے، اور اپنی ذات سے معرفت حاصل کرتا ہے، نہ ذات سے باہر، مرید اگر یہ حق دوسرے میں دیکھے پھر اپنی ذات میں مطالعہ کرے کہ انسانیت کی رو سے دونوں ایک ہیں تو اس کی ذات میں یہ مطالعہ عین اپنی ذات میں ہے نہ کہ خارج از ذات خود، اس لیے یہ لوگ کہتے ہیں کہ عالم میں حق کے سوا بالکل خیال ہی نہیں کیا جا سکتا،

ہے جو غیر حق کہا جاتا ہے، یہ غیریت اعتباری ہے نہ کہ حقیقی، یہ معتبر نہیں ہے، اہل سلوک کہتے ہیں کہ خداوند تعالیٰ نے جب اپنی ذات صفات کے اعتبار سے جیسی ہے ظاہر کرنا چاہی تو آئینۂ مصطفوی صلی اللہ علیہ وسلم بنایا، اور وہ آدمؑ کی صورت ہے، پھر اپنی صورت میں اپنی تجلی فرمائی، جیسا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آدمؑ کو اپنی صورت پر پیدا کیا، پھر اس میں اپنی تجلی فرمائی ؎

آں بادشاہ اعظم در بستہ بود محکم ‏ ‏ پوشیدہ دلق آدم ناگاہ بر در آمد

(وہ بادشاہ اعظم حجابات میں پوشیدہ رہ کر دروازہ کو مضبوطی سے بند کیے ہوئے تھا، جب اس نے لباس بشریت پہن لیا تو اچانک بے حجاب آگیا، (کُنْتُ کَنْزًا مَخْفِیًّا فَاَحْبَبْتُ اَنْ اُعْرَفَ فَخَلَقْتُ الْخَلْقَ)

مرید صادق جب پیر کی دستگیری سے مقام معرفت میں پہونچتا ہے تو اس کی ذات کو مع کل صفات کے اپنی ذات میں دیکھتا ہے، اور یہ رباعی اس کی مونس حال ہوتی ہے ؎

اے نسخۂ نامۂ الٰہی کہ توئی ‏ ‏ وے آئینۂ جمال شاہی کہ توئی

بیروں ز تو نیست ہر چہ در عالم ہست ‏ ‏ از خود بہ طلب ہر آنچہ خواہی کہ توئی

(تم ہی تو نامۂ الٰہی کے نسخے اور جمال شاہی کے آئینہ ہو، پھر تم یہ کیوں نہیں سمجھتے ہو کہ جو کچھ عالم میں ہے وہ تمھارے باہر نہیں، بلکہ تمھارے ہی اندر ہے، لہٰذا جو کچھ طلب کرنا ہو، اپنے ہی سے طلب کرو، کیونکہ جو کچھ ہو تم ہی ہو)

اہل سلوک کہتے ہیں کہ خدا کو خدا سے نہ مانگ، بلکہ اپنے سے خدا کو مانگ کہ اپنی یافت اس کی یافت اور اس کی یافت اپنی یافت ہے ؎

روزاں ہمہ با تو بودم و نمی دانستم ‏ ‏ شب با تو غنودم و نمی دانستم

ظن بردہ بُدم بہ خود کہ من من بودم ‏ ‏ من جملہ تو بودم و نمی دانستم

(اس روز میں دن بھر تیرے ساتھ رہا بلکہ رات بھر تیرے ہی ساتھ آسودۂ خواب رہا، اور مجھے علم ہی نہ ہو سکا (یعنی اپنا علم تیرے مشاہدہ اور دیدار سے رخصت ہو گیا، اور فنائیت میں اپنی سدھ بدھ نہ رہی) پہلے مجھے خارج میں یہ گمان ہوا تھا کہ کچھ تھا میں ہی تھا، اور اب جب کہ معیت دائمی حاصل ہو گئی ہے، تو اس معیت میں یہ مشاہدہ ہوا کہ وہ جس کو میں، میں سمجھتا تھا وہ دراصل میں نہیں بلکہ تو ہی تو ہے۔

بعض کا یہ کہنا ہے کہ خود کو خدا سے اور خدا کو خود سے طلب کر کہ اپنی یافت اس کی یافت اور اس کی یافت اپنی یافت ہے، جب ہم نے اس کو دیکھا تو اپنے کو دیکھا، اور جب اپنے کو دیکھا تو اس کو دیکھا ؂

من تو شدم تو من شدی من تن شدم تو جاں شدی ؎ تا کس نہ گوید بعد ازیں من دیگرم تو دیگری

(میں تو ہو گیا اور تو میں، میں جسم ہو گیا اور تو جان، اب کوئی یہ نہ کہے کہ میں اور تو الگ الگ ہیں)

لہٰذا دید اور دریافت اپنی ذات میں نہ کہ اپنی ذات سے باہر، جب معرفت کمال کو پہونچتی ہے تو اپنی ذات اور ذات سے خارج یافت مقصود کے لیے برابر ہوتی ہے ؂

دو دیدہ بہ دست آر کہ ہر ذرۂ خاک ؎ جامیست جہاں نما چو در وے نگری

(جاؤ، وہ نگاہ حاصل کرو کہ خاک کا ہر ذرہ تمھیں ایک جام جہاں نما نظر آئے، (یعنی جب تم بصارت سے بصیرت کی منزل پر آجاؤ گے تو ذرہ ذرہ میں حسن ازل کی شوخیاں ملاحظہ کروگے)

دوسرے سوال کا جواب یہ ہے کہ اہل سلوک کی کتابوں میں چار الفاظ آئے ہیں، مثل، مثال، تمثیل اور تمثل، مثل کا کوئی قائل نہیں ہے (لیس کمثلہ میں کاف زائد ہے، یعنی خدا کے مثل کوئی چیز نہیں ہے) لیکن مثال و تمثل و تمثیل جیسے الفاظ کا اطلاق اہل حقیقت کے نزدیک حق سبحانہ پر جائز ہے، اور وہ اس کے معنی بھی بیان کرتے ہیں، ہمارا مقصود لفظ تمثل سے ہے جو کثیر الوقوع ہے، اس میں لطیف معانی ہیں، یہ لوگ کہتے ہیں کہ اس دنیا بلکہ اس دنیا کی بنیاد تمثل پر ہے، تمثل پر مطلع ہونا کوئی معمولی بات نہیں، بلکہ بہت بڑا کام ہے، مریم کے لیے صحیح مجسم آدمی کی صورت اختیار کی اسی تمثل سے ہے، اور شب معراج

میں نے اپنے پروردگار کو جوان، امرد بے ریش و بروت گیسو دار کی صورت میں دیکھا، اور میں نے اپنے رب کو شب معراج میں بہترین صورت میں دیکھا، اس نے اپنے دونوں ہاتھ میرے کندھوں پر رکھے جن کی ٹھنڈک میں نے اپنے سینے میں پائی، یہ اسی تمثل کا بیان ہے، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ "امردوں پر نگاہ ڈالنے سے اپنے کو بچاؤ، کیونکہ ان کا رنگ خدا کا ایسا رنگ ہے"۔ اسی تمثل کا نشان ہے "اور جنت میں ایک بازار ہے جہاں صورتیں بیچی جاتی ہیں"۔ اسی معنی پر گواہ ہے، اور "میں نے اپنے رب کو اپنی والدہ کی شکل پر دیکھا" بھی اسی کی خبر دیتا ہے، اہل سلوک کہتے ہیں کہ خداوند تعالیٰ نے جب چاہا کہ عالم کُنْتُ کَنْزاً مَخْفِیًّا (میں ایک پوشیدہ خزانہ تھا) سے ظاہر ہو کر لباس عشق پہنے تو غیرت معشوقی نے یہ نہ چاہا کہ اس کا عاشق اس کے سوا کسی اور کو دوست رکھے، یا کسی حال میں کسی غیر کا محتاج ہو لہٰذا تمام چیزوں کی صورت میں متمثل ہوا تاکہ عاشق اسی کو دوست رکھے اور جس طرف متوجہ ہو وہی ہو، تو دنیا میں اور آخرت میں یہ جو کچھ نظر آتا ہے سب اسی کا تمثل ہے، لیکن سر الٰہی کو دیکھنا اور اس پر مطلع ہونا نیز اس سے فائدہ اٹھانا ہر شخص کا کام نہیں ہے، اور نہ ہر شخص اس کے لائق ہے ؎

ہر چہ بینی یار ہست اغیار نیست — غیر او جز وہم و جز پندار نیست
از جمال وھو معکم جلوہ ہاست — لیک ہر کس لائق دیدار نیست

(تم کو جو کچھ نظر آ رہا ہے وہ سب یار کا ہی جلوہ ہے، اور جو کچھ تم سمجھ رہے ہو وہ تمہارا پندار اور گمان ہے، وہ تو اپنے جمال جہاں آرا (وَھُوَ مَعَکُمْ اَیْنَمَا کُنْتُمْ) سے جلوہ نما ہے لیکن ہر شخص اس کے دیدار کے لائق نہیں)

خداوند تعالیٰ ہم اور سب بھائیوں کو خصوصًا تم کو اس عالم تمثل سے برخورداری نصیب فرمائے آمین یا رب العالمین

تیسرے سوال کا جواب یہ ہے کہ اہل سلوک کہتے ہیں کہ بنظر ذات الٰہی اس کو کسی عورت کی صورت میں متصف کرنا جائز نہیں، لیکن جب وہ عاشق کو وصال عطا کرنا چاہتا ہے تو کبھی مرد کی صورت میں وصل عطا کرتا ہے اور کبھی عورت کی صورت میں کبھی مرد کی صورت میں جلوہ گر ہوتا ہے اور کبھی بت کی صورت میں لیکن اگر مرد کی صورت میں وصل عطا کرے تو زیادہ بہتر ہے کیونکہ یہی خاص ہے

حاصل ہو، اگر غیر محرم عورت کی شکل میں وصال حاصل کرے اور پہلے وصال کے بعد دوسرا وصال حاصل ہوئے تو پہلا وصال باطل ہے، اس لیے کہ یہ تجلی خاص الخواص عاشقان خاص الخاص کے لیے ہے، اس وصال میں جو تجلی کی جائے لذت در لذت اور ذوق در ذوق ہے، میں نے ایک بزرگ کامل اور فقیر واصل کی زبان سے سنا ہے کہ حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مراد لِی مَعَ اللہِ وَقْتٌ الخ (میرے لیے اللہ کے ساتھ ایک وقت ہے جس میں کسی مقرب فرشتے اور نبی مرسل کی بھی گنجائش نہیں) سے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے خلوت ہے۔ اہل سلوک کہتے ہیں کہ جب عاشق کمال (انتہا) پر پہونچ جاتا ہے تو وہ اپنے آپ کو عین معشوق پاتا ہے، اس وقت اس کو وصال و فراق سے نجات مل جاتی ہے اور وہ بزبان حال کہنے لگتا ہے ؎

معشوق و عشق و عاشق ہر سہ یکیست ایں جا　　　چوں وصل در نگنجد ہجراں چہ کار دارد

(جب وصل کی ہی گنجائش نہیں ہے تو پھر ہجر کا کیا سوال ہے، (یعنی فراق و وصال سب اعتبارات ہیں)

اس وقت وصال کی طلب میں یا نت مرد یا عورت کی صورت میں نہیں ہوتی ہے اور جو شخص اس قید سے نجات دیا گیا ہو وہ منزل میں ہے، اہل سلوک کہتے ہیں کہ اَنَا مِنْ نُوْرِ اللہِ الخ (میں اللہ کے نور سے ہوں، اور تمام مخلوق میرے نور سے) کی رو سے سب ایک نور ہے، اس عالم کی ہر چیز، ہر صورت و شکل اور ذرہ ذرہ اس سے مالا مال ہے، لیکن اس کا ذوق اور اس کی لذت وہی شخص پاتا ہے جو نمک زار فنا میں فنا ہوگیا ہو، اب ایک غزل پڑھ کر اس سے پورے وصال کا فائدہ حاصل کرنا چاہیے اور جمع الجمع سے تفرقہ میں اور تفرقہ سے جمع الجمع میں جانا چاہیے اور مجمل سے مفصل اور مفصل سے مجمل میں متوطن ہونا چاہیے، سالک کے سلوک کی انتہا یہاں تک ہے، اس سے آگے راہ نہیں، کسی نے اس مجمل و مفصل میں جان دی ہے:

اے ز نورت آفرینش شد مصور در جہاں　　　عقل حیراں زیں تعجب فہم ابتر در جہاں

ہر چہ اندر عالم است از ذرہائے کائنات　　　از نقاب روئے تو ظہور یک منظر در جہاں

آفتاب است ہر ضیاء اندر زمین و آسمان　　　یا ستارہ [illegible] در جہاں

گہ ہلالے می شود ایں نور در اندر طلوع   گہ بہ غیرت ماہ سفر شد بدر انور در جہاں

گاہ گردی صبح صادق گاہ گردی وقت شام   گہ شبِ تاریک گردی گہ قمر در جہاں

گاہ گردی چرخ گرداں گاہ گردی وقت شام   گاہ گردی روز روشن گہ منبر در جہاں

گہ نمائی آسماں گوں گہ نمائی تیرہ گوں   گہ نمائی نیل گوں نش گہ معصفر در جہاں

گاہ خانہ، گاہ مہماں گاہ صحرا گاہ، کوہ   گاہ دہقاں گاہ مصری گاہ اشہر در جہاں

گہ زمیں گہ آسماں گہ درمیان این وآں   گاہ تخم و گاہ شجر و گہ مشجّر در جہاں

گاہ بری گاہ بحری گاہ ہستی بین بین   گاہ گوہر گاہ دریا بحر اخضر در جہاں

گہ خلایق، گہ ملک، گاہ عقل و گاہ فہم   گاہ روحے گہ بشر از جملہ برتر در جہاں

گاہ آدمؑ گاہ حواؑ، گاہ شیطاں گاہ دیو   گاہ گریاں، گاہ شاداں گاہ غم خور در جہاں

گہ محمدؐ گہ عمرؓ ہم گاہ عثمانؓ، گہ علیؓ   گہ نمائی ہم ہمہ آں صدیق اکبرؓ در جہاں

از مفصل درگذر بریک سخن کوتاہ کن

ہر چہ بینی در دو عالم اوست اظہر در جہاں

اہل سلوک کہتے ہیں کہ جب یہ معنی کمال کو پہونچ جاتے ہیں تو اپنی ذات اور خارج از ذات کا فرق اٹھ جاتا ہے، اس لیے تفرقہ جمع اور جمع تفرقہ ہو جاتا ہے، جیسے لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللہ اور اِلَّا اللہ لَآ اِلٰہ، اس میں ایک باریک راز ہے، جس کا اظہار جائز نہیں، جس نے سمجھا اس نے سمجھا، خداوند تعالیٰ ہم کو اور تمام طالبین کو ان اسرار سے فائدے دے، آمین یارب العٰلمین۔

عقد نکاح اور اولاد | ان کا نکاح قصبہ ہرگام ضلع سیتاپور کے ایک شریف گھرانے میں ہوا، ان سے چھ صاحبزادے اور چار صاحبزادیاں ہوئیں سبھی صاحبزادے علم و فضل اور تقویٰ و پرہیزگاری کے زیور سے آراستہ تھے، (۱) شیخ مَنّن (۲) شیخ عالم (۳) شیخ سمن (۴) شیخ عبداللہ (۵) شیخ خواجہ (۶) حافظ شیخ شہاب الدین المعروف بہ شیخ شوھن

استداد زمانہ کی وجہ سے سوائے خدا کے صاحبزادے ملا فتح شیخ شہاب الدین کے کسی کا کوئی حال نہیں ملتا ہو سکتا ہے کہ ان صاحبزادوں کے اصلی نام تک نہ پتہ چل سکے، قدیم نسب ناموں میں بھی اسی قدر مل سکے، یہ اپنے تمام بھائیوں میں ممتاز اور صاحب لیاقت تھے، اپنے والد کے سامنے ہی دو بیٹوں ملا عبدالکریم اور ملا عبدالقادر اور ایک بیٹی کو چھوڑ کر وفات پائی، ان کی اولاد علم و فضل اور نسب و حسب میں اپنے زمانہ کے اعلام سے ممتاز رہی، حضرت شیخ عبدالرشید ملتانی نے ان کی ہی فرمائش پر حضرت مخدوم کا ملفوظ "زاد الآخرت" لکھا تھا، جیسا کہ اس کے دیباچہ سے پتہ چلتا ہے،

ایک صاحبزادی کا نکاح قصبہ کنتور کے سادات خاندان میں ہوا، دوسری صاحبزادی سید جلال الدین ابن مخدوم شیخ سعدی صدیقی کاکوری کے ساتھ منکوح ہوئیں، تیسری صاحبزادی ہرگام ضلع سیتاپور میں بیاہی تھیں، چوتھی صاحبزادی ناکتخدا فوت ہوئیں،

وفات | آپ کی وفات بعمر ۹۱ سال ۸ ماہ ذی قعدہ ۹۸۱ھ/۱۵۷۴ء کو کاکوری میں ہوئی، مزار مبارک وسط قصبہ کاکوری محلہ جھنجھری روضہ میں اپنے والد کے مزار کے متصل حظیرہ میں واقع ہوئے، تاریخ وفات پر قل بھی ہوتا ہے، تاریخ وفات مولوی شریف الدین علوی ملک زادہ کاکوروی

چون نظام الدین قاری شیخ بھیکہ ۔۔۔ سوئے جنت اسپ ہمت تاختہ
ہشتمیں ذی قعدہ بودہ سال او ۔۔۔ در سنہ ہجری چنیں دریافتہ
آمدہ اعداد کامل سال او (۹۱) ۔۔۔ نہصد و ہشتاد و یک بشناختہ (۹۸۱)

خلفاء | مولف کشف المتواری نے آٹھ خلفاء کے نام تحریر فرمائے ہیں، جو معلوم ہو سکے تھے،

(۱) حضرت مولانا عبدالرشید ملتانی مصنف زاد الآخرت، آپ حضرت مخدوم کے عزیز شاگرد رشید بھی ہیں، (۲) سید شرف الدین شکارپوری (۳) شیخ محمد ساکن خوجہ (۴) شیخ بدیع الدین مانکپوری (۵) مولانا نصیر الدین سنبھلی (۶) حافظ محب اللہ خیرآبادی (۷) مرزا شمس الدین خاں کوکا (۸) حضرت ملا عبدالکریم علوی مرید و شاگرد و نبیرۂ حضرت مخدوم"

باب التقریظ والانتقاد

اقبال کا نظام فن

از

سید صباح الدین عبدالرحمن

یہ قابل قدر تصنیف پٹنہ یونیورسٹی کے پروفیسر عبدالمغنی کی ہے، جن کا نام پورے ہندوستان میں اس لیے مشہور ہو چکا ہے کہ انھوں نے اپنی ریاست بہار میں اردو کی مہا بھارت میں بھیم اور ارجن کی سپہگری دکھا کر وہاں اردو کو دوسری سرکاری زبان تسلیم کرا لیا ہے، اردو کی یہ حیثیت ہندوستان کی کسی اور ریاست میں تسلیم نہیں کرائی جا سکی ہے، اس لحاظ سے وہ اردو زبان کی دنیا میں ایک ہیرو بن گئے ہیں۔

وہ اردو زبان کے ایک اچھے ادیب اور نقاد کی حیثیت سے بھی مشہور ہیں، ان کے مضامین کے چار مجموعے نقطۂ نظر، جادۂ اعتدال، تشکیل جدید، معیار و اقدار علمی حلقوں میں مقبول ہو چکے ہیں، انھوں نے یہ زیر نظر کتاب "اقبال کا نظام فن" لکھ کر اپنی قبائے علم میں ایک اور زریں تکمہ کا اضافہ کیا ہے، یہ اپنے اسلوب بیان اور نقد و تبصرہ دونوں لحاظ سے اہل ذوق کو اپنی طرف کھینچے بغیر نہیں رہ سکتی ہے، ادھر چند دہائیوں میں بہار کی بوڑھی نسل کے بعض اہل قلم پر یہ نکتہ چینی ہوئی کہ وہ اچھی اردو لکھنے کی فکر نہیں کرتے، پروفیسر عبدالمغنی نے اپنی اردو تحریروں میں ان کی طرف سے فرض کفایہ ادا کر دیا ہے، پھر بعض علمی حلقے میں یہ شبہہ بھی تھا کہ بہار میں اقبال سے کچھ الرجی ہے، لیکن پروفیسر عبدالمغنی کی اس کتاب کی اشاعت سے یہ شبہہ جاتا رہا، وہ اقبال پر اردو اور انگریزی دونوں زبانوں میں کتابیں لکھنا چاہتے ہیں، اس عزم کی تکمیل ہی میں ان کی زیر نظر کتاب ہے جس میں اقبال کے

اردو کلام کے نظام فن کا مکمل تجزیہ ہے، فارسی کلام پر ایک علیحدہ جلد ہوگی، اور انگریزی میں ان دونوں جلدوں کے علاوہ ایک جلد ہوگی۔

کتاب کا آغاز وحدت و انفرادیت کے عنوان سے شروع ہوتا ہے جس کو پڑھ کر قارئین کا ذہن یہ سوچنے پر مائل ہوسکتا ہے کہ فن فکر سے بنتا ہے یا فکر فن سے پیدا ہوتی ہے، یا دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہیں؟ قارئین کے ذہن میں یہ خیال بھی آسکتا ہے کہ کیا ایک اچھا ادیب یا ایک اچھا شاعر اپنے خیالات کا اظہار فن کے ماتحت ہو کر کرتا ہے، یا اچھے ادیب اور اچھے شاعر ہی سے فن بنتا ہے، اقبال کے متعلق جب کوئی یہ سوچے کہ وہ اس "برصغیر کی آبرو"، "مشرق کی عزت"، "اسلام کے فخر"، "کاروان ملت کے حدی خوان"، "دین کامل کے علم بردار"، "تجدید ملت کے طلب گار" اور "فلسفۂ اسلام کے ترجمان" ہیں، تو کیا ان کی یہ حیثیت ان کے کلام کے نظام فن یا ان کے کلام کے نظام فکر کی وجہ سے سامنے آتی ہے، یقیناً ان کے کلام کے نظام فکر ہی سے ان کو یہ مقام حاصل ہوا، اور اسی نظام فکر نے ان کے نظام فن کو استوار اور رنگین بنایا ہے، ایک نقاد کے لیے فکر و فن کی بحث ضروری ہوسکتی ہے، مگر اقبال کی شاعری کا تجزیہ کرنے میں اس بحث کو چھیڑنا الجھنوں میں مبتلا ہونا ہے، جیسا کہ خود ہمارے فاضل مصنف بھی ہو گئے ہیں، وہ لکھتے ہیں کہ اقبال کے افکار کا طلسم فی الواقع اشعار کا طلسم ہے، ظاہر ہے کہ یہ کمال فن کا ہے، نہ کہ فکر کا ہے (ص ۹) لیکن اسی کے بعد وہ یہ بھی لکھتے ہیں کہ بلاشبہہ اقبال کی فکر ہی ان کے فن کی نوک بھی ہے (ص ۹) پھر وہ یہ بھی لکھ گئے ہیں کہ اقبال کی فکر کی بلوغت اور ان کے فن کی بلاغت الگ الگ اکائیاں نہیں ہیں .... دونوں ایک دوسرے میں بالکل مدغم ہیں، (ص ۱۱) وہ یہ بھی لکھتے ہیں کہ کوئی فن خالص ہوتا ہی نہیں، اس میں فکر کی نہ صرف آمیزش بلکہ نمائش ہوتی ہے، (ص ۱۵) وہ یہ بھی لکھتے ہیں کہ اقبال کا عظیم فن درحقیقت ایک عظیم فکر کی آئینہ ہے، اور اسی سلسلہ میں یہ بھی تحریر کرتے ہیں کہ فن کے اس آئینہ میں فکر کا عکس تو پورے طور پر جلوہ فگن ہے، اس کے علاوہ اس عکس نے شیشۂ فن کی دبیز تہوں سے گذرتے ہوئے کچھ رنگین اور زریں نقوش بھی حاصل کر لیے ہیں، (ص ۱۶)

اقبال کی شاعری کو فکر و فن کی بحث میں الجھانے کی ضرورت نہیں، کیونکہ وہ دنیا کے ان شاعروں میں ہیں جن کی فکر نے فن کو جلا دیا ہے، ہاں یہ ضرور ہے کہ ان کے نظامِ فکر سے جو نظامِ فن پیدا ہو گیا ہے، اس کا مطالعہ بھی دلچسپ اور ضروری ہے۔

فاضل مصنف کے لیے یہی مناسب تھا کہ ایک عام نقاد کی نظر و فکر سے الگ ہو کر فن اور فکر کی بحث چھیڑے ہوئے بغیر اقبال کی فکر کے اندر ان کے فن کی جو دبیز تہیں اور رنگین نقوش ہیں ان ہی سے ناظرین کو اپنے تنقیدی کاوش سے محظوظ کرتے، اور اس میں شک نہیں کہ ان کی پوری کتاب اسی کی کامیاب کوشش ہے البتہ اس باب کے آخر میں اقبال پر رقم کی گئی تنقیدوں کو غلامانہ، مقلدانہ، مستعار، بوسیدہ، رسمی، روایتی اور نہایت لغو قرار دینا فاضل مصنف اور ان کی کتاب کے وقار اور وزن کے خلاف ہے، (ص ۱۷-۱۶)

باب "تصورِ فن" مصنف کی تحریر کی رنگینی اور روانی کی بہت عمدہ مثال ہے، لیکن اس میں اقبال کے فن اور فکر دونوں کی بحثیں آگئی ہیں، جب وہ اس کی بحث کرتے ہیں کہ اقبال کے تصور میں فن کا کیا تصور تھا، تو اس کی مثال میں تقریباً سوا سو اشعار نقل کر گئے ہیں، یہ ان نقادوں کے لیے درسِ عبرت ہے جو ایک بات کہہ کر آگے بڑھ جاتے ہیں، اور اپنی سہل انگاری سے مثالیں دینا ضروری نہیں سمجھتے، اگر مصنف ہر شعر کے ساتھ یہ بتاتے جاتے کہ اس میں اقبال کا کیا تصورِ فن ہے، تو قارئین کے ذہن کی زیادہ تسکین ہو جاتی، انھوں نے اس باب کے آخر میں بڑے معلمانہ انداز اور بڑی دیدہ وری سے اقبال کے تصورِ فن کو نمبر وار طریقے سے سمجھایا ہے جس سے اچھے سے اچھے معلم بھی استفادہ کر سکتے ہیں، لیکن اس بحث میں جس چیز کی تشنگی طلب تھی، وہ بھی پوری ہو جاتی تو اچھا تھا، جب فاضل مصنف یہ لکھتے ہیں کہ اقبال کے فکر و فن میں یکجہتی کے علاوہ ایک زبردست فنی ارتکاز ہے، (ص ۵۴) تو قاری کے ذہن کا اس کا طلبگار ہونا نامناسب نہیں کہ اس فنی ارتکاز کو اشعار کے ذریعہ سے سمجھایا جاتا، یا جب وہ یہ کہتے ہیں کہ اقبال کا تصور تصویر ساز ہے، یا جب وہ اس کا یقین دلانا چاہتے ہیں کہ کلامِ اقبال کے رنگ سے بھی زیادہ اہم اس کا آہنگ ہے، یا جب وہ یہ نمونا

چاہتے ہیں کہ اقبال کا آہنگ سراپا ترنم ہے۔ ان کے الفاظ و تراکیب کی نشست اور بندش سے ایک ایک تاثر کا نغمہ مرتب ہوتا ہے تو پھر قارئین کا یہ طلب بالکل جائز ہے کہ ان تمام باتوں کے ساتھ ہی اشعار بھی سامنے کر دیے جاتے، پھر فاضل مصنف کو زیادہ بحث میں جانے کی ضرورت نہ ہوتی۔

امتیاز و اجتہاد کے عنوان سے فاضل مصنف نے یہ دکھایا ہے کہ اقبال کی پرسوز و نشاط انگیز شاعری کسی معمولی و عارضی سرور و انبساط اور وقتی و شخصی لطف و مسرت کے لیے نہیں ہے، وہ جس حیات نامزہ کے طالب ہیں وہ محدود اور فنا آمیز نہیں، ایک زندگی جاوداں اور وجود بیکراں ہے جو ایک بار حاصل ہونے کے بعد کبھی ختم نہیں ہوتی، (ص ۷۱) اس کو ثابت کرنے میں خود مصنف کی تحریر میں سوز و نشاط پیدا ہو گیا ہے۔ ایسی باتیں پہلے بھی کہی گئی ہیں، لیکن اس کو پیش کرنے میں مصنف کی بحث میں جو نیا پن ہے وہ اس تجزیہ کی جان ہے، اس باب میں اقبال کے فن سے زیادہ ان کی فکر پر بحث آ گئی ہے، بلکہ کتاب کے ہر باب میں اقبال کی فکر کی بحث ناگزیر طور پر آ گئی ہے، اس لیے اگر اس کتاب کا نام "اقبال کا نظام فکر و فن" ہوتا تو زیادہ صحیح ہوتا، پھر اس کتاب کے ریویو نگار کو بھی یہ فیصلہ کرنے کی الجھن میں مبتلا نہ ہونا پڑتا کہ اس میں کہاں پر فن اور کہاں پر فکر کی بحث ہے۔

"نظم و غزل" اور "غزلیں" کے عنوانات سے مصنف نے اقبال کی نظموں اور غزلوں کا تجزیہ کیا ہے، ان کی اردو غزل گوئی سے متعلق مصنف کے یہاں ایک محشر خیال ہے جس کو کاغذ کے صفحات پر منتقل کر کے اپنی تحریر کا ایک محشرستان برپا کر دیا ہے، اس کو پڑھ کر خیال ہوتا ہے کہ اقبال کی اردو غزل گوئی کا پرستار ان سے بڑھ کر شاید کوئی اور نہیں، اقبال کی غزلوں میں جو عصری حسیت، سیاست و معاشرت کے اشارات اور بصیرت منتقل ہیں، یا ان میں جو وسعت، والہانہ پن، معنی آفرینی، دل نوازی، ولولہ خیزی، رنگینی، تخیل کی گہرائی اور تفکر کی بلندی ہے، یا ان میں جو جدید معانی تخیلات کی زیبائی و رعنائی ہے، یا ان میں حسن و عشق کے جو عمیق ترین جذبات اور بلند ترین احساسات ہیں ان کو دکھانے میں مصنف نے اپنی تنقیدی امعان نظر کا پورا ثبوت دیا ہے، مگر اس

سلسلہ میں وہ ترقی پسند ناقدین کی انتہائی نااہلی اور خرقیت کے دعویدار ناقدین کے "ذہنی افلاس" کا ذکر نہ کرتے تو ان کی اس بحث میں کوئی کمی نہ ہوتی، یا کہیں کہیں حافظ، غالب اور رومی سے اقبال کی غزلوں کا جو موازنہ کیا گیا ہے اس کی بھی چنداں ضرورت نہ تھی، خواہ مخواہ بحث کو متنازعہ فیہ بنا دینے کی دعوت دینا ہے۔ وہ یہ لکھتے ہیں کہ غالب کے اسلوبِ سخن کے امکانات اقبال کے طرزِ بیان میں نہ صرف بہت زیادہ بڑھ گئے ہیں بلکہ نقطۂ کمال تک پہونچ گئے ہیں، (ص ۱۵۷) اس کے بجائے اگر وہ صرف یہ تحریر کرتے کہ اقبال نے غزل گوئی کے اسلوب کے امکانات اور طرزِ بیان کو نقطۂ کمال تک پہونچا دیا ہے تو پھر غالب کے پرستاروں کے لیے آزردہ ہونے کی کوئی گنجائش نہ ہوتی۔

اگر اقبال کی غزل گوئی کا تجزیہ اس کے مختلف ادوار کے ساتھ کیا جاتا تو ان کی غزل گوئی کے ارتقائی فن کو سمجھنے میں زیادہ مدد ملتی، اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ بانگِ درا کی غزلیں زیادہ تر ان کی ذہنی الجھنوں کے زمانہ کی ہیں جب کہ خود انھوں نے اپنے متعلق کہا تھا کہ ؏

اقبال بھی اقبال سے آگاہ نہیں ہے

وہ اس زمانہ میں اپنے مقصد کے یقینِ محکم کی تلاش کی الجھنوں میں تھے جن کو دور کرنے میں کبھی غزلیں کہہ دیا کرتے تھے، یہ اور بات ہے کہ ان میں بھی ان کے آفتابِ کمال کی کرنیں پھوٹتی دکھائی دیں، مصنف کو اس کا احساس ہے کہ اقبال کی غزلوں کو وہ اہمیت عام طور پر نہیں دی جاتی جس کے وہ مستحق ہیں، (ص ۸۷) بانگِ درا اور بالِ جبریل میں بہت سی غزلیں کہنے کے باوجود اقبال نے خود بالِ جبریل میں اس کا اعتراف کیا ہے کہ ؎

مری نوا میں نہیں ہے ادائے محبوبی	کہ بانگِ صورِ اسرافیل دلنواز نہیں

وہ اپنی نظموں کے ذریعہ سے خاراشگاف ہونا چاہتے تھے، پھر غزل گوئی کی شیشہ سازی کو کیوں پسند کرتے

حدیثِ بادہ و مینا و جام آتی نہیں مجھ کو	نہ کر خاراشگافوں سے تقاضا شیشہ سازی کا

ضربِ کلیم کی ترتیب کے وقت تک تو اس میں صرف پانچ غزلیں درج کر سکے، اور اس کے ایک مصرع

اندھیری شب میں ہے چیتے کی آنکھ جس کا چراغ

کے بارہ میں مصنف نے لکھا ہے کہ ممکن ہے کہ بعض لوگوں کو اس تصویر سے ہول آئے (ص ۱۰۱) لیکن اس کی ایسی تاویل بھی کر دی ہے، اور جب وہ ضربِ کلیم کی غزلوں کو تغزل کا دردِ تہ جام کہہ گئے ہیں (ص ۷۰) تو معلوم نہیں اس رنگین بیانی سے ان غزلوں پر رنگین پردہ پڑتا ہے یا بالِ جبریل کی غزلوں کی چھلکتی ہوئی شراب ہی کی طرح ان سے سرشار ہونے کی ترغیب دی ہے، مگر اس میں شک نہیں کہ اقبال کی غزلوں میں کیفیت ضرور ہے، اس کی ایک بہت بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ ان کی کسی بھی غزل کا مطالعہ کرتے وقت جب یہ خیال ہوتا ہے کہ اس کا کہنے والا اسرارِ خودی، رموزِ بے خودی، پیامِ مشرق، جاوید نامہ کا مصنف اور اسلام کے ساز کو اپنے رنگ میں گھول کر دکھانے والا ہے، تو اس کی نوعیت اور اہمیت بدل جاتی ہے، اور یہ بھی حقیقت ہے کہ انھوں نے اپنی غزلوں میں جہاں عقل، عشق، خودی اور مقدر کی طوفانی موجوں میں انسان کی حیثیت، ساری کائنات میں اس کی برتری یا جہاں مایوسی، حرماں نصیبی اور خود شکستگی کے بجائے رجائیت کے پیام دیے ہیں وہاں اس مینا و جام میں ان کی مے گلفام بہت زیادہ تیز اور تند ہو گئی ہے، مگر یہ غزل گوئی کے فن کی خاطر نہیں، بلکہ ان کے اس پیام کی خاطر ہے جس کے لیے وہ زندہ رہے، ان کو اپنی زندگی میں اس کا افسوس رہا کہ یاروں نے ان کو محض غزل خواں تصور کیا، اور ان کا جو اصل پیام تھا اس کو سمجھنے کی کوشش نہیں کی ؎

بآں رازے کہ گفتم پے نبردند — ز شاخِ نخلِ من خرما نخوردند
من اے میرِ امم داد از تو خواہم — مرا یاراں غزل خوانے شمردند

وہ اپنے کو غزل خواں نہ سمجھیں، لیکن وہ جو غزلیں اپنے پیچھے چھوڑ گئے ہیں وہ اب ان کی ملکیت نہیں رہیں، یہ اب ان کے بعد کی نسلوں کی ملکیت ہے، جس کا مصرف وہ جس طرح چاہیں لیں، ان ہی کا حق ہے، اور وہ خود بھی یہ پیام دے گئے ہیں ؎

میں شاخِ تاک ہوں میری غزل ہے میرا ثمر — مرے ثمر سے مئے لالہ فام پیدا کر

یہ اور بات ہے کہ اس پر بحث کی جائے کہ اوپر کے فارسی اشعار اور نیچے کے اردو شعر میں پہلے اور بعد میں کون لکھے گئے، پھر اس سے قطع نظر مصنف کا یہ دعویٰ دعوت فکر ضرور دیتا ہے کہ اقبال کی اردو غزل گوئی ایک اندرونی جذبہ کا نتیجہ ہے ذہن وقلب کی گہرائیوں سے پھوٹتا ہوا ایک فطری چشمہ ہے جس کے اجزائے عناصر جذبات و احساسات کے ساتھ افکار و خیالات اور تصورات و ادراکات بھی ہیں (ص ۱۵۵) ان کی نظموں میں جو کیفیت ہے اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ان میں غزل کے تغزل کا اسلوب بھی پنہاں ہے، زبور عجم کے چار حصے ہیں، پہلے حصہ میں انسان کے راز و نیاز خدا کے ساتھ، دوسرے حصہ میں آدم کے خیالات آدم کے متعلق ہیں، طرز دونوں کی غزلیاتی رنگ کی ہیں یعنی یہ الگ الگ غزل نما ٹکڑے ہی ہیں۔

اقبال کی غزلوں کے بعد مصنف کو ان کے قطعات، ظریفانہ کلام اور رباعیات پر تبصرہ کرنے میں ان کے قلم کی رنگینی میں خود اقبال کے کلام سے پہونچی ہے، قطعات میں ان کی رعنائی خیال اور شوخی بیان کے علاوہ ان کی نئی طرز فکر اور نئے اسلوب فن اور ہیئت سخن میں مخصوص پیمانے کی بہار نظر آتی ہے' (ص ۵۹) ان کے ظریفانہ کلام کو ایک لطیف اور معنی خیز تبسم قرار دیا ہے، مگر معلوم نہیں ان کے ظریفانہ کلام کے ان چار اشعار کے قوافی پر ان کی نظر گئی کہ نہیں جس میں ڈینگ، ہیگ اور بینگ کے ساتھ وینگ کا بھی قافیہ ہے' ان کی رباعیات کے متعلق مصنف نے لکھا ہے کہ ان میں ان کی شاعری کے بنیادی تصورات کا عطر ان کے مخصوص فن کے بوریں شیشے میں محفوظ کر لیا گیا ہے، (ص ۱۶۰) بعض اوقات مصنف کی تحریروں کی رنگینیوں میں ان کے قارئین ایسے گم ہو جاتے ہیں کہ پھر ان کو یہ خیال نہیں رہتا ہے کہ وہ اقبال کے نظام فن پر اپنی تنقید نگاری کا فن کس طرح دکھا رہے ہیں۔

فطرت کی شاعری کے عنوان سے ہمالہ کے ساتھ گل رنگین، عہد طفلی، ابر کہسار، ایک آرزو پر بھی اپنے ناقدانہ خیالات کا اظہار کیا ہے، مگر انھوں نے اپنی تنقید نہیں بلکہ تقریظ کا سارا زور ہمالہ پر صرف کیا ہے، جس طرح کسی ٹیلی ویژن کے کیمرہ کا فن کار کسی منظر کا احاطہ کرنے میں اس کے شش جہت پہلوؤں کو اس کے پردے پر

ہے، اسی طرح مصنف نے اس نظم کے شاعرانہ تصور، تنقید، تعمق اور تحویل سے پاک آہنگ، اس کی نغمگی، نوائی، معنی آفرینی، نغمہ ریزی، لفظ اور معنی کی پرکیف ترکیب، ترتیب اور ترنم کا احاطہ کر کے اپنی تنقید نگاری کا سچا فن دکھایا ہے، اس سے اس نظم کا جمال جمیل تر ہو گیا ہے، لیکن معلوم نہیں اس نظم کے متعلق ایک نقاد کی اس رائے سے مصنف کو اتفاق ہو سکے گا کہ نہیں کہ اس نظم کے خیالات مغربی ہیں، مگر جو نقاد یہ کہتے ہیں کہ اقبال کی فطرت نگاری کا حجم زیادہ وسیع نہیں، لہٰذا اس کا وزن بہت کم ہے، اس کا مدلل جواب مصنف نے یہ بحث چھیڑ کر دیا ہے کہ جو شاعری فطرت نگاری کہلاتی ہے اس میں بھی فطرت کے ساتھ کچھ اور تصورات ملے ہوتے ہیں، بلکہ ان ہی تصورات کے تحت ہی فطرت نگاری کی جاتی ہے، اس کی مثال میں انگریزی زبان کے بہت بڑے فطرت نگار ورڈس ورتھ کی شاعری پیش کی ہے، مصنف نے اس سلسلہ میں جو دلائل دیے ہیں وہ ضرور قابل توجہ ہیں۔

المیہ شاعری کے عنوان سے 'خفتگانِ خاک سے استفسار'، 'گورستانِ شاہی'، 'فلسفۂ غم' اور 'والدہ مرحومہ کی یاد میں' کو زیر بحث لائے ہیں، اس سلسلہ میں جب وہ یہ لکھتے ہیں کہ سوز و گداز ابھر کر جب رقیق ہو جائے تو اس سے صرف جذباتیت کا نتیجہ برآمد ہوتا اور جب وہ دقیق ہو جائے تو بصیرت کا باعث ہوتا ہے، پہلی صورت سطحی ہے، اور دوسری گہری، بڑا فن گہرائی سے نکلتا ہے، سطح پر نہیں کھیلتا (۲۱۷) تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ المیہ شاعری کے تجزیہ میں ایک نیا زاویۂ نگاہ دے رہے ہیں، اقبال کی المیہ شاعری میں جو ادراک اور دانش مندی ہے اسی روشنی میں اس کی طرف توجہ دلائی ہے۔

انھوں نے رومانی شاعری کے عنوان سے ...... کی گود میں بلی دیکھ کر، پھولوں کا تحفہ عطا ہونے پر، دردِ عشق، دل، محبت، حقیقت، حسن، حسن و عشق، وصال، جلوۂ حسن، تنہائی، فراق اور پیام کا ذکر لائے ہیں، مگر ان نظموں کی خوبیاں بیان کرنے میں ان کا قلم پہلے کی طرح زیادہ شگفتہ و رفتہ نہیں ہوا ہے، لیکن اس میں ان کی یہ رائے شاید تعجب سے پڑھی جائے گی کہ شیلی اور کیٹس جیسے خالص رومانیت پرست

شعراء اقبال کے مقابلہ میں نہیں آتے ، وہ کولرج اور ورڈز ورتھ کو بھی اقبال پر ترجیح دینے کے لیے تیار نہیں، یہ رائے ایک ایسے اہل قلم کی ہے جو ایک یونیورسٹی میں انگریزی زبان و ادب کا استاد ہے، کیا عجب کہ بعض نقاد اس رائے سے اتفاق نہ کریں، لیکن مصنف اس داد کے مستحق ضرور ہیں کہ انگریزی زبان کے بڑے سے بڑے شعراء کا فن ان کے ذہن کو اوروں کی طرح مفلوج اور مرعوب نہیں کر سکا ہے۔

نظم نیا شِوالہ میں اقبال کا جو یہ شعر ہے ؎

پتھر کی مورتوں میں سمجھا ہے تو خدا ہے خاک وطن کا مجھ کو ہر ذرہ دیوتا ہے

مصنف نے اس کی یہ تاویل کی ہے کہ یہ شعر اقبال نے اپنے لیے نہیں کہا ہے، بلکہ برہمن کو خطاب کر کے اس کے تخیل کو باطل کرنے کے لیے کہا گیا ہے، پھر لکھتے ہیں کہ اس پورے بند کا مقصود بداہتہً فرقہ آرائی اور تعصب کی مذمت ہے، (۱۴۲) یہ تاویل مشکل سے قابل قبول ہوگی، اقبال کے نظام فن میں اس بحث کی چنداں ضرورت بھی نہ تھی، یہ ارباب سیاست کے غور کرنے کی چیز ہے کہ اقبال اپنی وطنیت کے بعد اسلامیت پر کیوں اتر آئے، حالانکہ اس پر پوری بحث ہو سکتی ہے کہ وطنیت اور اسلامیت میں کوئی فرق نہیں، بشرطیکہ وطنیت کے تخیل میں جارحیت، فرعونیت اور رعونت نہ ہو۔

"شمع اور شاعر کے ہر بند کے لفظی و معنوی خوبیوں کو ایک اچھے معلم کی طرح سمجھایا ہے، اس میں توحید کا جو درس دیا گیا ہے، اس کی بھی وضاحت اپنی راسخ العقیدگی کے ساتھ کی ہے، آخر میں لکھتے ہیں کہ بانگ درا میں جتنی ملی نظمیں ہیں ان سب میں اس اہم نظم کے کچھ نہ کچھ نقوش ہیں، اس بات کو اس طرح لکھنا صحیح ہوتا کہ اس میں اقبال کے جو جذبات دبے ہوئے تھے وہ ان کی آیندہ کی اردو اور فارسی نظموں میں فلسفہ و حکمت کی شکل میں ابھرے۔

شکوہ اور جواب شکوہ کے متعلق مصنف نے لکھا ہے کہ ان کے مصرعے ہر انجمن میں برقی رو دوڑا دیتے ہیں، پھر تو ان نظموں کے فن اور فکر کو ان کی اسی عمدگی، تازگی اور طرفگی سے سمجھانا چاہیے تھا جس سے

جاگر بھی کیا ہے، مگر شاید ان کو یہ خیال ہو کہ یہ نظمیں ایسی جانی پہچانی ہیں کہ ان کا زیادہ تجزیہ کرنے کی ضرورت نہیں، مگر ان میں اسلامی تاریخ کا جو درس ہے، اور ان کے بیانی حرارت اور ملی غیرت میں جو ابال پیدا ہوتی ہے اس کی طرف توجہ دلانے کی ضرورت تھی۔

"خضر راہ" بھی ایک جانی پہچانی نظم ہے، لیکن اس میں جو فطرت نگاری ہے مناظرِ فطرت کے جلوے سے پیدا ہونے والے جو احساسات ہیں، خضر کی جہاں پیمائی کا جو راز ہے، یا اس میں اشعار کی آوازوں کی ترکیب سے جو طلسماتی صدا بندی ہے، یا پھر اس میں سرمایہ و مزدور کی جو کشمکش ہے، مغرب کی سیاست کی جو استبدادیت غالب ہے، اس کے مقابلہ میں اسلام کی جو چھپی ہوئی بین الاقوامیت ہے، اس کا تجزیہ کرنے میں مصنف نے اپنی تحریر کا پورا جوہر دکھایا ہے، لیکن بعض اوقات تحریر کے طرزِ اظہار کی رنگینی پر "راست انداز بیان" کی سادگی غالب ہو تو تحریر زیادہ موثر ہو جاتی ہے، بعض حلقوں میں اس نظم کا استحصال طرح طرح سے کیا گیا ہے، اس کو اردو شاعری کا نیا عہد نامہ' بھی کہا گیا ہے، لیکن مصنف اس کا پورا تجزیہ کرنے کے بعد جب دنیائے اسلام پر آکر رکتے ہیں تو بڑے جوش کے ساتھ لکھتے ہیں کہ یہ ایک بین الاقوامی برادری کے قیام کا منشور ہے' اس میں ایک آفاقی نظریہ کی بنیاد ایک عالمی اخوت کا بیان ہے، جو نسل' علاقہ، رنگ، زبان، فرقہ اور طبقہ وغیرہ کے تفرقہ انگیز حدود سے بالا ہے، (ص ۲۹۷)

"طلوعِ اسلام" میں جتنے بند ہیں، ان سب کی تصریح مصنف نے کی ہے، ان میں جو استعارات، علامات، تشبیہات، کنایات، تلمیحات، خیال آفریں الفاظ و تراکیب اور فکر انگیز نکات ہیں، ان سب کا تجزیہ کر کے اقبال کے کلام کے فن سے ناظرین کی ضیافت کی ہے، اور اس میں اسلام کی آفاقیت کا جو پیام ہے، اس کی طرف بھی توجہ دلا کر آخر میں لکھا ہے کہ اقبال کے نظامِ فن میں طلوعِ اسلام دیباچۂ کمال ہے۔

اس نظم کے تبصرہ کے ساتھ بانگِ درا کا جائزہ ختم ہو جاتا ہے، اس کی مختلف نظموں پر مصنف کی تنقیدی فکر و نظر کے پڑھنے کے بعد قارئین اس نتیجہ پر پہونچیں گے کہ یہ مجموعہ اقبال کے اور مجموعوں سے کسی طرح کمتر نہیں'

اس کو ظاہر کرنے میں مصنف کا جوشِ بیان اور ان کی حرارتِ فکر بہت معاون ہوئی ہے۔

مصنف کے قلم کا نند بال جبریل کی نظموں کے تجزیے میں بھی قائم ہے، اس مجموعہ میں کل بہتر ۷۲ نظمیں ہیں، ان میں مصنف صرف پندرہ ۱۵ کو زیر بحث لائے ہیں، جس میں ان کا اپنا حسن انتخاب کارفرما ہے، مگر اس انتخاب میں وہ ترتیب قائم نہیں رکھی ہے جو بال جبریل کے مجموعہ میں ہے، مثلاً اس میں مسجد قرطبہ شروع ہی میں ہے، مصنف نے اس پر اپنا تبصرہ سب سے آخر میں رکھا ہے، اس سے پہلے تیرہ ۱۳ نظموں پر اپنے خیالات کا اظہار کر کے ناظرین کو محظوظ کیا ہے، ان تیرہ نظموں میں بعض نظموں کے مرکزی خیالات پر ایک ساتھ اظہار خیال کرنے کے بجائے ان پر علیحدہ علیحدہ اپنی تنقیدی رائے قلمبند کی ہے، مثلاً وہ خود ہی لکھتے ہیں کہ الارض للہ، فرشتوں کا گیت، فرمانِ خدا، اور لینن خدا کے حضور میں ایک ہی قسم کے تصورات ہیں، اسی طرح محبت، مسجد قرطبہ، ذوق و شوق اور ساقی نامہ کے مضامین ملے جلے ہیں، جدائی اور روح ارضی آدم کا استقبال کرتی ہے، میں یکسانیت ہے، اگر ان نظموں کی نوعیت کے لحاظ سے ان کے فکر و فن پر ایک ساتھ تبصرہ کیا جاتا تو ان کو سمجھانے میں شاید زیادہ آسانی ہوتی، مگر مصنف کے ذوق کے مطابق ہی ان کے تنقیدی فن پر غور کرنا ہے۔

الارض للہ بظاہر ایک مذہبی نظم معلوم ہوتی ہے، لیکن اس میں فطرت، مذہب، معیشت، سیاست اور پھر شاعری کا جو طلسمی مرکب ہے اس کی وضاحت مصنف نے اچھی طرح کی ہے، اور اس کے ہر مصرع میں فطرت کی ایک تصویر اور فن کا ایک پیکر پایا ہے، اس میں زمین کے متعلق مصنف کے خیال میں ایک اشتراکی احساس ہے، مگر اس احساس میں وہ اشتراکیت نہیں جس کا مفہوم آج کل کچھ اور ہے، "محبت" صرف چار ۴ اشعار کی نظم ہے، مگر مصنف اس کو ہم آہنگی، مترنم شاعری، حسن بیان کی دلکشی، نکتہ وری اور دقیقہ سنجی کا مکمل نمونہ قرار دیتے ہیں، "جدائی" بھی چار ۴ اشعار کی نظم ہے، مگر مصنف کے خیال میں اس میں محبوب ازل کے ساتھ مظاہر فطرت کے وصال اور اس کے پیدا ہونے والے سکون کا ایک طلسماتی نغمہ ابھرتا ہے، "فرشتوں کے

گیت" اور "زمانِ خدائی" مصنف نے "گیت" میں تو جان پایا ہے، لیکن "زمان" میں جلالؔ کی آمیزش ابھی تعبیر ہے، اس تمثیلی نظم سے تو کل کے اشتراکی اپنے حسبِ مطلب کی برآری کرتے ہیں، اس کا رد مصنف نے یہ لکھا کیا ہے کہ "زمانِ خدا" اشتراکیت کا، جدلیاتی مادیت اور طبقہ وارانہ جنگ کا پیغام نہیں، بلکہ عصرِ حاضر کے عالمِ انسانیت میں ایک ہمہ جہت بنیادی اور مکمل انقلاب کا فرمان ہے، جو معاشی، مذہبی اور معاشرتی سب ہی سطحوں پر کامل تغیر کا متقاضی ہے، مصنف کی یہ تغیر ضرور قابلِ غور ہے، "لینن خدا کے حضور میں" بڑی مشہور نظم ہے، اشتراکیوں نے اس کا استحصال خوب کیا ہے، لیکن مصنف کا تبصرہ یہ ہے کہ اشتراکی لینن عالمِ آخرت میں پہونچ کر مسلمان ہو گیا ہے" اس کے بجائے اگر یہ لکھا جاتا تو شاید زیادہ بہتر ہوتا کہ اقبال نے لینن کو مشرف بہ اسلام کر کے خدا کے حضور میں پیش کیا ہے، کیونکہ ایک خیال یہ بھی ہے کہ کمیونزم گویا لسِ اسلام ہے، اگر کمیونزم میں خدا کا تصور شامل کر لیا جائے تو پھر مسلمانوں کو اس سے وحشت نہ ہو، اقبال کو شاید خیال رہا ہو کہ لینن مسلمان ہوتا تو اچھا تھا، وہ اس دنیا میں تو اس کو مسلمان نہیں بنا سکتے تھے، مگر اپنے شاعرانہ تخیل کے ساتھ آخرت میں مسلمان بنا کر خدا کے حضور میں پیش کر دیا، اندلس کے فاتح طارق کی دعا، پر تبصرہ کرتے ہوئے مصنف نے اس کو شخصیات کی شاعرانہ کردار نگاری کے مخصوص افکار کو فنی پیکر میں ڈھالنے کا ایک خیال آفریں نمونہ بتایا ہے، "اذان" کو ایک حسین پارۂ فن کہا ہے، وہ جبرئیل و ابلیس کی غضب کی شاعری، معرکہ کی فلسفہ طرازی اور کائنات کی علامت شر کی نقش گری سے متاثر ہوئے، اور "گو ابلیس و یزداں" ضربِ کلیم کے مجموعہ کی نظم ہے لیکن اس سے موازنہ کرنے کی خاطر اسی نظم کے ساتھ زیرِ بحث لے آئے ہیں، اور لکھتے ہیں کہ جبرئیل و ابلیس میں اصلی آواز ابلیس کی ہے، جس کی رومانیت شعر بداماں ہے، لیکن "ابلیس و یزداں" میں آواز خدا کی ہے جس کی الوہیت مظہرِ حکمت ہے" اس تبصرہ سے دونوں نظموں کے سمجھنے میں مدد ملے گی، "روحِ ارضی آدم کا استقبال کرتی ہے" کے مطالعہ میں افکار تخیلات و تصاویر کی ایک شاخِ زریں اور اسماء و افعال کا ایک نغمۂ رنگیں معلوم ہوا ہے، "زمانہ" کو بیانیہ شاعری کی ایک حسین مثال تصور کرتے ہیں، جس میں نکتۂ فکر بھی ہے اور نغمۂ فن بھی، نظم "لالۂ صحرا" کو اقبال کی شاعری کے

علائم کا محل سرسبد قرار دیا ہے، اور اس کا موازنہ رابرٹ ہیرک اور ورڈسورتھ کی ان نظموں سے
ان دونوں شاعروں نے ڈیفوڈلز کے عنوان سے لکھی ہیں، بڑے وثوق کے ساتھ لکھتے ہیں کہ اقبال
فطرت میں روح کی جو گہرائی اور ان کے یہاں عالم تنہائی کے تخیل میں جو شعلہ سینائی ہے وہ رابرٹ
کے یہاں نہیں، اسی طرح نشاط تنہائی میں ورڈسورتھ کی چشم باطن بہت ہی محدود اور ناقص ہے، اس کے
اقبال کی نگاہ اور اس کا نشاط پوری کائنات پر پھیلا ہے، ورڈسورتھ کا پورا نگارخانۂ فطرت اقبال
و آہنگ کے سامنے گرد ہو جاتا ہے، مظاہر فطرت سے جمال حقیقت کی آرزش کا جو کام اقبال نے
ورڈسورتھ نہیں لے سکا ہے، فطرت اقبال کا وسیلۂ فن ہے، اور ورڈسورتھ کا مقصد فن ہے،
اقبال کی مضبوطی اور ورڈسورتھ کی کمزوری کا سبب ہے، آگے چل کر مصنف نے اقبال کی نظم
کا موازنہ شیلی اور ورڈسورتھ کی نظموں اسکائی لارک سے بھی کیا ہے، اور لکھا ہے کہ شاہین پورے
اور شاعرانہ کمال کے ساتھ ساتھ ایک فکری نصب العین کی علامت اور ایک نظام فکر کا اشاریہ ہے
لتبار سے یہ ایک محیط و مربوط نظام فن کا جز ہے، اور ایک وسیع و منظم اخلاقی جمالیات کا حصہ ہے، یہ
انگریزی نظم اسکائی لارک میں نہیں پائی جاتی ہیں، مصنف نے رابرٹ ہیرک، شیلی اور ورڈسورتھ
نبال کے موازنے کی پر مغز اور دلچسپ بحث میں اپنی ادبی وراثت کی جو برتری دکھائی ہے اس کو پڑھ کر
کا سر پر غرور بھی اونچا دکھائی دے گا۔

مصنف نے اقبال کی نظم 'ذوق و شوق' کے پانچ بندوں کے بیس اشعار پر تبصرہ کر کے پھر اپنی
ی دیدہ وری کا پورا ثبوت دیا ہے، وہ لکھتے ہیں کہ بال جبرئیل کا تغزل منتظر ہو کر اس نظم میں مجسم
اہے، اس کے چوتھے بند کے حصہ کو غزل الغزلات کہتے ہیں، جس میں ان کو آفاق کی پہنائی' اور
ں کی گہرائی نظر آتی ہے۔

مصنف کے خیال میں نظم ساقی نامہ میں اقبال کے ذہن و فن کا امتزاج اپنے اس نقطۂ عروج پر ہے

جو انھوں نے حاصل کیا تھا، اور جو دنیائے شاعری کا سب سے قابل ہے۔

اقبال کی شاعری کا عظیم ترین نمونہ مسجد قرطبہ ہے جس میں اقبال کو کعبۂ فن اور سطوت دین متین نظر آیا مصنف نے اس نظم کو بہت ہی پیچیدہ، بالیدہ اور تراشیدہ کہا ہے، انھوں نے اس کے مختلف بندوں میں ایک ارغنون کی تیز، بسیط اور تہ دار آواز پائی ہے، اس میں عشق کے مضراب سے نغمۂ تار حیات کا جو آہنگ بلند ہوتا ہے، یا اس کے استعاروں میں جو عظیم فنکاری ہے اس کے حسن معنیٰ میں جو لالہ کاری ہے، اس کی فصاحت میں جو بلاغت یا سلاست میں جو فصاحت ہے، عقل و عشق اور منزل و حاصل کا جو آفاقی توازن ہے، اور عالم انسانیت کی جو عبرت خیز اور فکر انگیز تصویر کشی ہے، ان سب کا تجزیہ کرنے میں مصنف نے اپنی تنقید اور تحریر کا فن بہت ہی سلیقہ سے دکھایا ہے، اس نظم میں جو فطرت نگاری ہے اس کا موازنہ ورڈسورتھ کی نظم ٹنٹرن ایبی سے کیا ہے، اور ایک بار پھر ورڈسورتھ پر اقبال کی برتری دکھائی ہے، ان کے دلائل یہ ہیں کہ مسجد قرطبہ میں جو حرارت، تب و تاب اور زندگی کی کیفیات ہیں ان سے ٹنٹرن ایبی خالی ہے، جس کی سطریں نہایت ٹھنڈی، بجھی بجھی اور اکھڑی اکھڑی ہیں، اس کے مقابلہ میں اقبال کا فن رب السمٰوات والارض کی بندگی کو مرکز نظر بنا کر شاعری اور زندگی دونوں کے سدرۃ المنتہیٰ تک جانے کے لیے آزاد اور فراخ ہے، اس آزادی اور فراخی سے ادب کی وسعتوں میں دنیا کا بلند ترین مینارہ نظر آتا ہے، مصنف نے یہ ساری باتیں جس یقین محکم کے ساتھ کہی ہیں ان کی تردید کرنا آسان نہیں ہے، ان کے لیے تو اور مشکل ہے جو اقبال کی شاعری کے لعل بدخشاں کے ڈھیر پر اس کے خیالات و جذبات کی کرنوں کو دیکھنے کے لیے دیدۂ بینا نہیں رکھتے۔

بال جبرئیل کے بعد ضرب کلیم کا مطالعہ کیا گیا ہے، اس میں اقبال نے ایک سو ستاسی[۱۸۷] عنوانات سے چھوٹی بڑی نظمیں لکھی ہیں، جو بال جبرئیل سے بہت زیادہ ہیں، مگر مصنف نے اس کی صرف چودہ[۱۴] نظموں پر اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے، یہ دیکھ کر تعجب ضرور ہوتا ہے کہ انھوں نے بانگ درا کا احاطہ جس طرح اپنے

ایک سو پچپن[155] صفحے ملتے ہیں، بالِ جبریل کے لیے ایک سو چھیالیس[146] صفحے صرف کیے ہیں لیکن ضربِ کلیم پر ان کا قلم چھتیس[36] صفحے پہ رک گیا ہے، حالانکہ ان کا بیان ہے کہ بانگِ درا کی نظری و پیامی شاعری سے جو جذبۂ فن اور سلیقۂ ہنر نمودار ہوا تھا، وہ بعد کے مجموعوں میں اوجِ کمال پر پہونچ کر بھی ختم نہیں ہوتا شاید ضربِ کلیم تک پہونچتے پہونچتے ان کا جوشِ بیان مدھم پڑ گیا ہے،

مصنف نے ضربِ کلیم کی نظموں کے انتخاب میں اس مجموعہ میں جو ترتیب ہے، اس کا خیال نہیں رکھا ہے، اپنے حسنِ ذوق سے ان کا انتخاب کرکے ان کا تجزیہ شروع کر دیا ہے، 'صبح' کے چار مصرعوں میں ان کو طلوعِ اسلام کی حسین اور پُر اثر نقش گری نظر آئی 'معراج' کے ہر شعر کے کسی نہ کسی استعارہ یا تلمیح میں انسان کے آخری نقطۂ عروج کی طرف پرواز کرنے کا حوصلہ اور ولولہ پایا ہے، انھوں نے علم و عشق کے پُر معنی الفاظ و تراکیب کی نشست اور بندش میں موسیقی کی لہریں رقص کرتی ہوئی محسوس کی ہیں، 'مردِ مسلمان' کو ایک سرور انگیز غنائیہ کہہ کر اس کے رنگین اور زرین علامات و استعارات کی طرف توجہ دلائی ہے 'مدنیتِ اسلام' میں صرف پانچ اشعار ہیں، لیکن یہ لکھ کر اس کی تعریف کی ہے کہ اس میں تخیل نے ثقیل اور دقیق سے دقیق افکار کی متانت کو فن کی لطافت میں تبدیل کر دیا گیا ہے 'تعلیم و تربیت' کے ابلاغ شعریت، ایمائیت اور نفاستِ اظہار کے فن کی تحسین کی ہے، 'ٹیپو سلطان کی وصیت' میں اقبال کے فن کی اس کیمیاگری کی نشاندہی کی ہے جو اجزائے افکار کو تحلیل کر کے اشعار نظم میں ترکیب دیتی ہے، 'طالبِ علم' کے ذریعہ سے ان کے خیال میں خوابیدہ ذہنوں میں تلاطم پیدا ہوتا ہے، نظم 'عورت' پر اتنا ہی تبصرہ لکھنے پر اکتفا کیا کہ چند لفظوں اور چند نکتوں کے ذریعہ سے ایک نہایت سنجیدہ موضوع کو آئینہ دکھایا گیا ہے، حالانکہ اس کے مصرع۔ اس کے شعلے سے ٹوٹا شرارِ افلاطوں۔ کی پوری وضاحت کرنے کی ضرورت تھی، "نگاہ" کے ایک ایک مصرع، ایک ایک ترکیب اور ایک ایک لفظ کو حسنِ فطرت کی ایک ایک ادا کا آئینہ جمال کہا ہے، 'نگاہِ شوق' کی موسیقی کے آہنگ اور تراکیب کے رنگ سے محظوظ ہوتے ہیں، 'نسیم و شبنم' کے

خوبصورت مکالمہ میں ایک خیال کو جس طرح مجسم کیا گیا ہے اس سے وہ متاثر ہیں، 'تمثیلی مکالمہ' ... 'چمن' ان کو اس لیے پسند ہے کہ اس میں مناظر قدرت کی لطیف و بلیغ تصویر کشی میں ... کے مسلسل شاعرانہ پیکروں اور فنی رنگ و آہنگ سے بہت لطف اندوز ہوئے ہیں، 'شعاع امید' کو ضرب کلیم کی بہترین تمثیلی نظم قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اس میں جو ترتیب، تنظیم اور ارتکاز ہے، وہ عظیم ترین شاعرانہ فن کا نمونۂ کامل ہے۔

اپنی تحریروں کی محویت میں بعض نظموں کے عنوانات قائم کیے بغیر اپنے خیالات کا اظہار کرنا شروع کر دیا ہے، ان کے خیال میں 'ابی سینا' میں مغرب کی سرمایہ دارانہ اور مستبدانہ سیاست کا جائزہ بڑے بانکپن سے لیا گیا ہے، 'مسولینی' کے طرز اور انداز کو شعریت و معرفت سے لبریز، لطیف و دلپذیر، نکتہ آفریں، دل کشا اور موضوعاتی نظم نگاری کی حدود میں تمثیل کا اعلیٰ معیار قرار دیا ہے، بال جبریل میں بھی مسولینی پر ایک نظم ہے، ان دونوں نظموں سے کچھ غلط فہمیاں پیدا ہو گئی ہیں جن کو مصنف نے یہ لکھ کر دور کیا ہے کہ پہلی منتخب شخصیت کے شاعرانہ کردار نگاری کا باب اول ہے، اور دوسری باب دوم ہے، ایک میں متکلم اور موقف مسولینی سے تعلق رکھتے ہیں، دوسرے کا تعلق شاعر سے ہے، جب مسولینی کی زبان سے اس کے خیالات ظاہر کیے گئے ہیں تو وہ کچھ اور آواز ہے، لیکن جب شاعر نے خود اس کے کمالات کی شرح کی ہے تو دوسری آواز سے کام لیا ہے، یہ صرف تیور کا فرق ہے، جب کہ اسلوب سخن دونوں میں ایک ہی ہے، اور یہ اقبال کا معروف و معین طرز و انداز ہے، لیکن اسی کے ساتھ یہ وضاحت کر دی جاتی کہ ایک نظم اس وقت کہی گئی جب مسولینی اپنے ملک کا ہیرو بنا ہوا تھا، اس سے اقبال کا متاثر ہونا تعجب انگیز بات نہیں، لیکن جب اس نے ابی سینا پر حملہ کر دیا تو اقبال کی رائے اس کے متعلق بدل گئی، دوسری نظم اس حملہ کے بعد کی ہے، چنانچہ نظم 'ابی سینا' میں یہ لکھ کر اپنی آزردگی کا اظہار کیا ہے ؎

برگِ گل کو ہے بوئے معصوم کی تلاش

مصنف نے ارمغان حجاز کی نظموں کے انتخاب میں بھی مجموعے کی ترتیب کا خیال رکھے بغیر اس کی نظموں پر اپنے خیالات کا اظہار شروع کر دیا ہے، ان کی رائے ہے کہ "آوازۂ غیب" کے استعارات میں ایک فنی سانچہ تیار ہوا ہے، ان کو 'بلوچ کی نصیحت' میں خود اقبال کے تخیل کے عنصر کی علامت اور ایک نتیجہ خیز فن کاری کا وسیلہ دکھائی دیا ہے، 'تصویر و مصوری' میں خودی کا فلسفہ بیان کرنے میں مصرعوں میں جو چستی ہے اور لفظوں میں جو لطافت، ترکیبوں میں جو نفاست اور طرز ادا میں جو فصاحت و بلاغت ہے، اس سے لذت آشنا ہونے کی ترغیب دلائی ہے،

کتاب کے آخر میں ابلیس کی مجلس شوریٰ کے تجزیہ میں مصنف نے اپنے قلم، تحریر، انداز بیان، اور دقیقہ سنجی کا پورا زور ایک بار پھر دکھایا ہے، جس سے قارئین اچھی طرح لطف اندوز ہو سکتے ہیں، وہ اقبال کے عشق میں انگریزی زبان کے بڑے سے بڑے شعراء کو خاطر میں نہیں لاتے، اس لیے اس نظم کے سلسلہ میں بھی اقبال کا موازنہ شکسپیر اور ملٹن سے کرتے ہیں، اور یہ جانتے ہوئے کہ اقبال اور شکسپیر دو مختلف فن کے ترجمان ہیں' وہ یہ لکھ کر اپنے ذوق کو تسکین دیتے ہیں کہ شکسپیر اصلاً ایک ڈرامہ نگار ہے، جس نے نظم میں ڈرامہ نگاری کی ہے، جب کہ اقبال حقیقۃً ایک شاعر ہیں، جنھوں نے ڈرامائی عناصر سے بھی کام لیا ہے، البتہ اقبال اور ملٹن کے موازنہ کا انداز دوسرا ہے، اور صحیح بھی ہے' وہ لکھتے ہیں کہ اقبال کا ابلیس اپنے شر پہ نازاں ہے، اپنی تخریبی قوت کے نشے میں چور ہے، لیکن وہ خدائے کارساز کی برتری کو چیلنج نہیں کرتا، بلکہ اپنا حریف اپنے آقا کی اولاد کو سمجھتا ہے، اور اس پر خدا ہی کے غضب کا اعلان کرتا ہے، وہ خوش ہے کہ خدا اور ملائکہ نے انسانیت سے جو توقعات قائم کی تھیں' وہ ختم ہو چکی ہیں، اور اب آدم زاد کی کشتی برباد ہونے والی ہے، اس بربادی کو وہ اپنا کارنامہ تصور کرتا ہے، وہ ملوکیت، لادینی اور سرمایہ داری کو اپنا ہی فعل سمجھتا ہے، اور دعویٰ کرتا ہے کہ جس تمدن کے

ہنگاموں میں اس کا وجود معدوم ہو اس کا آتش سوزاں کبھی سرد نہیں ہو سکتی، مصنف کے خیال میں ابلیس کا یہ تصور ملٹن کے تصور سے مختلف ہے، ملٹن کا ابلیس خدا کا حریف ہے، وہ ملکوتی قوتوں کے مقابلہ میں اپنی شہ زوری دکھاتا ہے، اور انتہائی کریہہ دہیب شکل میں نمودار ہوتا ہے، اقبال کا ابلیس حقیقی، مستند اور متوازن ہے، ملٹن کا ابلیس زخمی، ناقابل اعتبار اور غیر معتدل ہے، ملٹن کے ابلیس میں ڈرامہ نگاری زیادہ اور شاعری کم ہے، اقبال کا ابلیس زیادہ شاعرانہ اور کم ڈرامائی ہے، ملٹن نے اپنے ڈرامائی ابوالہول کو زیادہ موثر بنانے کے لیے مسیحی روایات کی حدود سے تجاوز کر کے یونانی صنمیات کا سہارا لیا ہے، مگر اقبال نے اسلامی روایات کی حدود میں ایک موثر شاعرانہ شخصیت کی تعمیر کی ہے، مصنف یہ بھی لکھتے ہیں کہ اقبال کی اس نظم کا پورا منصوبہ اہل مغرب اور ان کے مختلف نظریات پر ایک کاری طنز ہے، مصنف کے اس موازنہ سے اقبال کے پرستاروں کو ضرور خوشی ہوگی، اور وہ اپنی ادبی وراثت پر فخر کرنا بھی سیکھیں گے،

مصنف نے ایک جگہ لکھا ہے کہ ارمغان حجاز کی بیشتر نظموں میں فن کی استواری اور فکر کی ہمواری کے باوصف کچھ خشکی کا احساس ہوتا ہے اور اقبال کے اسلوب سخن کی عام شگفتگی میں کمی محسوس ہوتی ہے، (ص ۵۲۵) پانچ سو باون صفحے کی اس کتاب میں یہی چند جملے اقبال کی شاعری کے کچھ خلاف لکھے گئے ہیں، ورنہ یہ شروع سے آخر تک نہایت پرستارانہ اور عقیدت مندانہ جذبات کے ساتھ لکھی گئی ہے، ممکن ہے کہ بعض نقادوں کو اس کی بعض باتوں سے اختلاف ہو، لیکن اس حقیقت کا انکار مشکل سے کیا جائے گا کہ اقبال کی اردو شاعری کے تجزیہ میں یہ ایک عمدہ کتاب کی حیثیت سے برابر پڑھی جائے گی۔

راقم کو خود اقبال کے کلام سے عشق ہے، اس لیے اس کتاب سے لذت لے کر اپنے ناظرین کو بھی لذت آشنا کرنے کی کوشش کی ہے

ہم تو اسیر ہیں خم زلف کمال کے

اب تک تو یہ دکھایا گیا کہ اس کتاب میں کیا ہے، اسی کے ساتھ اس کی بھی اندرونی خواہش ہوئی کہ اس میں کیا ہونا چاہیے تھا، اقبالیات پر لٹریچر کا ایک انبار لگ چکا ہے، خواہش ہوتی ہے کہ اقبال نے جتنی نظمیں لکھی ہیں، ان میں سے ہر ایک کے متعلق یہ بتایا جاتا کہ یہ کیوں، کب اور کن حالات میں لکھی گئیں، یہ محنت طلب کام ضرور ہے، لیکن زیادہ مشکل بھی نہیں، اب تک اقبالیات پر جتنا کچھ لٹریچر آچکا ہے، اس کے سہارے یہ انجام پا جائے تو اقبال کے نظام فن اور نظام فکر دونوں کو سمجھنے میں پوری مدد ملے۔

اقبال کے کلام میں الفاظ کے ذخیرے کا ایک چمنستان نظر آتا ہے، مصنف نے جا بجا ان کی طرف توجہ دلائی ہے، لیکن ان کی اردو شاعری میں ذرۂ سینائے علم، گلشن کن کی بہار، سورۂ والشمس کی تفسیر، سورۂ والنور، التجائے ارنی، اعراب السموات، تفسیر حرف لا نیسلون، رعونت شان لکم وغیرہ جیسے ٹکڑے اور اشارے استعمال ہوئے ہیں، اس بحث کی ضرورت تھی کہ ان سے ان کا نظام فن مجروح تو نہیں ہوا، گو ان کا نظام فکر تو ضرور بلند ہوا،

اقبال نے کوثر و تسنیم، سدرہ، طور، کلیم، ید بیضا، شراب طہور، سلسبیل، شبانی، کلیمی، بشیری، نذیری، خضر، الیاس، بایزید، معرکۂ ایک و غوری، نغمۂ خسرو، شوکت سنجر و طغرل، قوت حیدری، فقر جنید و بایزید، ارد شیری اور طلسم برہمن جیسے الفاظ استعمال کیے ہیں، جو اور اردو شعراء کے یہاں کم کیے گئے ہیں، کیا ان الفاظ سے اقبال کے نظام فن کو استوار اور ہموار کرنے میں مدد ملی، یا ان کی فکر میں ایسی روح پیدا ہوئی جو پہلے نہیں ہوئی تھی۔

اقبال کی اردو شاعری میں الفاظ کے تکرار سے جو حسن پیدا ہو گیا ہے، یا اس میں جو لفظی صناعیاں خود بخود بروئے کار آ گئی ہیں اس میں صنعت اشتقاق، صنعت تجنیس اور صنعت ایہام کی جو مثالیں ہیں ان کے نظام فن کو سمجھانے میں ان کی بھی نشاندہی کی ضرورت تھی، ان کے یہاں صنعت سجع بھی ہے،

جس سے انھوں نے اپنے کلام میں جو برجستگی اور خوش سلیقگی پیدا کی ہے، اس پر بھی کچھ اظہار خیال چاہیے تھا۔

بانگ درا میں اقبال نے بعض انگریزی شعراء کی نظموں کو سامنے رکھ کر کچھ نظمیں کہی ہیں، اسی طرح وہ داغ اور غالب کے علاوہ نسیمی، تشا طوہ، ملا عرشی، ابو طالب کلیم، فیضی، ملک قمی، رضی دانش، صائب اور بیدل سے بھی متاثر نظر آتے ہیں، اور ان میں سے بعض نظموں پہ تضمینیں بھی لکھی ہیں، کیا یہ ان کے ابتدائی دور کی محض مشق سخن سمجھی جائے، یا ان کا مستقل اثر ان کے کلام کے نظام فن اور فکر پر بھی رہا ہے؟ اقبالیات کے سلسلہ میں اس کی بھی بہت کچھ نشاندہی ہو چکی ہے کہ انھوں نے بعض مصرعے دوسرے شعراء مثلاً مسعود سعد سلمان، رومی، صائب، سنائی، قاآنی اور غالب سے بھی لیے ہیں، ذہن میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ مصرعے تعظیماً یا تفریحاً یا ضرورۃً لیے گئے یا فن اور فکر میں اضافہ کی خاطر لیے گئے ہیں؟ اگر یہ فن کے دائرہ کی چیز ہے تو اس کی کچھ وضاحت ہونی چاہیے تھی۔

ایک بار پھر یہ کہنا ہے کہ فن اور فکر کی بحث بڑی نازک ہے، اقبال کے حسب ذیل اشعار سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ فکر پر زیادہ زور دیتے تھے ؎

آیا کہاں سے نالۂ نے میں سرورِ مے ——— اصل اس کی نے نواز کا دل ہے کہ چوبِ نے

گر ہنر میں نہیں تعمیر خودی کا جوہر ——— وائے صورت گری و شاعری و نائے و سرود

مری نوائے پریشاں کو شاعری نہ سمجھ ——— کہ میں ہوں محرمِ رازِ درونِ مے خانہ

ان کا فن برائے فن نہ تھا، بلکہ زندگی کو پیام دینے اور اس کی تعمیر کے لیے تھا، ان کی فکر نے ان کے فن کو عظمت عطا کی، ان کا فن حسین اور رنگین ہو کر رہ جاتا تو ان کی شاعری بھی حسین اور رنگین بن کر رہ جاتی، جس کی قدر شاعرانہ اور جمالیاتی ذوق کی تسکین کے لیے تو کی جاتی، لیکن شاید اس سے وہ بے پناہ عقیدت نہ ہوتی جو اب ہے، اور یہی وجہ ہے کہ ان کی فکر نے ان کے فن کو با عظمت بنا دیا، اور اس

با عظمت ذکر و فکر کی صورت ہمارے کانوں میں بانگ درا سنائی دی، ہمارے ذہن کو جبرئیل کا بال و پر ملا، اور ہمارے جمود کو کلیم کی ضرب لگی، اور جو جوہر ادراک ہم سے کھو گیا تھا اس کی یادوں کا ارمغان ملا، اسی میں ان کی اصلی عظمت، شوکت اور جلالت ہے۔

آخر میں مصنف کی توجہ ایک خاص بات کی طرف بھی دلانی ہے، انھوں نے اپنی کتاب میں وہی دل آویز زبان استعمال کی ہے جس کا متقاضی اقبال کا کلام تھا، اقبال کے کلام پر کچھ لکھتے وقت خود ان کا کلام ذخیرۂ الفاظ پیش کرتا رہتا ہے، لائق مصنف نے اس سے پورا فائدہ اٹھایا ہے، لیکن ان کی تحریروں میں تخلیق، تخلیقات اور خلاقی جیسے الفاظ کھٹکے، وہ اقبال کے عاشق زار ہیں، ان کی ضرب کلیم کی نظم تخلیق جس معنی میں یہ لفظ استعمال ہوا ہے اس سے مصنف کو متاثر ہونا چاہیے تھا، تخلیق، خلق، خلاقی تو ہمارے اللّٰہ مطلق سے وابستہ ہے جو ساری کائنات کا خالق ہے، اب سے پہلے شاید ترقی پسندوں اور ملحدوں نے خالق کی تضحیک کے لیے یہ لفظ استعمال کرنا شروع کیا تھا، جو غیر شعوری طور پر ہمارے سنجیدہ اور حتی کہ مذہبی خیال کے اہل قلم بھی استعمال کرنے لگے، کتاب یا نظم کو تخلیق اور اس کے لکھنے والے کو خالق یا خلاق کہنا علمی اور ادبی بدعت ہے، جس سے شرک کی بو آتی ہے، معارف کے صفحات میں اس کی طرف پہلے بھی توجہ دلائی گئی تھی، لیکن اب یہ اتنی کثرت سے استعمال ہونے لگا ہے کہ اس کا ترک کرنا بظاہر آسان نہیں، مگر محتاط اہل قلم تو اس کے استعمال سے گریز کر سکتے ہیں۔

مطبوعات جدیدہ

کاروانِ زندگی حصہ دوم، مرتبہ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، متوسط تقطیع، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، صفحات ۴۲۰، مجلد مع رنگین گردپوش، قیمت تیس روپیے، پتہ:۔ مکتبہ اسلام، ۳۷ گوئن روڈ، لکھنؤ

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے خودنوشت حالات "کاروان زندگی" حصہ اول کا ان صفحات میں ذکر آچکا ہے، یہ اس کا دوسرا حصہ ہے، اس میں سنہ ۶۶ء سے سنہ ۸۳ء تک کی سرگذشت قلمبند کی گئی ہے، فاضل مصنف کی زندگی نہایت مشغول اور گوناگوں سرگرمیوں سے معمور ہے، اور وہ اپنی عالمگیر شہرت و مقبولیت کی بنا پر ملک و بیرون ملک خصوصاً دنیائے اسلام کا مرجع و مرکز توجہ بنے ہوئے ہیں، قوم و ملت کے مہمات امور میں رہنمائی و رہبری کے لیے ان کی جانب سب کی نگاہیں اٹھتی ہیں، وہ ملک و بیرون ملک کے اکثر ممتاز اداروں اور اکیڈمیوں کے ممبر بھی ہیں، اور ان کے اور دنیا کے اکثر اہم اجتماعات، بین الاقوامی کانفرنسوں اور بڑے بڑے علمی، تعلیمی، دینی اور تبلیغی جلسوں میں ان کو متواتر خطاب کرنے کا موقع ملتا ہے، ان کی زندگی دین و ملت کی خدمت، اسلام کے احیاء و اشاعت اور خلق کی اصلاح کے لیے وقف ہے، اور ان کا وجود بنی آدم کی ہمدردی و خیر خواہی، مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ، سرمایۂ ملت کی حفاظت اور کلمۃ اللہ کے اعلاء کے لیے ہمہ تن جہد و جہاد بنا ہوا ہے، ان کا یہ بھی کمال ہے کہ ان مشغولیتوں اور ہنگاموں سے

سروکار رکھ کر بھی وہ اپنا علمی اشتغال قائم اور تصنیفی سرگرمیاں جاری رکھے ہوئے ہیں، اس کتاب میں ان کے ان ہی مشاغل اور سرگرمیوں کی روداد پیش کی گئی ہے، اس کے علاوہ اس عرصہ میں ملک و بیرونِ ملک میں جو اہم واقعات و حوادث رونما ہوئے اور جن سے مولانا کا حساس دل اور درد مند طبیعت غیر معمولی طور پر متاثر ہوئی اور جن کے ردعمل میں بعض ایسی تحریکیں وجود میں آئیں جن سے مولانا کا بھی خاص تعلق رہا ہے، ان سب کا صحیح پس منظر بیان کیا ہے، اور ان کے جو اثرات و نتائج مترتب ہوئے ہیں ان پر بے لاگ اور حقیقت پسندانہ تبصرہ کیا ہے، یہ کتاب پندرہ ۱۵ ابواب پر مشتمل ہے، ان ابواب میں مولانا نے اپنی متعدد اہم تصنیفات اور تقریروں کے مجموعوں کا مبسوط تعارف کرایا ہے، جس میں ان کی تالیف کا محرک اور ان کی نمایاں خصوصیات بھی بیان کی ہیں، اور ان کے مفید بعض خیز بعض اقتباسات بھی دیے ہیں، ایک مستقل باب میں قومیت عربیہ اور اشتراکیت کے علمبردار صدر جمال عبد الناصر سے اپنی مخالفت کے اسباب بیان کیے ہیں، اس میں عالمِ عربی کے مسائل و واقعات سے اپنی غیر معمولی دلچسپی کی وجہیں بھی تحریر کی ہیں، اور صدر ناصر کی عربوں میں مقبولیت کے اسباب اور ۱۹۶۷ء میں اسرائیل کے ہاتھوں عربوں کی پسپائی اور ہزیمت کا ذکر بھی آگیا ہے، ایک باب مسلم مجلس مشاورت کے لیے خاص ہے، اس میں جنوبی ہند اور ملک کے دوسرے حصوں میں ارکانِ مجلس کے دورے اور مختلف جلسوں میں کی گئی اپنی تقریروں کا ذکر کیا ہے، اور اپنا ایک طویل مکتوب بھی نقل کیا ہے جو صدر مجلس ڈاکٹر سید محمود مرحوم کے نام ہے، اس سے سیاسی و ملی مسائل کے بارے میں ان کے نقطۂ نظر کا پتہ چلتا ہے، اس باب میں انھوں نے اپنے بارے میں ایک عام شبہہ کا جواب بھی دیا ہے اور بتایا ہے کہ ہنگاموں اور سیاسی کاموں سے عدم مناسبت، رائے پور کی خانقاہ سے وابستگی اور تصنیفی ذوق و انہماک کے باوجود انھوں نے مجلس مشاورت کے وفد کے ساتھ مختلف صوبوں کے طویل دورے کیوں کیے اور قوم و ملت کے امور، ملک کی سیاسیات اور انتخابات میں مسلمانوں کے طرزِ عمل کے تعین وغیرہ سے کیوں اس قدر

غیر معمولی دلچسپی لی، تحریک پیام انسانیت کی داغ بیل خود مولانا نے ڈالی ہے، ایک باب میں اس کا ذکر، اس کے قیام کے محرکات و مقاصد اور آغاز وارتقا کی تفصیل لکھی ہے، اور اس کے سلسلہ میں ملک کے بعض حصوں میں اپنے دورے اور تقریروں کا ذکر کیا ہے، مسلم پرسنل لا بورڈ اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی بھی مولانا کی سرگرمیوں کا خاص محور رہیں، ان کے بارہ میں بھی معلومات قلمبند کیے ہیں، ملک و بیرون ملک کے اہم واقعات میں پہلے ہندوستان و پاکستان کی جنگ کا ذکر کیا ہے، اس سلسلہ میں مشرقی پاکستان میں لسانی و تہذیبی تعصب اور بنگلہ دیش کے قیام کا تذکرہ ہے، پھر ہندوستان میں ایمرجنسی کے نفاذ اور جنتا حکومت کے قیام و خاتمہ کا حال لکھا ہے، حرم شریف کے ناشدنی واقعہ، مرادآباد کے فساد، نیز بیروت اور افغانستان کے المناک واقعات بھی قلمبند کیے ہیں، اور ان سب کے جو اثرات ان کے قلب و ذہن پر پڑے ان کا بے لاگ ذکر کیا ہے، اس کتاب میں ہندوستان کے مختلف شہروں کے علاوہ جن بیرونی ملکوں کے سفر اور وہاں کے مشاہدات اور تقریروں کا ذکر ہے، ان کے نام یہ ہیں: حجاز، انگلستان، کویت، مشرق وسطی اور خلیج کی ریاستیں، متحدہ عرب امارات، افغانستان، ایران، مراکش، امریکا، پاکستان، قطر، الجزائر، سری لنکا، اور آکسفورڈ، مولانا رابطہ عالم اسلامی مکہ کے بہت ممتاز رکن ہیں، بعض ملکوں کا سفر انھوں نے اس کے نمایندہ کی حیثیت سے کیا ہے، ہندوستان اور دوسرے ملکوں کے اجلاس اور سیناروں کا بھی اس میں تذکرہ ہے، جیسے ندوۃ العلماء کا پچاسی سالہ جشن تعلیمی، رابطہ کی ایشیائی کانفرنس منعقدہ کراچی، قطر کی سیرت کانفرنس، دارالعلوم دیوبند کا صد سالہ اجلاس، مذاکرۂ ادبیات اسلامی منعقدہ لکھنؤ، کشمیر یونیورسٹی کا کانوکیشن، دارالمصنفین کا اسلام اور مستشرقین پر سینار، الجزائر کا سینار اور آکسفورڈ یونیورسٹی کی تقریب کی نوعیت اور ان میں اپنی شرکت اور اپنے خطابات کی تفصیل دی ہے، انھوں نے اپنے دو اہم اعزاز کا بھی اس میں تذکرہ کیا ہے، ایک فیصل ایوارڈ، دوسرا کشمیر یونیورسٹی کے ڈاکٹر آف لٹریچر کی اعزازی ڈگری، اس عرصہ میں مولانا کو بعض نہایت اہم اور سنگین ذاتی و خانگی حوادث سے دوچار ہونا پڑا، یعنی والدہ

ہمشیر، ہمادرزادہ مولانا محمد الحسنی اور خواہرزادہ مولوی محمد ثانی حسنی کے علاوہ مولوی محمد اسحٰق جلیس مدیر تعمیر حیات کی وفات کے سانحے، مصنف نے ان پر اپنے شدید درد و کرب کا اظہار کیا ہے، مگر صبر و رضا کا دامن بھی نہیں چھوڑا ہے، یہ کتاب ایک ایسے نامور عالم، مشہور مصنف اور ممتاز ملی رہنما کی داستان حیات ہے، جو گذشتہ چالیس پچاس برس سے اسلام کے احیاء، ملت اسلامیہ کی سربلندی اور انسانیت کی فلاح و ترقی کے لیے سرگرم عمل ہے، اس لیے یہ آپ بیتی سے زیادہ جگ بیتی ہے، جو ہندوستان اور دنیائے اسلام کے گذشتہ بیس برس کے اہم قومی و ملی واقعات کی ایک مستند تاریخی دستاویز ہے، اس سے ملک و ملت کے مسائل سے مولانا کی باخبری اور ان کے بارہ میں ان کی فکر و تشویش اور دردمندی اور دلسوزی وغیرہ کا اچھی طرح اندازہ ہوتا ہے، ان کے سحر طراز قلم، ان کی انشاء پردازی اور رعنائی تحریر نے اس سرگذشت میں بڑی ادبی حلاوت اور چاشنی پیدا کردی ہے۔

تاریخ اطبائے بہار جلد دوم، مرتبہ حکیم محمد اسرار الحق صاحب، متوسط تقطیع، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر صفحات ۳۰۰ مجلد مع گرد پوش، قیمت ۲۵ روپیے، پتہ: حکیم محمد اسرار الحق، انوار منزل، قطب الدین لین، دریاپور، پٹنہ، ۸۰۰۰۰۴۔

حکیم محمد اسرار الحق صاحب طب و حکمت کی اس ناقدری کے زمانہ میں بھی اس کو فروغ دینے اور اس کا پرچم بلند رکھنے کا حوصلہ رکھتے ہیں، اسی مقصد سے یہ کتاب لکھی ہے، جس کی بدولت اطبائے بہار کا نام نیک محفوظ اور باقی رہے گا، اس کی پہلی جلد پر معارف میں مفصل تبصرہ چھپ چکا ہے، پیش نظر جلد میں صوبۂ بہار کے تقریباً دو سو اطباء کا تذکرہ ہے، لائق مصنف نے طبیبوں کے حالات، ان کی حذاقت فن اور کامیاب علاج کے حیرت انگیز واقعات، بعض مجربات اور مخصوص آزمودہ نسخوں کے علاوہ ان کی علمی و ادبی اور قومی و ملی سرگرمیوں کی تفصیل بھی قلمبند کی ہے، پہلی جلد کی طرح اس جلد میں بھی متعدد ایسے اصحاب کا ذکر ہے جو طب سے زیادہ دوسرے کمالات کے اعتبار سے ممتاز تھے، شروع میں طب یونانی کی مختصر تاریخ لکھی ہے، اس میں ہندوستان میں اس کی آمد اور ہندوستانی مصنفین کی طبی تصنیفات کی فہرست بھی دی ہے، حکیم عبداللہ صاحب

سالانہ پرنسپل گورنمنٹ مڈل اسکول کا پیش لفظ بھی پڑھنے کے لائق ہے، مصنف کے ایک ہم وطن نے اس کا ترجمہ کر لیا ہے، مگر اس کی زبان و بیان میں ناہمواری ہے، ص ۱۹۵ پر ۱۳۶۲ھ کا مطابق سنہ عیسوی ۱۹۴۲ء دیا ہے جو غلط ہے، صحیح ۱۹۴۳ء ہے، ص ۲۰۳ پر مولانا احمد علی لاہوری کا نام غلطی سے مولانا محمد علی لاہوری لکھا ہے، موخر الذکر قادیانی تھے، اور اول الذکر مولانا عبید اللہ سندھی کے مایۂ ناز شاگرد اور انجمن خدام الدین لاہور کے امیر تھے، ابن خلکان کا املا ابن خلقان اور ۔ ۔ ۔ ۔ مرضی کا مرضا لکھا ہے۔

ہند و پاک میں عربی ادب

:۔ مرتبہ مولوی اقبال احمد سلفی صاحب، کاغذ، کتابت و طباعت اچھی، صفحات ۱۴۴، قیمت آٹھ روپیے پتہ : محمد اسلام کمک سیلر، نوگڈھ، بستی

عربی زبان و ادب کی خدمت میں ہندوستان کے علما و مصنفین کے کارنامے بڑے اہم ہیں، اس کتاب میں دوسری صدی کے آخر سے اب تک کے وفات پانے والے ڈیڑھ سو عربی زبان و ادب کے ہندوستانی شعراء و مصنفین کا تذکرہ درج ہے، اور بعض کے کلام کا نمونہ بھی دیا ہے، یہ مصنف کی پہلی کتاب ہے، ابھی ان کو اس موضوع پر مزید تحقیق جاری رکھنی چاہیے، تاکہ دوسرا اڈیشن زیادہ بہتر ہو سکے، ایک مبتدی کا ایسے اہم موضوع پر کام کرنے کا حوصلہ قابل داد ہے۔

کانٹوں کی خوشبو

:۔ از جناب نیر وزظفر بدایونی صاحب تقطیع متوسط، کاغذ، کتابت و طباعت اچھی صفحات ۱۴۴ مجلد مع گرد پوش قیمت ۵ روپے، پتہ :۔ فرشوری ٹولہ، بدایون۔

جناب محمد فیروز فرشوری بدایون کے نوجوان اور ہونہار شاعر ہیں، اس مجموعہ سے ان کے اچھے شعری ذوق اور غزل، نظم اور قطعہ نگاری وغیرہ پر یکساں دسترس کا اندازہ ہوتا ہے، ان کی غزلوں میں عشق و محبت کے جذبات کی گرمی بھی ہے اور گرد و پیش کے معاشرتی و سیاسی حالات کی ترجمانی بھی، ابتدا میں ایک نعت ہے مگر نعت گوئی مشکل صنف سخن ہے، ؎ با خدا دیوانہ باش و با محمدؐ ہوشیار، اس کے ایک شعر میں آنحضرتؐ کو مختار کل کہا گیا ہے، جو خدا کی خاص صفت ہے، اگر سلامت روی کے ساتھ مشق سخن جاری رکھی تو وہ ان شاء اللہ آیندہ ایک کامیاب شاعر ہوں گے۔ ،، ض ،،

حیات سلیمان

یہ محض جانشین شبلی مولانا سید سلیمان ندویؒ کی سادہ سوانح عمری ہی نہیں ہے، بلکہ ان کے گوناگوں مذہبی، علمی، قومی، ملی، سیاسی حالات اور کارناموں کا ایک دلآویز مرقع ہے جس میں سید صاحبؒ کے دور کی نصف صدی کی ملی و قومی، سیاسی و علمی، ادبی و لسانی تحریکوں مثلاً ہنگامۂ مسجد کانپور، تحریک خلافت، تحریک ترک موالات، جنگ آزادی، مسئلۂ ملوکیت حجاز وغیرہ کی تفصیل بھی ضمناً آگئی ہے، اسی کے ساتھ دارالمصنفین جو سید صاحبؒ کی زندگی کا سب سے بڑا کارنامہ ہے، اس کی تاسیس، سال بہ سال اس کی ترقی کی روداد کے ساتھ ان کے قیام بھوپال، سفر پاکستان، قیام پاکستان کے دوران ان کی علمی خدمات کا تذکرہ اور پھر مختلف وفود کے رکن و صدر کی حیثیت سے سفر یورپ، سفر حجاز، سفر افغانستان وغیرہ کی مفصل روداد بھی سید صاحبؒ کے خطوط اور تحریروں کی روشنی میں قلمبند ہوگئی ہے، یہ کتاب اپنے اسلوب و طرز انشاء کے لحاظ سے بالکل حیات شبلی کا ثنیٰ ہے، ویسی ہی دلکش، دلچسپ اور دلنشین۔

مولفہ مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی قیمت ۴۳ روپے

سلوک سلیمانی

مولانا سید سلیمان ندویؒ کے عزیز ترین پاکستانی مسترشد مولانا سید سلیمان اشرف خان صاحب سلیمانی صدر شعبۂ عربی پشاور یونیورسٹی نے "سلوک سلیمانی پر ایک اجمالی نظر" کے عنوان سے ایک طویل مقالہ لکھا تھا جو معارف میں ستمبر ۱۹۵۵ء سے جنوری ۱۹۵۶ء تک مسلسل نکلتا رہا، یہ علمی حلقوں میں بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھا گیا، اسی مضمون کو مزید اضافوں کے ساتھ مولانا اشرف صاحب نے کتابی صورت میں سلوک سلیمانی کے نام سے ۲ جلدوں میں شائع کیا ہے، ان میں حضرت سید صاحبؒ کی سلوک و معرفت سے متعلق تعلیمات کو مرتب کی توضیحات و تعبیرات کی روشنی میں پیش کیا گیا ہے، ان دونوں جلدوں کو افادۂ عام کی خاطر دارالمصنفین نے بھی چھاپ کے شائع کیا ہے،

قیمت جلد اول ۳۰ روپے   قیمت جلد دوم ۲۵ روپے

تصنیفات مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ

۱۔ سیرۃ النبی جلد سوم: معجزہ کے امکان و وقوع پر علم کلام و قرآن پاک کی روشنی میں مفصل بحث ۳۲/-
۲۔ سیرۃ النبی جلد چہارم: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیغمبرانہ فرائض۔ " ۴۸
۳۔ سیرۃ النبی جلد پنجم: فرائض خمسہ نماز، زکوٰۃ، روزہ، حج، جہاد پر سیر حاصل بحث۔ " ۲۲
۴۔ سیرۃ النبی جلد ششم: اسلامی تعلیمات، فضائل و رذائل اور اسلامی آداب کی تفصیل۔ " ۳۸
۵۔ سیرۃ النبی جلد ہفتم: معاملات پر مشتمل متفرق مضامین و مباحث کا مجموعہ۔ " ۱۷
۶۔ رحمت عالم: مدرسوں اور اسکولوں کے چھوٹے بچوں کے لیے سیرت پر ایک مختصر و جامع رسالہ۔ ۵
۷۔ خطبات مدراس: سیرت پر آٹھ خطبات کا مجموعہ جو مسلمانان مدراس کے سامنے دیے گئے تھے۔ " ۱۱
۸۔ سیرۃ عائشہؓ: حضرت عائشہ صدیقہؓ کے حالات و مناقب و فضائل۔ " ۱۹
۹۔ حیات شبلیؒ: مولانا شبلیؒ کی بہت مفصل اور جامع سوانح عمری۔ " ۴۸
۱۰۔ ارض القرآن ج ۱: قرآن میں جن عرب اقوام و قبائل کا ذکر ہے ان کی اثری اور تاریخی تحقیق۔ " ۱۸
۱۱۔ ارض القرآن ج ۲: بنو ابراہیم کی تاریخ قبل از اسلام عربوں کی تجارت اور مذاہب کا بیان۔ " ۱۳
۱۲۔ خیام: خیام کے سوانح و حالات اور اس کے فلسفیانہ رسائل کا تعارف۔ " ۳۴
۱۳۔ عربوں کی جہاز رانی: بمبئی کے خطبات کا مجموعہ۔ " ۱۲
۱۴۔ عرب و ہند کے تعلقات: ہندوستان اکیڈمی کے تاریخی خطبات (طبع دوم عکسی) " ۴۰
۱۵۔ نقوش سلیمانی: سید صاحبؒ کے منتخب مضامین کا مجموعہ، جن کا انتخاب خود موصوف نے کیا تھا۔ " ۲۴
۱۶۔ یاد رفتگان: ہر شعبۂ زندگی کے مشاہیر کے انتقال پر سید صاحبؒ کے تاثرات۔ (زیر طبع) (طبع دوم عکسی) ....
۱۷۔ مقالات سلیمان اول: ہندوستان کی تاریخ کے مختلف پہلوؤں پر مضامین کا مجموعہ۔ " ۲۶
۱۸۔ مقالات سلیمان دوم: تحقیقی اور علمی مضامین کا مجموعہ۔ " ۲۳
۱۹۔ مقالات سلیمان سوم: مذہبی و قرآنی مضامین کا مجموعہ (بقیہ جلدیں زیر ترتیب ہیں) " ۲۳
۲۰۔ بریدِ فرنگ: سید صاحب کے یورپ کے خطوط کا مجموعہ۔
۲۱۔ دروس الادب حصہ اول و دوم: جو عربی کے ابتدائی طالب علموں کے لیے مرتب کیے گئے۔ ۲-۲۰

رجسٹرڈ نمبر اے۔ زیڈ۔ ایم۔ این۔ پی ۱۴۰

ستمبر ۱۹۸۵ء

معارف

مجلس دار المصنفین کا ماہوار علمی رسالہ

مرتبہ

سید صباح الدین عبد الرحمن

قیمت تیس روپیے سالانہ

دفتر دار المصنفین اعظم گڈھ
(پن ۲۷۶۰۰۱)

مجلسِ ادارت

ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کی مذہبی رواداری

تاریخ ہندوستان کا سلسلہ ابتک اٹھائیس کتابوں تک پہونچ چکا ہے، اس ضمن میں ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کی مذہبی رواداری کا بھی ایک سلسلہ شروع کیا گیا ہے، جس کی اب تک تین جلدیں شایع ہو چکی ہیں۔

جلد اوّل

اس میں مغل دور سے پہلے کے مسلمان حکمرانوں کی مذہبی رواداری، فراخ دلی اور وطن دوستی، رعایا پروری کے دلچسپ واقعات مستند ماخذوں کی مدد سے پیش کیے گئے ہیں، قیمت ۱۲ روپیے۔

جلد دوم

اس میں مغل فرماں روا بابر، ہمایوں، سوری خاندان کے شیر شاہ اور اسلام شاہ، پھر مغل شہنشاہ اکبر، جہانگیر اور شاہجہان کی مذہبی رواداری، فراخ دلی، وطن دوستی، رعایا پروری کے سبق آموز واقعات پیش کیے گئے ہیں، قیمت ۲۳ روپیے۔

جلد سوم

اس میں جدو ناتھ سرکار کی کتاب کا جواب خود اس کی کتاب کے حوالوں سے اس طرح پیش کیا گیا ہے کہ اورنگزیب عالمگیر اور اسکے بعد کے مغل بادشاہوں کی مذہبی رواداری، فراخ دلی، وطن دوستی اور رعایا پروری کی تفصیلات آگئی ہیں مرتبہ سید صباح الدین عبد الرحمٰن۔ قیمت ۳۰ روپیے۔

جلد ۱۳۶ ماہ محرم الحرام ۱۴۰۶ھ مطابق ماہ ستمبر ۱۹۸۵ء عدد ۳

مضامین

شذرات

۴ر ستمبر سے ۶ر ستمبر ۱۹۸۵ء تک دار العلوم تاج المساجد بھوپال کی بزم سلیمانی کے زیر اہتمام حضرت مولانا سید سلیمان ندویؒ کی یاد میں ایک شاندار علمی مذاکرہ ہوا۔

اس کے عام جلسہ کی صدارت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے کی، افتتاح مصر کے سفیر محترم عمرو موسیٰ نے کیا، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے وایس چانسلر جناب ہاشم علی اختر اور وہاں کے پروفیسر خلیق احمد نظامی نے بھی اس میں شرکت کی، دارالمصنفین کے علمی شعبہ کے تمام اراکین ایک وفد کے ساتھ شریک ہوئے، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، دہلی یونیورسٹی، جامعہ ملیہ دہلی، عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد، مدراس اور خود بھوپال کے بہت سے نمایندوں کی وجہ سے اس کی رونق میں بڑا اضافہ ہوا، چار روز تک قیام و طعام کا بڑا اچھا انتظام تھا، نمایندوں کو سیفیہ کالج بھوپال، جناب حفیظ اللہ خان بمبئی اسٹور، ٹکنیکل انسٹی ٹیوٹ، انجمن اتراء، جناب رسول احمد صدیقی وزیر مملکت حکومت مدھیہ پردیش، حضرت شاہ محمد سعید مجددی سجادہ نشین خانقاہ مجددیہ نے ایٹ ہوم اور کھانے پر مدعو کیا، جس سے مذاکرہ کی علمی ضیافت کے ساتھ کام و دہن کی لذت کا بھی پورا سامان فراہم رہا۔

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے اپنے خطبۂ صدارت میں حضرت مولانا سید سلیمان ندویؒ پر پورا ایک فاضلانہ مقالہ پڑھا، جس میں یہ دکھایا کہ کس طرح انھوں نے قدیم و جدید رنگ میں ایک خوشگوار امتزاج پیدا کیا، خاکسار کا چھپا ہوا کلیدی مقالہ پہلے ہی تقسیم کر دیا گیا تھا، پروفیسر خلیق احمد نظامی نے حضرت سید صاحبؒ کے علمی کارنامے پر ایک بہت ہی عمدہ مقالہ پیش کیا، جو ان شاء اللہ معارف میں جلد ہی شایع ہوگا، مقالات کی بہت بڑی تعداد تھی، جو مقالات پڑھے گئے ان کے حسب ذیل عنوانات اور مقالہ نگاروں کے اسمائے گرامی سے مذاکرہ کی نوعیت اور اہمیت کا اندازہ ہوگا: سید صاحبؒ کی تنقیدی بصیرت سیرۃ النبیؐ کی روشنی میں، از ڈاکٹر محمد یاسین مظہر، مسلم یونیورسٹی، سلیمانی سیرۃ النبی اور جدید عربی کتب سیرت، از ڈاکٹر

محمد راشد ندوی مسلم یونیورسٹی، سید صاحبؒ کی تاریخ نگاری عرب و ہند کے تعلقات کی روشنی میں، از ڈاکٹر عبدالباری مسلم یونیورسٹی، سید صاحبؒ کے کچھ علمی ملفوظات از مولانا ابوالعرفان خان ندوی، ندوۃ العلماء لکھنؤ، سیرۃ النبیؐ جلد چہارم کے بعض قرآنی مباحث از مولانا ضیاء الدین اصلاحی، دارالمصنفین حضرت سید صاحبؒ اور کتابوں پر مقدمات، از ڈاکٹر شبیر احمد ندوی، جامعہ ملیہ، سید صاحبؒ کی اردو شاعری، از جناب سید خاں صاحب بھوپال، سید صاحب کی عربی شاعری، از مولانا محمد رابع ندوی، ندوۃ العلماء لکھنؤ۔

اور دوسرے مقالات جو پڑھے گئے وہ یہ تھے: علامہ سید سلیمان ندوی ایک محقق اور تنقید نگار، از پروفیسر محمد ابراہیم ندوی، عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد، علامہ سید سلیمان ندویؒ اور قرآنیات: از ڈاکٹر محمد اقبال انصاری، مسلم یونیورسٹی، سید صاحبؒ کا تنقیدی اسلوب، از جناب حبیب ریحان خان ندوی ازہری، بھوپال، سید صاحبؒ کی فقیہانہ خدمات از مولانا عبیداللہ کوٹی ندوی دارالمصنفین، سید صاحبؒ کی فقیہانہ شان، از جناب محمد علی قاسمی بھوپال، حضرت سید صاحبؒ اور مستشرقین از حافظ عمیر الصدیق ندوی، دارالمصنفین، مکاتیب سلیمان کے علمی و ادبی نکات، از ڈاکٹر مفضل الرحمن ندوی مسلم یونیورسٹی، مولانا سید سلیمان ندوی ایک تحریک، از ڈاکٹر نثار احمد فاروقی، دہلی یونیورسٹی، مولانا سید سلیمان ندویؒ کے مکاتیب، از عبداللطیف اعظمی، دہلی، سید صاحبؒ اور عربی ثقافت کی نشر و اشاعت، از ڈاکٹر محمد شفیق ندوی، جامعہ ملیہ دہلی، سید صاحبؒ اور بھوپال از پروفیسر عبدالقوی دسنوی، سیفیہ کالج بھوپال، دارالقضاۃ بھوپال اور سید صاحبؒ از قاضی سید عابد علی وجدی الحسینی قاضی شہر بھوپال، سید صاحبؒ اور مولانا محمد علی جوہر از مولوی ابوالبقاء ندوی، دارالمصنفین، سید صاحبؒ کے ساتھ پانچ سال، از افضل العلماء محمد یوسف کوکنی، مدراس، تحقیق الفاظ اور سید صاحبؒ، از جناب حامد حسن، سیفیہ کالج بھوپال، بہت سے اور مقالات تھے جو وقت کی کمی کی وجہ سے پڑھے نہیں گئے۔

ایک شعری نشست بھی تھی جس میں بھوپال ہی کے شعراء تھے، اس کی امتیازی خصوصیت یہ تھی کہ جو نظمیں پڑھی گئیں وہ خالصۃً حضرت سید صاحبؒ ہی پر تھیں، جناب سید عابد علی وجدی الحسینی قاضی شہر بھوپال نے تو پورا منظوم مقالہ تحریر فرمایا تھا، جس کو انھوں نے بہت ہی موثر اور پرکیف انداز میں پڑھا۔

حضرت سید صاحبؒ کی مختلف تحریروں، خطوں، کتابوں اور دوسری چیزوں کی ایک نمائش بھی تھی، جس کو پروفیسر عبدالقوی دسنوی نے بہت ہی سلیقہ سے سجایا تھا، اس کا افتتاح حضرت شاہ محمد سعید مجددی نے کیا۔

مذاکرہ کے آخر میں مختلف تجویزیں پیش کر کے منظور کی گئیں، جن میں کچھ یہ ہیں: حضرت سید صاحبؒ کے الندوہ اور معارف کے جو مضامین اب تک علاحدہ سے شایع نہیں ہوئے ہیں ان کے مجموعے شایع کیے جائیں، سیرۃ النبی کا خلاصہ ایک جلد میں ترتیب دیا جائے، اور اس کے ترجمے مختلف زبانوں میں کیے جائیں، بھوپال کے دارالقضاۃ میں سید صاحبؒ نے جو فقہی فیصلے دیے تھے ان کا مجموعہ شایع کیا جائے۔ ان کی خواہش تھی کہ ہر صوبہ میں ایک امارت شرعیہ کا ادارہ ہو، اس کی تکمیل کی جائے، مسلم یونیورسٹی اور بھوپال یونیورسٹی میں ان کے نام پر ایک ایک چیئر قائم ہو، دارالمصنفین میں ہر سال ان پر ایک توسیعی لکچر ہو، مسلم یونیورسٹی طلبہ کے نصاب کے لیے سیرۃ النبیؐ پر ایک جامع کتاب تیار کرے، جو مقالات اس مذاکرہ میں پڑھے گئے ہیں ان کا مجموعہ جلد از جلد شایع کیا جائے۔

اس تقریب کا نمایاں ترین پہلو یہ تھا کہ جناب حافظ محمد عمران خان ندوی، امیر دارالعلوم تاج المساجد اپنی علالت کے باوجود ہر موقع پر موجود رہے، وہ چلنے پھرنے سے مجبور تھے لیکن پہیہ دار کرسی پر بیٹھ کر ہر جگہ پہونچے، حتیٰ کہ اپنے عزیز مہمانوں کو رخصت کرنے کے لیے ہوائی اڈے

اور ریلوے اسٹیشن تک پہونچے، ان کی یہ خاطر داری، پھر لذیذ کھانوں کے ساتھ میزبانی کی قندیل مہمانوں کے ذہن میں برابر روشن رہے گی، ان کا پورا خاندان خصوصاً ان کے داماد ڈاکٹر مسعود الرحمن نے اس تقریب کو ہر طرح کامیاب بنانے میں پوری محنت و مشقت کی۔

جناب حافظ محمد عمران خان ندوی کی نگرانی میں تاج المساجد کی تعمیر برسوں سے جاری ہے، یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ اب اس کی تکمیل تقریباً ہوچکی ہے، ۱۹۴۷ء کے بعد ہندوستان کے مسلمان جن ناسازگار حالات سے دوچار ہیں ان میں اس مسجد کی تعمیر ایک عدیم المثال کارنامہ ہے، بنو امیہ کے عہد میں دمشق کی جامع اموی، اندلس کی مسجد قرطبہ، دہلی اور لاہور کی شاہی جامع مسجدوں کی تعمیر کے لیے تو شاہی خزانے کھلے تھے، جناب حافظ محمد عمران خان ندوی کے پاس تو کوئی سرکاری خزانہ نہیں تھا، لیکن ولید بن عبد الملک، اندلس کے عبد الرحمن اول اور مغل فرماں رواؤں میں شاہجہاں اور اورنگ زیب کی دینی حمیت، اولوالعزمی اور بلند حوصلگی کا خزانہ ضرور تھا، جس کے سہارے انھوں نے یہ شاندار کارنامہ انجام دے کر اپنی اخروی سرخروئی اور سربلندی کا سامان کرلیا ہے، اس مسجد کی تعمیر ہندوستانی مسلمانوں کے لیے درس ہے کہ وہ ناسازگار حالات میں بھی اپنی عملی کوشش اور مخلصانہ لگن سے بڑے سے بڑا کام انجام دے سکتے ہیں۔

بھوپال میں پروفیسر مرتضیٰ حسین فیاض حسین قریشی بڑی محبت سے ملے، اور ہسٹری آف دارالعلوم دیوبند کی دوسری جلد خاص طور پر پیش کی، وہ سیلوادانو ساری کے رہنے والے ہیں، جناب سید محبوب رضوی صاحب نے دارالعلوم دیوبند کی دو جلدوں میں جو تاریخ لکھی ہے ان ہی کا ترجمہ جناب پروفیسر صاحب نے کیا ہے، جس سے امید ہے کہ دارالعلوم دیوبند کا پورا تعارف انگریزی داں طبقہ اور بیرونی ممالک میں اچھی طرح ہوسکے گا، اس کے لیے وہ

جارکباد کے مستحق ہیں، تاریخ نقد ادب کے نام سے ایک کتاب جناب مولانا محمد فضل الرحمن سیوانی ندوی شعبۂ اسلامیات مسلم یونیورسٹی نے بھی پیش کی، یہ تہران یونیورسٹی کے ڈاکٹر عبد الحسین زریں کوب کی فارسی تصنیف کا اردو ترجمہ ہے، جس میں فلسفۂ نقد، ناقدین کے اصول و مبانی، قدیم یونان، روم، مصر، عرب، ایران اور ہندوستان میں نقد ادب کی ارتقائی تاریخ، اسلامی اور مغربی نقد کے مختلف مکاتب فکر کے انتقادی رجحانات، ایرانی ادب کے جدید میلانات وغیرہ کا سیر حاصل جائزہ ہے، اس پر ڈاکٹر نذیر احمد سابق صدر شعبۂ فارسی مسلم یونیورسٹی کا ایک طویل پیش لفظ تقدیم کے عنوان سے ہے جو اس ترجمہ کے مستند اور مفید ہونے کی ضمانت ہے، امید ہے کہ یہ کتاب علمی حلقہ میں شوق سے پڑھی جائے گی، بھوپال سے جذب وسلوک کے نام سے ایک علمی ڈائجسٹ بھی شایع ہوتا ہے، اس کے چیف ایڈیٹر کرہ میں آکر برابر ملتے رہے، یہ رسالہ مسلمانوں کے مذہبی اور علمی ذوق کی تسکین کی خاطر اچھے اچھے مضامین شایع کیا کرتا ہے۔

بھوپال سے بمبئی کا بھی سفر ہوا، جو دارالمصنفین کے بہت بڑے مربی اور ہواخواہ جناب منشی عبد العزیز انصاری کی عیادت کے لیے تھا، وہ رعشہ کے مرض میں مبتلا ہو کر اب بہت کمزور ہو گئے ہیں، رفیق سفر جناب شوکت سلطان اور مولوی ابو البقا ندوی بھی تھے، اتفاق سے اسی ریل گاڑی سے مولانا ابوالحسن علی ندوی نے بھی مولانا معین اللہ ندوی کے ساتھ بمبئی کا سفر کیا، جو اپنے خاص معمول سے منشی جی کے لیے وہاں پہنچے، انھوں نے بھی منشی جی کی عیادت کی، شکر ہے کہ ان کو رعشہ کی شکایت کے سوا اور ہر طرح اچھا پایا، ان کے اور ان کے فرزند ارجمند ابو صالح سلمہٗ کی بے مثال میزبانی اور خاطر داری سے چند روز تک ہم لوگ محظوظ ہوتے رہے منشی جی ہم لوگوں کو دیکھ کر تازہ دم نظر آئے، ان کے ساتھ بڑے اچھے دن گذرے، دعا ہے

کہ ان کو اللہ تبارک و تعالیٰ پوری صحت عطا فرمائیں، اور اپنی زندگی کے پرانے آن بان سے بقیہ دن اچھی طرح گذاریں، آمین ثم آمین۔

مولانا مختار احمد ندوی نے بمبئی میں ایک علمی ادارہ دار السلفیہ کے نام سے قائم کیا ہے، اسی کے ساتھ اصلاح مساجد کے نام سے ایک تنظیم بھی ہے جس کا افتتاح مولانا ابو الحسن علی ندوی نے کیا، اس کا مقصد ملک میں اچھی مسجدیں تعمیر کرانا اور دوسری مسجدوں کی ضروریات کو پورا کرنا ہے، اس افتتاح کے موقع پر سعودی عرب کے کونسل جنرل اور بمبئی کے عرب تاجر شیخ محمد علی بکاش بھی تھے، دوسرے دن دار السلفیہ ہی میں دن کا کھانا تھا، جس میں شہر کے اکابر اور معززین مدعو تھے، مولانا مختار احمد ندوی نے اپنی ایک تقریر میں ادارہ کے مقاصد بتائے، اس کے جواب میں خاکسار کو شکریہ ادا کرنا پڑا اور ادارہ کی کامیابی اور کامرانی کے لیے دعا گو ہوا۔

مولانا مختار احمد ندوی بمبئی کی بڑی متحرک اور جاندار شخصیت ہیں، بڑے سے بڑا کام شروع کرکے اس کو بڑی خوش سلیقگی سے پایۂ تکمیل تک پہونچا دیتے ہیں، اپنے اور کاموں کے ساتھ دار السلفیہ کی علمی سرگرمیوں میں بڑی جان پیدا کر دی ہے، اب تک امام حافظ عبد اللہ کی الکتاب المصنف فی الاحادیث والآثار کی پندرہ جلدیں، امام ابو محمد مکی کی کتاب التبصرۃ فی القراءات السبعۃ، امام حافظ جلال الدین عبد الرحمن کی مسند ام المومنین عائشہ رضی اللہ عنہا اور مسند ابی بکر الصدیق رضی اللہ عنہ، ابو محمد عبد اللہ کی کتاب الامثال، شیخ ابو الفیض کی جواہر الاصول فی علم حدیث الرسول ﷺ اور امام ابو بکر احمد کی کتاب النفقات بہت ہی عمدہ لکھائی چھپائی اور جلدوں کے ساتھ شائع کر چکے ہیں، ان کے علاوہ عربی، انگریزی اور اردو کی تقریباً ساٹھ مفید کتابیں بڑے آب و تاب کے ساتھ طبع کراکے علمی حلقوں میں پہونچائی ہیں، اپنی مطبوعات کا ایک سٹ دار المصنفین کے بھی نذر کیا، جس کے لیے ہم ان کے شکر گذار ہیں، دعا ہے کہ ان کی علمی کارگذاریاں ملک و ملت کے لیے ہر طرح مفید ہوں اور یہ ادارہ باوقار بن کر مدت مدید تک قائم رہے۔ آمین۔

بمبئی کے قیام میں مولانا ابو الحسن علی ندوی کے ساتھ سعودی عرب کے جنرل کونسل شیخ الشبیلی کے یہاں

بیادگار کے مستحق ہیں، تاریخ نقد ادب کے نام سے ایک کتاب جناب مولانا محمد فضل الرحمٰن سیوانی ندوی شعبۂ اسلامیات مسلم یونیورسٹی نے بھی پیش کی، یہ تہران یونیورسٹی کے ڈاکٹر عبدالحسین زرین کوب کی فارسی تصنیف کا اردو ترجمہ ہے، جس میں فلسفۂ نقد، ناقدین کے اصول و مبانی، قدیم یونان، روم، مصر، عرب، ایران اور ہندوستان میں نقد ادب کی ارتقائی تاریخ، اسلامی اور مغربی نقد کے مختلف مکاتب فکر کے انتقادی رجحانات، ایرانی ادب کے جدید میلانات وغیرہ کا سیر حاصل جائزہ ہے، اس پر ڈاکٹر نذیر احمد سابق صدر شعبۂ فارسی مسلم یونیورسٹی کا ایک طویل پیش لفظ تقدیم کے عنوان سے ہے جو اس ترجمہ کے مستند اور مفید ہونے کی ضمانت ہے، امید ہے کہ یہ کتاب علمی حلقہ میں شوق سے پڑھی جائے گی، بھوپال سے جذب و سلوک کے نام سے ایک علمی ڈائجسٹ بھی شایع ہوتا ہے، اس کے چیف ایڈیٹر کمرہ میں آکر برابر ملتے رہے، یہ رسالہ مسلمانوں کے مذہبی اور علمی ذوق کی تسکین کی خاطر اچھے اچھے مضامین شایع کیا کرتا ہے۔

بھوپال سے بمبئی کا بھی سفر ہوا، جو دارالمصنفین کے بہت بڑے مربی اور ہوا خواہ جناب منشی عبدالعزیز انصاری کی عیادت کے لیے تھا، وہ رعشہ کے مرض میں مبتلا ہو کر اب بہت کمزور ہو گئے ہیں، رفیق سفر جناب شوکت سلطان اور مولوی ابو البقا ندوی بھی تھے، اتفاق سے اسی ریل گاڑی سے مولانا ابوالحسن علی ندوی نے بھی مولانا معین اللہ ندوی کے ساتھ بمبئی کا سفر کیا، جو اپنے خاص معالج سے مشورہ کے لیے وہاں پہنچے، انھوں نے بھی منشی جی کی عیادت کی، شکر ہے کہ ان کو رعشہ کی شکایت کے سوا اور ہر طرح اچھا پایا، ان کے اور ان کے فرزند ارجمند ابوصالح سلمہٗ کی بے مثال میزبانی اور خاطر داری سے چھ روز تک ہم لوگ محظوظ ہوتے رہے منشی جی ہم لوگوں کو دیکھ کر تازہ دم نظر آئے، ان کے ساتھ بڑے اچھے دن گذرے، دعا ہے

۔ان کو اللہ تبارک وتعالیٰ پوری صحت عطا فرمائیں، اور اپنی زندگی کے پرانے آن بان سے بقیہ دن بھی طرح گذاریں، آمین ثم آمین۔

مولانا مختار احمد ندوی نے بمبئی میں ایک علمی ادارہ دارالسلفیہ کے نام سے قائم کیا ہے۔ اسی کے ساتھ اصلاح مساجد کے نام سے ایک تنظیم بھی ہے جس کا افتتاح مولانا ابوالحسن علی ندوی نے کیا، اس کا مقصد ملک میں اچھی مسجدیں تعمیر کرانا اور دوسری مسجدوں کی ضروریات کو پورا کرنا ہے، اس افتتاح کے موقع پر سعودی عرب کے کونسل جنرل اور بمبئی کے عرب تاجر شیخ محمد علی بکاش بھی تھے، دوسرے دن دارالسلفیہ ہی میں دن کا کھانا تھا، جس میں شہر کے اکابر اور معززین مدعو تھے، مولانا مختار احمد ندوی نے اپنی ایک تقریر میں ادارہ کے مقاصد بتائے، اس کے جواب میں خاکسار کو شکریہ ادا کرنا پڑا اور ادارہ کی کامیابی اور کامرانی کے لیے دعا گو ہوا۔

مولانا مختار احمد ندوی بمبئی کی بڑی متحرک اور جاندار شخصیت ہیں، بڑے سے بڑا کام شروع کرکے اس کو بڑی خوش سلیقگی سے پایۂ تکمیل تک پہونچا دیتے ہیں، اپنے اور کاموں کے ساتھ دارالسلفیہ کی علمی سرگرمیوں میں بڑی جان پیدا کر دی ہے، اب تک امام حافظ عبداللہ کی الکتاب المصنف فی الاحادیث والآثار کی پندرہ ۱۵ جلدیں، امام ابو محمد مکی کی کتاب التبصرۃ فی القراءات السبعۃ، امام حافظ جلال الدین عبدالرحمٰن کی مسند ام المومنین عائشہ رضی اللہ عنہا اور مسند ابی بکر الصدیق رضی اللہ عنہ، ابو محمد عبداللہ کی کتاب الامثال، شیخ ابوالفیض کی جواہر الاصول فی علم حدیث الرسول اور امام ابوبکر احمد کی کتاب النفقات بہت ہی عمدہ لکھائی چھپائی اور جلدوں کے ساتھ شائع کر چکے ہیں، ان کے علاوہ عربی، انگریزی اور اردو کی تقریباً ساٹھ ۶۰ مفید کتابیں بڑے آب و تاب کے ساتھ طبع کرا کے علمی حلقوں میں پہونچائی ہیں، اپنی مطبوعات کا ایک سٹ دارالمصنفین کے بھی نذر کیا، جس کے لیے ہم ان کے شکرگذار ہیں، دعا ہے کہ ان کی علمی کارگذاریاں ملک و ملت کے لیے ہر طرح مفید ہوں اور یہ ادارہ باوقار بن کر مدت مدید تک قائم رہے۔ آمین۔

بمبئی کے قیام میں مولانا ابوالحسن علی ندوی کے ساتھ سعودی عرب کے جنرل کونسل شیخ الشبیلی کے یہاں

شام کی جلسۂ میں شرکت کرنے کا موقع ملا، جس میں مولانا عقیل احمد ندوی کے رفقا بھی شریک ہوئے، بمبئی میں جناب مولوی محمد مستقیم اعظمی، حاجی محمد نیاز، سیٹھ منشی محمد حنیف اور سیٹھ محمد الیاس نے جس فراخ دلی سے ہم لوگوں کی مہمانداری کی اس سے وہاں کا قیام پر کیف رہا۔

بمبئی کے الطیفی ہال میں مسلم پرسنل لا بورڈ کی طرف سے تحفظ شریعت کے ہفتہ کا جو آغاز ۲۴ ستمبر کو ہوا اس میں راقم نے بھی شرکت کی، اس کی صدارت بمبئی کی جامع مسجد کے امام نے کی، خصوصی مہمان مولانا ابوالحسن علی ندوی صدر مسلم پرسنل لا بورڈ تھے، جنھوں نے اپنی پُرمغز اور ایمان پرور تقریر سے مجمع کو متاثر کیا، اس جلسہ کو جناب بنات والا ممبر پارلیمنٹ اور دوسرے مقررین نے بھی مخاطب کیا، جو جوش و خروش تحریک خلافت کے ابتدائی دور میں دیکھنے میں آیا تھا وہی اس اجتماع سے ظاہر ہو رہا تھا، اگر یہ جلسہ ہال کے بجائے کھلے میدان میں ہوتا تو شاید لاکھوں کا ہجوم ہوتا، مسلمان مطلقہ عورت کے نان نفقہ کا جو فیصلہ اور اس سلسلہ میں مشترکہ سول کوڈ کی جو تجویز سپریم کورٹ نے پیش کی ہے اس پر انتہائی ناراضگی کا اظہار کیا جا رہا تھا، مجمع میں تحفظ شریعت کے لیے ہر قسم کی قربانی دینے کا عہد کیا گیا، اس سے اندازہ ہوا کہ ملک اس وقت یوں ہی طرح طرح کے مسائل سے دوچار ہے، مسلمانوں کے مذہبی جذبات کو مجروح کرنا بالکل مناسب نہ تھا، جلسہ کے خاتمہ پر مسلمانوں کے احساسات کی ترجمانی کرتے ہوئے عزیزی ابو صالح ابن جناب منشی عبدالعزیز انصاری نے حسرت موہانی کی اس غزل کی طرف توجہ دلائی۔

غضب ہے کہ پابند اغیار ہو کر — مسلمان رہ جائیں یوں خوار ہو کر
اٹھے ہیں جفا پیشگانِ مہذب — ہمارے مٹانے کو تیار ہو کر
تقاضائے غیرت یہی ہے عزیزو — کہ ہم بھی رہیں ان سے بیزار ہو کر
کہیں صلح و نرمی سے رہ جائے دیکھو — نہ یہ عقدۂ جنگ دشوار ہو کر
وہ ہم کو سمجھتے ہیں احمق جو حسرت — وفا کے ہیں طالب دل آزار ہو کر

مقالات

سرسید احمد خاں اور مستشرقین

از

عبید اللہ کوٹی ندوی رفیق دار المصنفین

(۸)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت سے متعلق کچھ روایتیں تو وہ ہیں جو قابل اعتماد نہیں اور نہ ہی وہ مذہبی روایتیں سمجھی جا سکتی ہیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات بابرکات کے سبب اسلام نے رد لتی پائی، اور مسلمانوں کو نمایاں فتوحات حاصل ہوئی گئیں، اور تمام مملکت فارس مسلمانوں کے ہاتھ پر فتح ہوئی اور وہاں کے قدیم آتشکدے برباد ہو گئے، اور کسریٰ کے محلوں میں زلزلہ آ گیا، ان واقعات کو جو بعد میں پیش آئے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت کے دن سے منسوب کر دیا گیا، اُن کے علاوہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت کے بارہ میں اور بھی روایتیں کتب سیر میں ہیں اگرچہ سرسید کے بقول "ان کی صحت کے لئے بھی کافی ثبوت موجود نہیں ہے، مگر ان کے غلط ہونے کے لئے بھی کوئی دلیل نہیں ہے" مثلاً ایک روایت یہ ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پیدا ہوئے تو حضرت آمنہ نے کسی کو عبد المطلب کے پاس بھیجا اور آپ کے پیدا ہونے کی اطلاع کی، عبد المطلب فوراً وہاں آئے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے ہاتھوں سے اٹھا کر کعبہ میں لے گئے، اور اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا کی،

سر ولیم میور لکھتے ہیں کہ عبد المطلب کی دعا کا جو مضمون بیان کیا گیا ہے وہ مسلمانوں کے طرز کے

مطابق ہے اور اس سے یہ خیال کیا جاتا ہے کہ وہ صرف مسلمانوں کی بنائی ہوئی بات ہے۔ مگر جیسا کہ سرسید نے لکھا ہے کہ

"ہم کو اس بات سے کہ عبدالمطلب نے جو دعا مانگی تھی، وہ مسلمانوں کے طرز پر تھی کچھ تعجب نہیں کیونکہ ہم کو اس میں کچھ شک نہیں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بزرگوں میں سے خدا پرستی بالکل ختم نہیں ہو گئی تھی۔ اس بات کا ایک بڑا قوی ثبوت یہ ہے کہ عبدالمطلب نے اپنے بیٹے یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے والد کا نام عبداللہ رکھا تھا جو خاص خدا پرستوں کا طریقہ ہے" (خطبات ص ۱۷۸)

حضرت حلیمہ کی تربیت اور قرآن کی زبان

شرفائے مکہ کا دستور تھا کہ آب و ہوا کے لحاظ سے اور اس غرض سے کہ بچوں کے لہجہ اور زبان میں غیر زبان کا اثر نہ ہونے پائے، اپنے بچوں کو جب وہ آٹھ دن کے ہو جاتے تھے، دودھ پلانے والیوں کے سپرد کر کے باہر بھیج دیا کرتے تھے چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی حلیمہ سعدیہ کے سپرد کر دیا گیا۔ وہ اپنے گھر لے گئیں، اور ہر چھٹے مہینے لا کر آپ کی والدہ اور دیگر اقربا کو دکھلا جاتی تھیں، دو برس بعد آپ کا دودھ چھڑایا گیا، اور حضرت حلیمہ آپ کو لیکر حضرت آمنہ کے پاس آئیں مگر حضرت آمنہ نے اس خیال سے کہ مکہ کی گرم آب و ہوا آپ کو موافق نہ ہوگی، پھر حضرت حلیمہ کے سپرد کر دیا، اور وہ اُن کو اپنے ساتھ لے گئیں، اور ہر چھٹے مہینے لا کر آپ کو ملا جاتی تھیں جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر چار برس کی ہوئی تو حضرت آمنہ نے آپ کو اپنے پاس رکھ لیا، اس لئے حضرت حلیمہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دودھ پلائی ماں اور اُن کے خاوند حارث، دودھ کے رشتہ کے باپ اور ان کی اولاد عبداللہ، انیسہ اور خزیمہ عرف عثمان دودھ شریک بھائی بہن ہوئے عربوں میں قریش اور خصوصاً یہ شاخ جو بنی سعد کہلاتی تھی عرب میں زبان کی شستگی اور فصاحت کے لئے مشہور تھی، اور اسی سبب سے جناب پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم بھی نہایت زبردست اور موثر ترین فصیح و بلیغ تھے، عرب فصاحت و بلاغت کی نہایت قدر کرتے تھے، اللہ جل

شخص فصیح و بلیغ نہ ہوتا اس کو نظرِ حقارت سے دیکھتے، اور ذلیل سمجھتے خواہ وہ کیسے ہی نامی اور شریف خاندان کا کیوں نہ ہو۔

مگر بنی سعد میں چار برس تک کی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پرورش کو، سرولیم میور قرآن مجید کی فصاحت کا سرچشمہ تصور کرتے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ اس سبب سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی گفتگو جنوبی عرب کی خوشنما زبان کے خالص ترین نمونے کے مطابق بن گئی تھی، ... جب اُن کی فصاحت و بلاغت ان کی کامیابی میں بڑا کام دینے لگی، تو ایک خالص زبان اور ایک دلفریب گفتگو سے فائدہ عظیم مترتب ہوا (یعنی آپ قرآن مجید جیسی فصیح و بلیغ چیز پیش کرنے میں کامیاب ہوگئے) مگر کیا قرآن مجید جیسا کلام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بنی سعد میں پرورش کا نتیجہ ہے، ؟ اور کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کلام، اسی انداز کا ہوتا تھا جیسا کہ ہم قرآن مجید کی سورتوں میں دیکھتے ہیں، ؟ سرسید نے قرآن مجید اور احادیث نبوی کے درمیان فرق کو واضح کرتے ہوئے لکھا ہے کہ :-

"ایک بات سرولیم میور صاحب کی نگاہ سے رہ گئی، جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی کسی متواتر یا مشہور حدیث کو پڑھتے ہیں جس میں یقین کیا جاتا ہے، کہ خاص آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظ محفوظ ہیں، جیسے دعائیں وغیرہ، تو ہم کو معلوم ہوتا ہے کہ ان کا طرزِ کلام (اپنی بلندی اور اعلیٰ درجہ کی فصاحت کے باوصف) فصحائے عرب کے طرزِ کلام جیسا ہے لیکن جب ہم قرآن مجید کے مقدس صفحوں کو پڑھتے ہیں تو ہم کو حیرت ہوتی ہے، اور ہمارا تعجب بے انتہا بڑھ جاتا ہے کہ وہ دونوں کلام ایک ہی شخص کے نہیں معلوم ہوتے، اور ہم دونوں میں بہت بڑا فرق پاتے ہیں اس کی وجہ اس کے سوا اور کچھ نہیں معلوم ہوتی کہ اول کلام انسانی ہے، اور دوسرا کلام ربانی"

(خطبات ص ۲۱۰)

عہدِ طفولیت کے واقعات | آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر مبارک چھ برس کی ہوئی حضرت آمنہ آپ کو اپنے عزیزوں سے ملانے کے لئے مدینہ منورہ لے گئیں، کچھ عرصہ تک وہاں ٹھہریں، اور پھر مکہ معظمہ کو واپس ہوئیں، مگر راستہ میں ابوا نامی مقام پر وفات پائی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا ابو طالب کے دادا عبدالمطلب نے آپ کی پرورش اور نگرانی اپنے ذمہ لی، اور ہمیشہ آپ کے ساتھ شفقت پدری سے پیش آتے رہے، اس دوران میں اور دادا کے انتقال کے بعد بھی، بارہ برس کی عمر تک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے چند واقعات کو، سر ولیم میور نے اپنی کتاب میں قابلِ اعتراض ٹھہرایا ہے، مثلاً مدینہ کی چھوٹی چھوٹی بچیوں کے ساتھ ان کا کھیل کود میں مصروف رہنا، اپنے مکان کی چھت پر بیٹھے ہوئے پرندوں کو اڑا دینا، دودھ شریک بہن کی پیٹھ میں کاٹ کھانا، اور مدینہ سے حدیبیہ کو جاتے وقت اپنی ماں کی قبر پر رونا، سر ولیم میور نے جس مقصد سے یہ واقعات بیان کئے ہیں، ان پر سرسید نے درج ذیل تبصرہ کیا ہے :-

> اگرچہ ان باتوں کی اور اس قسم کی اور باتوں کی جو سر ولیم میور نے بیان کی ہیں کوئی معتبر سند نہیں ہے، لیکن اگر یہ سب باتیں تسلیم بھی کر لی جائیں، تب بھی یہ ایسی باتیں ہیں کہ خوبی میں انسانی فطرت کے مطابق ہوا کرتی ہیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نہ خدا تھے اور نہ خدا کے بیٹے، انھوں نے اپنے آپ کو صرف یہ کہا کہ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُکُمْ یُوْحٰی اِلَیَّ "پس ایسی باتیں اگر ہوئی بھی ہوں تو انسانی فطرت سے زیادہ اور کچھ نہیں ہو سکتیں"۔ (ایضاً ص ۲۲)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر کے آٹھویں برس آپ کے دادا عبدالمطلب نے بیاسی برس کی عمر میں وفات پائی، سر ولیم میور لکھتے ہیں کہ "جب آنحضرت جنازہ کے ہمراہ قبرستان حجر کو گئے، تو لوگوں نے آپ کو روتے ہوئے دیکھا" لیکن بقول سرسید :-

> "یہ ایک ایسی بات ہو جس سے سر ولیم میور کی خواہش کے برخلاف ہمیں کچھ تعجب نہیں، بلکہ

اگر نہ روتے تو ہمیں نہایت تعجب ہوتا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس وقت کم عمر تھے، اور ایسے موقعوں پر آنسوؤں کا نکلنا، اور رنج کے وقت دل میں نرمی اور گداز کا ہونا اور محبت آمیز جوش کا اٹھنا اور آنکھوں کی راہ سے آنسوؤں کا بہنا خدائے رحیم کی طرف سے انسان کے دل کی تسلی اور اس کے رنج کی تسکین کا ذریعہ ہے پس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اسی فطرت کی پیروی کی تھی، جو خدا نے انسان میں پیدا کی ہے،، (خطبات ص ۲۲۲)

سر ولیم میور اور مولود ناموں کی روایات،

بعض مولود ناموں میں رجن کے لکھنے والے بھی زیادہ تر کم پڑھے لکھے لوگ ہوا کرتے ہیں) فکر و تخیل سے کام لے کر محض خوش گمانی سے شاعرانہ انداز میں جو کہانیاں لکھ دی گئی ہیں، سر ولیم میور نے ان کا بھی سہارا لے کر اسلام پر حملہ آور ہونے کی کوشش کی ہے' چنانچہ سرسید احمد خاں فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانۂ ولادت میں حضرت آمنہ کا ایک خوفناک اور نامعلوم آواز کو سن کر ڈر جانا، یا ایک سفید مرغ کا اچانک نمودار ہونا اور حضرت آمنہ کے سینہ پر اپنے بازو کا پھیرنا اور اس سے حضرت آمنہ کو اپنے اضطراب میں تسکین پانا یا حضرت آمنہ کے لئے ایک خوشگوار شربت کے پیالہ کا ایک نامعلوم ہاتھ سے ظاہر ہونا یا فرشتوں کی آواز آنی یا بغیر اس کے کسی شخص کا دکھائی دینا، یا اس کے چلنے پھرنے کی آہٹ کا محسوس ہونا یا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو آدمیوں کی نظر سے چھپا لینے کے لئے آسمان سے ایک نور کی چادر کا اترنا بہشت کے پرندوں کا چہچہانا بہشت کی خوشبوؤں کا مہکنا، یہ سب شاعرانہ مضمون ہیں، جو غالباً سر ولیم میور نے کسی مولود نامہ سے اخذ کئے ہیں، اور ہر مسلمان جس کو ذرا سا بھی علم ہوگا' سمجھتا ہے کہ یہ تمام باتیں شاعروں کے خیالات ہیں جو انھوں نے اپنے مضامین کو آراستہ کرنے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تاریخ کی رونق بڑھانے کے لئے بیان کی ہیں، جیسا کہ اس قسم کے واقعات بیان کرنے میں شاعروں کا خصوصاً مشرقی شاعروں میں دستور ہے، حضرت عیسیٰ کی نسبت بھی گرم جوش خیال کے عیسائی شاعروں نے اس قسم کے خیالات نظم میں بیان کئے ہیں، چنانچہ ملٹن کی پیرا ڈائز لاسٹ انہی خیالات سے

بھری ہوئی ہے، اس لیے نہایت افسوس کی بات ہے کہ ایک عیسائی عالم اپنے بیان کے اس قسم کے خیالات کو تو شاعرانہ خیالات سمجھے اور مسلمانوں کی اس قسم کی باتوں کو مذہبی معاملوں کی حیثیت دے کر یہ فیصلہ کرے کہ سب راویوں کی ایجاد ہیں،

شاعروں نے اپنی محبت کے جوش میں اور عقیدت کے طور پر اپنے شاعرانہ انداز میں اور بھی واقعات بیان کئے ہیں، مثلاً آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پیدا ہوتے ہی زمین پر سجدہ کیا، اور اپنی امت کی بخشش کی دعا مانگی، کلمہ پڑھا، تین نورانی فرشتے آسمان سے اترے، ایک کے ہاتھ میں چاندی کی چھاگل تھی، دوسرے کے ہاتھ میں ایک زمرد کا لگن، اور تیسرے کے پاس رومال تھا، انھوں نے آنحضرت صلعم کو سات مرتبہ غسل دیا، اور آپ کو خیر البشر کا خطاب دیا۔" آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بچپن کے یہ واقعات شاعرانہ اظہار خیال کی حیثیت رکھتے ہیں لیکن سر ولیم میور نے ان کو بھی مذہبی روایات کے طور پر بیان کیا ہے، جو کہ نہایت ہی غلط بات ہے۔" (ایضاً ص ۲۷-۲۲۶)

ایک بیجا تنقید | سر ولیم میور نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مختون پیدا ہونے کو بھی راویوں کی ایجاد قرار دیا ہے جس کو وہ عجیب و غریب بعید از قیاس اور قانون فطرت کے خلاف قرار دیتے ہیں" اس اعتراض پر سر سید احمد خاں نے اپنے تعجب کا اظہار کیا ہے، وہ یہ فرماتے ہیں کہ

" یہ بات نہ معجزہ سے تعلق رکھتی ہے نہ عجائبات سے بلکہ اس کا تعلق فطرت کی نیرنگیوں سے ہے جس کی اور بھی نظیریں بتلائی جا سکتی ہیں، مثلاً ایسے اشخاص کا پیدا ہونا جن میں تذکیر و تانیث دونوں کی علامتیں ہوں، ایسے واقعات یہ بتاتے ہیں کہ قوانین فطرت کے مطابق قدرت کی طرف سے کہیں کہیں دوسرے طریق اپنانے میں کوئی عجیب بات نہیں ہے، اس زمانہ میں بھی بعض اوقات مختون لڑکے پیدا ہوتے ہیں اس لئے معجزہ

یا اچانبات کا نام لئے بغیر بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا مختون پیدا ہونا قابل فہم اور قرین قیاس ہے، اس کا ثبوت اس بات سے بھی ہوتا ہے کہ ابراہیم کی اولاد میں ختنہ کی رسم بڑی پابندی سے جاری تھی، اور ضروری قرار پا گئی تھی، اور عرب دور جاہلیت میں بھی اس کے ترک کرنے کو گناہ عظیم سمجھتے تھے۔ مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ختنہ کی رسم کا ہونا کسی ضعیف ترین روایت میں بھی بیان نہیں کیا گیا، جس کے صریح معنی یہ ہیں کہ پیدائشی طور پر آپ کے مختون ہونے کی روایت درست ہے، اس کو راویوں کی ایجاد کہکر نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

مہر نبوت | مہر نبوت کے بارے میں سر ولیم میور کہتے ہیں کہ

" صفیہ سے نقل ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مہر نبوت ان کی پشت پر نور کے حرفوں میں لکھی ہوئی تھی "

لیکن سرسید کے خیال میں "تمام مستند حدیثیں بالاتفاق بیان کرتی ہیں کہ وہ ایک یا غدود سا تھا، اور اس پر بال تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ہر چیز کی حرمت اور تعظیم کی جاتی تھی، اس لئے اس کو مہر نبوت کے نام سے موسوم کیا گیا ہوگا، بعض لوگوں کے اس خیال کو کہ اس پر حرف لکھے ہوئے تھے، تمام علمائے اسلام نے نہایت صراحت کے ساتھ رد کیا ہے، پس کیا ایک عیسائی عالم کے لئے یہ بات نازیبا نہیں کہ وہ مسلمانوں پر ایسے امر کے اعتقاد رکھنے کا اتہام لگائے جس سے وہ خود انکار کرتے ہوں شمائل ترمذی کے حاشیہ باجوری میں لکھا ہے، کہ یہ جو روایت ہے کہ اس پر پچھنے کے جیسے نشان تھے، یا عنز جانور کے گھٹنے کی مانند، یا غدود سبز یا سیاہ رنگ کا تھا، اور اس پر محمد رسول اللہ لکھا ہوا تھا، یا یہ لکھا ہوا تھا آپ منصور "(انك منصور)" ان میں سے کچھ بھی ثابت نہیں ہے، جیسا کہ عسقلانی نے کہا ہے، اور اور بعض حفاظ حدیث نے کہا ہے کہ جس شخص نے یہ بیان کیا ہے کہ مہر نبوت پر محمد رسول اللہ کے الفاظ لکھے ہوئے تھے، اس کو ہاتھ کی مہر اور اس پشت کے غدود میں جس کو خاتم نبوت کہتے تھے، دھوکا ہوگیا ہے'

کیونکہ وہ عبارت اصل کتاب میں کندہ تھی نہ کہ پشت کے غدود پر" اس لئے باجوری اور عسقلانی کی تحقیق کے مطابق یہ بات صاف طور پر ثابت ہے کہ جو روایتیں سر ولیم میور نے بیان کی ہیں علمائے اسلام نے ان کو رد کیا ہے، شرح السنہ میں ابی رمثہ سے منقول ہے کہ وہ اپنے باپ کے ساتھ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس گئے ان کے باپ نے اس چیز کو دیکھا جو رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی پیٹھ پر تھی، اور کہا کہ آپ مجھ کو اجازت دیجئے کہ میں اس کا علاج کر دوں، کیونکہ میں طبیب ہوں، رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم رفیق ہو، اور اللہ طبیب ہے" اس روایت سے بخوبی ثابت ہوتا ہے کہ جس چیز کو مہر نبوت کہتے تھے، وہ کیا چیز تھی، اور صاف صاف معلوم ہوتا ہے کہ خود اس زمانہ کے مسلمان جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب تھے، اس کو کیا سمجھتے تھے، پس سر ولیم میور نے جو اس کو عجائبات اسلام کے طور پر بیان کیا ہے محض ایک بیجا امر ہے۔ (ایضاً ص ۳۰۷)

چند اور واقعات سر ولیم میور نے اور روایتیں بھی درج کی ہیں جن میں بیان کیا جاتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پیدا ہوتے ہی اپنے ہاتھوں کو ٹیک کر اٹھ بیٹھے، اور ایک خاک کی مٹھی بھر کر آسمان کی طرف پھینکی لیکن جیسا کہ سر سید احمد خاں نے وضاحت کی ہے کہ

"اس طرح کی باتوں کو خود علمائے اسلام نے غیر صحیح اور نامعتبر قرار دیا ہے، سر ولیم میور ان کو مذہبی روایتیں کہکر بیان کرتے ہیں، تو در اصل وہ یہ چاہتے ہیں کہ اس طرح اسلام کی بے وقعتی ظاہر کریں"

لیکن ان کو یہ نہ بھولنا چاہئے، کہ عام بے پڑھے لوگوں میں جو باتیں مشہور ہو جاتی ہیں، وہ مذہب نہیں بن جاتیں، بلکہ بے سند ہونے کی وجہ سے وہ نامعتبر ٹھہرائی جایا کرتی ہیں،

وہ یہ روایت بھی نقل کرتے ہیں کہ حضرت آمنہ سے ایک نور پیدا ہوا جس نے شام کی تمام گلیوں اور مکانوں کو روشن کر دیا لیکن شرح السنہ میں بیان کی ہوئی یہ روایت اس طرح نہیں ہے جس طرح

کہ سر ولیم میور نے بیان کیا ہے، شرح السنہ میں عرباض بن ساریہ سے منقول ہے کہ

"رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں تم کو اپنے پہلے حال سے مطلع کروں، میں دعا ہوں ابراہیم کی، بشارت ہوں عیسیٰ کی اور اپنی ماں کا خواب ہوں (سر ولیم) انہوں نے میرے پیدا ہونے کے زمانہ میں دیکھا کہ ان سے ایک نور پیدا ہوا ہے جس سے شام کے محل روشن ہو گئے"

پس جن روایتوں میں حضرت آمنہ سے نور پیدا ہونے کا ذکر ہے ان سے صرف اس قدر ثابت ہوتا ہے کہ حضرت آمنہ نے ایسا ایک خواب دیکھا تھا اور اس قسم کا خواب دیکھنا نہ تو تعجب انگیز ہے نہ خلاف قیاس ہے اور نہ ہی فطرت انسانی سے بعید۔

(خطبات ص ۲۲۲)

فرشتہ کے ذریعہ "احمد" نام کی تلقین

سر ولیم میور نے واقدی کا ایک بیان یہ نقل کیا ہے کہ حضرت آمنہ نے عبدالمطلب سے فرشتہ کا یہ حکم بیان کیا کہ اس لڑکے کا نام احمد رکھنا، وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ "محمد کے مادے سے جو نام مشتق ہوتے ہیں وہ عرب میں رائج تھے، مگر "احمد" نام عرب میں بہت کم ہوتا تھا، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا پانچ آدمی اور بھی گذرے ہیں جن کا نام محمد تھا، واقدی کے حوالے سے وہ یہ بھی نقل کرتے ہیں کہ یہ نام عرب کے وہ لوگ رکھا کرتے تھے جنھوں نے یہود، نصاریٰ اور کاہنوں کی زبانی سُنا تھا کہ عنقریب عرب میں ایک نبی اس نام کا ہونے والا ہے، اور اکثر لوگ اپنے لڑکوں کے یہی نام رکھا کرتے تھے اور ہر ایک امید کرتا تھا کہ میرا ہی بیٹا نبی آخر الزماں ہونے کی عزت حاصل کرے گا" مگر سرسید کا خیال یہ ہے کہ:۔

اگر حضرت آمنہ نے عبدالمطلب سے یہ کہا ہو کہ ایک فرشتہ نے مجھ سے کہا ہے کہ اس لڑکے کا نام احمد رکھنا تو سر ولیم میور صاحب نے اس بات پر کیوں تعجب کیا ہے؟ اگر

توریت مقدس کی کہ یہ آیت کہ اللہ تعالیٰ کے فرشتہ نے اس سے کہا کہ دیکھ تو حاملہ ہے
اور تیرے ایک لڑکا پیدا ہوگا اور اس کا نام اسماعیل رکھنا، (پیدائش باب ۱۶ آیت ۱۱)
اور یہ آیت " اللہ تعالیٰ نے کہا کہ سارہ تیری بی بی کے بے شک ایک لڑکا پیدا ہوگا، اور اس
کا نام اسحاق رکھنا، (پیدائش باب، آیت ۱۹) اور انجیل کی یہ آیت اور اس کے (مریم کے)
ایک بیٹا پیدا ہوگا، اور تجھ کو (یوسف کو) چاہئے کہ اس کا نام عیسیٰ رکھے، کیونکہ وہ اپنی
امت کو گناہوں سے نجات دے گا، (متی باب آیت ۲۰) صحیح ہے کہ وہ عیسائی جس کو
تسلیم کرتے ہیں تو وہ کس بنا پر اس بات سے انکار کرسکتے ہیں کہ حضرت آمنہ کو بھی ایک فرشتہ
نظر آیا تھا اور اس نے اس لڑکے کا جو پیدا ہونے والا تھا احمد نام رکھنے کے لئے کہا،

اس روایت کی صداقت کا ایک نہایت تسکین بخش ثبوت یہ ہے کہ (بائبل کے) عہد
عتیق میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بشارت محمد کے نام سے آئی ہے، اور انجیل میں احمد کے نام
سے، اس لئے ان بشارتوں کے پورا کرنے کے لئے ضروری تھا کہ حضرت آمنہ کو احمد کا نام
بتا دیا جائے، کیونکہ یہ ایک ایسا نام تھا، جس کو اہل عرب کبھی نہیں، یا شاذونادر رکھتے
تھے، (خطبات ص ۳۴۲)

سر ولیم میور، کے خیال میں انجیل یوحنا کے یونانی ترجمہ میں پیریکلی ٹوس تھا جس کے معنی
تسلی دہندہ کے ہیں لیکن کسی جاہل یا متعصب راہب نے اس کو پیریکلیوٹوس" کردیا جس کے معنی "احمد"
(تعریف کیا ہوا) ہیں) لیکن بقول سر سید انجیل کا صحیح لفظ پیریکلیوٹوس" ہی ہے جس کا ثبوت یہ ہے
کہ مسلمانوں میں اس کی عربی شکل فارقلیط پائی جاتی ہے، (اصل یونانی نسخہ کی عدم موجودگی میں)
ظاہر ہے کہ عربوں کی روایت ہی قابل ترجیح ہوگی جو فارقلیط کا لفظ استعمال کرتے تھے جو پیریکلیوٹوس
کی عربی شکل ہے اور اس لفظ کے بارہ میں تاریخ کی یہ قدیم ترین شہادت بتلاتی ہے کہ یونانی نسخہ میں

پیریکلی ٹوس تھا جس کا ترجمہ تسلی دہندہ کیا جاتا ہے))

سر ولیم میور کا یہ دعویٰ کہ عرب میں محمد نام کے اور لوگ بھی گزرے ہیں، سرسید کے نزدیک بے فائدہ ہے، اس لئے کہ اہل اسلام نے کبھی یہ نہیں کہا کہ آنحضرتؐ سے پہلے عرب میں اس نام کا اور کوئی نہیں ہوا، انھوں نے تو اس بات کے دریافت کرنے میں کامیاب کوشش کی، کہ اس نام کے عرب میں اور لوگ بھی گزرے ہیں، مگر:۔

"یہ بات کسی طرح بائبل کے عہد عتیق اور عہد جدید کی بشارتوں پر اثر انداز نہیں ہو سکتی کیونکہ کسی لڑکے کے والدین نے اس کے حق میں کچھ ہی تمنا کیوں نہ کی ہو اور نبی موعود کا نام اپنے لڑکے کے نبی ہونے کے لالچ میں کیوں نہ رکھا ہو، مگر نبی وہی ہوا جس کو درحقیقت خدا تعالیٰ کو نبی آخر الزماں بنانا منظور تھا، ہماری اس رائے کی تائید اس وقت اور بھی ہوتی ہے جب ہم ان بڑے بڑے کاموں پر غور کرتے ہیں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ظہور میں آئے تھے اور وہ ایسے کام ہیں، جو تمام جہان کی تاریخ میں اپنا نظیر نہیں رکھتے، اور جب ہم اس روحانی کیف و سرور کو دیکھتے ہیں جو دین حق کا طفیل ہے، اور جس کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی حیات میں عام کیا تھا، اور جو آئندہ نسلوں میں اپنے ورثہ کے طور پر اپنے پیچھے پیدا کیا، اور جب ہم اس سچائی اور پاک بازی پر نظر ڈالتے ہیں جس کو آنحضرتؐ نے رائج کیا اور جو زمانی گردش کے بعد بھی کامل اور بے عیب ہی رہی اور ابدالآباد تک اصلی حالت پر اسی طرح رہیں گی، تو ہم کو اس بات کا کامل یقین ہو جاتا ہے کہ جس محمد اور احمد کی بشارت عہد عتیق اور عہد جدید میں دی گئی تھی وہ وہی تھے، جو عبد اللہ کے بیٹے اور آمنہ کے پیٹ سے پیدا ہوئے تھے صلی اللہ علیہ وسلم،"

(خطبات ص ۷۳۶)

اسپرنگر کی عجیب و غریب دریافت

مستشرقین نے ہر جگہ عیب کی دریافت کی ہے، چنانچہ حضرت آمنہ کا خواب میں فرشتوں کی صورتوں کو دیکھ کر ڈر جانا ان کے نزدیک مرض یعنی مرگی جیسے مرض کا ثبوت فراہم کر دیتا ہے، جب کہ فرشتوں کو دیکھ کر خوف محسوس کرنا، سرسید کے نزدیک "کسی طرح تعجب انگیز بات نہیں ہے، بلکہ اس کے برخلاف، اس واقعہ سے تو مزید اس بات کی تائید ہو جاتی ہے، کہ حضرت آمنہ نے درحقیقت اپنے خواب میں آسمانی فرشتوں کو دیکھا تھا، سرسید فرماتے ہیں کہ :-

"اسپر" اسپرنگر صاحب کی عقل اور ایمانداری پر نہایت تعجب ہے کہ وہ اس واقعہ سے یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ حضرت آمنہ رضی اللہ عنہ کو ضعیف دماغ اور صرع کی بیماری تھی جب کہ حضرت سارہ اور حضرت مریم نے جو (بائبل کی تصریح کے مطابق) فرشتوں کو دیکھا تھا، اس کو صرع کی بیماری نہیں قرار دیتے،

(خطبات ص ۲۳۶)

حضرت حلیمہ کے گھر میں برکت

حضرت حلیمہ، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بچپن میں اپنے گھر پرورش کے لئے لے گئیں، تو کئی طرح سے برکتیں ظاہر ہوئیں، مثلاً انھوں نے محسوس کیا کہ وہ اب بچہ کو خوب سیر ہو کر دودھ پلا سکتی ہیں، بلکہ اس قدر کہ وہ ان کے اپنے بچہ کے لئے بھی کافی ہو جائے گا، اونٹنی کا دودھ بھی بڑھ گیا، وہ بچہ کو لے کر چلیں تو سواری کی رفتار خود بخود تیز ہو گئی، اور مویشی بھی فربہ ہوتے چلے گئے، اور کثرت سے دودھ دینے لگے، سرولیم میور نے یہ اور اس طرح کے کئی واقعات غالباً تعجب انگیز سمجھ کر نقل کئے ہیں، لیکن اس موقع پر سرسید نے یہ واضح کر دیا ہے کہ "یہ سب باتیں ایسی ہیں، جن کی سند بجز حلیمہ کے بیان کے اور کوئی نہیں ہے لیکن ایسے امور کا واقع ہونا کچھ ناممکن بھی نہیں ہے،" وہ لکھتے ہیں کہ

"ایسی باتوں کو عیسائی عالم بعید و صداز قیاس باتوں کے بیان کرتے ہیں تو بلا شبہ ہم کو تعجب ہوتا ہے کیونکہ وہ اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ لابان نے اس سے کہا کہ میں التماس کرتا ہوں کہ اگر تجھ کو میرا خیال ہے تو ٹھہر جا، کیونکہ مجھ کو تجربہ سے ثابت ہوا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تیری وجہ سے مجھ کو برکت دی ہے" (پیدائش باب ۳۰، آیت ۲۷) اور عیسائی عالم اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ یعقوبؑ نے کہا کہ تیرے آنے سے پیشتر میرے پاس بہت تھوڑا تھا اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ یعقوبؑ نے کہا کہ میرے آنے سے پیشتر تیرے پاس بہت تھوڑا تھا اور اب وہ کثیر التعداد ہو گیا ہے اور جب سے کہ میں آیا ہوں اللہ تعالیٰ نے تجھ کو برکت دی ہے" (پیدائش باب ۳۰، آیت ۳۰) آیت ۳۶ سے ۴۲ تک کے مضمون سے ثابت ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے لابان کے مویشی سے کمزور پیدا کیے تھا تو کیا وجہ ہے کہ اگر خدائے حلیمہ کے مویشی کو حضرت یعقوبؑ کے مویشی سے کمزور پیدا کیا تھا تو کیا وجہ ہے کہ اگر خدا نے حلیمہ کے مویشی میں بھی برکت دی ہو تو اس کو دور از قیاس قرار دے کر تعجب انگیز طور پر بیان کیا جائے" (خطبات ص ۴۳۷)

حیات رسولؐ میں کسی مرض کی جستجو

سر ولیم میور اور کئی دوسرے مستشرقین کی دماغی صحت کا یہ حال ہے کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیرت انگیز سیرت طیبہ، اعلیٰ کارناموں اور عظیم صفات کی اصل وجہ اور حقیقی سرچشمہ، اس بیماری کو قرار دیتے ہیں جو صرع یعنی مرگی کے نام سے موسوم ہے اور اس طرح وہ دراصل اپنی سیاہ باطنی، مذہبی عصبیت اور اپنی کوتاہ فہمی یا بد دیانتی کی آخری حد پر نظر آتے ہیں۔

سر ولیم میور کہتے ہیں کہ ابن ہشام اور دیگر متاخرین یہ بیان کرتے ہیں کہ حلیمہ کے شوہر کو یہ گمان ہوا کہ لڑکے کو ایک عارضہ (آزار) ہو گیا ہے، سر ولیم میور نے فٹ کا انگریزی لفظ استعمال

کیا ہے، جس کے معنی ہیں لغت میں کسی مرض کے ایسے سخت اور یکبارگی حملے کے ہیں جس سے بدن کپکپانے لگے، اور کبھی غشی طاری ہو جائے، اس سے موصوف نے غالباً صرع (مرگی) مراد لی ہے، مگر سرسید فرماتے ہیں کہ :۔

"ہمارے پاس سیرت ابن ہشام موجود ہے جو ڈاکٹر فرڈنینڈ وسن فیلڈ کی نگرانی میں ۱۸۵۸ء میں گاٹنجن میں چھپی ہے، اس کتاب سے ہم وہ عبارت نقل کرتے ہیں :۔

قالت وقال لی ابوہ یا حلیمۃ لقد خشیت ان یکون ھذا الغلام قد اصیب فالحقیہ باھلہ یعنی حلیمہ نے کہا کہ اس کے باپ (دودھ شریک باپ اور حلیمہ کے شوہر) نے کہا کہ اے حلیمہ! مجھ کو اندیشہ ہے کہ اس لڑکے کو کچھ ہو گیا ہے، اس لئے اس کو اس کے گھر والوں کے پاس پہنچا دے، مگر جب وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو حضرت آمنہ کے پاس لے گئیں تو حضرت آمنہ نے اُن کو نہیں لیا، اور حلیمہ سے کہا کہ اس کو واپس لے جاؤ اور فرمایا کہ کیا تجھ کو یہ اندیشہ ہوا تھا کہ اس پر شیطان مسلط ہو گیا ہے، (یعنی تمہارا یہ خیال درست نہیں ہے) اس سے ثابت ہوتا ہے کہ حلیمہ کے شوہر کو جو گمان ہو گیا تھا وہ صحیح نہیں تھا،"

سر ولیم میور نے ایک غلطی تو یہ کی ہے کہ اپنی کتاب کے ص ۲۱ (حاشیہ) پر لفظ "اصیب" کو "امیب" لکھا ہے، دوسری غلطی یہ کی ہے کہ اس سے وہ (Fit) یعنی مرگی جیسی بیماری مراد لیتے ہیں، ایک دو کے سوا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سوانحعمری لکھنے والے تمام عیسائی مصنفین، یہ بیان کرتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو صرع (مرگی) کی بیماری لاحق تھی، بہت تلاش کے بعد ہمیں معلوم ہوا کہ یہ خام خیالی عیسائیوں

میں دو وجہ سے پیدا ہوئی، ایک تو ان کے مذہبی توہمات کی وجہ سے، اور دوم عربی
عبارت کے لاطینی میں غلط ترجمہ ہو جانے کی وجہ سے۔"

ڈاکٹر ڈی پاک نے تاریخ ابوالفدا کا لیٹن میں ترجمہ کیا، جو ۱۷۲۳ء میں آکسفورڈ میں شائع ہوا، اس میں فَالْحَقِیۃ کو "بالحقیقۃ" بنا دیا گیا، اور چونکہ اس کا ترجمہ نہیں کیا جا سکتا تھا، اس لئے ترجمہ میں اس کو تو چھوڑ دیا گیا، اور اصیب جس کے معنی صرف بیماری کے ہیں، اس کے لئے لیٹن میں جو الفاظ درج ہوئے، اس میں یہ ترجمہ کر دیا گیا کہ اس لڑکے نے کسی اپنے ساتھی سے دماغی بیماری کو اخذ کر لیا ہے، اس مترجم نے دماغی بیماری سے غالباً صرع یا بیہوش کر دینے والی بیماری مراد لی ہے، حالانکہ یہاں صحیح ترجمہ یہ تھا کہ "مجھ کو اندیشہ ہے کہ یہ لڑکا مبتلا ہو گیا ہے، پس اس کو اس کے گھر والوں کے یہاں پہونچا دو۔"

عرب ان تمام بیماریوں کو جن کا سبب معلوم نہ ہوتا خبیث روحوں اور شیطان کا اثر سمجھتے تھے، عیسائی مصنفوں نے اپنے وہمی ذہن سے، یہ سمجھ لیا کہ یہ بیماری صرع تھی، حالانکہ عرب صرع ہی کو نہیں، بلکہ ہر ایک پیچیدہ بیماری کو شیطان کا اثر سمجھتے تھے، لیکن ایک عیسائی مورخ گبن نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں اس بیماری سے متعلق لکھا ہے کہ یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر یونانیوں کا ایک نامعقول اتہام ہے۔"

سرسید احمد خاں نے صرع کے بارے میں پہلے تو طبی نقطۂ نظر سے بحث کی ہے، چیمبرز ان سائیکلو پیڈیا میں لکھا ہے، کہ صرع اس بیماری کو کہتے ہیں جس میں سلسلۂ رگ جانے اور اعصاب میں تشنج پیدا ہو جانے کی وجہ سے، بے اختیار ہو کر شدت سے اعصاب پھڑکنے لگیں، اور کبھی سانس بالکل ہی بند ہو جائے اس بیماری میں مریض اکثر پاگل ہو جاتا ہے، بسا اوقات اس کا حافظہ جاتا رہتا ہے، اس میں تیزی اور چستی نہیں رہتی، مردہ دلی اسے کاروبار سے معذور کر دیتی ہے، بدہضمی بھی اکثر ہوتی ہے، تمام جسم میں ضعف پیدا ہو جاتا ہے، اس کے چہرہ سے دائمی نقاہت کے آثار نمایاں ہوتے ہیں، ایسے مریض کے

ذہن میں اپنی کمزوری کا یقین جم جاتا ہے، اور اسے مشقت طلب کاموں سے نفرت ہو جاتی ہے۔
اس تفصیل کے بعد، سرسید نے نہایت وضاحت کے ساتھ یہ لکھا ہے کہ

"کوئی مورخ مسلمان یا عیسائی یہ نہیں بیان کرتا، کہ مذکورہ بالا اثرات میں سے ایک بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم میں پایا گیا تھا، بلکہ اس کے برخلاف سب اس بات پر متفق ہیں کہ آنحضرتؐ اپنے بچپن اور جوانی میں نہایت تندرست اور قوی تھے، خود سر ولیم میور لکھتے ہیں کہ دو برس کی عمر میں حلیمہ نے ان کا دودھ چھڑایا، اور ان کے گھر لے گئیں، آمنہ اپنے لڑکے کو تندرست اور قوی ہیکل دیکھ کر جو آپ سے دوگنی عمر والے لڑکے کے برابر معلوم ہوتی تھی، اس قدر خوش ہوئیں کہ حلیمہ سے کہا کہ اس کو پھر لیجا" لڑکپن اور جوانی کے زمانہ میں آنحضرت مضبوط، تندرست اور قوی تھے، بہت تیز چلا کرتے اور زمین پر مضبوطی سے قدم رکھتے، تمام عمر بھر ان کو بڑے بڑے خطرے اور تکلیفیں پیش آئیں ان سب کو انھوں نے کمال صبر و استقلال سے برداشت کیا، انھوں نے خدائے واحد کی پرستش و عبادت کی تجدید ایسے طور پر کی، جس کی کوئی مثال نہیں پائی جاتی، علم الٰہیات کو ایسے پختہ اور معقول اصول پر قائم کیا جن کا ہمسر جہان سے معدوم ہے، انھوں نے قوانین تمدن و اخلاق کو ایسے کمال پہنچا دیا جو اس سے پیشتر کبھی نہیں ہوا تھا، ان کے ذریعہ انسانوں کی بہبود اور رفاہ کے لئے ونکلی و مالی، دینی و دنیوی قوانین کا مجموعہ حاصل ہوا، جو اپنی نوعیت کا یکتا و بے نظیر ہے آنحضرت ہی وہ ہیں جنھوں نے اپنی زندگی میں تمام جزیرۂ عرب کو فتح کیا، اور مختلف قبیلوں کو متحد کر کے ایک عظیم الشان مضبوط اور طاقتور قوم بنا دیا جس نے اس زمانہ کی مہذب دنیا کے بڑے حصہ کو معمولی عرصہ میں مفتوح و مسخر کر لیا، کیا یہ

خیال عقل و انصاف کی رو سے درست ہوگا کہ ایسے نمایاں کارنامے ایک لاچار اور ناتواں، صرع کی بیماری میں مبتلا شخص سے وجود میں آئے ہوں گے، ایسے نمایاں کارنامے اسی شخص کے ذریعہ عمل میں آسکتے ہیں، جس کی روحانی وجسمانی قوتیں صحیح وسالم ہوں، اور جس کو تائید ربانی حاصل ہو،

(خطبات ص ۴۵-۳۸۰)

سر ولیم میور کہتے ہیں کہ حلیمہ پھر ایک بادل کو آنحضرتؐ کے سر پر سایہ فگن دیکھ کر گھبرائیں اور انجام کار ان کو ان کی ماں کے پاس پہنچانے کے لئے روانہ ہوئیں "تعجب کی بات یہ ہے کہ بادل کو سایہ کرتے ہوئے تو دیکھا حلیمہ نے اور سر ولیم کو اس سے آنحضرتؐ کی بیماری کا خیال آگیا، پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اوپر اگر کبھی بادل کا ٹکڑا سایہ دار آگیا ہو تو یہ بات ناممکن نہیں، البتہ یہ خیال کہ آپ پر ہمیشہ بادل سایہ کئے رہتے تو اس کی کوئی سند نہیں ورنہ اکثر صحابہ اس کا ذکر کرتے، اور مستند حدیثوں میں بھی اس کا تذکرہ ہوتا،

ایک مضحکہ خیز بات یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نزول وحی کے وقت جو کیفیت طاری ہوتی تھی، سر ولیم میور اسے بھی "صرع" کی بیماری کا اثر ثابت کرنے پر آمادہ نظر آتے ہیں جس پر سرسید احمد خاں نے اس طرح اظہار خیال فرمایا ہے:-

"ہم سر ولیم میور کی اس رائے کو کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مرگی (دورہ) نے ان کے ذہن میں اپنی رسالت کا خیال پیدا کر دیا، اور ان کے متبعین کا بھی یہی اعتقاد تھا، تمام منصف مزاج اور غیر متعصب لوگوں کے روبرو پیش کرنا چاہتے ہیں، اور پھر یہ سوال کرتے ہیں کہ کیا یہ بات قرین قیاس ہے کہ ایسا آدمی جس کو ہر آدمی مصروع جانتا ہو، اپنے صرعی غشوں کو اپنے رسول برحق ہونے کے ثبوت میں پیش کرے، اور جو شخص اپنی قوم کی بت پرستی کو مٹانے کے لئے بھیجا گیا ہو اور تمام لوگ اس کی اس بیماری سے واقف ہوں لیکن

اس کے باوجود اس کے عزیز واقارب اور عرب کے تمام بڑے بڑے لوگ اس کی رسالت کو دل سے تسلیم کرلیں اور اپنے آبائی مذہب اور قدیم رسموں کو چھوڑ کر اس شخص کے قول و فعل پر کامل ایمان لے آئیں،

(خطبات ص ۳۴۷)

اہل کفر کے لئے دعائے مغفرت

سر ولیم میور نے اپنی کتاب میں یہ بھی لکھا ہے کہ ان لوگوں کی مغفرت کی دعا مانگنے کی ممانعت کرنا جو حالت کفر میں مرے ہوں پیغمبر صاحب کے حکموں کی سختی اور شدت کی ایک عجیب مثال ہے۔

مگر سرسید فرماتے ہیں کہ "ہمارے نزدیک ان لوگوں کے حق میں دعائے مغفرت نہ کرنے میں جو خدائے واحد پر ایمان نہ رکھتے ہوں، اور انبیائے سابقین کے دین کو بھی نہ مانتے ہوں، بلکہ محض بے ایمانی کی حالت میں مرگئے ہوں، کسی طرح کی سختی اور شدت نہیں ہے، بلکہ یہ بات زندہ آدمیوں کو بت پرستی کے چھوڑنے اور اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کے اقرار کی ترغیب دینے کے لئے ایک نہایت کارآمد اور عمدہ ذریعہ ہے،" مگر ہم یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ اگر مذکورہ سبب سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام پر سختی اور شدت کا الزام لگایا گیا ہے، تو "رحم دل" عیسائی مذہب میں ان لوگوں کے لئے جو اگرچہ اللہ تعالیٰ کو مانتے ہوں، مگر حضرت عیسیٰؑ کے ابن اللہ ہونے سے انکار کرتے ہوں، کیا نرم فیاضانہ اور رحم دلی کا سلوک کیا گیا ہے، مگر افسوس ہے کہ ہماری یہ امیدیں پوری نہیں ہوئیں بلکہ سرسید کے اپنے الفاظ میں :۔

"ہماری توقع کے خلاف "رحم دل" عیسائی مذہب میں غیر عیسائیوں کے لئے اس سے بھی زیادہ سخت احکام معلوم ہوئے، اس کا ایک نمونہ یہ ہے کہ تثلیثین خطبہ میں جو انگلستان کے تمام پروٹسٹنٹ گرجاؤں میں متعین دنوں میں پڑھا جاتا ہے، اور تمام اہل کلیسا کے اتفاق سے منظور ہوا ہے، ان سب عقیدوں کو بیان کرنے

کے بعد جن کا ماننا ہر شخص پر فرض ہے، صاف طور پر یہ لکھا گیا ہے کہ یہ عیسوی عقیدہ ہے جس پر عقیدہ رکھے بغیر کوئی آدمی نجات نہیں پا سکتا" تو جب کہ "رحم دل" عیسوی مذہب کے مطابق ایسا شخص نجات کا مستحق نہیں ہے، اور اسی لئے کسی کی دعائے مغفرت بھی اس کے حق میں مفید نہیں ہے، تو عیسوی مذہب کو اس بارہ میں مذہب اسلام پر کیا فوقیت ہے؟" (خطبات ص ۹۳)

سامان خورد و نوش میں برکت

سر ولیم میور اپنی کتاب میں ایک روایت یہ بھی نقل کرتے ہیں، کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کھانے پر موجود نہ ہوتے، تو تمام خاندان کے لوگ اپنے کفایت شعار کھانے سے (فارغ ہونے پر بھی) بھوکے ہی اٹھتے تھے لیکن جب پیغمبر صاحب بھی کھانے میں شریک ہوتے، تو سب کا پیٹ بھر جاتا تھا"

پھر سر ولیم میور اس پر تبصرہ کرتے ہیں کہ اس بات کو عروج پذیر نبی کی بڑائی اور عظمت خیال کیا جاتا لیکن سر ولیم میور نے اس موقع پر بھی اسلام پر اعتراض کرتے ہوئے اپنی مذہبی روایات کو نظر انداز کر دیا ہے، چنانچہ سر سید احمد فرماتے ہیں کہ

"ہم کو تعجب ہے کہ عیسائی ایسی روایتوں کو اعتراض کی نیت سے نقل کرتے ہیں (حالانکہ) ان کو ایسے واقعہ کے امکان پر اعتقاد نہ رکھنے کی کوئی وجہ نہیں ہے، جب کہ وہ متی باب ۱۴، آیت ۲۰۔۱۹، کے اس بیان کو مانتے ہیں کہ اس نے (حضرت مسیح نے) جماعت کو (جن کی تعداد پانچ ہزار تھی) گھاس پر بیٹھنے کا حکم دیا، اور پانچوں روٹیاں اور دونوں مچھلیاں نکالیں، اور آسمان کی جانب نظر اٹھا کر دعا کی، اور ان کو توڑا، اور اپنے حواریوں کو دیں، اور حواریوں نے جماعت کو تقسیم کیں، اور ان سب نے پیٹ بھر کے کھائیں، اور

بچے ہوئے ٹکڑوں کو جن سے بارہ ٹوکرے بھر گئے اٹھا لیا"

آنحضرتؐ کے سفرِ شام سے نبوت کا تعلق

سر ولیم میور نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سفرِ شام سے متعلق ایک روایت یہ نقل کی ہے کہ:

"جب محمد صلی اللہ علیہ وسلم ملک شام کو گئے، تو بحیرہ راہب نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اور لوگوں کے درمیان اس نشان سے پہچان لیا تھا کہ آپ کے سر پر ایک بادل سایہ کئے ہوئے چلتا تھا، اور درختوں کی شاخیں آپ کے اوپر دھوپ روکنے کے لئے جھک جاتی تھیں، اور بحیرہ نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے سوالات کئے اور مہرِ نبوت کو معلوم کرنے کے لئے آپ کے جسم کا معائنہ کیا"

شام کے اس سفر میں، سر ولیم میور کا یہ خیال ہے کہ:-

"زمانہ سابق کے منہدم اور اُجڑے ہوئے مقامات نے جن کو خیالی قصوں عجیب وغریب بیانات اور دل کش روایتوں نے اور بھی مؤثر بنا دیا تھا اور گرجاؤں صلیبوں مورتوں، آراستہ مذہبی نشانات و آثار اور گھنٹوں کے بجنے کی قومی رسموں نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے غور و فکر کرنے والے دل و دماغ پر ایک گہرا نقش چھوڑا اور پائیدار اثر ڈالا تھا"

سر سید نے، سر ولیم میور کے جواب میں اول تو ترمذی کی یہ روایت پیش کی ہے کہ ابو طالب نے محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ابو بکرؓ و بلالؓ کے ہمراہ شام سے واپس بھیجا تھا" وہ یہ لکھتے ہیں کہ حضرت ابو بکرؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دو سال چھوٹے تھے، اور بلالؓ اس وقت پیدا بھی نہیں ہوئے تھے، اور یہ بات بھی پیش نظر رہے کہ اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر ۱۲ سال کی تھی، اس لئے آپ کو ان دونوں حضرات کے ساتھ شام سے واپس بھیجنا

سوال ہی نہیں اٹھتا، لیکن اگر اس واقعہ کو تسلیم کر لیا جائے تب بھی سرسید کے نزدیک یہ بات ہرگز لائق تعجب نہیں ہے کہ بحیرہ راہب کو آپ کے بارہ میں نبی ہونے کا گمان ہوا ہو، کیونکہ اس وقت یہود و نصاریٰ ایک مسیحا اور ایک فارقلیط کے منتظر تھے، مگر یہ بات کہ ۱۲ سال کی عمر میں، آپ نے محض ایک سفر میں، اور معمولی سے وقت میں بحیرہ راہب سے، نبوت کا کامل سبق پڑھ لیا، اور تقریباً ۳۰ برس کے بعد اس کو اچانک لوگوں کے سامنے پیش فرمایا، یہ بات سر ولیم میور کے شر انگیز لیکن زرخیز ذہن کی پیداوار تو ہو سکتی ہے لیکن کیا ایسا ہونا ممکن بھی ہے؟ اور پھر سر ولیم میور یہ بھی کہتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مرگی زدہ شخص تھے، اس موقع پر سرسید احمد خاں فرماتے ہیں کہ

"ہم سر ولیم میور سے پوچھتے ہیں کہ کیا ایک مصروع شخص کا دل و دماغ ایسا اثر قبول کر سکتا ہے اور کیا ایک مصروع شخص کے دل و دماغ میں غور و فکر کی اس قدر صلاحیت ممکن ہے، اگرچہ سر ولیم میور کا یہ بیان نہایت دلچسپ ہے مگر افسوس ہے کہ ہم اس بیان سے اتفاق نہیں کر سکتے، کیونکہ اسی لڑکے نے جس کا دماغ صلیبوں، مورتوں اور دین عیسوی کی علامتوں کو دیکھ کر اس قدر متاثر ہوا تھا" بعد میں انہی چیزوں کی مخالفت کی، صلیب کو توڑا، مورتوں کو پھوڑا، ان کی پرستش سے منع کیا، اور یہ بتایا کہ خدا کا کوئی بیٹا نہیں ہے تثلیث کے عقیدہ کو جھٹلایا، خدا کو وحدہٗ لاشریک بتلایا، اور اسی کی عبادت کا وعظ کیا، اور تمام دنیا میں اسی کو رواج دیا،

لیکن اس بات کو تسلیم کر کے کہ مذکورہ بالا چیزوں نے اس لڑکے کے دل پر درحقیقت اثر ڈالا تھا، ایک اور خیال خود بخود دل میں آتا ہے اور وہ یہ ہے کہ ایسا لڑکا جس کے ابتدائی ۸ برس ایک صحرا میں کٹے تھے، اور پھر وہ آٹھ

برس تک مشرک اور بت پرست لوگوں میں گذرا تھا، صرف بارہ برس کی عمر میں وہ ایک دل رکھتا تھا کہ ہر چیز سے جو اس کی نظر سے گذری تھی، پرانی منہدم عمارتوں کے آثار سے گرجاؤں، صلیبوں، مورتوں اور دین عیسوی کی علامات تک، وہ اس قدر عقل و فہم و ذکا سے آراستہ تھا کہ ان چیزوں کو دیکھ کر انہی کے برخلاف ایسے کامل تناسخ اور معبود غیر ظاہر اور بقائے روح انسانی کے بارے میں ایسے ایسے عالی خیالات پیش کر سکا، وہ لڑکا بلا شبہ مادر زاد پیغمبر برحق تھا جس کی فطرت خود اس کی معلم تھی، اور وہی تھا جس کی نسبت خود حضرت عیسیٰؑ نے یہ کہکر بشارت دی تھی، کہ "سچ تو یہ ہے کہ میرا چلا جانا تمھارے لئے ضرور ہے، کیونکہ اگر میں نہ جاؤں تو فارقلیط (یعنی احمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم) تمھارے پاس نہیں آوے گا، اور اگر میں چلا جاؤں گا تو اس کو تمھارے پاس بھیج دوں گا"

(خطبات احمدیہ ص۲۵۵) (ختم)

سلسلۂ مقالات سلیمان

مولانا سید سلیمان ندویؒ نے متعدد بلند پایہ تصانیف کے علاوہ بہت سے علمی، مذہبی، فقہی، تاریخی، ادبی و تنقیدی مضامین بھی لکھے تھے، ان تمام مضامین کو فن وار کتابی صورت میں تین ضخیم جلدوں میں مرتب کر کے شائع کیا جا چکا ہے، پہلی جلد تمام تر ہندوستان کی تاریخ کے مختلف پہلوؤں کے مضامین پر، دوسری جلد خالص علمی و تحقیقی مضامین پر، تیسری جلد قرآنی و مذہبی مضامین پر مشتمل ہے، تیسری جلد میں علامہ کے وہ معرکۃ الآرا مضامین بھی ہیں جو انھوں نے یورپ اور امریکہ کے بعض سرکردہ مستشرقین کے جواب میں لکھے تھے، اور بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھے گئے تھے، قیمت:-
علی الترتیب ۲۶ روپیے، ۲۳ روپیے، ۲۳ روپیے، بقیہ جلدیں زیر ترتیب ہیں" "منیجر"

حضرۃ الاستاذؒ کی اہم تصنیف

تاریخ ارض القرآن پر ایک نظر

از

سید صباح الدین عبد الرحمٰن

(۲)

سید صاحبؒ لکھتے ہیں کہ قریش کے خاندان میں ایک نامور سردار قصی پیدا ہوا تو اس نے قریش کی ایک مستقل ہستی پیدا کر دی، سید صاحبؒ کے خیال میں قصی کا زمانہ پانچویں صدی کے عہد اوسط کا تھا (ص ۱۰۲) اس نے قریش کے منتشر اجزا کو یکجا کیا اور ایک چھوٹی سی جمہوری ریاست کی بنیاد ڈالی، اس شہری حکومت میں چودہ[۱۴] عہدے تھے، جو دس[۱۰] عہدیداروں پر منقسم تھے، دس[۱۰] عہدہ دار قریش کے دس قبائل سے منتخب ہوتے تھے، ان عہدوں اور ان کی توضیح خدمات اور قبیلوں کو سید صاحبؒ نے بڑی محنت سے جمع کر دیا ہے، ان کا جاننا ہمارے ناظرین کے لیے دلچسپی سے خالی نہ ہوگا، حاجیوں کے کھانے پینے کا سامان (سقایہ) اور خانۂ کعبہ کا انتظام (عمارہ) بنو ہاشم، حاجیوں کی مالی امانت کا انتظام (رفادہ) بنو نوفل، خانۂ کعبہ کی دربانی اور کلید برداری (سدانہ) بنو عبد الدار، بتوں سے استخارہ کی خدمت (ایسار) بنو جمح اور بتوں کے نذرانوں اور چڑھاووں کا انتظام (اموال محجرۃ) بنو سہم کے ذمہ تھا، پھر عدالتی نظام میں عدالت خانہ اور مشورہ گاہ کا انتظام (ندوہ) بنو عبد الدار، امور مہمہ میں مشورہ لینا (مشورہ) بنو اسد، خون بہا، جرمانہ اور مالی تاوان کا انتظام (اشناق)، بنو تیم، مقدمات کا فیصلہ (حکومۃ) بنو سہم کے سپرد تھا، پھر جنگی معاملات میں نشان قومی کی علم برداری (عقاب) بنو امیہ، فوجی کیمپ کا نظم (قبہ) بنو مخزوم، سواروں کے رسالہ کی سپہ سالاری

(اعراب) کی قوموں اور صفات (صفات) بنو عدی کے حوالے تھیں۔ (ص ۱۰۱-۱۰۵) اس چھوٹی سی شہری جمہوریت کا ایوان حکومت دار الندوۃ کے نام سے موسوم تھا، اس کا بانی بھی قصی تھا، تمام قسم کے فیصلے اسی عمارت میں صادر ہوا کرتے تھے، قریش نے داعیِ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے قتل کا مجرمانہ فیصلہ بھی اسی دار الندوۃ میں کیا تھا، (ص ۱۰۶) وہ زیادہ تر تجارتی کاروبار کرتے تھے، عرب سے نکل کر ان کے تاجر عراق، ایران، شام، بلکہ ایشیائے کوچک تک ان کے تاجر گذرتے تھے، (ص ۱۰۶) پھر قریش اور قرآن مجید کا عنوان قائم کر کے یہ بتایا گیا ہے کہ قریش کے افراد اور اشخاص کے الہامی تذکرے تو قرآن مجید میں کثرت سے ہیں، لیکن نام کے ساتھ قریش اور موالی قریش میں تین[۳] اشخاص کا ذکر ہے، ایک تو خود رسالت مآب محمد صلی اللہ علیہ وسلم، دوسرے زید بن حارثہ اور تیسرے ابولہب، پھر اس کی تفصیل بتائی گئی ہے کہ یہ نام کیسے اور کس طرح آئے جو عام طور سے ہمارے ناظرین کو معلوم ہے۔

قریش کے بعد ارض القرآن کی قوموں اور قبیلوں کی تاریخ ختم کر دی گئی ہے، ان کھوئی اور بھلائی ہوئی قوموں کی تاریخ لکھنا آسان نہیں تھا، لیکن جس طرح اس مشکل سے سید صاحب عہدہ برآ ہوئے ہیں، اس سے علم الاقوام سے ان کی غیر معمولی دلچسپی کا اظہار ہوتا ہے، اور پھر جس طرح ان کے بکھرے اور منتشر واقعات کو قلمبند کیا ہے اس سے ان کی تحقیق و تلاش میں محنت شاقہ اور علم و فن کے قلمرو میں ان کے قلم کی طاقت اور استیلا کا بھی اندازہ ہوتا ہے، اب تک ان قوموں کی سیاسی تاریخ لکھ رہے تھے، بقیہ ابواب میں ان کی تجارتی، لسانی اور مذہبی سرگرمیوں کے کوائف ہیں۔

عربوں کی تجارت | عربوں کے تجارتی حالات زیادہ تر توراۃ، قرآن مجید اور یونانی تاریخوں کے حوالے سے لکھے گئے ہیں، اور اس خشک موضوع کو بھی سید صاحبؒ نے اپنی تحریر کے ذریعہ سے پُرمغز اور پُر از معلومات بنا دیا ہے، عربوں کی تجارتی سرگرمیوں سے متعلق بعض اہم بیانات سے پوری تصویر سامنے آجاتی ہے، وہ لکھتے ہیں کہ ملک عرب کا زیادہ تر حصہ غیر آباد اور ریگستان ہے، اس لیے طبعًا وہاں زراعت سے زیادہ تجارت کے کاروبار کو فروغ ہونا چاہیے، اس کے آباد حصے تمام ملک کے تین طرف بحری سواحل پر واقع ہیں، مغرب سے چلیے بحرین اور عمان خلیج فارس پر شمال میں حضرموت اور یمن بحر عرب پر، اور مشرق میں حجاز و مدین بحر احمر پر واقع ہیں، اندرون ملک کا جو حصہ زرخیز ہے،

مثلاً یمامہ، نجد اور یثرب وغیرہ ان میں کاشتکاری ہوتی تھی، عرب کے یہ ساحلی صوبے دنیا کے بڑے بڑے ممالک کے آمنے سامنے واقع ہیں، عمان و بحرین، ایران و عراق سے متعلق ہیں، یمن اور حضرموت کو افریقہ اور ہندوستان سے تعلق ہے، حجاز کے سامنے مصر ہے، اور شام کا ملک اس کے بازو پر واقع ہے، آنا لکھنے کے بعد وہ لکھتے ہیں کہ عربوں کی تجارت ان ہی ہمسایہ ملکوں سے تھی، پھر وہ یہ بھی لکھتے ہیں کہ بحرین کے پاس کچھ عرب تاجروں نے انتقال مکان کر کے بحر روم، بحر ابیض، بحر متوسط کے سواحل پر جو شام و کنعان کے بحری مقامات تھے سکونت اختیار کر لی تھی، بنی اسرائیل ان کو آرامی، کنعانی اور اہل یونان انکو فینیقین (فینیشین) کہتے تھے، ان فینیقی عربوں نے یورپ اور افریقہ کے انتہائی ملکوں تک اپنے تجارتی سلسلے پھیلا رکھے تھے، (ص ۱۱۱ - ۱۱۰) مگر اس کے بعد سید صاحبؒ نے جو کچھ لکھا ہے وہ حیرت سے پڑھا جائے گا کہ یونان میں تہذیب و تمدن کا آغاز ان ہی بیوپاریوں کے ذریعہ سے ہوا، اور رفتہ رفتہ یہ چنگاریاں دور دراز تک اپنی روشنی کی شعاعیں ڈالتی چلی گئیں، (ص ۱۱۱) اندرون ملک ان کے تجارتی شہر بحرین یا یمامہ، حضرموت، شبوۃ قلنہ، مآرب، عدن اوزال، مدین اور ایلہ وغیرہ تھے، (ص ۱۱۴) اس اجمال کی پوری تفصیل اس باب میں ملے گی، عربوں کے تجارتی راستوں اور شاہراہوں کا بھی ذکر آیا ہے، اس کی طرف بھی توجہ دلائی گئی ہے کہ جو تجارتی شاہراہ حجاز ہو کر یمن تک کو جاتی تھی قرآن مجید نے اس کو امام مبین (ظاہر راستہ) لکھا ہے، سبا کے تجارتی قافلوں اور ان بے خوف و خطر منزلوں کا ذکر بھی قرآن مجید میں ہے، اور پھر حضرت یوسفؑ کے قصہ میں تجارتی قافلہ کی گذرگاہ کا بھی ذکر کیا گیا ہے، اور اس کی تصدیق توراۃ اور یونانی مورخوں کی تحریر سے بھی کی گئی ہے (ص ۱۱۳) اس کی نشان دہی بھی کی گئی ہے کہ مسلمان جغرافیہ نویسوں میں ابن الحائک ہمدانی نے اپنی کتاب "صفۃ جزیرۃ العرب" میں ان تجارتی راستوں کی تفصیل لکھی ہے، حضرموت سے لے کر عقبہ تک تقریباً ۱۱۰ دن کا راستہ تھا، (ص ۱۱۵)

پھر اس کی تفصیل لکھا ہے کہ عرب کن کن چیزوں کی تجارت کرتے تھے، ان میں عموماً تین چیزیں ہوتی تھیں، (۱) کھانے کا مسالہ اور خوشبودار چیزیں (۲) سونا، جواہرات اور لوہا (۳) چمڑا، کھال، زین پوش، بھیڑ اور بکری (ص ۱۱۶)، اس کی معلومات بھی فراہم کی گئی ہیں کہ عود، لوبان اور بخورات سبا اور حضرموت کے علاقہ میں پیدا ہوتے تھے

(ص ۱۱۸) موتی خاص سواحل عرب کی چیز ہے، بحرین و عمان کے دریاؤں میں موتی کے خزانے ہیں، اس کا ذکر قرآن مجید کے سورۂ رحمٰن میں بھی ہے، (ص ۱۱۹) عرب میں سونے کی بڑی کانیں تھیں، ان کے سونے کی شہرت یروشلم اور اسکندریہ کے بازاروں میں تھی (ص ۱۱۹) عرب کی کھالیں بھی سامان تجارت میں نظر آتی تھیں، یمن کی کھال تو بہت مشہور تھی یہاں تک کہ فارسی شعراء کے کلام میں اس کی تلمیحات ملتی ہیں، (ص ۱۱۹)

اس قسم کی تفصیلات سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ یہ عرب اپنا سامان فروخت کرکے غیر ملکوں سے مسالے یعنی لونگ، سیاہ مرچ، الائچی، ڈلی، دارچینی، ناریل، املی (ص ۱۱۰) کپڑا، غلہ، شراب، ہتھیار، آئینہ اور آرائش کی چیزیں لاتے تھے، (ص ۱۲۰) عربوں کے تجارتی بازاروں کی بھی تفصیل ہے، یعقوبی اور امام مرزوقی کی کتاب الامکنۃ والازمنۃ کے حوالہ سے ان کے بڑے بڑے میلوں کا ذکر ہے، جو اس زمانہ میں لگا کرتے تھے، یہ میلے دومۃ الجندل، مشقر، صحار، دبا، شحرۃ، عدن، صنعا، حضرموت، عکاظ، ذوالمجاز، حباشہ، خیبر اور یمامہ میں لگتے تھے، (ص ۱۲۲) قرآن مجید میں قریش کا ذکر آتا ہے اور ان سے دعوتِ اسلام سے ٹکر ہوئی، اس لیے اس باب میں ان کی تجارت کا بھی ذکر آیا ہے، جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ قریش تاجر قبیلہ تھا، وہ زراعت اور کاشتکاری کو ذلیل ترین پیشہ سمجھتے تھے، (ص ۱۲۴) اس لیے وہ زیادہ تر تجارت کرتے تھے، جاڑوں میں یمن اور گرمیوں میں شام بلکہ ایشیائے کوچک تک قریشی سوداگر جاتے تھے (ص ۱۲۴) وہ چمڑا اور چاندی کی تجارت زیادہ کرتے تھے، (ص ۱۲۷) قریش کی تاجرانہ ترقی کی انتہا یہ تھی کہ بیوہ اور لاچار عورتیں تک اپنا سرمایہ تجارت میں لگاتی تھیں، دوسروں کو اپنا روپیہ دیتی تھیں کہ وہ اس سے تجارت کریں اور نفع میں شریک ہوں، حضرت خدیجہ رضؓ اپنی بیوگی کے زمانہ میں اسی طریقہ سے تجارت کرتی تھیں، ان کا سامان تجارت ہر سال شام کو جایا کرتا تھا، (ص ۱۲۶) قریش عکاظ اور ذوالمجاز کے میلوں میں اپنے تجارتی سامان کے ساتھ شریک ہوتے، اسلام کے بعد قریش کی تجارتی سرگرمی افسردہ نہ ہوئی، حضرت ابوبکر رضؓ کپڑے کی تجارت کرتے تھے، حضرت عمر رضؓ کی تجارت کا سلسلہ ایران تک پھیلا ہوا تھا، حضرت عثمان رضؓ بنو قینقاع کے بازار میں کھجوروں کی تجارت کرتے تھے، عبد الرحمٰن رضؓ بن عوف پنیر بیچتے تھے، حضرت زبیر رضؓ بھی کپڑے کے تاجر تھے، عام مہاجرین مدینہ کے اندر زیادہ تر تجارت ہی

کرتے تھے، (ص ۱۲۰ - ۱۲۸)

عربوں کی مختلف زبانیں | سید صاحب نے ارض القرآن کی مختلف زبانوں پر بھی بڑی دقیق بحث کی ہے، اپنی اس کتاب میں السنۃ العرب قبل الاسلام کے عنوان سے جو کچھ لکھا ہے اس کو پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ اس وقت تک علم اللسنہ میں بھی ان کی نظر کتنی گہری ہو چکی تھی، اس میں جو فنی مباحث ہیں ان کو تو ماہر لسانیات ہی اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں، لیکن عام ناظرین کے فہم وادراک کے لیے جو چیزیں لائق توجہ ہو سکتی ہیں ان کو سید صاحبؒ ہی کے الفاظ میں اس طرح بیان کیا جا سکتا ہے:

عرب کی قومیں سامی تھیں، سامی زبانیں تین مرکزوں میں تقسیم ہو گئی تھیں، عربی، بابلی، اور شامی،
عربی کی مختلف شاخیں یہ تھیں، آرامی، ثمودی، مدیانی، نبطی، عدنانی، سبائی، حمیری اور حبشی وغیرہ۔
بابلی کی شاخیں یہ تھیں: آرامی، کلدانی، سریانی۔
شامی کی شاخیں یہ تھیں: آرامی، فنیقی، عبرانی، تدمری۔

ان میں سید صاحبؒ نے اپنے موضوع کے لحاظ سے عربی کی مختلف شاخوں ہی پر پوری بحث کی ہے، وہ عربی زبان کی پہلی شاخ کو آرامی کہتے ہیں، ان کا بیان ہے کہ شام کی قدیم ترین زبان کو ملکی حیثیت سے عربی اور قومی حیثیت سے آرامی کہنا چاہیے (ص ۱۳۰) بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ آرامی زبان ہر جگہ پہونچی اس لیے بابلی اور شامی شاخوں میں بھی آرامی دکھائی دیتی ہے، وہ لکھتے ہیں کہ اکثر لوگ سمجھتے ہیں کہ عبرانی زبان سب سے قدیم ہے اسی کا حضرت ابراہیمؑ کی زبان تھی لیکن یہ بالکل غلط ہے، حضرت ابراہیمؑ کی زبان آرامی عربی تھی، حضرت اسماعیلؑ کی بھی زبان یہی آرامی زبان تھی، (ص ۱۳۱) پھر انھوں نے عرب مورخوں کے مطابق عرب کی تمام قوموں کو تین طبقوں میں تقسیم کیا ہے: (۱) بائدہ جو امم سامیہ میں ہیں (۲) عرب عاربہ یعنی بنو قحطان (۳) عرب مستعربہ یعنی بنو اسماعیل، عرب کے یہ تینوں طبقے تین مستقل خاندانوں سے تعلق رکھتے تھے، اور الگ الگ تین زبانیں بولتے تھے، لیکن یہ تینوں زبانیں گویا اپنی اصلیت کی رو سے ایک ہی ماں سے پیدا ہوئی تھیں، لیکن چونکہ

مختلف خاندانوں میں ان کی پرورش اور نشوونما ہوئی تھی، اس لیے ان میں باہم خاص امتیازات پیدا ہوگئے تھے، (ص ۱۳۱) جس ایک ماں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے وہ عربی زبان ہی ہے۔

اس کے بعد سید صاحب یہ بتاتے ہیں کہ امم سامیہ کے طبقۂ اولیٰ میں سب سے طاقتور قوم عاد ارم کی تھی، جس میں عاد اور ثمود بھی شامل تھے، ان کی زبان عربی آرامی ہی تھی (ص ۱۳۲) امم سامیہ کے طبقۂ دوم میں بنو قحطان تھے، ان میں جنوبی عربی کی حسب ذیل شاخیں بولی جاتی تھیں: سبائی، حمیری، حضرموتی، مہری، حبشی، سید صاحبؒ نے ان کے متعلق یہ معلومات فراہم کی ہیں: سبائی قوم سبا، حمیری اصحاب الاخدود اور حبشی اصحاب الفیل کی زبانیں تھیں، سبائی زبان بہت پہلے ختم ہو چکی تھی، بقیہ زبانیں ظہور اسلام تک بولی جاتی تھیں، لیکن قرآن کی زبان نے اپنا اثر دکھایا تو یہ زبانیں بھی ختم ہوتی گئیں، گو اپنے اپنے صوبوں میں ان کا اثر باقی رہا، حبشی تغیر زمانہ کے بعد ایک مستقل زبان بن گئی، سبائی اور حمیری میں بہت کم فرق تھا، (ص ۱۳۶) اسی طرح سید صاحب یہ بھی بتاتے ہیں کہ بنو اسماعیل میں شمالی عربی کی حسب ذیل شاخیں رائج تھیں: تدمری، نبطی، حجازی، ان میں بھی الفاظ، حروف، معانی اور قواعد کا باہم فرق ہے، تدمری قرآن کی عربی زبان کے الفاظ سے بہت مغایر ہے، نبطی اصحاب الحجر کی زبان تھی، وہ قرآن کی عربی زبان سے بہت قریب ہے، اور اس کا خط بھی عربی خط بلکہ کوفی خط سے مشابہ ہے، (ص ۱۴۱ - ۱۴۰)

سید صاحبؒ کے خیال میں حجاز اور نجد میں جو عربی زبان بولی جاتی تھی، وہ سب سے بہتر تھی، ان میں بھی قبیلہ بنی سعد اور قریش کی زبان اور بھی بہتر تھی، اسی لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے دو قبیلوں کے انتساب پر فخر کیا ہے، آپ قریش میں پیدا ہوئے اور بنو سعد میں پرورش پائی، پھر وہ یہ بھی بتاتے ہیں کہ قرآن میں دو موقع پر لِسَانٌ عَرَبِيٌّ مُّبِينٌ کہا گیا ہے جس سے مراد یہ ہے کہ قرآن ایسی زبان میں اتارا گیا ہے جو نہایت فصیح ہے، اس کے مطالب کھل جاتے ہیں، معانی واضح ہو جاتے ہیں، سمجھنے میں کوئی دشواری نہیں پیش آتی (ص ۱۴۴ - ۱۴۳) پھر قریش کی عربی کی خوبی یہ بھی بتائی ہے کہ قریش کا قبیلہ بہ تجارت کی خاطر نہ صرف عرب کے

گوشہ گوشہ میں بلکہ آس پاس کے ممالک میں بھی جاتا تھا، اس بنا پر اس کی زبان میں دوسری زبانوں کے اعتبار سے زیادہ وسعت اور ہمہ گیری پیدا ہو گئی تھی، پھر جب مکہ میں مراسم حج ادا ہوتے اور ہر گوشہ کے لوگ یہاں جمع ہو جاتے تھے، یا جب عکاظ کا میلہ لگتا تھا، تو یہ میلہ اکاڈمی کا کام دیتا تھا، اس بنا پر مکہ کی زبان ایسی زبان ہو گئی تھی جو عرب کی تمام زبانوں کا خلاصہ اور عطر مجموعہ تھی (ص ۱۴۶)

عربوں کے مذاہب کتاب کے آخری دو ابواب میں اسلام سے پہلے عرب کے مذاہب اور ادیان پر بہت ہی تفصیلی معلومات ہیں جو طالبانہ اور متعصبانہ انداز میں لکھنے کے بجائے مورخانہ اور ناقدانہ انداز میں لکھے گئے ہیں، ان کو قلمبند کرنے میں جہاں قرآن پاک، صحیح بخاری، مسند ابن حنبل، سیرۃ ابن ہشام، معجم البلدان یاقوت، طبقات الامم انصاعد اندلسی، معارف ابن قتیبہ، تاریخ مختصر الدول، الفہرست ابن ندیم، کتاب الازمنہ والامکنہ از امہرزوقی، لسان العرب سے مدد لی گئی ہے، وہاں توراۃ، ہیرن کی ہسٹاریکل ریسرچ، انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا، انسائیکلو پیڈیا آف اسلام، ہسٹورین ہسٹری آف دی ورلڈ، انسائیکلو پیڈیا آف ریلیجس اینڈ اتھکس، گولڈ اگنس آف مڈین، ڈوزی کی تاریخ مسلمان اسپین میں، سورسز آف القرآن از سر ولیم میور، ہسٹری آف دی مورش امپائر، از ایس. پی. اسکاٹ اور معرکۂ مذہب و سائنس سے بھی استفادہ کیا گیا ہے، اس کے مطالعہ سے معلوم ہوگا کہ عاد، ثمود اور جرہم وغیرہ بت پرست تھے، خدائے برحق کو چھوڑ کر اور بہت سے خداؤں کو پوجتے تھے (ص ۱۴۹) صابیوں کا عام اعتقاد یہ تھا کہ تمام دنیا ارواح سے بھری ہوئی ہے، ان میں زیادہ تر ارواح خبیثہ اور کچھ ارواح طیبہ ہیں، ارواح خبیثہ کو نذر و نیاز، قربانی اور چڑھاوے سے خوش رکھنا اور ارواح طیبہ کو مدح و ثنا کر کے ان کے مقابلہ کے لیے تیار کرنا ان کا مسلک تھا، وہ یہ بھی سمجھتے تھے کہ ہر روح کا مسکن ایک ستارہ ہے، اس لیے ستارہ کی پرستش بھی کرتے (ص ۱۵۴ - ۱۵۳) مصر میں بھی سامیۂ اولیٰ کے زمانہ میں اسی قسم کی ستارہ پرستی جاری تھی، سب سے بڑا دیوتا آفتاب تھا، جس کو وہ اپنی زبان میں رع کہتے تھے، ان کے دار الحکومت میں آفتاب دیوتا کا مندر رہتا، بادشاہ آفتاب دیوتا کا بیٹا سمجھا جاتا تھا، (ص ۱۵۵) آفتاب کے علاوہ مصر میں بہت سے

دیوتا اور دیویاں تھیں، ہر شہر کا ایک خاص الگ الگ دیوتا تھا، پھر ہر گھر کا الگ اور گھر کے ہر آدمی کے الگ الگ دیوتا تھے، (ص ۱۵۷) قوم سبا میں زیادہ تر آفتاب کی پوجا ہوتی تھی، (ص ۱۵۰) یمن میں آفتاب کے علاوہ چاند کی بھی پرستش ہوتی تھی، (ص ۱۵۹) بنو قحطان میں بتوں کی پوجا ہوتی تھی، ان کے بت خانوں کی آبادی اور مصارف کے لیے لوگ اپنی پیداوار کی کمائی کا مخصوص حصہ نذر کیا کرتے تھے، (ص ۱۶۶) بتوں پر سونا اور چاندی کی نذر چڑھائی جاتی تھی، (ص ۱۶۹) مدین بعل دیوتا کو پوجتے تھے، سامی قبائل میں بعل کو سب سے زیادہ مقبولیت حاصل تھی (ص ۱۶۹) مستشرقین یورپ کی تحقیق کے مطابق بعل ستارۂ زحل کا نام تھا، جس کو عربی میں ہبل کہتے تھے، اس کے لیے مذہبی قربان گاہ اور ہیکل بنے تھے، لوبان اور بخورات ان میں جلائے جاتے تھے، اونٹ کی قربانی اس کے لیے سب سے بہتر سمجھی جاتی تھی، اولاد کو بھی اس کی خاطر آگ میں ڈال دیا جاتا تھا، (ص ۱۷۱) اصحاب الایکہ میں موآب کا دیوتا کموش اور عمون کا مولک تھا، ان دونوں پر لوگ اپنی اولاد کی قربانی کرتے تھے، (ص ۱۷۲) بنو ادوم یعنی حضرت ایوبؑ کی امت سورج اور چاند کی پوجا کرتی تھی، ان کو دیکھ کر اپنے ہاتھ چوم لیتے تھے، یہ گویا اس بات کی طرف اشارہ تھا کہ اگر ممکن ہوتا تو وہ خود ان کے بوسے دیتے، (ص ۱۷۲) بنو اسمٰعیل کو جو اچھا سا چکنا پتھر مل جاتا اس کو اٹھا لیتے اور اس کو اپنے گھر کا دیوتا بنا لیتے۔ (ص ۱۷۳) اصحاب الرس اور اصحاب الحجر کے بھی بہت سے دیوتا تھے، ان کے یہاں باضابطہ ایک کاہن تھا، جو لوگوں پر مذہبی جرمانہ کر سکتا تھا (ص ۱۷۵) انباط کے یہاں چاند گھٹنے اور بڑھنے کی حالت میں دو توام دیوتا سمجھے جاتے تھے، (ص ۱۷۶) اوس اور خزرج کے گھروں میں دیوتاؤں کی مورتیں رہتی تھیں، مناۃ کی مورت لکڑی کی تراشی ہوئی یثرب کے گھر میں اتنی بڑی تھی کہ چند آدمی مل کر اس کو اٹھاتے تھے (ص ۱۷۶) ان قبائل میں ستارہ پرستی بھی تھی، لخم اور جذام ستارۂ مشتری کو پوجتے تھے، اور طی سہیل کے پرستار تھے، (ص ۱۷۷) بنو قیدار یعنی عدنانی قبائل کا سب سے بڑا دیوتا ہبل تھا، جو خاص خانۂ کعبہ میں نصب تھا، لات کا ہیکل شہر طائف میں تھا، مکہ سے چند میل دور مقام نخلہ میں عزیٰ نام کی ایک دیوی کا مسکن تھا، ان دیوتاؤں کے لیے قربانیاں ہوتی تھیں، ان میں بعض قبائل ستارہ پرست بھی تھے، قیس شعریٰ پوجتا تھا، کنانہ چاند کو

پرستار تھا، اسد عطارد کی پرستش کرتا تھا، تمیم ستارۂ دبران پوجتے تھے، قریش اور ان کے ہم نسب قبائل کا دیوتا ہبل تھا، جو دراصل ستارۂ زحل تھا (۱۷۹) پتھر اور مٹی کی مورتوں کے علاوہ بھوت اور پریت پر بھی ان کا اعتقاد تھا، ان کو خدا یا خدا کا مقرب سمجھ کر پوجتے تھے، (ص ۱۸۰) خانۂ کعبہ میں بہت سے بت تھے، ان میں ایک خاص تعداد رنگین تصاویر کی بھی تھی، ان میں حضرت ابراہیمؑ، حضرت اسماعیلؑ، حضرت مسیحؑ اور حضرت مریمؑ کی بھی تصویریں تھیں، اس سے کعبہ کے یہودیوں، اسماعیلی عربوں اور عیسائیوں کے لیے بھی مرجع انقلاب بننے کا دعویٰ سمجھا جا سکتا ہے (ص ۱۸۱)

بت پرستی کے علاوہ عرب میں کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو ملحد اور بے دین تھے، عام مذاہب میں صابئیت، مجوسیت، یہودیت اور عیسائیت بھی تھے، صابئیت یعنی ستارہ پرستی قدیم زمانے سے عرب میں موجود تھی، مجوسیت نے عرب پر کم اثر ڈالا، مگر بعض قبیلے اس کے پیرو تھے، یہودیت نے یہاں بڑا برگ و بار پیدا کیا، یثرب سے شام تک عرب کے اکثر مقامات یہودیوں کے قبضے میں تھے، عیسائیت شام کا شاہی مذہب تھا، لخم، جذام، غسان، مذحج، بہرا اور سلیح وغیرہ قبائل میں عیسائیت عام تھی، نجد کا قبیلہ طے عیسائی تھا، قریش کے خاندان بنی اسد میں چند آدمی عیسائی ہو گئے تھے، (ص ۱۸۲ - ۱۸۱)

اوپر جو کچھ اختصار سے لکھا گیا ہے اس کی پوری تفصیل اسلام سے پہلے عرب کے مذاہب کے باب میں ملے گی، اس میں حیرت انگیز بات یہ پائی جاتی ہے کہ عربوں کے معبودوں کے نام، ان کے معنی، اور کن کن شہروں میں ان کی پرستش ہوتی تھی، پھر بتوں کے علیحدہ علیحدہ نام، بڑھنے اور گھٹنے والے چاند کے نام، ان کی کیفیت، آفتاب کی پرستش جہاں جہاں ہوتی تھی، یا مختلف دیوتاؤں اور ان کے پرستاروں کے نام جس تفحص اور تلاش سے جمع کیے گئے ہیں، وہ تحقیق اور تدقیق کے بے مثال نمونے ہیں، ان کو جمع کرنے میں کوئی مذہبی عقیدہ بھی نہ تھا جس کے لیے اتنی محنت اور ریاضت کی جاتی، سید صاحبؒ میں محنت اور ریاضت فطرت ثانیہ تھی، اس کا نمونہ اس ابتدائی تصنیف میں دکھائی دیا جو آگے چل کر ان کی اور تصانیف خصوصاً سیرۃ النبی میں منتہائے کمال کو پہنچ گئی تھی، اس باب میں یہ بھی دکھایا گیا کہ ان عربوں کو سنوارنے کے لیے حضرت صالحؑ، حضرت ہودؑ، حضرت لوطؑ، حضرت ایوبؑ، حضرت

شعیبؑ، حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسمٰعیلؑ وغیرہ بھیجے گئے، مگر انھوں نے ان کی تکذیب کی، اس لیے وہ تباہ و برباد کر دیے گئے،

کتاب کے آخری باب میں قرآن مجید کی روشنی میں اسلام سے قبل کے عرب کے مذاہب پر مباحث ہیں، ان سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ گذشتہ ادوار میں جس اعظم پرستی (یعنی ہر اس شے کی پرستش جو انسان کی نظر میں بڑی معلوم ہو) قوئی پرستی (یعنی قوائے فطریہ کو معبود بنانا) اور ستارہ پرستی کا ذکر ہے، قرآن مجید نے ان سب کی مذمت کی ہے، اور ان تمام آیتوں کی نشان دہی کر دی گئی ہے۔

قرآن مجید میں عربوں کے مذاہب کا ذکر

قرآن مجید کے نزول کے وقت عرب میں متعدد مذاہب کے علاوہ مستند مذاہب میں یہودیت، نصرانیت، مجوسیت، صابئیت اور حنیفیت تھے، اور ان سب کے متعلق قرآن شریف میں جو کچھ کہا گیا ہے ان سب کو اس باب میں جمع کر دیا گیا ہے، عرب کے یہودیوں کے ذمائم اخلاق کو جس طرح کھول کر بیان کیا گیا ہے اس کا ذکر کیا ہے (ص ۱۸۸۔ ۱۸۷) پھر عیسائی تین خدا کو مانتے ہیں، تو قرآن مجید میں اس کی تردید کی گئی ہے، (ص ۱۸۹) مجوسی یزدان اور اہرمن دو خداؤں کے قائل تھے، ایک فاعل خیر (یزدان) دوسرا فاعل شر (اہرمن) تھا، یزدان کو نور اور اہرمن کو ظلمت سے تعبیر کرتے تھے، قرآن مجید نے اس مجوسی اعتقاد کا جس طرح ابطال کیا ہے اسی کا ذکر کیا گیا ہے، صابئیت کا ذکر نسبۃً زیادہ تفصیل سے ہے، اس کے متعلق قرآن شریف، حافظ ابن کثیر کی تفسیر، علامہ ابن تیمیہؒ اور علامہ ابن حزم کی تحریروں میں جو کچھ ہے، یا ان کے متعلق قدیم عیسائیوں اور علمائے یورپ کے جو بیانات ہیں ان سب کو اس میں جمع کر دیا گیا ہے، پھر سید صاحبؒ خود اس پر اپنا تبصرہ کرتے ہوئے اس نتیجہ پر پہونچے ہیں کہ صابئین کا اصل مولد بابل تھا، (ص ۱۹۲) یہ کلدان کے قدیم مذہب ستارہ پرستی، یونان کے فرقہ ناستک اور ایران کے مسئلہ نور و ظلمت کا ایک مخلوط مجموعہ ہے، (ص ۱۹۰) ان مباحث میں صابی کی لغوی تحقیق بھی کی گئی ہے، اور اس کے مختلف معنے بتائے گئے ہیں، ایک تو یہ کہ عربی لفظ صبغ کے ہم معنی ہے جس سے عربی میں اصطباغ ہے، اس کے اصل معنی نہانے اور دھونے کے ہیں، اور اصطلاحًا بپتسمہ کے معنی میں بولا جاتا ہے

چونکہ یہ فرقہ مذہبوں میں کثرت سے غسل کرتا ہے اس لیے اس کا آرامی نام صابی پڑا، اور اسی سے عربی میں آیا، ایک اور لغوی تشریح یہ ہے کہ سامی زبانوں میں لفظ ستاروں کے مفہوم میں عام طور سے مستعمل ہے، عبرانی میں اس کے معنی جماعت ستارگان کے ہیں، عربی میں صبا کے معنی ستارے کے طلوع اور نکلنے کے ہیں، چنانچہ قاضی بیضاوی نے صابی کا اشتقاق اسی لفظ سے کیا ہے، ان مباحث سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ خود صابئین پہلے اپنے لیے یہ اصطلاح استعمال نہیں کرتے تھے، لیکن خلیفہ مامون رشید کے عہد سے یہ لقب استعمال کرنے لگے، عباسیوں کے زمانہ میں ان کا عروج ہوا تو انھوں نے اپنے کو اہل کتاب ثابت کرنے کی بھی کوشش کی، اور اپنے مذہب کی ایسی تجدید و اصلاح کی کہ وہ اپنے کو اسلام کے قریب تر ثابت کرنے لگے، اسی لیے بعض علمائے اسلام نے ان کے عقائد و طرز عبادت کو اسلام سے قریب تر بیان کیا ہے، لیکن ان مباحث سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ قرآن مجید میں ان کی ستارہ پرستی کا الزام ہے، ان کی ستارہ پرستی کی تردید میں حضرت ابراہیمؑ کا وہ مکالمہ ہے جو انھوں نے ستارے، چاند اور آفتاب سے کیا ہے، (ص ۵۰۴) قرآن ہی سے ظاہر ہے کہ صابی قوم کی ہدایت و اصلاح کے لیے سب سے پہلے حضرت ابراہیمؑ مامور ہوئے، اور قرآن ہی سے یہ ثابت کر دکھایا گیا ہے کہ وہ نہ یہودی تھے، نہ عیسائی، بلکہ موحد مسلم تھے، مشرکوں میں نہ تھے، (ص ۲۱۴) قرآن سے یہ بھی ظاہر ہے کہ ان میں ارواح اور ملائکہ پرستی کا بھی رواج تھا، (ص ۲۰۸)

اس کے بعد مذہب حنیف کی تصریح بڑی تفصیل سے کی ہے، اس سے مستشرقین کی بعض تلبیسات اور تدلیسات کا پول بھی کھل جائے گا، لکھتے ہیں کہ حنیف حنف سے مشتق ہے، عربی میں اس کے معنی مڑنے اور جھکنے کے ہیں، اس لیے حنیف وہ شخص ہے جو ایک طرف سے جھک کر اور مڑ کر دوسری طرف جائے، یہ لفظ اچھے اور برے دونوں معنوں میں مستعمل ہو سکتا ہے، اگر یہ فرض کیا جائے کہ اس نے اچھی بات کو چھوڑ کر بری بات اختیار کی تو حنیف کے وہ معنی ہو سکتے ہیں جس میں عبرانی و سریانی میں وہ مستعمل ہے، یعنی کافر و منافق، اور اگر یہ سمجھا جائے کہ برے کام کو ترک کر کے اس نے کوئی اچھا کام پسند کیا ہے تو اس کا وہ مفہوم ہوگا جس میں اہل عرب اس کو بولتے ہیں، یعنی دیندار اور خدا پرست، اس بنا پر اس لفظ کے اچھے یا برے مفہوم کی تحقیق موقع استعمال اور حرف صلہ سے ہوگی،

اصل میں اس کا ابتدائی استعمال اللہ یا الدین کی تخصیص کے ساتھ ہوتا تھا، یعنی الحنیف للہ خدا کی طرف جھکنے والا، الحنیف للدین سچے مذہب کی طرف جھکنے والا، کثرت استعمال اور زبان زدگی عام سے اس قید کی ضرورت نہ رہی، اور مطلق حنیف (جھکنے والا) کے معنی بھی حنیف للہ (خدا کی طرف جھکنے والا) یا حنیف للدین (سچے مذہب کی طرف جھکنے والا) ہی کے سمجھے جانے لگے، چنانچہ قرآن مجید میں اس لفظ کا استعمال دونوں طرح سے ہوا ہے، سورۂ حج میں حنفاء للہ (خدا کی طرف مڑنے والے بن کر) لیکن سورۂ بینہ میں بغیر صلہ کے آیا ہے: مخلصین له الدین حنفاء (اپنے اعتقاد کو خدا کے لیے خالص کرکے مڑنے والے بن کر) یہاں حنفاء کے معنی حنفاء للہ سمجھے جائیں، (ج ۲، ص ۲۰۸) اس کے بعد سید صاحب لکھتے ہیں کہ حنیف، حنف سے مشتق ہے، حنف کے معنی ہٹنے اور ٹیڑھے ہونے کے ہیں، (ص ۲۰۰) جب حضرت ابراہیمؑ کی بعثت صابی قوم کے اندر ہوئی تو انھوں نے دلائل اور عمل دونوں طریقوں سے ان کے مذہب کی تردید کی، باطل پرستوں سے سخت تنفر ظاہر کیا، اور خدائے برحق پر ایمان لائے، اسی بنا پر انھوں نے خود یا بعد کو ان کے پیروؤں نے اپنا لقب حنیف اختیار کیا، یعنی ستارہ پرستی وغیرہ سے مڑکر خدا پرستی کی طرف آنے والا، (ص ۲۱۱)

اس کے بعد شرک کا ذکر ہے، جو عرب کا سب سے وسیع الاثر مذہب تھا، اس کے معنی یہ بتائے گئے ہیں کہ ایک خدا کو مان کر اس کی اعانت و امداد کے لیے اس کے اعوان و انصار کا یقین رکھا جائے، مشرکین کے عقائد کی تفصیل قرآن کی آیتوں کے ذریعہ سے لکھی گئی ہے، ان کو اس بات کی چڑھ تھی کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کا نام کیوں لیتے ہیں، (ص ۲۱۸) فرشتوں کے متعلق ان کا اعتقاد یہ تھا کہ یہ اللہ کی بیٹیاں ہیں، اسی لیے ان کو عورت فرض کرتے تھے، (ص ۲۱۹) وہ بھوت پریت اور جنات کے بھی قائل تھے، ان کو خدا یا خدا کے ہم پایہ سمجھتے تھے، ان کی دہائی مانگتے تھے، اور ان کے غضب سے ڈرتے تھے، (ص ۲۲۰) ان کو حشر و نشر کے اعتقاد اور رسالت و نبوت سے سخت انکار تھا، ان کو تعجب ہوتا تھا کہ کیا مر کر بھی کوئی جی سکتا ہے، اور آدمی ہو کر بھی کوئی خدا کا فرستادہ بن سکتا ہے، (ص ۲۲۱) قرآن مجید سے ان اعتقادات کی تردید و ابطال میں آیتیں جمع کر دی گئی ہیں۔

عربوں کے بت | قرآن مجید میں جن بتوں کا ذکر آیا ہے ان کے نام بھی ان مباحث میں جمع کر دیے گئے ہیں، اور وہ یہ ہیں: لات، عزیٰ، مناۃ، ہبل، ود، سواع، یغوث، یعوق اور نسر، اور ان کے پرستار قبائل کے نام بھی لکھ دیے گئے ہیں، لات اور عزیٰ قریش کے دیوتا تھے، مناۃ کو اوس و خزرج سے خصوصیت تھی، ود قبیلۂ کلب کا بت تھا، سواع کی پرستش ہذیل کرتے تھے، یغوث مراد اور بنی غطیف کے قبیلوں کا دیوتا تھا، یعوق ہمدان میں پوجا جاتا تھا، نسر حمیر کے خاندان ذی الکلاع کا معبود تھا، ہبل کی پرستش شام میں ہوتی تھی (ص ۲۲۵)

پھر ان تمام بتوں سے ناموں کی لغوی اور معنوی تحقیق بہت ہی عالمانہ انداز میں کی گئی ہے، کتاب کا خاتمہ یہ لکھ کر کیا گیا ہے کہ ہم سمجھتے ہیں کہ عرب میں دو متضاد جماعتیں تھیں جن میں ایک اپنے معبود کو اللہ اور دوسری الرحمٰن کہتی تھی، اسلام ان دونوں کو یکجا کرتا ہے کہ تم جس کو اللہ کہتے ہو اور وہ جس کو رحمٰن کہتے ہیں درحقیقت ایک ہی ذات کی دو تعبیریں ہیں، اور یہ باہمی اختلاف محض نزاع لفظی ہے، اس بنا پر بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کے معنی ہمارے نزدیک یہ ہیں: ہم اپنا کام اس خدا کے نام سے شروع کرتے ہیں جس کا دوسرا نام رحمٰن ہے، اور جو رحمت والا ہے، (ص ۲۳۴)

ارض القرآن کی اہمیت اور افادیت پر ایک نظر | اس کتاب کی اہمیت اور افادیت اور پھر اس کی نوعیت پر تبصرہ کرنا راقم جیسے کم سواد کے بس کی بات نہیں پھر بھی یہ کہنے میں تامل نہیں کہ یہ حضرت سید صاحبؒ کی پہلی تصنیف ہے، لیکن اس کے عرض ہنر میں اب تک ان کا کوئی حریف نہ ہو سکا، جس محنت اور ریاضت سے یہ لکھی گئی ہے اردو زبان کیا، بلکہ دنیا کی دوسری زبانوں میں بھی ایسی کتاب کم لکھی گئی ہوگی، ان کی ابتدائی علمی زندگی میں ان کے استاد محترم علامہ شبلی نعمانیؒ نے ان کو نصیحت کی تھی کہ معلومات اور مواد کو ہر گوشہ اور ہر گوشہ سے اس محنت سے ڈھونڈ کر کہ پھر کوئی کونہ خالی نہ رہ جائے، اس عنوان پر اگر پہلے کسی نے کچھ لکھا ہو تو ہم سے تمہارا مضمون بالکل الگ رہے، یا اس سے بڑھ جائے، مستند حوالہ کے بغیر کوئی واقعہ نقل نہ کیا جائے معنی کے ساتھ عبارت کی چستی، طرز ادا کی شگفتگی اور تشبیہ و استعارہ کی ندرت ہاتھ سے نہ جانے پائے،

پامال معلومات، مبتذل محاورات اور عامیانہ الفاظ سے پوری طرح پرہیز کیا جائے، (معارف جولائی [illegible])

اس معیار پر تاریخ ارض القرآن بعض حیثیتوں سے پوری اترتی ہے، البتہ یہ دیکھنا ہے کہ اس میں عبارت کی چستی، طرز ادا کی شگفتگی اور تشبیہ و استعارات کی ندرت ہے کہ نہیں؟ مولانا شبلیؒ نے جو باتیں لکھی تھیں سید صاحبؒ نے ابن خلکان کے مطالعہ سے بھی حاصل کی تھیں، جس سے وہ آخر زندگی تک اپنے استاد ہی کی طرح متاثر رہے، رسالہ الندوہ کے دو شماروں (اکتوبر، نومبر ۱۹۰۵ء) میں ابن خلکان اور تاریخ ابن خلکان پر ایک مضمون میں اس کی خصوصیات بتائیں کہ وہ جو کچھ لکھتا ہے بڑی محنت سے لکھتا ہے، کسی کتاب سے کوئی عبارت نقل کرتا ہے تو ایک لفظ کی کمی بیشی کو گناہ سمجھتا ہے، وہ اپنے ماخذوں کا بھی ذکر کرتا جاتا ہے وہ روایت پر بالکل اعتماد نہیں کرتا، بلکہ درایت سے بھی کام لیتا ہے، جو باتیں خلاف عقل ہوتی ہیں ان کو بالکل نہیں چھوتا، اس کی بڑی خوبی یہ ہے کہ اس کی عبارت میں لطافت اور بیان میں حسن ہوتا ہے، ابن خلکان کی یہ خصوصیات سید صاحبؒ کے ذہن پر ارض القرآن قلمبند کرتے وقت چھائی رہیں، لیکن اس کا مطالعہ بھی ضروری ہے کہ ابن خلکان کے بیان کے مطابق اس کی عبارت میں لطافت اور بیان میں حسن ہے کہ نہیں، لیکن پہلے ارض القرآن کی نوعیت کا مطالعہ ضروری ہے۔

اس کو پڑھتے وقت یہ سوال اٹھتا ہے کہ اس میں آخر سید صاحبؒ کا جلوہ کس حیثیت سے زیادہ نمایاں نظر آتا ہے، کیا وہ علم القرآن یا علم التاریخ یا علم الجغرافیہ یا علم آثار قدیمہ و کتابت کے ماہر دکھائی دیتے ہیں، بنیادی طور پر تو وہ علم القرآن کے ماہر ہے، ان کو قرآن مجید سے عشق تھا، اسی عشق کی بنیاد پر انھوں نے ارض القرآن کی قوموں کو اپنا محبوب موضوع بنایا، اور اپنی تحقیقات کا پورا جوہر دکھا دیا، اسی کے ساتھ اس کتاب کے لکھنے میں ان کا اہم ترین مقصد یہ بھی تھا کہ قدیم و جدید معلومات کی تطبیق کے ساتھ ارض القرآن کے حالات کی اس طرح تحقیق ہو کہ قرآن مجید کی صداقت اور معترضین کی لغزش علی الاعلان آشکارا ہو جائے (ج ۱، ص ۲) اس مقصد کو پورا کرنے میں وہ شروع سے آخر تک بہت ہی مستند اور بلند پایہ مورخ کی حیثیت سے نمایاں ہوئے ہیں، انھوں نے

اس میں قرآن مجید کی آیتیں بکثرت نقل کی ہیں، ان کا مطالعہ کرتے وقت یہ حیرت ہوتی ہے کہ لوگ قرآن مجید کو پند و موعظت اور عبرت و بصیرت کا محض صحیفہ سمجھتے ہیں، لیکن سید صاحبؒ نے اس کو تاریخ و سیر کا ایک بہت بڑا اہم ماخذ بنا دیا ہے، قرآن مجید کے ساتھ زبور، تورات، انجیل اور پھر یونانی اور یورپی اور عرب مورخوں کی تصانیف، جغرافیہ کی کتابوں اور آثار قدیمہ کے اکتشافات اور کتبات کو جس طرح استعمال کیا ہے، اور ان سے جو تاریخی نتائج استنباط کیے ہیں، وہ تلاش، تجسس اور تفحص کے اعلیٰ نمونے ہیں، پھر اس کے ساتھ اس میں ان کے مبصرانہ اور ناقدانہ نظر و فکر کے بھی کرشمے دکھائی دیتے ہیں، کبھی وہ قرآن کے مفسروں سے اختلاف کرتے ہیں کبھی زبور، تورات اور انجیل کے واقعات پر تنقیدی نظر ڈالتے ہیں، کبھی یونانی اور رومی مورخوں کے بیانات کو تسلیم کرنے میں ہچکچاتے ہیں، کبھی عرب جغرافیہ دانوں کے بیان کو زیر بحث لاتے ہیں، کبھی مختلف عرب مورخوں کے بیانات کا موازنہ کر کے اپنی کوئی خاص رائے قائم کرتے ہیں، اس جگر کاوی کے بعد انھوں نے اس سرزمین کی قوموں کی اور قبیلوں کی تاریخ مرتب کر دی ہے، جہاں قرآن مجید کا نزول ہوا، ان کی یہ تصنیف زیادہ تر ارض القرآن کے نام سے مشہور ہوئی، حالانکہ اس کا نام تاریخ ارض القرآن رکھا گیا ہے، ارض القرآن سے بظاہر یہ دھوکہ ہوتا ہے کہ شاید علوم قرآن جیسی چیزوں سے متعلق اس میں کچھ لکھا گیا ہو، لیکن یہ دراصل تاریخ ارض القرآن ہے، جو خالص مورخانہ نقطۂ نظر سے لکھی گئی، قرآن کی سرزمین کی جن قدیم قوموں اور قبیلوں کو بھلا دیا گیا تھا ان کی یاد اس کتاب میں پھر سے دلا دی گئی ہے، ان کی تاریخ لکھنے میں ہر قبیلہ کے نام کی تصریح کی گئی ہے، اس کا زمانہ متعین کیا گیا ہے، اس کی سیاسی تاریخ لکھی گئی ہے، اس کا دائرۂ حکومت بتایا گیا ہے، اس کے فرماں رواؤں کے نام اور تعداد کی بھی حتی الوسع وضاحت کی گئی ہے، ان فرماں رواؤں کے نام تلاش کرنے میں جو دقتیں ہوئی ہیں ان کی بھی تفصیل بیان کی گئی ہے، پھر ان کے مذاہب اور عقائد کی تفصیل ہے، اس میں ان کے بتوں اور معبودوں کی جو تصریح کی گئی ہے اس کو پڑھ کر حیرت ہوتی ہے کہ ان کی تلاش میں کیسی عرق ریزی کی گئی ہے، پھر ان کی مختلف زبانوں کی تفصیلات لکھ کر سید صاحبؒ نے اپنے کو بہت بڑا لسان دان بھی ثابت کر دکھایا ہے، ان قبیلوں کے زوال

اور تباہ ہوتے کے کیا اسباب ہوئے، اس پر کیا روشنی ڈالی گئی ہے، اس حیثیت سے تو سید صاحبؒ اقوام ملل کے ادیان اور ان کی زبانوں کے بہت بڑے مورخ نظر آتے ہیں، ان کی نبانی بار بار سنا کہ مولانا شبلیؒ تاریخ وعرب کو کوئی فن نہیں سمجھتے تھے، بلکہ اپنے علمی دسترخوان کے سنگین کھانوں کے ساتھ ان کو ذائقہ تبدیل کرنے کے لیے چٹنی سمجھتے تھے، مگر یہ عجیب بات ہے کہ ان دونوں بزرگوں نے جب کوئی تاریخی چیز لکھی تو یہ چٹنی شاہجہانی اور نورتن چٹنی سے زیادہ لذیذ بن گئی، یہ دونوں بزرگ اپنے علم وفضل کی بصیرت سے کوئی غیر تاریخی چیز بھی لکھتے تو اس میں بھی تاریخی رنگ پیدا کر دیتے، تاریخی پس منظر پیش کرنا، تاریخی مسائل کی گتھیوں کو سلجھانا، تاریخی نتائج کا استنباط کرنا، ان کی علمی فطرت ثانیہ بن گئی تھی، اسی لیے آگے چل کر اپنی تصنیفی زندگی کی رنگارنگی میں سید صاحب ایک جید مورخ بھی تسلیم کیے گئے، لیکن ان کو اپنی تاریخ نویسی میں بادشاہوں کی تاریخوں سے زیادہ دلچسپی نہیں رہی، وہ صرف تاریخ ہی لکھتے رہتے تو مسلمان بادشاہوں کی تاریخ کے بجائے اسلام اور مسلمانوں کی تاریخ لکھتے، تاریخ نویسی کے سلسلہ میں ان کے موضوعات کی نوعیت اور مورخوں سے الگ ہوتی، اور ہوئی، ان کے قلمبند کیے ہوئے تاریخی مضامین کے کچھ عنوانات یہ ہیں: مثلاً مسلمان حکمرانوں کے عہد میں ہندوؤں کی علمی ترقی کی تاریخ، ہندوستان میں اشاعت اسلام کی تاریخ، تاج محل اور لال قلعہ کی تعمیر کی تاریخ، اور پھر عرب و ہند کے تعلقات اور عربوں کی جہازرانی کی تاریخ لکھ کر تو اپنی تاریخ نویسی کے معیار کو سدرۃ المنتہیٰ بنادیا، یہ موضوعات دلچسپ ہیں، ان پر لکھنا بھی دلچسپی سے خالی نہیں، لیکن عرب کی بھلائی قوموں پر تحقیق کرنا تو بہت صبر آزما تھا، سید صاحبؒ اپنی صبر آزمائی میں پورے اترتے نظر آتے ہیں، ان کو پڑھنا تو اپنے صبر و استقلال کو آزمائش میں ڈالنا ہے، پھر ان پر لکھنا تو صبر اور استقلال کا بے مثال نمونہ پیش کرنا ہے، اس حقیر راقم نے گذشتہ صفحات میں جو تاریخ ارض القرآن کی دونوں جلدوں کی خاص خاص باتیں خلاصہ کے طور پر پیش کی ہیں، ان کو سمیٹ کر قلمبند کرنے میں راقم کو جتنی مشکلیں پیش آتی گئیں، اس سے اس کتاب کے لکھنے میں سید صاحب کی جانکاہ محنت، جانگسل ریاضت اور قلم کی طاقت کا اندازہ ہوتا گیا۔

ان خلاصوں سے اس کا اندازہ ہوا ہوگا کہ کتاب شروع سے آخر تک تحقیق اور رد تحقیق کے انبار سے لدی ہوئی ہے، جہاں ان کی اپنی تحقیقات ہیں وہاں دوسروں کی تحقیقات سے ان کو جو اختلاف ہوا ہے، اس کو وہ رد بھی کرتے جاتے ہیں، اس میں امم سامیہ عاد، ثمود، طسم وجدیس، شاہان معین، بنی لحیان، بنو قحطان، سبا کی شاخیں، ملوک سبا، جنت سبا، تبابعہ کے نام اور زمانے، بنو قطورا، بنو سارہ، بنو ہاجرہ، بنو ادوم، بنو اسمٰعیل، ہشام، ادبائیل، اشماع، بطور، بنات، اصحاب الحجر، آل غسان، انباط، آرامی زبان کی حقیقت، ام بائدہ کی آرامی زبان، قحطانی زبانوں، ثمود کی زبان، لسان عرب جیسے وغیرہ عنوانات پڑھ کر گھبراہٹ ہوتی ہے، لیکن سید صاحبؒ نے ان کو اپنے لیے دلچسپ موضوعات بنا کر اپنا تحقیق و تدقیق کی لالہ کاری دکھائی ہے، اس کتاب کے ہر صفحہ پر کچھ نہ کچھ نئی بات پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے، جگہ ہو، کوئی تاریخی واقعہ ہو، کسی زبان کا کوئی لفظ ہو، کسی شخص کا نام ہو، یا کوئی متنازعہ فیہ واقعہ ہو ان سب کی تحقیق اور وضاحت کیے بغیر نہیں رکے ہیں، اور ان کو واضح کر کے آگے بڑھے ہیں، ایسی بہت سی مثالیں ہیں، لیکن نمونہ کے طور پر ہم ایک ایک مثال یہاں پر ہدیۂ ناظرین کرتے ہیں،

عرب کے نام کی تحقیق کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ علمائے انساب کہتے ہیں کہ اس ملک کا پہلا باشندہ یعرب بن قحطان تھا، جو یمنی عربوں کا پدر اعلیٰ ہے، اس لیے اس ملک کے باشندوں اور نیز اس ملک کو عرب کہنے لگے، لیکن یہ بالکل خلاف قیاس اور معلومات تاریخی کے مخالف ہے، نہ یعرب اس ملک کا باشندہ تھا اور نہ لفظ عرب کسی قاعدۂ لسانی کے موافق یعرب کی طرف منسوب ہو سکتا ہے، اور سب سے عجیب بات یہ ہے کہ یعرب کا مسکن یمن تھا، اس لیے سب سے پہلے خود یمن یعنی جنوبی عرب کو عرب کہنا چاہیے، لیکن اس کے بالکل برخلاف عرب کا لفظ پہلے شمالی عرب کے لیے استعمال ہوا، اہل جغرافیہ کہتے ہیں اور بالکل صحیح کہتے ہیں کہ عرب کا پہلا نام عَرَبۃ اور عربۃ تھا جو تخفیفاً بعد کو عرب بولا جانے لگا، اس کے بعد ملک کے نام سے خود قوم کا نام بھی قرار پا گیا، چنانچہ شعرائے عرب کے اشعار سے بھی جو عرب کی تنہا ڈکشنری ہے اس کی تصدیق ہوتی ہے،

اس کے بعد عربی شعراء میں اسد بن جاہلی ابن مقبل قوری، ابوسفیان اور ابوطالب بن عبدالمطلب کے اشعار نقل کیے گئے ہیں، اس کے بعد خود یہ سوال پوچھتے ہیں کہ اس ملک کا نام عرب کیوں قرار پایا ہے؟ اس کا جواب خود دیتے ہیں کہ اصل یہ ہے کہ تمام سامی زبانوں میں عرب صحرا اور بادیہ کا مفہوم رکھتا ہے، عبرانی میں عربا بیابان اور میدان کو کہتے ہیں، اور خود عربی زبان میں اس مفہوم قدیم کے بقایا موجود ہیں، عرابہ کے معنی بدویت کے ہیں؛ اور اعراب اہل بادیہ اور صحرا نشینوں کے لیے اب تک مستعمل ہے، چونکہ عرب کا ملک زیادہ تر ایک بیابان بے آب و گیاہ ہے، اور خصوصاً وہ حصہ جو حجاز سے بادیۂ عرب و شام اور سینا تک پھیلا ہوا ہے، اس لیے اس کا نام عربا قرار پایا، اور پھر رفتہ رفتہ وہاں کے باشندوں کو عرب کہنے لگے، (ج ۱، ص ۵۸ - ۵۷)

یہ ایک تاریخی واقعہ ہے کہ حضرت سلیمانؑ نے ملکۂ سبا کا تخت اپنے دربار میں اٹھوا منگوایا تھا، اس پر مختلف حقیقتوں سے بحث کر کے سید صاحبؒ نے یہ ثابت کیا ہے کہ حضرت سلیمانؑ نے اس کو اٹھا نہیں منگوایا تھا، بلکہ ملکۂ سبا جب حضرت سلیمانؑ کے پاس آئی تو اپنے ساتھ تحفہ کے طور پر ایک تخت لائی، جو سبا کی دستکاری کا اعلیٰ نمونہ تھا، پھر قرآن مجید میں ہے کہ ایک درباری نے جو کتاب سے واقف تھا عرض کی کہ میں نگاہ پلٹنے سے پہلے ملکہ کا تخت اٹھا لاتا ہوں، سید صاحبؒ کے خیال میں نگاہ پلٹنے سے پہلے سے مراد سرعت اور جلدی ہے، اس سے نگاہ پلٹنے کے ساتھ کام ہو جانا مقصود نہیں، پھر اس پر بحث کی ہے کہ کتاب سے کیا مراد ہے، عام مفسرین تورات یا اسم اعظم مراد لیتے ہیں، لیکن سید صاحبؒ رقمطراز ہیں کہ تورات کے علم سے تخت کا جلد اور بہ سرعت لے آنا کیا مناسبت رکھتا ہے، اسم اعظم یہودی تخیل میں جادو منتر کی کوئی سریع التاثیر چیز ہے، جو اسلام میں نہیں، سید صاحبؒ لکھتے ہیں کہ ایک مدعی کلام جدید کا خیال ہے کہ کتاب سے مراد رجسٹر اور دفتر ہے، سید صاحبؒ اس کو مضحکہ خیز یہ لکھ کر قرار دیتے ہیں کہ اس عہد میں بیسویں صدی کی طرح باقاعدہ دفتر اور رجسٹر نہ تھا، سید صاحبؒ کی رائے ہے کہ کتاب سے خط مراد ہے، کیونکہ لفظ کتاب یعنی خط عربی میں عام طور سے استعمال ہے، بلکہ فصحاء اس کے سوا کوئی دوسرا لفظ استعمال نہیں کرتے، سید صاحبؒ لکھتے ہیں کہ میری

تاویل یہ ہے کہ درباریوں میں ملکۂ سبا کے مضمون خط کا جس کو علم تھا کہ وہ بطور تحفہ اپنے ساتھ ایک تخت لائی ہے، اس نے کہا میں ابھی لاتا ہوں، اس سلسلہ میں کتاب یمنی خط کی تائید میں قرآن کی آیتیں بھی نقل کی ہیں، (ص ۶۶ ـ ۲۶۵) اس ضمن میں یہ بحث بھی اٹھائی گئی ہے کہ قرآن مجید میں ہے کہ ملکۂ سبا حضرت سلیمانؑ کے ہاتھ پر اسلام لائی، اور پیغمبرانہ جاہ و جلال دیکھ کر بے اختیار پکار اٹھی اسلمتُ مع سلیمان سید صاحبؒ لکھتے ہیں کہ بظاہر نبیم یعنی توراۃ سے اس کی تائید نہیں ہوتی لیکن اسی سے ملکہ کے یہ فقرے بھی نقل کرتے ہیں کہ خداوند تیرا خدا مبارک ہو جو تجھ سے راضی ہے اور جس نے تجھ کو اسرائیل کے تخت پر بٹھایا، کیونکہ خداوند اسرائیل کو ابد تک پیار کرتا ہے، اور تجھ کو بادشاہ بنایا کہ عدل و انصاف کرے، ان فقروں کو نقل کرکے سید صاحبؒ پوچھتے ہیں کہ کیا یہ اس کے ایمان قلب کو نہیں ظاہر کرتے (ج ۱، ص ۶۷ ـ ۲۶۶)

حمیر کے جیسے لفظ کی پوری تحقیق اس طرح کی گئی ہے کہ علمائے انساب کہتے ہیں کہ حمیر سبا کے جانشین فرزند کا نام تھا، اس لیے سبا کی تمام تاریخ میں وہ بجائے سبا کے ہر جگہ حمیر بولتے ہیں، لیکن اب تک جو کتبات ملے ہیں اور جن میں سے اکثر کی بعینہ عبارتیں میری نظر سے گذری ہیں ان میں لفظ حمیر کہیں نظر نہیں آیا، خود حمیر کے سلاطین اپنے آپ کو ملک ذو ریدان لکھتے ہیں، ہاں اہل حبش کے کتبات میں حمیر اور ارض حمیر البتہ کہیں کہیں ملتا ہے، حمیر عربی اور حبشی میں حمر سے مشتق ہوگا جس کے معنی سرخ کے ہیں، اور محاورہ میں گورے رنگ کو احمر کہتے ہیں، اس کا مقابل اسود ہے، عرب سیاہ و سپید کی جگہ الاسود والاحمر بولتے ہیں، چونکہ اہل حبش کو اسود اور اسودان کہتے ہیں، اس کے مقابل میں حبش عربوں کو حمیر یعنی گورے رنگ کے آدمی کہتے ہوں گے،

(ج ۱، ص ۲۷۴)

لقمان کون تھا؟ اس کی تصریح جس طرح کی گئی ہے وہ بھی لائق مطالعہ ہے، سید صاحبؒ لکھتے ہیں کہ روایات عرب میں ایک شخص لقمان مشہور ہے، جس کو لوگ اب عموماً حکیم لقمان کہتے ہیں، اس کی طرف حکایات و تمثیلات حکیمانہ کثرت سے منسوب ہیں، قرآن میں بھی لقمان کا تذکرہ اور اس کے بعض نصائح کا

حوالہ ہے، ہم ان دونوں کو ایک ہی سمجھتے ہیں، سید صاحبؒ نے اپنے اس بیان کی تصدیق مشہور مورخ ابن اسحٰق کے بیان سے کی ہے، جس کی سیرت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات میں قدیم ترین تصنیف ہے (ج۱، ص ۱۶۸) پھر وہ یہ بھی لکھتے ہیں کہ عام لوگ غلطی سے لقمان عاد اور لقمان حکیم کو ایک کہتے ہیں، عرب کے افسانہ گو کہتے ہیں کہ لقمان حکیم افریقی الاصل تھا، اور ایک غلام کی حیثیت سے عرب میں آیا تھا، بعض علمائے یورپ حکیم لقمان اور ایساپ نامی ایک یونانی حکیم کو ایک قرار دیتے ہیں، اس اتحاد کی جو دلیل پیش کرتے ہیں وہ یہ ہے کہ ان دونوں کی طرف جو حکایات و تمثیلات منسوب ہیں وہ تقریباً ایک ہی قسم کے ہیں، لیکن یہ ایک تعجب انگیز استدلال ہے، کسی دو تصنیف کے مطالب کا اتحاد ان کے مصنفین کے اتحاد شخصیت کو اگر مستلزم ہے تو افسوس ہے کہ اس جرم میں سینکڑوں تاریخی اشخاص کے مٹ جانے کا افسوس ہوگا، (ج۱، ص ۱۶۹)

سید صاحبؒ نے اپنی اس کتاب میں عرب کے مختلف قبیلوں کے علٰحدہ علٰحدہ طبقات قائم کرکے ان کے زمانے اور دائرۂ حکومت کی تعیین کرکے بہت سے خلط ملط واقعات کی تصریح کر دی ہے، ان میں سے بعض کے زمانے کی تعیین نہیں ہو سکی تھی، لیکن سید صاحبؒ نے تقریباً سب کے زمانہ کی تعیین کرکے بہت سے متنازعہ فیہ واقعات کو حل کر دیا ہے، وہ کس طرح اس کی تصریح کرتے ہیں، اس کی مثال یہ ہے:

"آج کل عموماً تسلیم کیا جاتا ہے کہ بنو سام کی حقیقی ترقی کا عہد ۲۲۰۰ ق م - ۲۰۰۰ ق م ہے، سامی اقوام کے حملۂ مصر و بابل کی بھی یہی تاریخ ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ عاد ارم کا وجود ۲۲۰۰ ق م سے شروع ہوتا ہے، انتہائے مدت تک کی تعیین کی یہ صورت ہے کہ پندرہ سو ق م میں یمن میں ایک دوسری قوت کا ظہور معلوم ہوتا ہے، اور اس سے کچھ ہی پہلے حضرت موسیٰؑ کا زمانہ ہے، حضرت موسیٰؑ کے عہد سے عاد کی تباہی عام ہو چکی تھی، قرآن مجید نے نقل قصص میں ہمیشہ عاد کا ذکر حضرت موسیٰؑ و فرعون سے پہلے کیا ہے ..... ان وجوہ سے عاد کی عظمت اور ترقی کا زمانہ ۲۲۰۰ ق م سے ۱۷۰۰ ق م تک ہو سکتا ہے، حالانکہ عاد کا وجود اس کے بعد بھی ابتدائے عہد مسیح تک باقی رہا ہے، اور یونانیوں نے رعادیہ ٹا (عاد ارم) اور رعادائیت (عاد) لکھا ہے"

ان کا ذکر حضرموت اور یمن کے باشندوں میں کیا ہے، تمیز کے لیے عہد اول کو عاد اولیٰ اور عہد ثانی کو عاد ثانیہ کہتے ہیں، (ج ۱، ص ۱۳۰ - ۱۲۹)

سید صاحبؒ نے قدیم قبیلوں کی تاریخ اور ان کے زمانے کی تعیین کرنے کے لیے چند اصولوں کی طرف بھی توجہ دلائی ہے، جن کا مطالعہ آج بھی مفید ہے، وہ لکھتے ہیں کہ جدید طرز تاریخ کی رو سے نہایت ضروری ہے کہ قبائل کے زمانہ کی بھی تعیین کی جائے، لیکن یہ نہایت مشکل کام ہے، عموماً کسی مجہول العہد قوم کی تعیین زمانہ کی یہ صورت اختیار کی جاتی ہے کہ اس کے معاصر معلوم العہد قوم یا شخص کے زمانہ سے اس کا قیاس کیا جاتا ہے، دوسرا اصول یہ ہے کہ عموماً چار پشتوں کی ایک صدی فرض کر کے پشتوں کے شمار سے زمانہ کی تعیین کر لی جاتی ہے، لیکن یہ ذہن نشین کر لینا چاہیے کہ کسی قوم کے وجود کی تاریخ اور اس کی شہرت اور ناموری کی تاریخ دونوں دو چیزیں ہیں، یہ ضروری نہیں کہ اگر ایک قوم کی شہرت کا ایک زمانہ ہو تو وہی اس کے آغاز وجود کا بھی ہو، فلسفۂ تکوین اقوام کی وجہ سے نہایت ضروری ہے کہ قوم کے آغاز وجود کا زمانہ اس کے زمانۂ ارتقاء و شہرت سے سینکڑوں ہزاروں برس پیشتر ہو، کہ ایک فرد کنبہ بن سکے، اور ایک کنبہ قوم، ایک اور چیز جس سے کسی قدیم قوم کی جائے سکونت اور قومیت کی نوعیت کی تحقیق میں بڑی مدد مل سکتی ہے وہ تاریخی اشخاص، ان کے مقامات سکونت، ان کی زبان اور دیوتاؤں کے ناموں کے باہمی تطابق، اشخاص و مقامات کے ناموں کا باہمی تطابق ان اشخاص کے مقامات سکونت کا پتہ دیتا ہے، اور دو قوموں کی زبان اور ان کے باہمی اسماء کا تطابق ان کے اتحاد قومیت کی طرف اشارہ کرتا ہے' (ج ۱، ص ۵۲ - ۵۱) مگر ان اصولوں کے اجراء میں سید صاحبؒ کو کچھ دقتوں کا بھی احساس تھا، ایک تو یہ کہ زمانہ کے امتداد اور قوموں کے انقلابات اور زبانوں کے تغیر سے نام کچھ سے کچھ ہو گئے ہیں، اس لیے مقامات اور باشندوں کے ناموں میں تطابق کے بجائے صرف تشابہ پر قناعت کرنی پڑتی ہے، دوسری دقت جو پہلے سے سہل تر ہے' یہ ہے کہ سامی زبانوں میں باہم اور نیز یونانی زبانوں میں جس میں توراۃ کا قدیم ترجمہ ہے اور اب زیادہ تر وہی پھیلا ہوا ہے، جب ایک نام ایک زبان سے منتقل ہوتا ہے تو بعض حروف کا مبادلہ خصوصیت زبان کی وجہ سے

ہوجاتا ہے، مثلاً ابجر اور ہاجر، یاران اور باران اور فاران، اسمٰعیل اور اسمٰعیل، ثہمور اور ثمود، میثا اور عیسیٰ اور عیصاؤ، سبا اور شبا، حصار موت اور حضار موت، اضحاک اور اسحاق، حدر موت اور حضر موت، ابی رہام اور ابراہیم، قیدار اور کیدار وغیرہ (ج ۱، ص ۵۴ - ۵۱)

سید صاحبؒ نے اصول اتحاد اسماء السنہ کو زیادہ کارآمد قرار دیا ہے، ان کا خیال ہے کہ اگر دو قوموں کے ناموں میں باہمی تشابہ نظر آئے گا تو بہ آسانی سے کہا جاسکتا ہے کہ دونوں قومیں حقیقت میں متحد الاصل ہیں، اسی طرح مذہبی اعتقادات کا تشابہ اور الفاظ زبان کی مماثلت اور مشاکلت بھی باہمی اقوام کی ایک مبہم دلیل ہے، (ج ۱، ص ۵۴) ان ہی باتوں کو سامنے رکھ کر سید صاحبؒ نے عرب کے قدیم قبیلوں کے بعض متنازعہ فیہ کوائف کو حل کرنے کی کوشش کی ہے۔

مستشرقین سے ذکر | اس کتاب میں مستشرقین سے بھی جابجا ٹکر لی گئی ہے، سید صاحبؒ مستشرقین کے کارناموں کے معترف ہیں، جیسا کہ رسالہ الندوہ میں ان کی بعض تحریروں سے ظاہر ہے، (جولائی، اگست، اور دسمبر ۱۹۱۰ء) مگر ان کی تحقیقی تلبیسات اور تدلیسات سے بھی اچھی طرح واقف تھے، جن کو وہ کسی حال میں نظر انداز کر دینا پسند نہیں کرتے تھے، اس مضمون کے شروع میں بھی بیان کیا گیا ہے کہ سید صاحبؒ نے اس کا اعتراف کیا ہے کہ بعض مستشرقین نے تاریخ عرب قبل اسلام پر محققانہ کتابیں لکھیں، ان کے کھنڈروں کا مشاہدہ کیا، ان کے کتبات کو حل کیا، مگر ان سے عجیب وغریب نتائج استنباط کر کے قرآن کے فوائد کو پامال کیا، جن قوموں کا ذکر قرآن مجید میں ہے ان کو غیر تاریخی قرار دیا، اسی سے متاثر ہو کر سید صاحبؒ نے تاریخ ارض القرآن لکھی، ان مستشرقین میں سید صاحبؒ کے سامنے خاص طور پر ریونڈ فارسٹر، نولدکی، مارگولیتھ اور اسپرنگر ہیں۔

ریونڈ فارسٹر سے تو وہ بہت بدظن ہیں، اس کے متعلق بہت سخت الفاظ استعمال کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"اٹھارہویں صدی کے وسط میں ریونڈ فارسٹر نے عرب کا تاریخی جغرافیہ لکھا، جس میں انھوں نے اپنی جہالت کے عجیب وغریب نمونے پیش کیے، ان کو پڑھ کر کبھی ہنسی اور کبھی رونا آتا ہے، لیکن

کیا کیجیے کہ ہماری غفلت سے وہ قرآن کی صداقت کا تاریخی صحیفہ ہے" (ج ۱، ص ۵)
آگے چل کر تاریخ قدیم کے بعض اصول کے سلسلہ میں بھی لکھتے ہیں:

"مسٹر فارسٹر نے اٹھارہویں صدی کے اواسط میں عرب کا جو تاریخی جغرافیہ لکھا ہے، اس میں اس اصول سے انھوں نے نہایت کاوآمد نتائج پیدا کیے ہیں، گو بعض مقامات پر ان کے استنباطات وہم و ظن سے آگے کا علم نہیں بخشتے، اور کہیں علم کے بجائے وہ جہالت کا ثبوت پیش کرتے ہیں" (ج ۱، ص ۵۲)

اس سلسلہ میں سید صاحبؒ نے یہ بحث کی ہے کہ زمانہ کے امتداد، قوموں کے انقلابات اور زبانوں کے تغیرات سے نام کچھ سے کچھ ہو گئے، جب ایک نام ایک زبان سے دوسری زبان میں منتقل ہوتا ہے تو بعض حروف کا مبادلہ خصوصیت زبان کی وجہ سے ہو جاتا ہے، سید صاحبؒ کے خیال میں ریونڈ فارسٹر کو اپنے نتائج کے استنباط میں اسی زبانوں کا احساس نہیں رہا، سید صاحب نے اپنی کتاب میں ایسے بہت سے الفاظ کی مثالیں دی ہیں جو مبادلہ میں کچھ سے کچھ ہو گئے ہیں، (ج ۱، ص ۵۳)

ریونڈ فارسٹر بطلیموس کا بہت حامی ہے جس نے اپنے جغرافیہ میں عرب کے ۵۴ قبائل ۱۶۴ مقامات، ۵۰ کوہستانی سلسلے اور چار دریاؤں کا ذکر کیا ہے، لیکن سید صاحبؒ بطلیموس کے اس جغرافیہ کو مستند قرار نہیں دیتے، اور عرب مورخین کے حوالہ سے لکھتے ہیں کہ اکثر ان اقطاع عرب میں آبادی کا کبھی کوئی باقاعدہ و مقرر اصول نہیں رہا ہے جن کا بطلیموس نے نشان دیا ہے، اگر بطلیموس کے ناموں کی کوئی حقیقت ہے تو وہ کنویں ہوں گے یا نخلستان جہاں کاروان اور قافلے اپنے خیمے کھڑے کر دیتے ہوں گے، (ج ۱، ص ۷) اسی سلسلہ میں سید صاحبؒ رقمطراز ہیں کہ مسعودی نے بھی مروج الذہب میں لکھا ہے کہ جغرافیہ بطلیموس کے یونانی ناموں کا سمجھنا مشکل ہے، ساتویں صدی ہجری میں یاقوت نے معجم البلدان میں لکھا ہے کہ میں جغرافیہ بطلیموس کے اکثر بیان کردہ مقامات سے ناواقف ہوں، اور میری سمجھ میں نہیں آتا کیونکہ مرور زمانہ سے وہ مٹ گئے ہیں، اور اب مجہول ہیں، دسویں صدی ہجری میں حلبی کا بھی بیان ہے کہ بطلیموس کے اکثر بیان کردہ

مقامات مٹ گئے ہیں، اور ان کے نام بدل گئے ہیں، اس لیے اس سے فائدہ اٹھانے کا دروازہ بند ہو گیا ہے، (ج ۱، ص ۱۰۰ - ۱۰۱) لیکن ریونڈ فارسٹر نے اپنی ساری تحقیقات اور معلومات کا انحصار بطلیموس کے جغرافیہ پر کیا ہے، ظاہر ہے کہ اس کے بعد سید صاحبؒ کا یہ لکھنا کس قدر صحیح ہے کہ

"ریونڈ فارسٹر نے ۱۸۴۴ء میں عرب کے جغرافیۂ تاریخی کے دوسرے حصے میں ۱۰۹ سے ۲۰۷ تک ۱۵۰ صفحے ان ناموں کی تصدیق و تطبیق میں صرف کیے ہیں اور ہر جگہ اپنی عالمانہ جہالت کی عجیب و غریب مثال پیش کی ہے، غریب فارسٹر کو نہیں معلوم کہ یہ قبائل کب پیدا ہوئے، ان مقامات میں کب آباد ہوئے، اور عرب علماء نے ان کا صحیح نام کیا ہے، وہ بطلیموس قبائل کے ناموں کے ہیر پھیر سے موجودہ قبائل سے تطبیق دیتا ہے، اس کو نہیں معلوم کہ اب قدیم قبائل کا اکثر و بیشتر نشان بھی نہیں، وہ عہد اسلام میں فاتحانہ کہاں سے کہاں نکل کر آباد ہو گئے، موجودہ قبائل کے نام بالکل نئے ہیں، (ص ۱۰۷)

پھر ریونڈ فارسٹر کے تحقیقی کارناموں کا پردہ جس طرح فاش کیا گیا ہے، وہ بھی سید صاحبؒ ہی کی زبانی سنیے، پہلے وہ لکھتے ہیں:

"بیسیوں قبائل کا نشان قدیم یونانی جغرافیوں میں ملتا ہے، جس میں تین سب سے زیادہ پرزور اور طاقت ور بتائے گئے ہیں یعنی زومین، سیڈینی، اور بنو بری، یہ تینوں قبائل سواحل بحر احمر بہ خلیج عقبہ سے عسیر تک حجاز و تہامہ میں متوطن ظاہر کیے گئے ہیں، لیکن ان کے اصلی اور صحیح نام کیا ہیں؟ ان ناموں کا تو عرب میں کوئی قبیلہ نہیں،" (ج ۱، ص ۷۸)

اصول علم تمدن اور سیرت طیبہ ﷺ

از

ڈاکٹر نثار احمد فاروقی، صدر شعبۂ عربی دہلی یونیورسٹی، دہلی

تمدن بداوت کی ضد ہے، دیہات یا صحرا کی زندگی میں سادگی ہے، فطرت سے قرب ہے، مگر نظم معاشرت نہیں ہے، مدنیت کی زندگی میں ایک دوسرے پر انحصار زیادہ ہے، اس لیے پیچیدگی بھی زیادہ ہے، اسی لین دین سے معاشرہ کا وجود ہے، اور اسی لیے انسان کو "سماجی جانور" کہا گیا ہے، تمدن کی بنیاد تہذیب اخلاق اور انس و الفت ہے، اس میں آداب و عادات، علم و فن، آبادکاری، فن تعمیر، مشاغل تفریح، صنعت و حرفت، نظام زراعت کے علاوہ ملکی و مالی انتظام کے متعلق مباحث و مسائل بھی آجاتے ہیں

اس طرح مطالعۂ تمدن کے سیاسی، انتظامی، علمی، اخلاقی اور جمالیاتی متعدد پہلو ہیں، انسان نے جب سے مل جل کر رہنا سیکھا ہے سطح ارض پر مختلف تہذیبیں وجود میں آچکی ہیں، بابل و نینوا، مصر و سندھ کی تہذیبوں سے علم تمدن کا ہر طالب علم واقف ہے، لیکن آج ان تہذیبوں کو ان کے آثار و عمارات، صنعت و حرفت، رقص و موسیقی، رسوم و توہمات اور اساطیر و خرافات کے مظاہر میں تلاش کیا جاتا ہے، جو تہذیبیں فنا ہو گئیں ان کے تصور تمدن کے بارے میں ہماری معلومات بہت ناقص اور محدود ہیں، ان ہی تہذیبوں نے ایسے مذاہب کو جنم دیا جن میں غالب حصہ اوہام و اباطیل کا ہے، اور یہ تاریخ کی عجیب ستم ظریفی ہے کہ ان تہذیبوں کا جو قوی حصہ تھا وہ تو مٹ گیا لیکن اوہام و خرافات ہمیں وراثت میں مل گئے،

اسلام کے نام ہی سے ظاہر ہے کہ یا من و آشتی کا مذہب ہے، اللہ کی زمین کو فساد سے پاک کرنا اور اسے خیر و صلاح سے آراستہ کرنا اسلام کا مقصد وجود ہے، اس لیے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہر مسلمان کی ذمہ داری ہو جاتی ہے، اسلام ایسی اصلاح پر بھی نفریں کرتا ہے جو بظاہر خیر نظر آئے، لیکن اس کے عواقب میں شر و فساد پوشیدہ ہو، اسلام ان مذاہب میں سے نہیں ہے جو تہذیب کی کوکھ سے جنم لیتے ہیں، اگرچہ اسے سامی تہذیب سے جوڑا جاتا ہے، اسلام کا سرچشمہ وحی الٰہی ہے، اب یہ توفیق کی بات ہے کہ انسان لاکھوں بے سروپا اوہام کو یقین سے بھی زیادہ ماننے اور وحی کے وجود و قوت سے انکار کر دے۔

اسلام سارے بنی نوع انسان کے لیے ہے اور اسے کرۂ ارضی کے گوشہ گوشہ تک جانا تھا، اس لیے اسے عالمی تہذیب و تمدن کا دیباچہ بنا کر بھیجا گیا، ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ اسلام کے اصولی عقائد میں اصول تمدن کی کیا رعایتیں رکھی گئی ہیں، اور سیرت طیبہ و حدیث نبوی میں تمدن کا کیا تصور پیش کیا گیا ہے، اسلام کے ایوانِ رفیع میں بنیادی اور کھر بجے کی اینٹ عقیدۂ توحید ہے، یہ ساری بشریت پر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا احسان عظیم ہے کہ آپ نے توحید باری کا بالکل واضح، غیر مبہم اور روشن تصور پیش کیا، اور اسے اتنی بدیہی حقیقت بنا دیا کہ اب اس سے کامل انحراف کسی سے بھی بن نہیں پڑتا، بقول اکبر الٰہ آبادی ؎

تثلیث کے قائل نے بھی خالق کو کہا ایک تھی تین پہ سوئی مری ہیبت سے بجا ایک

قرآن کریم نے توحید ہی پر ہماری انفرادی و اجتماعی زندگی استوار کی ہے، اس سے جڑا ہوا عقیدہ رسالت پر ایمان لانا ہے، اور یہ دو مقصد حاصل ہوں تو آخرت پر ایمان خود ہی نصیب ہو جاتا ہے، بعث بعد الموت حشر و نشر، وزن اعمال، جنت و جہنم، وجود ملائکہ وغیرہ پر ایمان بالغیب، تصور آخرت کے لیے ضروری ہے، اور توحید کے بعد عقیدۂ آخرت وہ دوسری بڑی نعمت ہے، جو ہمیں اسلام سے ملتی ہے، آخرت کا عقیدہ ہماری مسئولیت (ACCOUNTABILITY) کو قائم کرتا ہے، آج مادہ پرست اور بے دین معاشروں میں انسان شتر بے مہار بن کر رہ رہا ہے یہی وہ بہیمیت، جاہلیت اور انارکی ہے جسے اسلام دور کرنا چاہتا ہے،

اسلامی معاشرہ میں ہر فرد یہاں بھی قانونِ شریعت کے سامنے مسئول ہے، اور آخرت میں بھی اپنے ذرہ ذرہ اعمال کو اپنی آنکھوں سے دیکھے گا، آخرت پر عقیدہ راسخ ہونے پر ہی مرتبۂ ایمان حاصل ہو سکتا ہے، کیونکہ ایمان دراصل تصدیق بالقلب (دل سے ماننا) اور عمل بالجوارح (اعضاء سے عملی اثبات) کا نام ہے، اور ایمان ہی وہ قوت ہے جو معاشرہ کی تمام برائیوں کو جڑ سے اکھاڑ سکتی ہے، اہل ایمان کا معاشرہ ایک ایسی تہذیب کو جنم دیتا ہے جس میں مفادات کی بنیاد جبر و استحصال پر نہیں ہوتی۔

اسلامی فکر کی روشنی میں جس تمدن کا خاکہ تیار ہوتا ہے اس میں فرد کو اولیت حاصل ہے، اس لیے کہ معاشرہ بھی اصلاً مجموعۂ افراد ہی ہے، اسلام نے حقوق انسانی کا تعین درجہ بدرجہ کیا ہے، پہلے اپنے نفس کا حق ہے، پھر ذوی القربیٰ 'الاقرب فالاقرب' کے اصول پر، یعنی جتنا قریب کا رشتہ ہے، اتنا ہی حق زیادہ ہے' ظاہر ہے کہ والدین، اولاد، ازواج، بہن بھائی، بنی اعمام اور ذوی الارحام ہر ایک کے حقوق کا درجہ متعین کر دیا گیا ہے، اور اس کی حکمت (CRITERIA) سماجی انصاف کا حصول ہے، پھر بہترین معاشرتی تعلقات کے لیے پڑوسیوں کے حقوق جتلائے گئے، اور حدیث شریف میں حق ہمسائیگی کی بار بار اتنی تاکید آئی ہے کہ اصحاب رسولؐ یہ سوچنے لگے تھے کہ شاید آپ وراثت میں بھی پڑوسی کا حصہ مقرر فرمانا چاہتے ہیں، ہمسایہ کے لیے وہی چاہے جو خود اپنے لیے چاہتا ہو (مسلم) اور اپنے مکان کو پڑوسی کے گھر سے اونچا نہ بنائے، تاکہ اس کی ہوا نہ رکے، اور اپنے چولھے کے دھوئیں سے پڑوسی کو ایذا نہ دے" (طبرانی)

پھر یتامیٰ اور مساکین کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قول و عمل میں جو تاکید ہے اس سے زیادہ سماجی انصاف اور معاشرتی تحفظ و تامین (SOCIAL SECURITY) اور پسماندہ طبقات کی خیر خواہی کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا، آج کا سماج وارانہ اقتصادی اعتبار سے پسماندہ لوگوں کے لیے بہت کچھ دعوے کر رہا ہے، یہ علمی تحقیق اور فلسفیانہ موشگافیوں کا موضوع بھی ہے، اس پر سیمینار اور سمپوزیم ہو رہے ہیں، قراردادیں منظور ہی ہیں، ریزولیوشن پاس ہو رہے ہیں، مگر ریزولیوشن کی شورش ہے مگر اس کا اثر غائب ہے

یتیموں کی صدا سنتا ہوں اور کہتا نہیں آتا

دوسری طرف سوشل ویلفیئر کے ادارے بھی قائم ہیں، تحفظ کے لیے قانون سازی ہے، بے سہارا افراد کے لیے پناہ گاہیں (SHELTERS) ہیں، ملازمتوں میں ان کے لیے ریزرویشن بھی رکھا جا رہا ہے، اور بھی بہت کچھ ہے، مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا دنیا کے کسی مفکر، مدبر اور مسکینوں کے کسی حامی نے یہ دعا نہیں مانگی کہ۔

اَللّٰھُمَّ اَحْیِنِیْ مِسْکِیْنًا وَّاَمِتْنِیْ	اے اللہ مجھے مسکین بنا کر زندہ رکھیو، مسکین
مِسْکِیْنًا وَّاحْشُرْنِیْ فِیْ زُمْرَۃِ	بنا کر ہی موت دیجیو اور میرا حشر بھی مساکین
الْمَسَاکِیْنِ۔	کی ٹولی میں کیجیو۔

اب دنیا میں مساکین کے لیے جو کچھ بھی کیا جائے گا یا کیا جائے گا وہ اس دعائے نبوی کے سامنے فروتر ہی رہے گا۔

ایک اسلامی معاشرہ خواہ اس میں شریعت پر مبنی حکومت نہ ہو، ہر فرد کو ضمانت دیتا ہے، حتیٰ کہ ایک مسافر بھی سارے معاشرہ کا مہمان ہوتا ہے کیونکہ "ابن السبیل" کو بھی اہل حقوق کے زمرہ میں شامل کیا گیا ہے، ظاہر ہے کہ ابن السبیل کے لیے مسلم و غیر مسلم کی شرط بھی نہیں ہے۔

اسلامی تمدن میں اقتصادی توازن باقی رکھنے کے لیے عام حکم انفاق اموال (گردش زر) کا ہے؛ لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰی تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ، اس سے دولت کی ذخیرہ اندوزی نہیں ہوتی، اور اس کے مفاسد کا تدارک بھی ہوتا ہے، آج کا ترقی یافتہ علم الاقتصاد بھی دقیق ریسرچوں کے بعد اس سے زیادہ کچھ نہیں کہہ سکا کہ معاشرہ کی اقتصادی خوش حالی کی ضمانت دولت کی گردش میں ہے، اسلام نے دولت اور اجناس دونوں کی ذخیرہ اندوزی پر لعنت بھیجی ہے، (ابن ماجہ، مشکوٰۃ) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ دولتمند لوگ جنت میں رینگتے ہوئے جائیں گے، اپنی مسئولیت کی وجہ سے۔ عام انفاق کے بعد صدقہ ہے جس پر

ہزارہا ٹیکسوں کی بجائے زکوٰۃ مقرر کردی گئی اور اسے بلاؤں کا روکنے والا بتایا گیا، یہ سب مفکرانہ معروضات ہیں، لیکن صاحب استطاعت لوگوں پر کم از کم ڈھائی فیصد زکوٰۃ کی حیثیت شرعی اجباری ٹیکس کی ہے جو ارکان دین میں دوسرے نمبر پر ہے، اس کی مقدار مقرر ہے، اور اسے محتاجوں کا حق بتایا گیا ہے، کسی دوسرے مذہبی نظام میں زکوٰۃ جیسا انقلابی اقتصادی نظریہ موجود نہیں ہے، افسوس ہے کہ ہم تحصیل و تقسیم زکوٰۃ کا مرکزی نظام کھو بیٹھے جو یتیموں، بیواؤں، مسکینوں اور ناداروں کا سب سے بڑا سہارا تھا، یہ نظام زندہ ہوتا تو کسی بے سہارا مطلقہ کو قانون فوجداری کی دفعہ ۱۲۵ کا سہارا لینے کی ضرورت ہی پیش نہ آتی۔

کسی تمدن کی خوبی یہ ہے کہ وہ قومی عظمت و وحدت کی تعمیر کرے اور ایک خوشحال سوسائٹی بنائے جس میں معاشرتی تعلقات کی بنیاد انصاف پر ہو، لوٹ کھسوٹ پر نہ ہو، اسلام نے سود کا دروازہ بند کر کے اقتصادی سطح پر استحصال کا خاتمہ کیا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: سود کا گناہ ستر حصے ہے اور اس کا ادنیٰ حصہ یہ ہے کہ جیسے کوئی اپنی ماں سے زنا کرے (ابن ماجہ و مشکوٰۃ) اور فرمایا کہ کسی کو قرض دو تو پھر مقروض سے کوئی ہدیہ قبول نہ کرو کیونکہ اس میں بھی شائبہ سود کا ہے، (بخاری) اسی طرح رشوت لینے والا، دینے والا، اور اس کا معاملہ طے کرانے والا سب ملعون ہیں (ابو داؤد، مسند) جو نفع کیا جائے اس کا یقینی ہونا ضروری ہے، اسی لیے جوا اور اس سے ملتی جلتی سب چیزیں حرام مطلق ٹھہریں، حد یہ کہ درخت پر لگا ہوا پھل بیچنا بھی ناجائز ہوا، کیونکہ اس کے صحیح وزن اور نوعیت کا یقین حاصل نہیں ہوتا، احتمال باقی رہتا ہے۔

اب مغربی تہذیب کے مظاہر پر نظر ڈالیے تو مختلف نشہ آور اشیاء جیسے شراب، مارفیا، ہیروئن، ایل. ایس. ڈی وغیرہ کا آزادانہ استعمال جس کے لیے کھربوں روپیہ کا ناجائز کاروبار ساری دنیا میں اور خاص طور سے عالم ثالث میں ہو رہا ہے، پھر ایک ایسی آزاد (PERMISSIVE) سوسائٹی جیسی مانویت کے پیروکاروں نے بنائی تھی، بلکہ اس سے بھی بدتر جنس (SEX) کا رشتہ اخلاق اور مذہب دونوں سے منقطع کر دیا گیا ہے، انجام یہ کہ اس زرق برق معاشرہ میں زنا کا تو تصور ہی ختم ہو چکا ہے، انگلستان

جیسے ملک میں ہم جنس پرستوں کے کلب موجود ہیں اور لواطت کو قانونی تائید حاصل ہے، اس سے نسلی خصوصیات کا خاتمہ ہو چکا ہے، اور بہت بڑی تعداد میں ایک ایسی درمیانی نسل وجود میں آ چکی ہے جو قدامت و جدیدیت کے درمیان آویزاں ہے، اور الحاد و زندقہ اسی کے دم سے پھل پھول رہا ہے۔

اسلامی تمدن میں جنسی زندگی آزاد بھی ہے اور پابند بھی، تعدد ازدواج کی رخصت میں حکمت یہ بھی تھی کہ وسیع تر خاندانی تعلقات قائم ہوں، عورتوں کے حقوق و فرائض کی صراحت کی گئی ہے، اور انھیں سوسائٹی میں باعزت مقام دیا گیا ہے (ترمذی) معاشرتی تعلقات میں کسب حلال کی تلقین ہے، حدیث شریف میں کہ یمین سے کمانے والے (دستکار یا مزدور) کو حبیب اللہ کہا گیا ہے (ترمذی) مزدور کی مزدوری اس کا پسینہ خشک ہونے سے پہلے ادا کی جائے (ابن ماجہ) تجارت میں حسن معاملہ کی سخت تاکید ہے، اور کم ناپ تول کرنے یا دھوکا دھڑی سے بیچنے والے کے لیے سخت وعید آئی ہے (ابن ماجہ و ترمذی) دیانتدار تاجر کا حشر انبیاء، صدیقین اور شہداء کے ساتھ ہوگا، (ترمذی)

اسلامی معاشرہ میں حاکم و محکوم کا تعلق جمہوری انتخاب سے قائم ہوتا ہے، آج الیکشن ووٹ کے ذریعہ ہوتا ہے، مگر اس میں فریقین کے لیے کوئی شیرازہ (BINDING FACTOR) نہیں ہے، بیعت و اطاعت کا اسلامی (INSTITUTION) زیادہ محکم اور فریقین میں ربط باقی رکھنے والا ہے لیکن بیعت بھی تابع شریعت ہے: لاطاعۃ لمخلوق فی معصیۃ الخالق (بخاری، مسلم، مشکوٰۃ) انتظام ریاست کا ضابطہ عدل و انصاف سے بنتا ہے، نظام عدالت کے لیے شہادت کی جو بنیاد فقہ اسلامی نے قائم کر دی ہے وہ (LAW OF EVIDENCE) آج بھی ایک آفاقی اصول مانا جا رہا ہے، اور ایسے کسی انصاف کا تصور نہیں کیا جا سکتا جسے قانون شہادت سے مستثنیٰ کر دیا گیا ہو، دستور مدینہ کی دفعہ ۲۶ میں جس کے لیے اسلام کی بنیاد بھی یہی ہے جس میں غیر مسلموں سے بھی منصفانہ سلوک کی تاکید ہے، فرقہ وارانہ فسادات نام کی یا اس سے ملتی جلتی کوئی شیطنت کبھی کسی اسلامی معاشرہ میں نہیں پائی گئی۔

احادیث نبوی میں ایمان لانے والوں کو ایک با مقصد اور مسئول زندگی گذارنے کی دعوت دی گئی ہے، کسی جدید طرز زندگی میں مقصد حیات اتنا واضح نہیں ہے اسی لیے لہو ولعب کے مشاغل سے مسلمان کو باز رکھا گیا ہے، حدیث شریف ہے: مِنْ حُسْنِ إِسْلَامِ الْمَرْءِ تَرْكُهُ مَا لَا يَعْنِيهِ (ترمذی، ابن ماجہ) یعنی حسن اسلام یہ ہے کہ وقت ضایع کرنے والی فضول باتوں کو چھوڑ دیا جائے، اس لیے اسلامی تمدن کو رقص و سرود، مصوری یا مجسمہ سازی جیسے مشاغل میں تلاش نہیں کیا جاسکتا، اوہام و اباطیل اور فضول رسموں کا دروازہ بدعات سے بچنے کی تاکید نے بند کر رکھا ہے، (بخاری و مسلم) اصول معاشرہ اور اصول تمدن کے تحفظ (CONSERVATION) کا اس کو بھی ایک موثر وسیلہ سمجھنا چاہیے۔

کوئی لباس "اسلامی" نہیں ہے، لیکن اصولی طور پر غیر اسلامی لباس سے تشابہ ممنوع ہے (ابوداؤد مسند) مرد کے لباس میں تفاخر نہ ہو، بس صاف ستھرا اور بے تکلف ہو، عورتوں کے لباس میں زینت کی نمائش اور تجاذب نہ ہو، (مشکوٰۃ، ابوداؤد) اسی طرح کھانے میں یہ شرط ہے کہ وہ پاک ہو، حلال کمائی کا ہو اور شکم پروری کے لیے نہ ہو۔

افراد معاشرہ سے قوانین شریعت کا مطالبہ طہارت، حلم، عفو، صبر، استقامت، تسلیم و رضا، ایفائے عہد، شجاعت وسخاوت، قناعت و توکل، دیانت و امانت، ایثار اور صلہ رحمی کا ہے، ان سب اوصاف کا حاصل ہے، "عبدیت" جو ارکان دین کی بجاآوری سے حاصل ہوتی ہے، اور اس کا مفہوم ہے خالق سے اپنا رشتہ استوار کرنا، یہ ہو جائے تو انسان انسان کے رشتوں میں خود ہی بہتری آجاتی ہے۔

احادیث نبوی کی روشنی میں جو طرز زندگی ابھر کر سامنے آتا ہے وہ فرد کو معاشرہ کا ایک فعال اور ذمہ دار رکن بناتا ہے، اسے اپنی تکمیل اور معاشرہ کے اکمال کی دعوت دیتا ہے، اس کا ہر قدم نئی جستجو کے لیے اور ہر سانس ذوق طلب سے سرشار ہوتا ہے، مَنِ اسْتَوَىٰ يَوْمَاهُ فَهُوَ مَغْبُونٌ۔ (جس کے دو دن برابر رہے وہ گھاٹے میں رہا) مومن کا ہر دن ترقی احوال کی طرف نیا قدم ہوتا ہے۔

جیسے ملک میں ہم جنس پرستوں کے کلب موجود ہیں اور لواطت کو قانونی تائید حاصل ہے، اس سے نسلی خصوصیات کا خاتمہ ہو چکا ہے، اور بہت بڑی تعداد میں ایک ایسی درمیانی نسل وجود میں آ چکی ہے جو قامت وہیئت کے درمیان آدھیان ہے، اور اکثر وبیشتر اسی کے دم سے پھل پھول رہا ہے۔

اسلامی تمدن میں جنسی زندگی آزاد بھی ہے اور پابند بھی، تعدد ازدواج کی رخصت میں یہ حکمت بھی تھی کہ وسیع تر خاندانی تعلقات قائم ہوں، عورتوں کے حقوق و فرائض کی صراحت کی گئی ہے، اور انہیں سوسائٹی میں باعزت مقام دیا گیا ہے (ترمذی) معاشرتی تعلقات میں کسب حلال کی تلقین ہے، حدیث شریف میں کہ یمین سے کمانے والے (دستکار یا مزدور) کو حبیب اللہ کہا گیا ہے (ترمذی) مزدور کی مزدوری اس کا پسینہ خشک ہونے سے پہلے ادا کی جائے (ابن ماجہ) تجارت میں حسن معاملہ کی سخت تاکید ہے، اور کم ناپ تول کرنے یا دھوکا دھڑی سے بیچنے والے کے لیے سخت وعید آئی ہے (ابن ماجہ و ترمذی) دیانتدار تاجر کا حشر انبیاء، صدیقین اور شہداء کے ساتھ ہوگا۔ (ترمذی)

اسلامی معاشرہ میں حاکم و محکوم کا تعلق جمہوری انتخاب سے قائم ہوتا ہے، آج الیکشن ووٹ کے ذریعہ ہوتا ہے، مگر اس میں فریقین کے لیے کوئی شیرازہ (BINDING FACTOR) نہیں ہے، بیعت اطاعت کا اسلامی (INSTITUTION) زیادہ محکم اور فریقین میں ربط باقی رکھنے والا ہے، لیکن بیعت بھی تابع شریعت ہے: لا طاعۃ لمخلوق فی معصیۃ الخالق (بخاری، مسلم، مشکوۃ) انتظام ریاست کا ضابطہ عدل و انصاف سے بنتا ہے، نظام عدالت کے لیے شہادت کی جو بنیاد فقہ اسلامی نے قائم کر دی ہے وہ (LAW OF EVIDENCE) آج بھی ایک آفاقی اصول مانا جاتا ہے، اور ایسے کسی انصاف کا تصور نہیں کیا جا سکتا جسے قانون شہادت سے مستثنیٰ کر دیا گیا ہو، دستور مدینہ کی دفعہ ۲۶ میں اسکے لزوم کی بنیاد بھی موجود ہے جس میں غیر مسلموں سے بھی منصفانہ سلوک کی تاکید ہے، فرقہ وارانہ فسادات نام کی یا اس سے ملتی جلتی کوئی شیطنت کبھی کسی اسلامی معاشرہ میں نہیں پائی گئی۔

احادیث نبویؐ میں ایمان لانے والوں کو ایک با مقصد اور مسئول زندگی گذارنے کی دعوت دی گئی ہے، کسی جدید طرز زندگی میں مقصد حیات اتنا واضح نہیں ہے اسکلیے لہو ولعب کے مشاغل سے مسلمان کو باز رکھا گیا ہے، حدیث شریف ہے: مِنْ حُسْنِ إِسْلَامِ الْمَرْءِ تَرْكُهُ مَا لَا يَعْنِيهِ (ترمذی، ابن ماجہ) یعنی حسن اسلام یہ ہے کہ وقت ضایع کرنے والی فضول باتوں کو چھوڑ دیا جائے۔ اس لیے اسلامی تمدن کو رقص و سرود، مصوری یا مجسمہ سازی جیسے مشاغل میں تلاش نہیں کیا جا سکتا، اوہام و اباطیل اور فضول رسموں کا دروازہ بدعات سے بچنے کی تاکید نے بند کر رکھا ہے، (بخاری و مسلم) اصول معاشرہ اور اصول تمدن کے تحفظ (CONSERVATION) کا اس کو بھی ایک موثر وسیلہ سمجھنا چاہیے۔

کوئی لباس "اسلامی" نہیں ہے، لیکن اصولی طور پر غیر اسلامی لباس سے تشابہ ممنوع ہے (ابو داؤد، مسند) مرد کے لباس میں تفاخر نہ ہو، بس صاف ستھرا اور بے تکلف ہو، عورتوں کے لباس میں زینت کی نمائش اور تجاذب نہ ہو، (مشکوٰۃ، ابو داؤد) اسی طرح کھانے میں یہ شرط ہے کہ وہ پاک ہو، حلال کمائی کا ہو اور شکم پروری کے لیے نہ ہو۔

افراد معاشرہ سے قوانین شریعت کا مطالبہ طہارت، حلم، عفو، صبر، استقامت، تسلیم و رضا، ایفائے عہد، شجاعت وسخاوت، قناعت وتوکل، دیانت و امانت، ایثار اور صلہ رحمی کا ہے، ان سب اوصاف کا حاصل ہے "عبدیت" جو ارکان دین کی بجا آوری سے حاصل ہوتی ہے، اور اس کا مفہوم ہے خالق سے اپنا رشتہ استوار کرنا، یہ ہو جائے تو انسان انسان کے رشتوں میں خود ہی بہتری آجاتی ہے۔

احادیث نبویؐ کی روشنی میں جو طرز زندگی ابھر کر سامنے آتا ہے وہ فرد کو معاشرہ کا ایک فعال اور ذمہ دار رکن بناتا ہے، اسے اپنی تکمیل اور معاشرہ کے اکمال کی دعوت دیتا ہے، اس کا ہر قدم نئی جستجو کے لیے اور ہر سانس ذوق طلب سے سرشار ہوتا ہے، مَنِ اسْتَوَى يَوْمَاهُ فَهُوَ مَغْبُونٌ (جس کے دو دن برابر رہے وہ گھاٹے میں رہا) مومن کا ہر دن ترقی احوال کی طرف نیا قدم ہوتا ہے۔

جدید عالم تمدن میں حاکم و محکوم کے تعلقات اور عام نظم و نسق کے اصول و ضوابط تو بہت کچھ ہیں، لیکن اخلاق کو اس سے بے دخل کر دیا گیا ہے، گویا وہ ایک علیحدہ ہی (DISCIPLINE) ہے جس کا نہ مذہب سے ہے، نہ تمدن سے، نہ جنسی زندگی سے، وہ ایک ایسا زائد مضمون ہے جس میں آپ سکتے ہیں نمبر حاصل کر لیں، وہ (AGGREGATE) میں شامل نہیں ہوتے، لیکن اسلامی تمدن میں اخلاق کی یہ حیثیت نہیں، یہاں وہ ایسا محور ہے جو تمام دوسرے تصورات اقدار کو چلا رہا ہے،

قدیم تہذیبیں ایک سادہ و بسیط زندگی کو نسبتاً نظم و ضبط اور باہمی انحصار کے ساتھ گذارنے کا نمونہ تھیں لیکن جب وہ فنا ہو گئیں تو اپنے پیچھے کچھ بھی نہیں چھوڑا، سیرت و احادیث نبوی میں اصول تمدن کی ابدی بنیادیں ملتی ہیں، معاشرے بدلتے رہیں گے مگر اصول اپنی جگہ قائم رہیں گے، اس لیے کہ وہ اصول خدا ساز ہیں اور ان کا مصدر وحی الٰہی ہے، ورنہ ریگستان حجاز میں جنم والی تہذیب اس وقت کی متمدن ساسانی، رومی، اور بیزنطینی قوتوں کو بھلا کیسے نیچا دکھا سکتی تھی، اور ایک نبی امی (صلی اللہ علیہ وسلم) ایک آفاقی نظام حیات کیسے پیش کر سکتے تھے، ؎

یتیمے کہ ناکردہ قرآں درست کتب خانۂ چند ملت بشست

(ایک یتیم بچہ جس نے لکھنا پڑھنا بھی نہیں سیکھا تھا، اس نے چند ملتوں کے پورے پورے کتب خانے دھو کر رکھ دیے،)

اس وقت اطراف عالم میں جو تمدن رائج تھے، ان میں ایرانیوں کو اپنے رنگ کا گھمنڈ تھا تو آریوں نے اپنی معاشرت کو پیشوں کے اعتبار سے جاتیوں میں بانٹ رکھا تھا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انسانی معاشرہ کی ہر قسم تقسیم و تفریق کی نفی کر کے ایک ایسے تمدن کا تصور دیا، جس میں عظمت آدمؑ اور "احترام آدمیت" سب سے زیادہ نمایاں وصف ہے، اور انسانوں میں تفوق و فضیلت کی بنیاد "تقویٰ" یعنی اعمال صالحہ ہیں، تمدن اور حضارت کے فروغ و بقا کا راز یہی تقویٰ اور خشیت الٰہی ہے، کیونکہ اس سے انسانوں کے

درمیان خیر خواہی کے تعلقات قائم ہوتے ہیں، اور افراد کی اخروی مسئولیت انھیں تخریب و استحصال سے باز رکھتی ہے، آج کی متمدن دنیا کا المیہ یہی ہے کہ سب کچھ ظاہری نمود و نمایش، طمطراق اور مادی وسائل کے ہوتے ہوئے بھی سینوں میں بھٹی سلگ رہی ہے اور بے نام خطرے سروں پر منڈلا رہے ہیں، شقاوت اور سنگدلی اپنے نقطۂ عروج پر پہونچ چکی ہے، صنعتی اعتبار سے ترقی یافتہ ممالک اپنا اسلحہ فروخت کرنے کی غرض سے تیسری دنیا کے ننگے بھوکے عوام کو ہمیشہ برسر جنگ رکھنا چاہتے ہیں، پہلی دو عالمی جنگوں کے پیچھے بھی یہی سیاسی اور اقتصادی خود غرضی کارفرما تھی، اور آیندہ بھی جب کبھی تجارتی و صنعتی مفادات کا توازن بگڑے گا تو یہ نام نہاد متمدن ممالک دنیا کے کروڑوں انسانوں کو جنگ کی بھٹی میں بے تکلف جھونک دیں گے، یہ آخر کیسا تمدن اور کیسی صنعتی تہذیب ہے، جو اپنی اس سنگدلی اور حیوانیت پر ذرا نہیں شرماتی، جس کا بچہ بچہ "بہاڑی وعظ" سنتا ہے، مگر اسے عالم انسانیت پر رحم کرنے کے لیے کسی شے کی دہائی نہیں دی جا سکتی۔

غرض آج نہیں تو کل دنیا یہ تسلیم کرے گی کہ انسانی تہذیب کی بقا اور فروغ کا راز بھی سیرۃ طیبہ اور احادیث میں موجود ہے، اور ہمارے ہادئ اعظم صلی اللہ علیہ وسلم نے مدنیت کے ایسے ابدی اور آفاقی اصول بیان فرما دیے ہیں جو کاروانِ تمدن کی راہوں کو سدا اجالتے رہیں گے اور انسانیت کی بقا کی ضمانت دے سکیں گے۔

فان فضل رسول اللہ لیس لہ — حد فیعرب عنہ ناطق بفم

یا رب صل وسلم دائما ابدا — علی حبیبک خیر الخلق کلھم

وراقت: کتاب منزل بمنزل

از

مولانا محمد عبدالحلیم چشتی، کانو، نائجیریا

عہد عباسی میں علوم وفنون کی تدوین اور کتابی صورت میں ان کی اشاعت ایسی تیزی سے کی گئی تھی کہ نقل واشاعت کے لیے ایک نئی صنعت اور نیا علم وراقت وجود میں آیا تھا، صنعت وراقت، کاغذ سازی، جلد سازی، سامان کتابت (تصحیح وضبط اعراب) سے عبارت تھی[1]، جیساکہ سابق میں اس کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، صنعت وراقت کا تعلق انسان کے علوم وافکار سے ہے اور اسی کے ساتھ مخصوص ہے[2]، علوم ومعارف اور اعلی صنعتیں جو انسان کی فکری کاوشوں کے نتائج ہیں کمال تمدن کی ضامن اور آرائش وزینت کا موجب ہیں[3]۔

کتابت، طباعت اور موسیقی وہ صنعت ہیں جو بادشاہوں (وزیروں اور امیروں) سے ربط وضبط اور رسائی کا ذریعہ رہی ہیں، اس لیے ان صنعتوں کو دوسری صنعتوں کے مقابلہ میں اہمیت اور برتری حاصل ہے[4]، عہد عباسی اور اس کے بعد مسلم حکمرانوں کے دورِ عروج میں وراقت وکتابت کی صنعت کو بہت فروغ حاصل تھا، مورخ ابن خلدون کہتا ہے:

---

[1] ابن خلدون، المقدمہ ص ۵۵۷، القلقشندی، صبح الاعشیٰ ج ۲، ص ۴۸۴، ۴۸۲، السمعانی، کتاب الانساب ورق ۵۷۹،

[2] ابن خلدون، ص ۴۱۳، ۴۱۵، [3] ایضاً ص ۴۲۲، ۴۲۳، [4] ایضاً،

"صنعت وراقت ملت اسلامیہ میں عراق سے اندلس تک ایک ٹھاٹھیں مارتے ہوئے سمندر کی طرح تھی، صنعت آبادی اور اطراف مملکت میں اس کی گرم بازاری تھی، کثرت سے علمی کتابیں لکھی جاتی اور اسلامی دنیا کے ہر گوشہ میں ان کی نقلیں لی جاتی، جلدیں بندھوائی جاتی تھیں، کاتب، وراق، نقل، تصحیح، جلد سازی اور دوسرے کاموں میں بہت مشقت اٹھاتے تھے، یہ صنعت بڑے بڑے آباد شہروں میں خصوصیت سے بہت ترقی پر تھی[۱]۔"

اس صنعت کے مرکز توجہ ہونے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ یہ نوع انسان کے علم و دانش میں اضافہ اور معیشت کو مستحکم کرنے کا موثر ذریعہ رہی ہے، ابن خلدون کہتا ہے:

"صنعت کتابت چونکہ متعدد علوم پر مشتمل ہے، اس لیے یہ دوسری صنعتوں کے مقابلہ میں زیادہ عقل سکھاتی ہے، کتابت میں خطی حروف سے الفاظ کی طرف اور الفاظ سے معانی کی طرف، پھر ایک دلیل سے دوسری دلیل کی طرف ذہن کی رسائی ہوتی ہے، اس سے نفس انسانی میں دلائل سے مدلولات کی طرف منتقل ہونے کا ملکہ پیدا ہوتا ہے، یہ ملکہ نظر عقلی سے عبارت ہے، نامعلوم علوم کو حاصل کرنے اور انہیں بار بار لکھنے سے عقل و دانش میں اضافہ ہوتا اور معاملہ فہمی میں بصیرت پیدا ہوتی ہے[۲]۔"

عہد عباسی میں صنعت وراقت نظری و عملی ہر دو پہلوؤں سے اہل علم کی مرکز توجہ بنی ہوتی تھی، چنانچہ مشہور فلسفی ابوزید، احمد بن سہل بلخی (۲۳۵-۳۲۲ھ = ۸۴۹-۹۳۴ء) فضل صناعۃ الکتابۃ ہروراقت کی فضیلت میں ایک رسالہ لکھا تھا[۳]۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ بلخ اور دوسرے اسلامی شہروں میں صنعت وراقت ایک معزز پیشہ سمجھی جاتی تھی، نیز ابوحیان توحیدی المتوفی سنہ ۴۱۴ھ نے وراقت کے موضوع پر ایک رسالہ ترتیب دیا تھا جس میں کتابوں کے نقل کرنے کے اصول اور وراقوں کی تصحیف سے بچنے کے قواعد بیان

۱۔ ابن خلدون ص ۶۵، ایضاً ص ۳۷۶، اویس وفا ابن محمد الارزنجانی، منہاج الیقین شرح ادب الدنیا والدین، آستانہ محمود بک مطبعہ سنہ ۱۳۲۸ھ، ص ۳۷۰، ۳۔ معجم الادباء طبع القاہرۃ، مطبعۃ ہندیہ ج ۱، ص ۱۴۳۔

کیے تھے[1]

سوق الوراقین | ان وجوہ سے عہد عباسی میں صنعت وراقت اور دوسرے اہم مسائل جن کا تعلق اس صنعت اور سوق الوراقین سے ہے اسلامی قلمرو میں ان سے خصوصی اعتنا کیا جاتا تھا، سوق الکتب میں جانے کی ترغیب دی جاتی تھی، مہلب المتوفی ۸۳ھ اپنے فرزندوں سے کہتا تھا تم بازاروں میں صرف سوق حرب (جہاں سامان حرب وضرب بکتا ہے) اور سوق الوراقین میں بیٹھا کرو[2] اور عربی شاعر کہتا ہے :

مجالسة السوق مذمومة	ومنها مجالس قد تختشب
(بازاروں میں اٹھنا بیٹھنا اچھا کام نہیں ہے	لیکن بازاروں کی بعض بیٹھکیں لائق عزت ہیں)
فلمّا تقربن غیر سوق الجیاد	وسوق السلاح و سوق الکتب

(لہٰذا تم گھوڑوں، ہتھیاروں اور کتابوں کے بازار کے علاوہ کسی بازار میں نہ پھٹکنا)

فهاتیك آلة اهل الوغی	وهاتیك آلة اهل الادب

(کیونکہ گھوڑوں اور ہتھیاروں کا بازار مردانِ کارزار کے سامان کا بازار ہے، اور کتابوں کا بازار اہل ادب کے سامان کا بازار ہے)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی دنیا میں سب سے زیادہ آباد اور پر رونق گھوڑوں، ہتھیاروں اور کتابوں کے بازار تھے، نیز عربوں کو اپنے تہذیبی و ثقافتی مرکز و سرمایہ سے کیسی دلچسپی و رغبت تھی، اس سے ظاہر ہے کہ اسلامی معاشرے میں سیف و قلم کے بازار ہی عزت و وقعت کی نظر سے دیکھے جاتے تھے، اور ان ہی کی طرف لوگوں کو جانے کی ترغیب دی جاتی تھی، یہ ترغیب کتب اور کتب خانوں کی نشر و اشاعت، تشہیر اور علمی افادہ و استفادہ کا باعث تھی[3]

---

[1] معجم الادباء طبع القاہرۃ، مطبعۃ ہندیہ ج ۵، ص ۱۳ [2] کتاب العقد الفرید لابن عبد ربہ القاہرۃ، مطبعۃ لجنۃ التالیف والترجمہ والنشر ۱۳۶۵ھ ج ۲ ص ۲۱۰ [3] الخطط المقریزیۃ القاہرۃ، دار الطباعۃ المصریہ بولاق ۱۲۷۰ھ ج ۲ ص ۱۰۲

سوق الوراقین کی کثرت | عہد عباسی میں اسلامی قلمرو کے ہر شہر میں سوق الوراقین پایا جاتا تھا، لیکن مرکزی شہروں کے سوق الکتب کو شہرت حاصل ہوتی تھی، ان میں مندرجہ ذیل شہروں کے سوق الکتب کو تاریخ میں زیادہ شہرت حاصل رہی ہے، کوفہ[1]، بصرہ[2]، بغداد[3]، واسط[4]، دمشق[5]، قاہرہ[6] (قاہرہ کے محلہ فسطاط میں جامع عمرو بن العاص کے مشرقی گوشہ کی طرف بہت بڑا سوق الوراقین تھا[7])، بخارا[8]، مصر۔

سوق الوراقین کی علمی و ثقافتی حیثیت | یہ سوق الکتب مقامی ارباب کمال کی نظر میں ہوتے تھے، چنانچہ ابوبکر احمد بردیجی المتوفی سنہ ۳۰۱ھ جن کی حفظ حدیث میں شہرت تھی، جب کوفہ میں وارد ہوئے اور ابن عقدہ سے جنھیں اپنے حفظ پر ناز تھا، ملاقات ہوئی تو باتوں ہی باتوں میں ابن عقدہ نے ان سے کہا، حدیث کی زیادہ باتیں نہ کیجیے، کسی وراق کی دکان پر چلیے، قبان (پیمانۂ غلہ) بھیجیے اور کتابیں جتنی چاہیں تلوائیے، پھر ہم بحث کریں گے، تو ان کے ہوش اڑ گئے تھے[9]۔

اس سے معلوم ہوا کہ اس دور میں سب سے بڑا عالم وہ سمجھا جاتا تھا جس کی نظر میں اپنے فن سے متعلق سوق الوراقین کی جملہ کتابیں ہوتی تھیں، سوق الکتب میں بعض اہل علم وراق کی علمی شہرت ایسی تھی کہ ان کے

---

[1] تاریخ بغداد ج ۵، ص ۱۶، الانساب للسمعانی، ورق ۳۹۴ [2] تاریخ بغداد ج ۴ ص ۱۰۲، انباہ الرواۃ علی انباہ النحاۃ للقفطی، القاہرۃ، دار الکتب المصریہ ۱۳۶۹ھ ج ۲، ص ۳۰۱ [3] البلدان لليعقوبی ط: ۲، النجف؛ المطبعۃ الحیدریہ ۱۳۷۷ھ ص ۱۳، مناقب بغداد لابن الجوزی، ص ۲۶۔ [4] الجواہر المضیہ للقرشی ج ۲، ص ۱۵۵، مصطفیٰ جواد، معجم مواضع واسط، مجلۃ المجمع العلمی العراقی، المجلد الثامن (۱۹۶۱ء) ص ۱۵۹، ۱۷۰، ۱۷۱، [5] وفیات الاعیان لابن خلکان ج ۲ ص ۲۱۰، احسن التقاسیم للمقدسی ص ۱۵۸، مدینۃ دمشق عند الجغرافیین والرحالین المسلمین للمنجد، بیروت، دار الکتاب العربی ۱۹۶۷ء ص ۷، [6] الخطط المقریزیہ ج ۲، ص ۱۰۲ [7] عبد الرحمٰن زکی، نہضۃ العلوم فی قاہرۃ الفاطمیین، المجلۃ مجلۃ الثقافۃ الرفیعۃ، القاہرۃ، شمارہ ۱۴۸، اپریل ۱۹۶۹ء ص ۱۷ [8] تتمہ صوان الحکمۃ للبیہقی ص ۴۲، [9] تاریخ بغداد للخطیب ج ۵ ص ۱۶، السمعانی ورق ۳۹۴، ابن الجوزی ج ۶، ص ۲۳۷۔

تھا، تاہم بعض اوقات میں بھی دوکانوں پر آکر لوگ ان سے کتابوں کی سند لیتے تھے،[1] شعراء کا کلام نقل کیا جاتا تھا[2] بعض دوکانوں میں علمی مباحثے ہوتے تھے،[3] اہل علم، وراقوں کے ذریعہ معلومات فراہم کرتے تھے، چنانچہ ابوالعلاء المعری کا بیان ہے "میں مدینۃ السلام بغداد میں تھا، وہاں ایک وراق کو دیکھا کہ وہ عدی بن زید کے اشعار جن کا مطلع تھا:

بکی العاذلات فی غلس الصبـ ـح یعاتبنہ اما تستفیق

ودعا بالصبوح فجراً فجاءت قینۃ فی یمینها ابریق

کے قافیے کے متعلق پوچھتا تھا، وراق کا زعم تھا کہ ابن حاجب النعمان نے اس قصیدہ کے متعلق دریافت کیا تھا، دیوان عدی کے نسخے بھی طلب کیے تھے، لیکن وہ نہیں ملے، پھر میں نے استرابادی کو سنا کہ وہ یہ قافیہ دیوان العبادی میں پڑھتا تھا، لیکن دارالعلم بغداد کے نسخہ "دیوان العبادی" میں یہ قافیہ موجود نہیں تھا،[4] علماء وادباء کی مجلسیں جمتی تھیں، ناقدان فن کے جوہر کھلتے تھے، چنانچہ ابونصر زجاج کا بیان ہے کہ میں سوق الوراقین میں ابوالفرج صاحب الاغانی کے ساتھ ایک دکان پر بیٹھا ہوا تھا اور قریب ہی وراق ابوالفتح بن ابکر اری کی دکان پر ابوالحسن علی بقال شاعر سے ابراہیم صولی کے شعر سنا رہا تھا، جب وہ مندرجۂ ذیل شعر پر پہونچا:

رأی خلتی من حیث یخفی مکانہا وکانت قذی عینیہ حتی تجلت

(اس نے میری حاجت کو پوشیدہ جگہ دیکھا، وہ اس کی آنکھ میں تنکا تھی کہ فوراً نکل گئی)

تو اس نے اس کی بہت داد دی، ابوالفرج اس منظر کو دیکھ رہا تھا، اس نے مجھ سے کہا جاؤ، اس سے پوچھو کہ اس شعر میں خوبی کیا ہے؟ میں نے جاکر پوچھا تو اس نے کہا: شاعر کا قول 'وکانت قذی عینیہ' ہے، ابوالفرج نے کہا جاؤ، کیونکہ شعر کی خوبی کے ادراک میں تم سے غلطی ہوئی ہے، اصل خوبی من حیث یخفی مکانہا میں مضمر ہے،[5] اس طرح بحث چھڑ جاتی تھی،[6] ابوحیان توحیدی (... سنہ ...

---

[1] تاریخ بغداد ج ۳ ص ۲۰۰ [2] انباہ الرواۃ للقفطی ج ۲، ص ۳۰۰-۳۰۱ [3] الوافی بالوفیات للصفدی ج ۲ ص ۱۱۹ [4] ابن خلکان ج ۲، ص ۲۱۰ [5] رسالۃ الغفران للمعری ط: ۵ القاہرہ، دارالمعارف، ص ۱۳۶، ۱۴۷ [6] معجم الادباء یاقوت ج ۵، ص ۱۰۰، ۱۵۰، یاقوت نے محاکمہ کیا کہ دونوں کا قول درست ہے، لیکن ابوالفرج کا قول زیادہ بہتر ہے۔

۴۰۱ھ) سوق الوراقین میں اسی قسم کے مناظروں سے لطف اندوز ہوتے تھے، چنانچہ موصوف نے کتاب الامتاع والمؤانسۃ میں ایسے مناظروں کا تذکرہ کیا ہے۔[1] قفطی نے لکھا ہے کہ بغداد میں ابن وداع ازدی المتوفی فی حدود سنہ ۲۳۰ھ کی دوکان ایسی تھی کہ اس میں عامۂ اہل ادب آکر بیٹھتے، مذاکرہ و مباحثہ کرتے، ان میں ایسی باتیں حاصل ہوتی تھیں جو دوسری ادبی مجالس میں حاصل نہیں ہوتی تھیں۔[2] "زبا" میں جو موصل و شام کے مابین ایک شہر ہے اسعد وراق کی ایسی ہی ایک دوکان تھی،[3] بعض نابینا اہل علم بھی بلا ناغہ روزانہ یہاں آتے تھے، چنانچہ ابوالغنائم حبشی بن محمد واسطی ضریر المتوفی ۵۶۵ھ بیس[4] برس تک بغداد کے سوق الوراقین میں برابر آتے رہے تھے۔[5] ان ہی خوبیوں کی وجہ سے مورخین نے سوق الوراقین کو مجالس علماء و شعراء کا مرکز[6] اور اہل علم کا مستقر[7] قرار دیا ہے۔

سوق الوراقین میں ارباب فن تقویم کام کرتے، اہل کمال کے جوہر کھلتے، باہم محبت بڑھتی تھی، چنانچہ ماہر نجوم و تقویم ابوالقاسم رضی مصاحب سیف الدولۃ حمدانی کا بیان ہے:

"میں عضد الدولۃ کے زمانہ میں بغداد آیا، علم نجوم کو خیرباد کہہ کر تجارت کرنے لگا، ایک دن سوق الوراقین سے گذر رہا تھا کہ ابوالقاسم قصری المتوفی سنہ ۴۱۳ھ کو تقویم بناتے دیکھا تو کھڑے ہو کر اس کے عمل کو دیکھنے لگا، تھوڑی دیر بعد اس نے سر اٹھا کر دیکھا اور کہا: کیا دیکھتے ہو آگے بڑھو، یہ تمہارے سمجھنے کی چیز نہیں، مگر میں دیکھتا رہا، جب وہ فارغ ہوا تو میں نے عرض کیا: آپ نے دوہرا عمل کیا، دوہری ضربیں لگائیں، اگر اس طرح سے کیا ہوتا تو یہ زحمت نہ کرنی پڑتی، اور چلتا ہوا، قصری میرے پیچھے دوڑا، آکر مجھ سے چمٹ گیا، سر کو چوما، معافی مانگی، نام پتہ پوچھا، شہرت کی بنا پر فوراً پہچان گیا اور مکان پر آکر مشکلات حل کرنے لگا۔[8]

وراق اہل علم کی قدر کرتے، اگر ان میں کوئی خوبی دیکھتے تو کتاب نذر کرنے سے دریغ نہیں کرتے تھے،

---

[1] کتاب الامتاع والمؤانسۃ تحقیق احمد امین و احمد الزین بیروت، دار مکتبۃ الحیاۃ ب۔ت، ج ۲ ص ۱۱ و ۲۹ [2] انباہ الرواۃ للقفطی ج ۲ ص ۱۳۴ [3] معجم الادباء ج ۳ ص ۲۲۳ [4] ایضاً ص ۳ [5] نکت الہمیان للصفدی ص ۱۳۴ [6] مناقب بغداد لابن الجوزی ص ۲۶ [7] الخطط المقریزیہ ج ۲ ص ۱۰۲ [8] انباہ الرواۃ للقفطی ص ۳۱۹ - ۳۲۰۔

عرب کا مشہور شاعر متنبی سوق الوراقین میں زیادہ بیٹھا اٹھا تھا، اور اس کا علم انھی کتابوں کا رہین منت تھا، اس نے کسی وراق کے پاس اصمعی کی تیس[3] ورق پر مشتمل کتاب دیکھی، اسے کر پڑھنے لگا، جب دیر لگی تو وراق بولا، آپ کا مقصد اسے یاد کرنا ہے، یہ کام ایک مہینہ کے بعد کیجیے گا، متنبی نے کہا یہ یاد ہو گئی، کہنے لگا: پھر کتاب تمھاری ہے، وراق نے متنبی سے کتاب لی، اس نے پوری زبانی سنا دی، وراق نے کتاب متنبی کو دے دی، وہ آستین میں رکھ کر لے گیا[1]، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اہل علم سائل کی کمی کی وجہ سے سوق الوراقین میں نادر واہم رسالے یاد کیا کرتے تھے، نیز اہل کمال کا علم سوق الوراقین کا رہین منت ہوتا تھا،

عہد عباسی میں کتب اور کتب خانہ سماجی زندگی کے لوازم سے سمجھا جاتا تھا، اس لیے کتابوں کی مانگ بہت بڑھ گئی تھی، تجارت کتب کے مستقل اور عارضی مرکزوں کے اسلامی قلمرو میں بہتات تھی، ہر قسم کی کتابیں عام بازاروں میں فروخت ہوتی تھیں، کتابوں کا خاص بازار بھی تھا جس کو سوق الوراقین[2]، سوق الکتبیین[3] اور سوق الکتب[4] کہا جاتا تھا، بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سوق الوراقین دراصل کاغذ سازی، کاغذ فروشی، اور سوق الکتبیین، سوق الکتب (کتب فروشی) کا بازار تھا، البتہ عرف عام میں ایک کا دوسرے پر اطلاق کیا جاتا تھا، اسی اعتبار سے اس کا یہاں ذکر کیا گیا ہے، جو لوگ سوق الکتب میں کتابیں فروخت کرتے تھے، انھیں کتبی کہا جاتا تھا، بہت سے اہل علم اس نسبت سے مشہور تھے، وراق کو بھی کتبی کے نام سے یاد کیا جاتا تھا، اس لیے کہ وہ اوراق وکتب کا مشغلہ رکھتا تھا، چنانچہ کتبی اور ابن الکتبی سے وراق کی شہرت اس امر کی غماز ہے

تیسری صدی ہجری میں بعض شہر جیسے بغداد کا سوق الکتب جو باب البصرہ کے سامنے واقع تھا[5]، یہ بازار

---

[1] تاریخ بغداد ج ۴، ص ۱۰۳ [2] لسان المیزان ج ۱، ص ۱۲۰ [3] الفہرست لابن الندیم ص ۲۰۹، تاریخ بغداد ج ۱۱، ص ۳۹۹، الحضارة الاسلامیة لادم متز ج ۱، ص ۲۶۹ [4] الخطط المقریزیہ ج ۲، ص ۱۰۲ [5] معجم البلدان ج ۳، ص ۱۴۹، الخطط المقریزیہ ج ۲، ص ۱۰۲، المقدمہ لابن خلدون ص ۵۵۰، خطط الشام ملکرد علی ج ۶، ص ۱۹۵۔

[6] المدخل فی تاریخ الحضارة تالیف ناجی معروف بغداد، مطبعة العانی، ۱۳۶۹ھ ص ۱۸۰۔

سینکڑوں دکانوں پر پھیلا ہوا تھا، ان دکانوں پر کتابیں سب معیاری طرح تھیں[1]، معلوم ہوتا ہے سوق الکتب مشاہیر کی کتابوں سے آباد رہتا تھا، اس کا اندازہ اس امر سے کیا جا سکتا ہے کہ ۳۰۹ھ میں جب منصور حلاج کو قتل کیا جانے لگا تو اس نے کہا تھا کہ میری کتابیں اہل السنۃ والجماعۃ کے مذہب پر سوق الکتب میں موجود ہیں[2]، یہ دکانیں چوک بازار میں کھولی جاتی تھیں، تاکہ ہر طرف سے آنے والے کاغذ بآسانی خرید سکیں، چنانچہ ابو نصر خمارتاش بن عبداللہ کاغذی رومی المسمیٰ بعمر المتوفی ۵۳۱ھ کی نیشاپور میں دکان چوک بازار میں واقع تھی[3]، یہ دکانیں بالعموم کسی مسجد کے قریب ہوتی اور کتابوں سے بھری رہتی تھیں[4]، اس لیے خریداروں کو کبھی مایوسی نہیں ہوتی تھی[5]، پھر سوق الکتب میں وراقوں کا عریف (expert) ہوتا تھا جس کی نظر سوق الکتب کے ذخائر پر رہتی تھی، وہ وراقوں اور خریداروں کی رہنمائی کرتا تھا، چنانچہ شرف الدین محاسن الصوری المتوفی ۶۶۳ھ قاہرہ کے سوق الکتب کے عریف تھے[6]،

ان بازاروں اور دکانوں کے علاوہ چھوٹے چھوٹے مقامات پر بھی کتب فروشوں کی دکانیں کھلی ہوتی تھیں[7]، وراق یہاں کتابیں بیچتے اور نقل بھی کرتے تھے، چنانچہ احمد بن جعفر وراق کی شرقی بغداد میں خان زیل میں اسی قسم کی دکان تھی، بعض وراق کتب خانوں میں کتابیں نقل کرتے اور اپنی دکان پر کتابیں بیچتے تھے[8]۔

عہد عباسی میں مشرقی و مغربی قلمرو کے دار الخلافہ اور مرکزی شہر کتابوں کی تجارت کی منڈیاں تھے، یہاں نہ صرف کتابیں، بلکہ پورے پورے کتب خانوں کی قیمت لگتی تھی، مغرب (یورپ) میں قرطبہ اور مشرق (ایشیا) میں بغداد کو اس امر میں شہرت خاص حاصل تھی، تنہا یہی فضیلت شہروں کی برتری کے ثبوت میں کافی

---

[1] مسلمانوں کی صنعت و حرفت، زراعت و تجارت از قرآن کریم، ترجمہ محمد جمیل الرحمن، الہ آباد، کتابستان ۱۹۳۳ء ص ۵۔
[2] تکملۃ تاریخ الطبری لمحمد بن عبد الملک الہمدانی تحقیق البرت یوسف کنعان ج ۲: بیروت، المطبعۃ الکاثولیکیۃ ۱۹۶۱ء، ص ۲۵۔ [3] التحبیر للسمعانی ج ۱ ص ۲۷۲ [4] مسلمانوں کی صنعت و حرفت ص ۵، [5] ایضاً [6] الذیل علی الروضتین لابی شامہ، ص ۲۳۶ [7] الفہرست لابن الندیم، ص ۱۴۱ (فلوگل) [8] معجم الادباء ج ۵، ص ۶۷۔

بھی جاتی تھی، چنانچہ مناظروں میں یہاں کے لوگ دوسرے شہر کے رہنے والوں کا یہی بات کہہ کر منہ بند کرتے اور اپنی برتری کا اظہار کرتے تھے، ابوالفضل تیفاشی کا بیان ہے:

"ایک مرتبہ مراکش میں سلطان مغرب المنصور یعقوب موحدی (۵۵۵ھ، ۵۸۰ھ تا ۵۹۵ھ / ۱۱۶۰ء تا ۱۱۹۹ء) کے دربار میں ۵۸۰ھ میں مشہور فلسفی و فقیہ ابن رشد المتوفی ۵۹۵ھ اور حکیم ابوبکر محمد بن عبدالملک ابن زہر ایادی المتوفی ۵۹۵ھ میں اس موضوع پر مناظرہ ہوا، ابن رشد نے ابن زہر سے کہا: تم جو فضائل بتاتے ہو میں یہ نہیں جانتا، بس ایک ہی بات جانتا ہوں کہ اگر کوئی عالم اشبیلیہ میں مرتا ہے تو اس کی کتابیں بکنے کے لیے قرطبہ آتی ہیں، یہاں ان کی قیمت اچھی ملتی ہے اور اگر کوئی گویا قرطبہ میں مرتا ہے تو اس کے گانے بجانے کے سامان کے دام وہاں اچھے ملتے ہیں، اور پھر کہا[1]:

قرطبة اكثر بلاد الله كتباً. — قرطبہ بلادِ اسلامی میں کتابوں کی کثرت میں سب سے بڑھا ہوا ہے:

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی قلمرو میں کتابوں کا شوق بڑھتے بڑھتے وجہ افتخار بن گیا تھا۔

بلادِ مشرقی میں بھی جب کوئی مرتا اس کی کتابیں بغداد میں اچھی قیمت میں بکتی تھیں، چنانچہ ابوالعباس جعفر ابن احمد مروزی کی کتابیں ان کی وفات کے بعد ۲۷۴ھ میں اہواز سے فروخت کے لیے بغداد لائی گئیں، اور طاق حرانی میں فروخت کی گئی تھیں[2]،

اس سے یہ حقیقت عیاں ہو جاتی ہے کہ ہر شہر میں کتابیں بکتی تھیں، لیکن مرکزی شہروں میں کتابوں کی قیمت زیادہ ملتی تھی، یہاں چونکہ کتابیں اور کتب خانے فروخت ہوتے تھے اس لیے شائقین کتب ان مرکزی شہروں کا بار بار سفر کرتے تھے، ابونصر سہل بن مرزبان المتوفی تقریباً ۴۲۰ھ نے نفیس و نادر کتابوں کی جستجو میں بغداد کا بار بار سفر کیا تھا[3]، اس سے عوام و خواص میں کتابوں کے شوق کا اندازہ کیجیے

---

[1] نفح الطیب للمقری ج۱ ص ۱۴۴ [2] الفہرست لابن الندیم ص ۲۱۴ - ۲۱۵ [3] یتیمۃ الدہر للثعالبی ج۴ ص ۲۸۶۔

جاسکتا ہے[1]

رات میں کتب فروش سوق الوراقین میں دوکانیں اہل علم کو کرایہ پر دے کر تشنگان علم کی پیاس بجھاتے، طلب و رسد کے سلسلہ کو پروان چڑھاتے، معاشرے کی علمی استعداد میں اضافہ کرنے کی سعی کرتے تھے، چنانچہ سوق الوراقین میں جاحظ کو رات بھر کے لیے دوکانیں کرایہ پر دی جاتی تھیں[2]، سوق الوراقین میں نصابی کتابوں کی خرید فروخت سب سے زیادہ ہوتی تھی[3]۔

ہر علم و فن کی کتابیں اتنی بڑی تعداد میں سوق الوراقین میں موجود رہتی تھیں کہ اہل علم کو ہر وقت ان کی ضرورت کی کتابیں دستیاب ہوتی تھیں، جن کتابوں کی طلب زیادہ ہوتی ان کے نسخے بھی سوق الوراقین میں زیادہ پائے جاتے تھے، اور جن کتابوں کی مانگ کم ہوتی یا جن کی طرف اہل علم کی رغبت کم ہوتی تھی وہ کتابیں سوق الکتب میں کم ملتی تھیں[4]، بازار کتب میں لوگ عالموں اور کتابوں سے استفادہ کرنے کے بعد جو کتابیں اپنے مطلب کی پاتے ان کو خرید لیتے تھے جن اہل علم کو اساتذۂ فن سے کتابوں کی سند حاصل نہیں ہوتی اور معاشرہ میں عالم و مصنف کے روپ میں نمایاں ہونے کی خواہش چٹکیاں لیتی تھی، وہ سوق الوراقین سے کتابیں خرید کر اور ان کتابوں پر نامور علماء سے اپنی قراءت و سماعت کی نسبت کرکے روایت کرتے تھے[5] یہ سوق الوراقین سے خریدی ہوئی کتابوں کو عام کرنے والے صحفی کہلاتے تھے، معاشرہ میں لفظ صحفی ان کی علمی حیثیت کا تعین کرنے اور ان کے سلسلۂ سند کو ناقابل اعتبار قرار دینے کے لیے کافی سمجھا جاتا تھا، عجب حسن اتفاق ہے کہ صحافی اور صحافت کو آج بھی معاشرے میں تحقیق کا درجہ حاصل نہیں ہے،

کتابوں کی نقل انفرادی و اجتماعی | عہد عباسی میں اگر کسی کو کئی جلد والی کتاب درکار ہوتی تو اس کے اجزاء اور

---

[1] مسلمانوں کی صنعت و حرفت ص ۵۰، [2] الفہرست لابن الندیم ص ۱۶۹، معجم الادباء ج ۶، ص ۵۶ [3] المحدث الفاصل للرامہرمزی، ص ۲۱۰، تذکرۃ السامع و المتکلم لابن جماعۃ ص ۱۶۴ [4] الوساطۃ بین المتنبی و خصومہ لعلی بن عبد العزیز الجرجانی، تحقیق محمد ابو الفضل ابراہیم و علی محمد البیجاوی، القاہرۃ مطبعۃ عیسی البابی الحلبی ۱۳۸۶ھ ص ۵۱ [5] تاریخ بغداد ج ۸ ص ۳۶۷ ۔

مجلدات مختلف وراقوں کو دے کر نقل کرائی جاتی تھی، اس طرح ضخیم سے ضخیم متعدد جلد والی کتاب بہت جلد، اور کم سے کم مدت میں جلدی تیار ہو جاتی تھی، چنانچہ امین الدولہ ابو الحسن بن غزال نے ایک مرتبہ ابن عساکر کی تاریخ دمشق جو اسّی جلدوں میں تھی نقل کرانی چاہی تو اسے دس کاتبوں میں تقسیم کر دیا، ہر کاتب کے حصہ میں آٹھ جلدیں آئیں، اور انھوں نے دو برس میں پوری کتاب نقل کرالی تھی[1]

مصنف و وراق کی نقل میں فرق | عالم، مصنف اور وراق کی کتابت میں فرق تھا، وراق کمائی اور وصولی کی خاطر کشادہ لکھتا، عالم و مصنف کم اوراق میں زیادہ لکھتا، جگہ کم گھیرتا اور کاغذ بھی احتیاط سے استعمال کرتا تھا، تاکہ خرچ کم ہو، وہ تھوڑے پیسوں میں زیادہ کتابیں نقل کرتا، تاکہ نقل و حمل اور سفر میں لے جانے میں سہولت ہو، اس کا لکھا ہوا وراق سے زیادہ مستند سمجھا جاتا تھا، چنانچہ ابو علی حسین ماسرجسی نے مسند ابی بکر دس جزوں سے کچھ زیادہ میں لکھی، اسے وراق نے ساٹھ جزوں سے بھی زیادہ میں نقل کیا تھا[2]

یہ سوق الوراقین سے پیدا ہونے والی خوبیاں تھیں جو علم و فن کو پھیلا رہی تھیں، لیکن کچھ لوگ اس میں ایسے بھی در آئے تھے جو تصنیف و تالیف کی قابل قدر صلاحیتیں رکھتے اور اچھی تصنیف و تالیف کرتے، مگر احساس کمتری یا نفع اندوزی کی خاطر وہ اپنی تحریریں کسی معروف مصنف کے نام سے فروخت کرنے لگے تو ماہرین کتابیات اور کتب شناسوں نے ایسے اصحاب کا کھوج لگایا، ان کو نمایاں کیا، تاکہ جعل سازی کی حوصلہ افزائی نہ ہو سکے، ابن الندیم نے اس جعل سازی کے تدارک کے لیے "الفہرست" میں ایسے اشخاص و کتب کی جا بجا نشاندہی کی ہے اور یہ نشاندہی کتب خانوں میں کتابوں کے انتخاب میں بڑی مدد و معاون رہی۔

فن کتابیات کی تاریخ میں جعل سازی کی نشاندہی کا آغاز ابن الندیم نے کیا ہے، ان جعل سازیوں کے اظہار کے لیے وضع، اختلاق، انتحال وغیرہ کے الفاظ استعمال کیے جاتے تھے جعل سازی کی وجہ سے سوق الوراقین کے علمی وقار کو نقصان پہونچا جس کی یادگار اردو زبان میں ایک لفظ سو قیانہ ادب (بازار کے لائق) معرض وجود

[1] عیون الانباء لابن ابی اصیبعہ ج ۲ ص ۲۰۶ [2] تذکرۃ الحفاظ للذہبی ج ۳ ص ۹۵۶۔

میں آیا، جو ان ہی جعل سازوں کے فن کا نتیجہ ہے۔

دورِ عباسی میں وراق اور کتب فروش بھی اہل علم کو مستعار بلا منفعت کتابیں مہیا کرتے تھے، چنانچہ ایک وراق نے ابن جریر طبری کو صرف قیاس کے موضوع پر چالیس سے کچھ کم کتابیں مستعار مہیا کی تھیں[1]۔

فروخت کتب کے مستقل و عارضی مرکز | سوق الوراقین کتابوں کی خرید و فروخت کے مستقل مرکز تھے، کتابوں کی خرید و فروخت کے عارضی مرکز وہ وقتی مقامات تھے جہاں کسی مجبوری کے تحت کتابوں کا ذخیرہ فوری طور پر بیچا جاتا تھا، جیسے علماء کے مکانات جہاں مرنے کے بعد ان کی کتابیں اور ان کا کتب خانہ بکتا تھا، کوفہ میں ابن الاعرابی کا کتب خانہ ان ہی کے مکان پر ابو جعفر قطبی نے خریدا تھا[2]۔ کبھی کسی خاص مقام پر مقررہ دنوں میں فروخت کی جاتی تھیں، چنانچہ ابو الفتوح ناصر بن علی انصاری المعروف بابن صورہ المتوفی ۶۰۷ھ اپنے مکان کے دروازہ کی دہلیز پر بیٹھا کرتا اور دو شنبہ اور چہار شنبہ کو علماء و رؤسا آتے، اور اپنی پسند کی کتابیں خرید کر لے جاتے تھے[3]۔ اجزاء اور مجلدات جب ذخیرۂ کتب میں رل مل جاتیں تو جو کتابیں ناقص ہو جاتی تھیں انھیں تلاش کر کے پورا کرتے تھے، موصوف فروخت کتب میں پورے اجزاء اور مجلدات کا اہتمام کرتے تھے، اسی لیے ہفتہ میں دو دن فروخت کرتے تھے[4]۔

وزراء، امراء، و رؤسا اور وہ لوگ جو اپنے کاروبار یا علمی کاموں میں انہماک کی وجہ سے سوق الکتب نہیں جا سکتے تھے یا کم جاتے تھے وہ دلالوں کی معرفت جنھیں "دلال الکتب" اور "سمسار" کہا جاتا تھا، کتابیں منگاتے[5] اور خریدا کرتے تھے[6]۔

بعض اوقات نایاب کتابوں کی جستجو کے لیے جہاں گشت ادباء کی خدمات حاصل کی جاتی تھیں، چنانچہ

---

[1] معجم الادباء ج ۶، ص ۴۵۳ [2] ایضاً، [3] ابن خلکان ج ۱، ص ۶۳، [4] الذیل علی الروضتین لابی شامہ ج ۱ ص ۱۲۸، کتاب السلوک للمقریزی ج ۱، ص ۳۷۷، النجوم الزاہرۃ لابن تغری بردی ج ۶ ص ۳۲۳ -

[5] الخطط المقریزیۃ ج ۲ ص ۱۰۶، [6] معجم الادباء ج ۵ ص ۴۴۳، اعلام النبلاء بتاریخ حلب الشہباء تالیف محمد راغب الطباخ، حلب المطبعۃ العلمیۃ سنہ ۱۳۴۲ھ ج ۴، ص ۳۴۱۔

قاضی فاضل نے وزیر ابونصر احمد بن یوسف منازی المتوفی سنہ ۴۳۷ھ کے دیوان کو جو بہت نایاب تھا، "بعض الادباء السفار" چند جہاں گشت ادیبوں کو مامور کیا تھا، لیکن وہ بھی اس کے حاصل کرنے میں ناکام رہے تھے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ عہد عباسی میں نایاب کتب کو حاصل کرنے کے لیے کیا تدبیریں اختیار کی جاتی تھیں[1] بادشاہوں اور وزیروں کے گماشتے حصول کتب کی خاطر اسلامی قلمرو کے مشرقی و مغربی شہروں میں سفر کرتے رہتے تھے[2]

عہد عباسی میں مصنف یا اہل علم امراء اور قدردانوں کے یہاں کتاب پہونچاتے تو اس کی قیمت کچھ نہیں ہوتی تھی، کتاب ان کی طرف سے ہدیہ اور دینار ان کی جانب سے عطیہ ہوتے تھے، اس طرح امراء اہل علم کی قدر و ہمت افزائی کر کے کتابیں حاصل کرتے تھے، چنانچہ محمد بن عبدالملک زیات کو جاحظ نے کتاب الحیوان کا نسخہ پیش کیا تو اس نے پانچ ہزار دینار اس کو دیے تھے، اور جب ابن ابی داؤد کو کتاب البیان والتبیین کا نسخہ دیا تو اس نے بھی جاحظ کو پانچ ہزار دینار دیے، جب اس نے ابراہیم بن عباس کو کتاب الزرع والنخل کا نسخہ پیش کیا تو اس نے اس کو پانچ ہزار دینار عطا کیے تھے[3]

عہد عباسی میں ذخائر کتب میں اضافہ کے تین اہم ذرائع

عہد عباسی میں عموماً ذخائر کتب میں تین اہم ذرائع سے اضافہ کیا جاتا تھا:

(ا) حسب ضرورت وقتاً فوقتاً کتابیں سوق الوراقین سے خریدی جاتی تھیں۔

(ب) کتب خانہ میں کاتب و وراق کتابت پر مامور کیے جاتے جو شب و روز لکھتے رہتے اور کتابوں میں اضافہ کرتے رہتے تھے، جیساکہ واقدی کا معمول تھا (ج) اساتذہ اپنے تلامذہ کو کئی بار نشتر کتابیں املاء کرا کر کتابوں کی نشر و اشاعت کرتے، تازہ بنظر ثانی شدہ ایڈیشن ذخائر کتب میں اضافہ کرتے رہتے تھے، چنانچہ ابو عبداللہ محمد بن زیاد اعرابی (۱۵۰-۲۲۵ھ) کی مجلس درس کے متعلق ابوالعباس ثعلب کا بیان ہے "اس کی مجلس املاء و درس میں بیک وقت سو طلبہ شرکت کرتے تھے، اور وہ ان اہل علم کو کئی بار نشتر علم لکھواتے تھے"[4]

(باقی)

---

[1] الوافی بالوفیات للصفدی ج ۸ ص ۲۰۵ [2] الحلۃ السیراء لابن الآبار طبع مصر ۱۹۶۳ء ج ۱ ص ۲۰۲ تاریخ ابن خلدون ج ۴ ص ۳۱۷ نفح الطیب للمقری ج ۱ ص ۲۶۲ [3] معجم الادباء ج ۶ ص ۷۶ [4] الفہرست لابن الندیم ص ۱۰۳۔

مطبوعات جدیدہ

معرکۂ سنت و بدعت:۔ مرتبہ جناب محمد اشفاق حسین صاحب، متوسط تقطیع، کاغذ، کتابت وطباعت قدرے بہتر، صفحات ۳۲۰، قیمت پندرہ روپیے، پتے:۔ (۱) مکتبۂ نشاۃ ثانیہ معظم جاہی مارکٹ حیدرآباد، نمبر ۱ (۲) کوثر ایجنسی چھتہ بازار حیدرآباد نمبر ۲ (۳) مکتبۂ تجلی دیوبند (یو۔ پی)

جس طرح ایک مسلمان کے لیے اتباع سنت لازمی ہے اسی طرح اجتناب بدعت بھی ضروری ہے، یہ کتاب اسی مقصد سے لکھی گئی ہے اور اس میں سنت کی اہمیت واضح کی گئی ہے اور بدعتوں کی تردید کی گئی ہے یہ پندرہ[15] ابواب پر مشتمل ہے، پہلے بدعت اور تحریف دین کی مذمت اور مانعین بدعت کی فضیلت قرآن مجید اور احادیث سے واضح کی ہے، اور مختلف حدیثوں سے بدعات کے نقصانات دکھائے ہیں، نیز ان کے فروغ واشاعت کے اسباب تحریر کیے ہیں، پھر دو[2] ابواب میں کتاب وسنت اور آثار صحابہ کے اتباع کی اہمیت بیان کی ہے، اور ایک باب میں اجماع اور سواد اعظم کا مطلب بیان کیا ہے، اور اس پر زور دیا ہے کہ سواد اعظم سے عوام کی کثرت کے بجائے اہل علم کی کثرت مراد ہے، ایک باب میں بدعت واجتہاد کا فرق دکھا کر اہل بدعت کے نقطۂ نظر کی تردید کی ہے، ایک باب بدعت کی حقیقت اور اس کی تعریف وتوضیح پر مشتمل ہے، اس کتاب میں جا بجا بدعت کی حسنہ وسیئہ کی تقسیم کو غلط ثابت کیا ہے، اور لکھا ہے کہ اس کا خواہ کوئی بھی نام دیا جائے دین میں اس کی کوئی گنجائش نہیں، لائق مصنف نے بدعت حسنہ کو باطل ثابت کرنے کے لیے احادیث وآثار صحابہ کے علاوہ بکثرت ائمہ متقدمین اور کبار علماء کے اقوال نقل کیے ہیں، رد بدعت میں یہ

ایک مفید کتاب ہے، جو لایق مطالعہ ہے، لیکن اس کی ترتیب اور زبان و بیان میں کسی قدر ناہمواری ہے اور کہیں کہیں تکرار اور غیر ضروری طوالت بھی ہے، مصنف کو مناظرانہ انداز سے پرہیز کرنا اور مباحث کو سمیٹ کر لکھنا چاہیے تھا۔

عورت :۔ مرتبہ مولانا افتخار فریدی صاحب، متوسط تقطیع، کاغذ، کتابت و طباعت عمدہ، صفحات ۳۱۶، مجلد، قیمت ۲۵ روپیے، ناشر عرشی پبلیکیشنز انڈیا ۱۲۰۵، کتاب گھر، آصف علی روڈ، دہلی ۲

مولانا افتی فریدی کو دعوت و تبلیغ کے کام سے بڑی دلچسپی اور فطری مناسبت ہے، اس لیے وہ مسلمانوں کی اصلاح اور دین کی اشاعت کے لیے برابر فکرمند رہتے ہیں، اور اس غرض سے مفید دینی و تبلیغی کتابیں اور رسالے بھی شایع کرتے رہتے ہیں، ابھی تک ان کی توجہ مردوں کی جانب زیادہ مبذول تھی، اب انھوں نے عورتوں کی اصلاح و ہدایت کی جانب بھی توجہ کی ہے، اور یہ مفید کتاب شایع کی ہے، جس کی حیثیت کشکول جیسی ہے، اس میں عورتوں کے تعلق سے گوناگوں مفید اور ضروری باتوں کا تذکرہ ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ عورت کے بارہ میں اسلامی اور جاہلی نقطۂ نظر کیا ہے؟ اسلام سے پہلے اس کی کیا حیثیت تھی، اور اسلام نے اسے کیا درجہ دیا ہے، ہندو سماج اور بعض دوسرے مذاہب میں اس کی کیا حیثیت ہے، اور اس کے بارہ میں موجودہ مغربی نظریات کیا ہیں؟ مصنف کا اصل مقصد عورت کے بارہ میں اسلامی تعلیم و ہدایت کو پیش کرنا ہے، اس لیے انھوں نے ان حقوق و فرایض کی زیادہ وضاحت کی ہے جو اسلام نے اس کو دیے اور بتائے ہیں، انھوں نے عورتوں کی چار حیثیتوں ماں، بہن، بیوی اور بیٹی کا ذکر کر کے بھی ان کے مسئلہ پر روشنی ڈالی ہے، اور ان کے مذہبی و معاشرتی مسائل اور پردہ وغیرہ پر اچھی گفتگو کی ہے، گذشتہ اور موجودہ دور کی متعدد ایسی خواتین کا بھی تذکرہ کیا ہے جو علمی و عملی حیثیت سے بہت ممتاز تھیں، اس سلسلہ میں جنگ و جہاد اور اشاعت اسلام میں ان کے کارنامے، علمی و دینی خدمات اور نمایاں دینی و اخلاقی خصوصیات بیان کی ہیں، مصنف نے متعدد اہل علم اور اصحاب قلم کی مفید تحریریں اور

شعراء کی موثر نظمیں یکجا کر دی گئی ہیں، جن کا مطالعہ ہر مسلمان خاتون کے لیے مفید ہوگا، انھوں نے حسبۃً للہ یہ کتاب لکھی ہے اس لیے اس میں ربط و تسلسل اور ترتیب وغیرہ کا زیادہ خیال نہیں رکھا ہے۔

تذکرۂ طیب:۔ مرتبہ مولوی ابوبکر غازیپوری تقطیع کلاں، کاغذ، کتابت و طباعت قدرے بہتر، صفحات ۲۷۰، قیمت ۲۵ روپیہ، پتہ:۔ المکتبۃ الاثریۃ قاسمی منزل، سید واڑہ غازی پور (یو۔پی)

یہ کتاب مولانا قاری محمد طیب مرحوم مہتمم دارالعلوم دیوبند پر متعدد اصحاب کے مضامین اور تحریروں کا مجموعہ ہے، شروع میں ممتاز علماء مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، مولانا سعید احمد اکبرآبادیؒ اور مولانا محمد منظور نعمانی وغیرہ کی تاثراتی تحریریں درج ہیں، پھر ان کے حالات و سوانح، فضل و کمال، سیرت و شخصیت اور خدمات و کارناموں پر مشتمل مضامین پیش کیے گئے ہیں، شعراء کا منظوم خراج عقیدت اور اخبار و رسائل کے اداریے بھی شامل کیے گئے ہیں، لیکن ملک کا اکثر و بیشتر حصہ کو نظرانداز کر دیا گیا ہے، مولانا محمد طیب صاحبؒ کی شخصیت گوناگوں خوبیوں کی جامع تھی، اس تذکرہ میں ان کی سیرت و شخصیت کے مختلف پہلوؤں کی عکاسی کی گئی ہے، بعض مضامین میں ان کی تصنیفات اور شاعری پر تبصرہ کیا گیا ہے، اور بعض میں ان کی تقریروں کی دلنشینی اور خطابت میں غیر معمولی کمال کا ذکر ہے، اس کا بھی تذکرہ ہے کہ ان کے دور میں دارالعلوم دیوبند ترقی کے بام عروج پر پہونچ گیا، مولانا برہان الدین سنبھلی استاذ دارالعلوم ندوۃ العلماء کا مضمون لائق مطالعہ ہے، انھوں نے دارالعلوم کے فکر و مسلک کے تحفظ و اشاعت کے لیے مولانا محمد طیبؒ کی غیر معمولی جد و جہد کا تذکرہ کیا ہے، مولانا محمد طیبؒ اور دارالعلوم دیوبند میں گوشت و ناخن جیسا تعلق تھا، بعض مضامین میں ان کی اس سے جدائی کا المناک ذکر بھی آگیا ہے، لیکن اس کی جو توجیہ کی گئی ہے وہ ایک دوسرے سے مختلف ہے، چنانچہ بعض مضمون نگاروں نے خود مہتمم صاحبؒ ہی پر اس کی ذمہ داری عاید کی ہے، اور بعض نے ان کے متعلقین اور قریبی اشخاص کو اور بعض نے ان کے مخالفین کو ذمہ دار ٹھہرایا ہے، اس کتاب کو مولانا محمد طیب کے شایان شان تو نہیں کہا جا سکتا، اور نہ یہ ان کی مستقل سوانح عمری ہے بعض مضامین بھی فکر و نظر، زبان و بیان کی حیثیت سے کم درجہ کے ہیں، تاہم لائق مرتب نے اسے محنت اور

دلچسپی سے مرتب کیا ہے، اور اس کے لیے وہ حوصلہ افزائی کے مستحق ہیں۔

مضامین وحشت :۔ مرتبہ جناب جمال احمد صدیقی صاحب تقطیع متوسط، کاغذ، کتابت و طباعت اچھی، صفحات ۳۰۴، مجلد مع گردپوش، قیمت ۱۰ روپے، پتہ مغربی بنگال اردو اکادمی ۱۸ا سندری موہن ایوینیو کلکتہ۔

جناب رضا علی وحشت مرحوم کلکتہ کے مشہور ادیب و شاعر تھے، ان کے قلم کی روانی نظم و نثر دونوں میں یکساں تھی، انھوں نے مشق سخن کے ساتھ بہت سے ادبی و تنقیدی مضامین بھی لکھے تھے، زیر نظر کتاب ان کے چھوٹے بڑے پندرہ مضامین کا مجموعہ ہے، پہلے اردو کے قدیم شاعر ولی گجراتی کی شاعری پر سیر حاصل مضمون ہے، اس کے بعد شیخ علی حزیں پر مبسوط مضمون ہے، ان دونوں میں ان شعراء کے کلام کا جائزہ لے کر ان کے لفظی و معنوی محاسن دکھائے ہیں کہیں کہیں دوسرے شعراء سے ان کا موازنہ بھی کیا ہے، اور شیخ علی حزیں کے مختصر حالات بھی تحریر کیے ہیں، اور مختلف عنوانات کے تحت ان کے کلام کا انتخاب بھی دیا ہے، ایک مضمون میں پنجاب کے فارسی گو شاعر غنیمت کی قادر الکلامی دکھائی ہے، چند مضامین میں اردو غزل میں اصلاح کی ضرورت واضح کی ہے اس سلسلہ میں مولانا حالی مرحوم کی اصلاحی کوششوں کا ذکر بھی کیا ہے، اور ایک مستقل مضمون میں ان کی غزل گوئی پر اظہار خیال کیا ہے، جناب عندلیب شادانی کے نام ان کا ایک طویل مکتوب بھی درج ہے جس میں شعر و ادب کے دلچسپ نکتے بیان کیے ہیں، دوسرے مضامین میں بنگال کی اردو خدمات کا اجمالی جائزہ اور چند بنگالی شعراء کے خصوصیات کلام پر بحث کی ہے، ان مضامین میں اہل بنگال کی اردو بیزاری کا گلہ کرتے ہوئے ایک جگہ لکھا ہے "یہ وہی بنگالہ تھا جو بلا تفریق مذہب و ملت اردو کی خدمت کرتا تھا، یا اب وہی بنگالہ ہے کہ ایک مسلمان کے اردو بولنے پر کوئی غیر مسلم نہیں بلکہ ایک مسلمان اپنے تیور بدل لیتا ہے" اور اردو بولنے والے کو نفرت کی نظر سے دیکھنے لگتا ہے، وہ صرف اسی پر اکتفا نہیں کرتا بلکہ اردو بولنے والوں کو ہر قسم کا نقصان پہونچانا اپنا قومی و ملکی فرض سمجھتا ہے" تفو بر تو اے چرخ گرداں تفو" افسوس کہ بنگال کے لوگوں نے اپنے اس مایہ ناز فرد کی دردمندانہ شکایت کا کوئی اثر قبول نہ کیا بلکہ ان کے رویہ میں مزید شدت پیدا ہو گئی ہے جس کا وقتاً فوقتاً مظاہرہ بھی ہوتا رہتا ہے، یہ مضامین بہت پہلے لکھے گئے تھے، اب نئے رجحانات نے شعر و ادب اور تنقید کے دائرہ میں بڑی وسعت پیدا کر دی ہے، لیکن خالص ادب کی ترو تازگی میں فرق نہیں آتا، اس لحاظ سے اس گلدستہ ادب کی اشاعت پر مغربی بنگال اردو اکاڈمی تحسین کی مستحق ہے۔

"ض"

حیات سلیمان

یہ محض جانشین شبلی مولانا سید سلیمان ندویؒ کی سادہ سوانح عمری ہی نہیں ہے، بلکہ ان کے گوناگوں مذہبی، علمی، قومی، ملی، سیاسی حالات اور کارناموں کا ایک دلآویز مرقع ہے جس میں سید صاحبؒ کے دور کی نصف صدی کی ملی و قومی، سیاسی و علمی، ادبی و لسانی تحریکوں مثلاً ہنگامۂ مسجد کانپور، تحریک خلافت، تحریک ترک موالات، جنگ آزادی، مسئلۂ ملوکیت حجاز وغیرہ کی تفصیل بھی ضمناً آگئی ہے، اسی کے ساتھ دارالمصنفین جو سید صاحبؒ کی زندگی کا سب سے بڑا کارنامہ ہے، اس کی تاسیس، سال بہ سال اس کی ترقی کی روداد کے ساتھ ان کے قیام بھوپال، سفر پاکستان، قیام پاکستان کے دوران کی علمی خدمات کا تذکرہ اور پھر مختلف وفود کے رکن و صدر کی حیثیت سے سفر یورپ، سفر حجاز، سفر افغانستان وغیرہ کی مفصل روداد بھی سید صاحبؒ کے خطوط اور تحریروں کی روشنی میں قلمبند ہوگئی ہے، یہ کتاب اپنے اسلوب و طرز انشاء کے لحاظ سے بالکل حیات شبلی کا ثانی ہے، ویسی ہی دلکش، دلچسپ اور دلنشین۔

مولفہ مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی قیمت ۴۲ روپے

سلوک سلیمانی

مولانا سید سلیمان ندویؒ کے عزیز ترین پاکستانی مسترشد مولانا سید سلیمان اشرف خان صاحب سلیمانی صدر شعبۂ عربی پشاور یونیورسٹی نے "سلوک سلیمانی پر ایک اجمالی نظر" کے عنوان سے ایک طویل مقالہ لکھا تھا جو معارف میں ستمبر ۱۹۵۵ء سے جنوری ۱۹۵۶ء تک مسلسل نکلتا رہا، یہ علمی حلقوں میں بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھا گیا، اسی مضمون کو مزید اضافوں کے ساتھ مولانا اشرف صاحب نے کتابی صورت میں سلوک سلیمانی کے نام سے دو جلدوں میں شائع کیا ہے، ان میں حضرت سید صاحبؒ کی سلوک و معرفت سے متعلق تعلیمات کو مرتب کی توضیحات و تعبیرات کی روشنی میں پیش کیا گیا ہے، ان دونوں جلدوں کو افادۂ عام کی خاطر دارالمصنفین نے بھی چھاپ کر شائع کیا ہے۔

قیمت جلد اول ۳۰ روپیے   قیمت جلد دوم ۲۵ روپیے

تصنیفات مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ

۱۔ سیرۃ النبی جلد سوم: معجزہ کے امکان و وقوع پر علم کلام اور قرآن مجید کی روشنی میں مفصل بحث۔ قیمت ۴۰/-

۲۔ سیرۃ النبی جلد چہارم: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیغمبرانہ فرائض۔ 〃 ۴۸

۳۔ سیرۃ النبی جلد پنجم: فرائض خمسہ نماز، زکوٰۃ، روزہ، حج، جہاد پر سیر حاصل بحث۔ 〃 ۴۴

۴۔ سیرۃ النبی جلد ششم: اسلامی تعلیمات، فضائل و رذائل اور اسلامی آداب کی تفصیل۔ 〃 ۴۸

۵۔ سیرۃ النبی جلد ہفتم: معاملات پر مشتمل متفرق مضامین و مباحث کا مجموعہ۔ 〃 ۱۶

۶۔ رحمت عالم ؐ: مدرسوں اور اسکولوں کے چھوٹے بچوں کے لیے سیرت پر ایک مختصر اور جامع رسالہ۔ ۵

۷۔ خطبات مدراس: سیرت پر آٹھ خطبات کا مجموعہ جو مسلمانان مدراس کے سامنے دیے گئے تھے۔ ۱۱

۸۔ سیرۃ عائشہ ؓ: حضرت عائشہ صدیقہ کے حالات و مناقب و فضائل۔ 〃 ۱۹

۹۔ حیات شبلی ؒ: مولانا شبلی ؒ کی بہت مفصل اور جامع سوانح عمری۔ 〃 ۴۸

۱۰۔ ارض القرآن ج ۱: قرآن میں جن عرب اقوام و قبائل کا ذکر ہے ان کی اثری اور تاریخی تحقیق۔ 〃 ۱۸

۱۱۔ ارض القرآن ج ۲: بنو ابراہیم کی تاریخ قبل از اسلام عربوں کی تجارت اور مذاہب کا بیان۔ 〃 ۱۳

۱۲۔ خیام: خیام کے سوانح و حالات اور اس کے فلسفیانہ رسائل کا تعارف۔ 〃 ۳۴

۱۳۔ عربوں کی جہاز رانی: بمبئی کے خطبات کا مجموعہ۔ 〃 ۱۲

۱۴۔ عرب و ہند کے تعلقات: ہندوستان اکیڈمی کے تاریخی خطبات (طبع دوم عکسی) 〃 ۴۰

۱۵۔ نقوش سلیمانی: سید صاحب ؒ کے منتخب مضامین کا مجموعہ، جن کا انتخاب خود موصوف نے کیا تھا۔ 〃 ۲۴

۱۶۔ یاد رفتگان: ہر شعبۂ زندگی کے مشاہیر کے انتقال پر سید صاحب ؒ کے تاثرات۔ (زیر طبع طبع دوم عکسی) ۰۰۰۰

۱۷۔ مقالات سلیمان اول: ہندوستان کی تاریخ کے مختلف پہلوؤں پر مضامین کا مجموعہ۔ 〃 ۲۶

۱۸۔ مقالات سلیمان دوم: تحقیقی اور علمی مضامین کا مجموعہ۔ 〃 ۲۳

۱۹۔ مقالات سلیمان سوم: مذہبی و قرآنی مضامین کا مجموعہ (بقیہ جلدیں زیر ترتیب ہیں) 〃 ۲۳

۲۰۔ بریدِ فرنگ: سید صاحب کے یورپ کے خطوط کا مجموعہ۔

۲۱۔ دروس الادب حصہ اول و دوم: جو عربی کے ابتدائی طالب علموں کے لیے مرتب کیے گئے۔ 〃 ۳۰-۲

رجسٹرڈ نمبر ۔ ایم ایل ۔ پی ۔ ۳۴ اکتوبر ۱۹۸۶ء

معارف

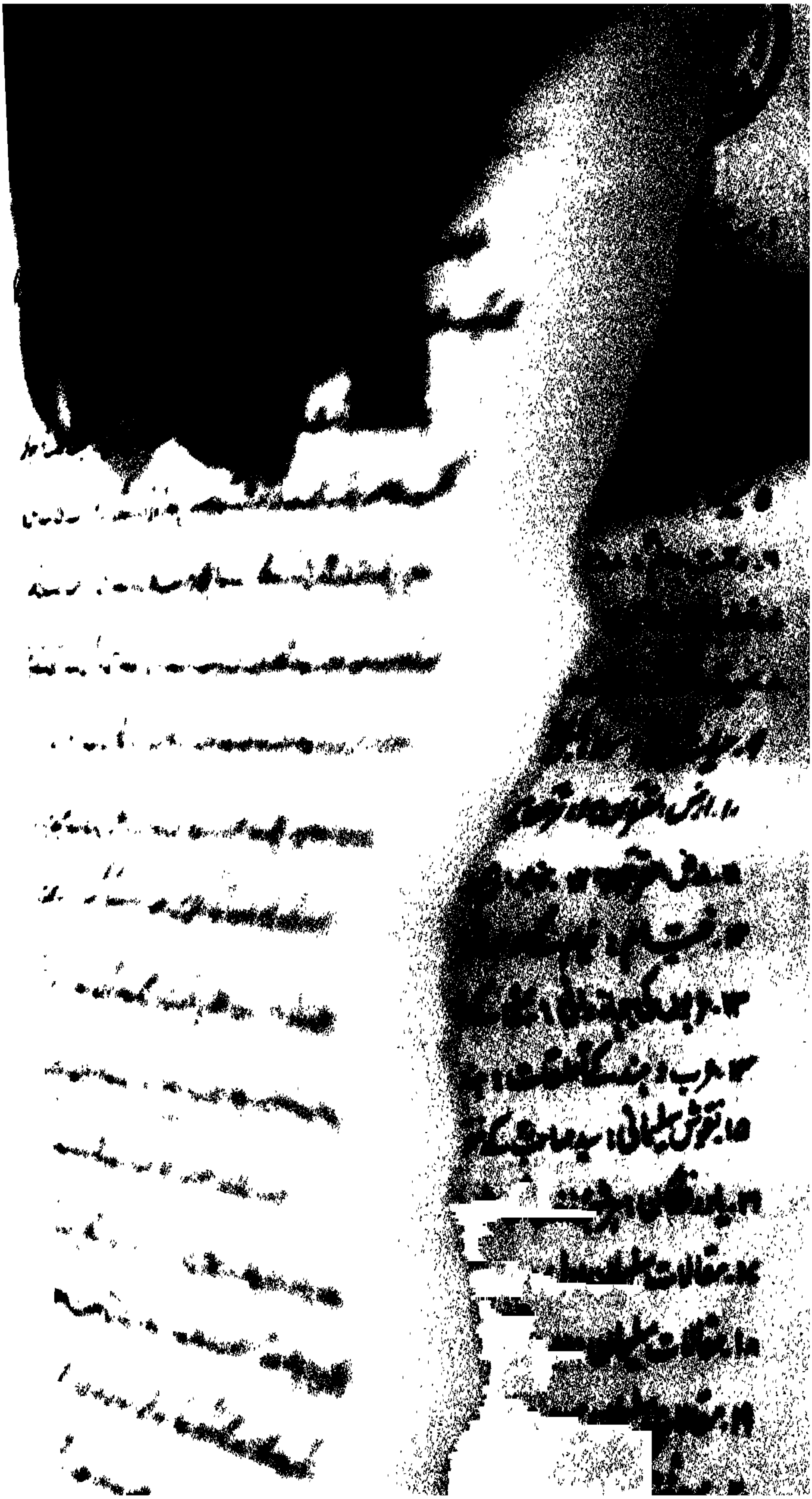
دار المصنفین کا ماہوار علمی رسالہ

مرتبہ

سید صباح الدین عبد الرحمٰن

قیمت تیس روپیے سالانہ

دفتر دار المصنفین اعظم گڈھ
(یوپی ۔ ۲۷۶۰۰۱)



[illegible] جمع کرنے والا)، البر (نیک اور مجسم خیر)، المقسط (عادل

[illegible] معنی ہیں کہ وہ بے پناہ محبت کرنے والا ہے، یا جب وہ اپنے کو
[illegible] محبت کرتا ہے جیسا باپ اپنے بیٹے سے کرتا ہے، یا جب وہ اپنے کو
[illegible] محبت والا ہے جیسی ماں کو اپنے بیٹے سے ہوتی ہے، اللہ تعالیٰ
[illegible] اپنے بندے سے بھی یہی چاہتا ہے کہ وہ اس کے ان صفات کو سامنے

[illegible] کو نماز پڑھنے کا اس لیے حکم دیتا ہے کہ نماز کھلی بدکاریوں اور ناپسندیدہ
[illegible] روزے رکھنے کو اس لیے کہتا ہے کہ ان سے روزے رکھنے والوں کو تقویٰ
[illegible] اس لیے زور دیتا ہے کہ اس سے دل کی صفائی اور غریبوں کی مدد ہوتی ہے،
[illegible] معلوم دنوں میں اللہ کی یاد ہو۔ (حج : ۴)

[illegible] اپنے رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو سارے جہانوں کے لیے رحمت
[illegible] کرنے والا، خدا کی طرف پکارنے والا ایک چراغ بنا کر

[illegible] کی سیرت دونوں ایک ہیں، یہ عملی نمونہ کہاں مل سکتا ہے کہ
[illegible] دشمن لشکریوں کو پسپا کر دے، مگر صلح کے لیے وہ خواستگار ہوتے
[illegible] فتح کر دیا ہو، فاتح ایسا کہ مفتوح ہو کر وہ شقی اور ظالم لوگ
[illegible] کے سامنے نہتے اور بے بس ہو کر کھڑے ہو جاتے ہیں ان سے
[illegible] والا ہے تو وہ پکار اٹھے کہ تو شریف بھائی اور شریف

مجلسِ ادارت

ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کی مذہبی رواداری

تاریخ ہندوستان کا سلسلہ اب تک اٹھائیس کتابوں تک پہونچ چکا ہے، اس ضمن میں ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کی مذہبی رواداری کا بھی ایک سلسلہ شروع کیا گیا ہے، جس کی اب تک تین جلدیں شایع ہو چکی ہیں۔

جلد اول

اس میں مغل دور سے پہلے کے مسلمان حکمرانوں کی مذہبی رواداری، فراخ دلی اور وطن دوستی رعایا پروری کے دلچسپ واقعات مستند ماخذوں کی مدد سے پیش کیے گئے ہیں، قیمت ۱۲ روپے

جلد دوم

اس میں مغل فرماں روا بابر، ہمایوں، سوری خاندان کے شیر شاہ اور اسلام شاہ، پھر مغل اکبر، جہانگیر اور شاہجہان کی مذہبی رواداری، فراخ دلی، وطن دوستی، رعایا پروری کے سبق واقعات پیش کیے گئے ہیں، قیمت ۲۳ روپیے۔

جلد سوم

اس میں جدو ناتھ سرکار کی کتاب کا جواب خود اس کی کتاب کے حوالوں سے اس طرح پیش کیا گیا ہے کہ اورنگزیب عالمگیر اور اسکے بعد کے مغل بادشاہوں کی مذہبی رواداری، فراخدلی، وطن دوستی اور رعایا پروری کی تفصیلات آگئی ہیں مرتبہ سید صباح الدین عبدالرحمن۔ قیمت ۳۰ روپے

جلد ۱۳۶ ماہ محرم الحرام سنہ ۱۴۰۶ھ مطابق ماہ اکتوبر سنہ ۱۹۸۵ء عدد ۴

مضامین

مقالات

آثار علمیہ

باب التقریظ والانتقاد

شذرات

اخباروں کی یہ خبر پرانی ہو چکی ہے کہ ایک فرقہ پرست، مردم بیزار، مسلم آزار اور ملک دشمن شخص نے کلکتہ ہائی کورٹ میں ایک درخواست داخل کرکے اس ملک میں کلام پاک کی اشاعت کو ممنوع قرار دینے کی کوشش کی۔

یہ درخواست ہائی کورٹ سے خارج کر دی گئی تھی، مگر کلکتہ کے مشہور ایڈووکیٹ جناب خواجہ محمد یوسف کے ایک مکتوب سے معلوم ہوا کہ مدعی نے ہائی کورٹ کے فیصلہ پر نظر ثانی کرنے کی درخواست دی ہے، اس کا یہ بھی اعلان ہے کہ وہ سپریم کورٹ میں بھی اپیل کرے گا، اس کے پیچھے جو مقصد کارفرما ہے اس پر اظہار کرنے کی ضرورت نہیں، البتہ اس کی طرف توجہ دلانی ہے کہ کلام مجید میں یہ صدائے ربانی ہے کہ جن لوگوں نے قرآن کے پیش کردہ راستہ کے خلاف دوسرا راستہ پسند کیا ہے تو اللہ نے ان کے دلوں اور کانوں پر مہر لگا دی ہے (۲ : ۷) اور اگر انھوں نے اللہ کے بتائے ہوئے طریقہ پر چلنے سے انکار کر دیا ہے تو ان کی حالت بالکل ایسی ہی ہے جیسے چرواہا جانوروں کو پکارتا ہے اور وہ ہانک پکار کی صدا کے سوا کچھ نہیں سنتے، وہ بہرے گونگے اور اندھے ہیں، اس لیے کوئی بات ان کی سمجھ میں نہیں آتی (۲ : ۱۷۱) کلام پاک میں یہ بھی ہے کہ کون ہے جو ابراہیمؑ کے طریقہ سے نفرت کرے، وہی جس نے خود اپنے آپ کو حماقت وجہالت میں مبتلا کر لیا، اس کے سوا کون یہ حرکت کر سکتا ہے۔ (۲ : ۱۳۰)

قرآن پاک ہی میں مسلمانوں کو مخاطب کرکے یہ بھی کہا گیا ہے کہ ایسے لوگ تمہارا کچھ بگاڑ نہیں سکتے، زیادہ سے زیادہ بس کچھ ستا سکتے ہیں۔ (۳ : ۱۱۱) کیونکہ کلام پاک کی تعلیمات کچھ ایسی اعلیٰ اور اٹل ہیں کہ ان کو کوئی نقصان نہیں پہونچا سکتا، مسلمانوں کو فخر ہے کہ یہ تمام انبیاءؑ کی تعلیمات کا عطر مجموعہ ہے، اس میں اللہ تعالیٰ کی ننانوے صفتوں کا ذکر ہے، جن میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ رحمٰن (نہایت مہربان)، رحیم (بار بار رحمت کرنے والا)، ذوالجلال والاکرام (صاحبِ جلال وعظمت)، ستّار (چھپانے والا)، غفّار (بخشش کرنے والا) غفور رحیم (بخشنے والا اور رحم کرنے والا) العدل (سراپا انصاف)، العفو (معاف کرنے والا) الوہاب (عطا کرنے والا)، الحلیم (بردبار)، الصبور (بندوں کی

گستاخیوں پر صبر کرنے والا) التواب (بندوں کے حال کی طرف رجوع کرنے والا) البر (نیک اور مجسم خیر) المقسط (عادل اور منصف) ہے۔

جب وہ اپنے کو ودود کہتا ہے تو اس کے یہ معنی ہیں کہ وہ بے پناہ محبت کرنے والا ہے، یا جب وہ اپنے کو رؤف کہتا ہے تو اس کا یہ مطلب ہے کہ وہ ویسے ہی محبت کرتا ہے جیسا باپ اپنے بیٹے سے کرتا ہے، یا جب وہ اپنے کو حنّان سے یاد کرتا ہے تو اس سے یہ مراد ہے کہ وہ ایسی ہی محبت والا ہے جیسی ماں کو اپنے بیٹے سے ہوتی ہے، اللہ تعالیٰ نے اپنی ان صفتوں کا ذکر اس لیے کیا ہے کہ وہ اپنے بندے سے یہی چاہتا ہے کہ وہ اس کے ان صفات کو سامنے رکھ کر دنیا میں اس کے بندوں سے پیش آئیں۔

اللہ تعالیٰ قرآن مجید میں اپنے بندوں کو نماز پڑھنے کا اس لیے حکم دیتا ہے کہ نماز کھلی بدکاریوں اور ناپسندیدہ باتوں سے روکتی ہے' (عنکبوت: ۵) وہ روزے رکھنے کو اس لیے کہتا ہے کہ ان سے روزے رکھنے والوں کو تقویٰ حاصل ہوتا ہے، (بقرہ: ۲۴) وہ زکوٰۃ کو ضروری اس لیے قرار دیتا ہے کہ اس سے دل کی صفائی اور غریبوں کی مدد ہوتی ہے' (الیل) اس نے حج کی اہمیت اس لیے رکھی ہے کہ چند معلوم دنوں میں اللہ کی یاد ہو۔ (حج: ۴)

پھر اسی کلام پاک میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو سارے جہان کے لیے رحمت (الانبیاء: ۱۰۷) نیکوں کو خوشخبری سنانے والا، غافلوں کو ہشیار کرنے والا، خدا کی طرف پکارنے والا ایک چراغ بنا کر بھیجا ہے' (احزاب: ۴۵)

قرآن مجید کی تعلیمات اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت دونوں ایک ہیں، یہ عملی نمونہ کہاں مل سکتا ہے کہ سپہ سالار ایسا کہ مٹھی بھر ہمراہیوں کو لے کر ہزاروں آہن پوش لشکریوں کو پسپا کردے، مگر صلح کے لیے وہ خواستگار ہوتے ہوں تو اپنی رحم دلی سے صلح کے کاغذ پر بے چون وچرا دستخط کر دیتا ہو، فاتح ایسا کہ مفتوح ہوکر وہ شقی اور ظالم لوگ جن کی تشنہ لبی خون نبوت کے سوا کسی اور چیز سے بجھ نہیں سکتی تھی سامنے نہتے اور بے بس ہو کر کھڑے ہو جاتے ہیں ان سے یہ فاتح پوچھتا ہے کہ تم کو کچھ معلوم ہے کہ تم سے کیا معاملہ ہونے والا ہے تو وہ پکار اٹھے کہ تو شریف بھائی اور شریف

شذرات

اخباروں کی یہ خبر پرانی ہو چکی ہے کہ ایک فرقہ پرست، مردم بیزار، مسلم آزار اور ملک دشمن شخص نے کلکتہ ہائی کورٹ میں ایک درخواست داخل کرکے اس ملک میں کلام پاک کی اشاعت کو ممنوع قرار دینے کی کوشش کی۔

یہ درخواست ہائی کورٹ سے خارج کر دی گئی تھی، مگر کلکتہ کے مشہور ایڈووکیٹ جناب خواجہ محمد یوسف کے ایک مکتوب سے معلوم ہوا کہ مدعی نے ہائی کورٹ کے فیصلہ پر نظر ثانی کرنے کی درخواست دی ہے، اس کا یہ بھی اعلان ہے کہ وہ سپریم کورٹ میں بھی اپیل کرے گا، اس کے پیچھے جو مقصد کار فرما ہے اس پر اظہار کرنے کی ضرورت نہیں، البتہ اس کی طرف توجہ دلائی ہے کہ کلام مجید میں یہ صدائے ربانی ہے کہ جن لوگوں نے قرآن کے پیش کردہ راستہ کے خلاف دوسرا راستہ پسند کیا ہے تو اللہ نے ان کے دلوں اور کانوں پر مہر لگا دی ہے (۲ : ۷) اور اگر انھوں نے اللہ کے بتائے ہوئے طریقہ پر چلنے سے انکار کر دیا ہے تو ان کی حالت بالکل ایسی ہی ہے جیسے چرواہا جانوروں کو پکارتا ہے اور اور وہ ہانک پکار کی صدا کے سوا کچھ نہیں سنتے، وہ بہرے گونگے اور اندھے ہیں، اس لیے کوئی بات ان کی سمجھ میں نہیں آتی (۲ : ۱۷۱) کلام پاک میں یہ بھی ہے کہ کون ہے جو ابراہیمؑ کے طریقہ سے نفرت کرے، وہی جس نے خود اپنے آپ کو حماقت و جہالت میں مبتلا کر لیا، اس کے سوا کون یہ حرکت کر سکتا ہے۔ (۲ : ۱۳۰)

قرآن پاک ہی میں مسلمانوں کو مخاطب کرکے یہ بھی کہا گیا ہے کہ ایسے لوگ تمھارا کچھ بگاڑ نہیں سکتے، زیادہ سے زیادہ بس کچھ ستا سکتے ہیں۔ (۳ : ۱۱۱) کیونکہ کلام پاک کی تعلیمات کچھ ایسی اعلیٰ اور اٹل ہیں کہ ان کو کوئی نقصان نہیں پہونچا سکتا، مسلمانوں کو فخر ہے کہ یہ تمام انبیاءؑ کی تعلیمات کا عطر مجموعہ ہے، اس میں اللہ تعالیٰ کی ننانوے ۹۹ صفتوں کا ذکر ہے، جن میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ رحمٰن (نہایت مہربان)، رحیم (بار بار رحمت کرنے والا)، ذوالجلال والاکرام (صاحبِ جلال و عظمت)، ستّار (چھپانے والا)، غفّار (بخشش کرنے والا) غفور رحیم (بخشنے والا اور رحم کرنے والا) العدل (سراپا انصاف)، العفو (معاف کرنے والا) الوہاب (عطا کرنے والا)، الحلیم (بردبار)، الصبور (بندوں کی

گناہوں پر صبر کرنے والا) التواب (بندوں کے حال کی طرف رجوع کرنے والا) البر (نیک اور مجسم خیر) المقسط (عادل اور منصف) ہے۔

جب وہ اپنے کو وَدود کہتا ہے تو اس کے یہ معنی ہیں کہ وہ بے پناہ محبت کرنے والا ہے، یا جب وہ اپنے کو رؤف کہتا ہے تو اس کا یہ مطلب ہے کہ وہ ویسے ہی محبت کرتا ہے جیسا باپ اپنے بیٹے سے کرتا ہے، یا جب وہ اپنے کو حنّان سے یاد کرتا ہے تو اس سے یہ مراد ہے کہ وہ ایسی ہی محبت والا ہے جیسی ماں کو اپنے بیٹے سے ہوتی ہے، اللہ تعالیٰ نے اپنی ان صفتوں کا ذکر اس لیے کیا ہے کہ وہ اپنے بندے سے بھی یہی چاہتا ہے کہ وہ اس کے ان صفات کو سامنے رکھ کر دنیا میں اس کے بندوں سے پیش آئیں۔

اللہ تعالیٰ قرآن مجید میں اپنے بندوں کو نماز پڑھنے کا اس لیے حکم دیتا ہے کہ نماز کھلی بدکاریوں اور ناپسندیدہ باتوں سے روکتی ہے' (عنکبوت: ۵) وہ روزے رکھنے کو اس لیے کہتا ہے کہ ان سے روزے رکھنے والوں کو تقویٰ حاصل ہوتا ہے، (بقرہ: ۲۴) وہ زکوٰۃ کو ضروری اس لیے قرار دیتا ہے کہ اس سے دل کی صفائی اور غریبوں کی مدد ہوتی ہے' (الیل) اس نے حج کی اہمیت اس لیے رکھی ہے کہ چند معلوم دنوں میں اللہ کی یاد ہو۔ (حج: ۴)

پھر اسی کلام پاک میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو سارے جہان کے لیے رحمت (الانبیاء: ۱۰۷) نیکوں کو خوشخبری سنانے والا، غافلوں کو ہشیار کرنے والا، خدا کی طرف پکارنے والا ایک چراغ بنا کر بھیجا ہے' (احزاب: ۴۵)

قرآن مجید کی تعلیمات اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت دونوں ایک ہیں، یہ عملی نمونہ کہاں مل سکتا ہے کہ سپہ سالار ایسا کہ مٹھی بھر ہمراہیوں کو لے کر ہزاروں آہن پوش لشکریوں کو پسپا کر دے، مگر صلح کے لیے وہ خواستگار ہوتے ہوں تو اپنی رحم دلی سے صلح کے کاغذ پر بے چون و چرا دستخط کر دیتا ہو، فاتح ایسا کہ مفتوح ہو کر وہ شقی اور ظالم لوگ جن کی تشنہ لبی خون نبوت کے سوا کسی اور چیز سے بجھ نہیں سکتی تھی سامنے نہتے اور بے بس ہو کر کھڑے ہو جاتے ہیں ان سے یہ فاتح پوچھتا ہے کہ تم کو کچھ معلوم ہے کہ تم سے کیا معاملہ ہونے والا ہے تو وہ پکار اٹھے کہ تو شریف بھائی اور شریف

یہ ارشاد ہے، فاتح کی طرف سے اعلان ہوتا ہے کہ تم پر کچھ الزام نہیں، جاؤ تم سب آزاد ہو، بادشاہ ایسا کہ اس کے قبضہ میں ہوتے خزانوں کے خزانے رہے ہوں، لیکن مہینوں اس کے گھر میں چولھا نہ جلتا ہو، انسان دوست ایسا کہ عرب کے ذرہ ذرہ کی فکر رکھتا ہو، مگر اسی کے ساتھ خدا کے سوا کسی اور کی یاد اس کو نہ ہو۔

قرآن مجید ہی میں مسلمانوں کو یہ کہکر سمجھایا گیا ہے کہ تم تمام امتوں میں بہترین امت، اسی وقت ہو سکتے ہو جب تم اچھے کاموں کا حکم دیتے رہو، برائیوں کو روکتے رہو اور اللہ پر ایمان رکھتے رہو (۳: ۱۰۹) پھر تاکید کی گئی ہے کہ تم دنیا کو نیکی کی طرف بلاتے رہو، بھلائی کا حکم دیتے اور برائیوں کو روکتے رہو، تو دنیا میں فلاح پاؤگے (۳: ۱۰۴) تمہارے لیے برگزیدگی اسی وقت ہے جب تم اللہ کے رشتے کو مضبوط پکڑو، جان اور مال دونوں کو اس کے لیے لٹاؤ، وہی تمہارا آقا ہے، جس کا آقا خدا ہو، اس کا کیا ہی اچھا مالک ہے اور کیسا قوی مددگار ہے (۲۲: ۷۸) مزید تصریح کی گئی ہے کہ مسلمانوں کی قوم وہ قوم ہے کہ اگر ہم ان کو حکومت اور بزرگی دے کر دنیا میں قائم کر دیں تو وہ اللہ کی عبادت اور اس کے نام کی تقدیس کو قائم کریں گے، مال و دولت سے انسانوں کو فائدہ پہونچائیں گے اور دنیا سے برائیوں کو مٹائیں گے اور سب کا انجام اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے (۲۲: ۴۳) کیا یہ ساری تعلیمات ایسی ہیں کہ ان کی ترویج اور تلقین پر پابندی لگا دی جائے۔

اخباروں ہی سے معلوم ہوا کہ کلکتہ ہائی کورٹ میں درخواست دینے والے کا یہ الزام بھی ہے کہ مسلمانوں کی تاریخ میں جنگ و جدل بہت رہی اس لیے ان کے قرآن کی اشاعت پر پابندی لگانے کی ضرورت ہے، یہ الزام رکھتے وقت مدعی کو شاید اپنے قدیم ہندوستان کی تاریخ یاد نہیں رہی، ہندوستان کی مقدس کتاب مہابھارت میں تو صرف لڑائیوں ہی کا ذکر ہے، دوسری پوتر کتاب رامائن میں رام اور راون کی جنگ کی تفصیل مزے لے لے کر پڑھی جاتی ہے، موریا، گپت اور کشان وغیرہ کے خاندانوں کی تاریخ میں معلوم نہیں کتنی لڑائیاں ہوئیں، ہندوؤں اور بودھوں کی لڑائیاں تو مذہبی تاریخ میں بہت ہی ہولناک سمجھی گئی ہیں، شودروں سے ہندوؤں کی اونچی ذاتوں کی منافرت تو انسانیت کی تذلیل ہے، راجستھان کے اندر راجپوتوں کی خانہ جنگیاں مشہور ہیں، مرہٹوں، جاٹوں اور بندیلوں کی غارتگری تو ضرب المثل بن گئی تھی، موجودہ دور میں گاندھی جی کا قاتل کون ہے، پھر ایسے لوگوں کی مقدس کتابوں کی اشاعت پر بھی پابندی عائد کرنے کا حکم صادر کیا جا سکتا ہے ؟۔

مقالات

مستشرقین کے متعلق دو متضاد رائیں

از

مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی مرحوم، سابق ناظم دار المصنفین

"یہ تحریر آج سے اکسٹھ سال پہلے اپریل سنہ ۱۹۴۲ء کے معارف میں شایع ہوئی تھی، یہ اس لیے شایع کی جارہی ہے کہ ہمارے ناظرین اس کا مطالعہ کرکے خود فیصلہ کریں کہ ان مستشرقین کے متعلق اب سے پہلے جو رائیں تھیں وہ اب ویسے ہی باقی ہیں یا کچھ تبدیلی پیدا ہوگئی ہے، یا ہو رہی ہے۔" (ص۔ع)

اس سیاسی دور میں جب کہ ہر کام اور ہر عمل کی تہ میں کوئی نہ کوئی غرض پنہاں ہوتی ہے، مشرقیات اور اسلامیات کے متعلق مستشرقین کی تحقیقات کے قبول کرنے کا سوال نہایت اہم ہے، اس میں شبہہ نہیں کہ بہت سے مستشرقین نے مسلمانوں کی بڑی خدمت کی، انھوں نے ساری ساری عمریں اسلامیات کی تحقیق میں صرف کردیں، اور بڑی جانکاہ محنت اور جانی و مالی قربانی برداشت کرکے مسلمانوں کے علوم و فنون اور ان کی گذشتہ عظمت کو دنیا کے سامنے پیش کیا، ان کی نادر اور نایاب کتابوں کا پتہ چلایا اور بڑی مشقت اور بڑے اخراجات برداشت کرکے انھیں حاصل کیا، اور نہایت اہتمام اور صحت کے ساتھ شایع کیا، ان پر حواشی لکھے، ان کی شرحیں لکھیں، مختلف زبانوں میں ان کے تراجم شایع کیے، اسلامی موضوعات پر نہایت بلند پایہ کتابیں تالیف کیں، اور اسلامی علوم و فنون کی ہر شاخ پر نہایت وسیع ذخیرہ فراہم

کر دیا جو مسلمانوں سے بھی ممکن نہ تھا۔

ان کی ان اسلامی خدمات سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا، اور ان کی محنت و جانفشانی کی داد نہ دینا ظلم اور احسان فراموشی ہے، لیکن اسی کے ساتھ جہاں تک مذہب اسلام کے متعلق ان کے افکار و خیالات اور تحقیقات کا تعلق ہے خاص اسلامی نقطۂ نظر سے ان کے قبول کرنے کا سوال نہایت اہم ہے، اس لیے کہ اسلامی مسائل کے متعلق زیادہ تر تحقیقات میں انھوں نے اب تک نیک نیتی کا کوئی ثبوت نہیں دیا ہے یا تو وہ مشرقی روایات، مشرقی مذاق اور اسلامی ذوق و نظر سے بیگانہ ہونے کی وجہ سے اسلامیات کے سمجھنے اور اس کے پیش کرنے میں نہایت فاش غلطیاں کرتے ہیں، یا عمداً وہ اسلام کو نہایت مسخ شدہ صورت میں پیش کرتے ہیں، بہر حال جو صورت بھی ہو ان کی یہ غلطیاں علم و فن کی خدمت اور تحقیق و ریسرچ کے پردہ میں ہوتی ہیں، یہ زمانہ ریسرچ اور تحقیق کا ہے، اس لیے ان سے خود مسلمانوں اور غیر قوموں میں اسلام کے متعلق سخت گمراہیاں پھیلی ہیں، بلکہ یہاں تک کہا جا سکتا ہے کہ مسلمانوں کو یونانی فلسفہ، مجمی دہریت اور ہندی خرافات، کسی سے اتنا نقصان نہیں پہونچا جتنا ان محققین کی زہر آلود تحریروں سے پہونچا ہے، جس کے مظاہر آئے دن آج کل کے جدید تعلیم یافتہ نوجوانوں میں نظر آتے ہیں، اس لیے مذہب اسلام کے متعلق ان کی تحقیقات پر اعتماد کرنا سخت غلطی ہے۔

ہندوستان کی طرح مصر میں بھی مستشرقین کے بارے میں دو متضاد رائیں ہیں، ایک جماعت ان کی علمی شہرت سے مرعوب ہو کر ان کی ہر جنبش قلم کو بلا چون و چرا مان لیتی ہے، اور دوسری جزا ان کی زہر چکانیوں سے واقف ہے وہ ان کی تحریروں کو ناقدانہ نظر سے دیکھتی ہے، حال میں مصر کے دو ممتاز اہل قلم ڈاکٹر حسین ہراوی اور ڈاکٹر زکی مبارک نے علی الترتیب مستشرقین کی مخالفت اور موافقت میں اپنے خیالات ظاہر کیے ہیں، ذیل میں ان کا خلاصہ پیش کیا جاتا ہے تاکہ ہندوستان کے تعلیم یافتہ اصحاب اور اہل علم بھی اس مسئلہ کی اہمیت سے واقف ہوں، حسین ہراوی لکھتے ہیں کہ

مستشرقین سے فائدہ سے زیادہ نقصان پہونچا ہے۔

جب ہم یورپین زبانوں کی کسی ایسی تالیف پر نظر ڈالتے ہیں جس میں مشرق یا اسلام کے اجتماعی یا عمرانی موضوعات پر مباحث ہوں تو ہم کو بہت سی خلافِ عقل و قیاس باتیں نظر آتی ہیں، خصوصاً ان کتابوں میں جو مذہب اسلام پر ہیں، ان میں نہ صرف خلافِ حقیقت اور خلافِ عقل و قیاس باتیں ہوتی ہیں، بلکہ ان میں اسلام کی ایسی عجیب و غریب اور بھیانک تصویر پیش کی جاتی ہے جسے کوئی مسلمان برداشت نہیں کر سکتا ہے، مشرقی آدمی اس کی یہ تاویل کر لیتا ہے کہ یہ غلطی مشرق کے حالات اور یہاں کے عادات و خصائل سے ناواقفیت کا نتیجہ ہے، اور مسلمان اسلام کی بھیانک تصویر دیکھ کر پیچ و تاب کھا کر رہ جاتا ہے۔

میں نے یہ رائے ان یورپین تصنیفات کو پڑھ کر قائم کی ہے جن سے بیک نظر ظاہر ہو جاتا ہے کہ لکھنے والے کو عموماً مشرق اور خصوصاً اسلام کی حقیقت سے مطلق واقفیت نہیں ہے، مثلاً: آرنل اپنی کتاب "شادی" میں لکھتا ہے کہ مصر میں اسلامی پردہ کا یہ اثر ہے کہ وہاں چودہ سال کی عمر کے بعد ماں بھی اپنی لڑکی کا چہرہ نہیں دیکھ سکتی، یا اسی کتاب میں ایک دوسرے موقع پر ہے کہ ریفی مصر کی لڑکی اپنے چہرہ کے علاوہ باقی جسم کے تمام حصوں کو مردوں کے سامنے عریاں کر سکتی ہے، یا کتاب 'شادی اور وراثت کی نسبت' میں ہے کہ اسلام نے پردہ اور تعدد ازدواج کے حکم سے تمدن پر ایک کاری ضرب لگائی ہے، یا اسی کتاب میں ایک اور مقام پر ہے کہ نعوذ باللہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) محض ایک زن پرست آدمی تھے، ان خیالات اور علمی ریسرچ سے لکھنے والے کی نسبت صاف ظاہر ہے کہ وہ حق و انصاف کو پامال کر کے محض اسلام کو بدنام کرنا چاہتا ہے،

یورپین مصنفات کی یہ خوبی ہے کہ اس میں ماخذوں کے حوالے بھی دے دیے جاتے ہیں، جب میں اصل ماخذ کی طرف رجوع کرتا تھا تو معلوم ہوتا تھا کہ ان کا ماخذ محض مستشرقین کے دماغ ہیں،

اس میں شبہہ نہیں ہے کہ یورپین زبانوں میں عام خاص تاریخوں اور مختلف قوموں اور ان کے

علمی کارناموں پر نہایت عمدہ کتابیں ہیں، میں نے یہ کتابیں دیکھی ہیں، ان میں دیکھنے والے کو ایک خاص بات نہایت نمایاں نظر آتی ہے کہ جب تک وہ قدیم و جدید تاریخ مثلاً مصر قدیم اور اس کے آثار اور عراق اور اس کی گذشتہ عظمت وغیرہ پر لکھتے ہیں اس وقت تک نہایت محققانہ لکھتے ہیں، لیکن جب اسلامی مباحث یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت پر قلم اٹھاتے ہیں تو ان کا قلم بہک جاتا ہے، اور وہ نہایت لغو، مہمل، ذلیل، رکیک، بلکہ جھوٹ باتیں تک لکھ جاتے ہیں، مثلاً ان کا قلم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ تصویر پیش کرتا ہے کہ نعوذ باللہ وہ جنگی مذہب کے بانی تھے، اور ان کو انسانی فضائل سے کوئی علاقہ نہیں، بلکہ اس سے کہیں زیادہ خرافات بک جاتے ہیں۔

مشہور پروفیسر مارگولیتھ جو یورپ میں اسلامیات کے امام فن مانے جاتے ہیں، اور آکسفورڈ میں اسلامیات کا درس دیتے ہیں، اپنی کتاب "تاریخ العالم" میں یہ نادر تحقیق پیش کرتے ہیں، کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) عبداللہ کے بیٹے ہیں، اور عبداللہ عرب میں اس لڑکے کو کہا جاتا تھا، جس کا باپ نامعلوم ہو، بہت ممکن ہے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے باپ کا نام عبداللہ بھی اسی وجہ سے پڑا ہو، اگر کوئی معمولی مستشرق اس قسم کی بیہودہ بات کہتا، تو قابل درگذر تھا، لیکن یہ اس شخص کی تحقیق ہے جو یورپ میں عربی کا سب سے بڑا ماہر ہے،

انسائیکلوپیڈیا آف اسلام کو لیجئے، جہاں تک عام تاریخ اسلام کا تعلق ہے، اس میں تمام چھوٹے بڑے مسائل پر نہایت تاریخی استقصاء کے ساتھ بحث ہے، لیکن اسی محققانہ کتاب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق نہایت دل شکن اور تکلیف دہ باتیں درج ہیں، اس کی کیا تاویل کی جاسکتی ہے۔

"تجنۃ العمل الغربی" کی تقریروں کے مجموعے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کمیٹی سیاسی استعمار کا ایک دام ہے، جس کا کام مستشرقین کے ذریعہ سے مشرق میں استعمار کی جڑیں مضبوط کرنا ہے، چنانچہ یہ کمیٹی مشرق میں اسلام کے مقابلہ کے گر بتاتی ہے، اور مستشرقین ان پوشیدہ تقریروں کو جو ان میں اسلام کے مقابلہ کی صورتیں بتائی جاتی ہیں غیر ملکوں میں اپنی حکومتوں کے پاس بھیجتے ہیں، چونکہ اسلام استعمار کے خلاف ایک زبردست تعلیم ہے، اس سے اسلام کو کمزور کرنے کے لیے یہ چال چلی جاتی ہے کہ شمالی افریقہ اور دوسرے اسلامی ملکوں میں جہاں کی مادری زبان عربی ہے،

عربی کی اہمیت گھٹا کر وہاں کے باشندوں کو مقامی زبانوں کے زندہ کرنے کے دام میں پھنسایا جاتا ہے تاکہ وہ ان کی طرف متوجہ ہو کر عربی زبان بھول جائیں، اور قرآن کے سمجھنے والے باقی نہ رہیں، اس وقت ان کے خیالات اور رجحانات کو اپنے سانچے میں ڈھال لیا جائے، (جیسا کہ آج کل ہندوستان میں ہو رہا ہے، اور اس کے مذموم نتائج بھی نکل رہے ہیں،

یہ تقریر جس کا میں نے اوپر ذکر کیا ہے، یوروپین مصنفات کی طرح اسلام کے متعلق خرافات کا ایک زہر چکاں مجموعہ تھی، مجھے یورپ کے قیام کے زمانہ میں یوروپین اشخاص سے اسلام پر گفتگو کرنے سے معلوم ہوا کہ ابتداء سے ان کی پرورش ایسے ماحول میں ہوتی ہے جس میں شروع ہی سے اسلام سے نفرت اور مسلمانوں کی تحقیر سکھائی جاتی ہے، تاکہ نہ وہ اسلام کی طرف مائل ہو سکیں اور نہ مسلمانوں سے مل سکیں۔

مشرق والوں کو مستشرقین سے کسی خیر خواہی اور ہمدردی کی توقع رکھنا عبث ہے، کہ وہ سانچے ہی مشرق کے مفاد کے خلاف ہیں، جن میں مستشرقین ڈھالے جاتے ہیں، یورپ کی یونیورسٹیوں میں خاص اغراض و مقاصد کے ماتحت طلبہ کو مشرقی زبانوں کی تعلیم دی جاتی ہے، ان میں جو طلبہ پڑھتے ہیں، انھیں مشرق سے کوئی قسم کا تعلق ہوتا ہے اور نہ مشرقی زبانوں سے کوئی محبت اور انسیت ہوتی ہے، بلکہ وہ اجنبی طلبہ ہوتے ہیں جنھیں استعماری مشین چلانے کے لیے ان ہی اصولوں پر ڈھالا جاتا ہے جن سے وہ استعماری مشین کا پرزہ بن سکیں، اور اس کا خاص اہتمام رکھا جاتا ہے کہ ان کی قومی عصبیت خارج نہ ہونے پائے، تاکہ وہ مشرق میں جا کر مشرق یا اسلام کی طرف مائل نہ ہو سکیں، ایسی صورت میں ان سے جن میں بعض آگے چل کر مستشرقین کے زمرہ میں آ جاتے ہیں، یا ان کے اساتذہ سے جو بڑے بڑے مستشرقین ہوتے ہیں، مشرق یا اسلام کے ساتھ انصاف کی توقع رکھنا بے کار ہے، مستشرقین خواہ یونیورسٹی کے احاطہ میں استاذ کے لباس میں ہوں، یا ماہر مصنف کی شکل میں، اپنے اصل مقصد کو کسی حالت میں نظر انداز نہیں کر سکتے۔

مستشرقین نے اسلام کے خلاف زہر پھیلانے کے لیے یہ عجیب فریب دہ طریقہ نکالا ہے کہ جب تک وہ

اسلامی تاریخ پر بحث کریں گے اُس وقت تک خاص معروضی رہیں گے لیکن جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی
سیرت، مذہب اسلام یا قرآن کی طرف متوجہ ہوں گے تو ہمیشہ مخالفانہ لکھیں گے کہ دوسرے اس کو پڑھ کر اسلام
سے خوفزدہ ہوں، اسلامی مباحث پر لکھنے میں وہ علمی دیانت اور تحقیقی اصول کو بھول جاتے ہیں، ان کا طریقہ
ہے کہ پہلے وہ اپنے ذہن میں ایک نظریہ یا ایک خیال فرض کرتے ہیں، اس کے بعد اس کے اسباب تلاش
کرتے ہیں، اگر قرآن میں کوئی ایسی شے مل گئی جو ان کے خیال میں ان کے مفید مطلب ہے، یا اسے کھینچ تان کر
اپنے مقصد کے مطابق بنا سکتے ہیں تو فوراً اسے لے لیتے ہیں، اور اگر قرآن ان کے مقصد کے معارض پڑتا ہے
تو اسے نظر انداز کر کے کہہ دیتے ہیں کہ قرآن میں ہے ہی نہیں، یہ تنہا میرا سوءِ ظن نہیں ہے بلکہ اس کے ثبوت
میں واقعات موجود ہیں، اس موقع پر مشتے نمونہ از خروارے دو واقعات پیش کیے جاتے ہیں۔

مثلاً انسائیکلوپیڈیا آف اسلام کے چیف ایڈیٹر موسیو ونسنک جو یورپ میں اسلامیات کے بڑے
متبحر عالم مانے جاتے ہیں، اور جن کی رائے اسلامی مباحث پر فیصلہ کا حکم رکھتی ہے، حضرت ابراہیمؑ اور
کعبہ کے متعلق لکھتے ہیں:

"اسپرنگر پہلا وہ شخص ہے جس کا ذہن سب سے پہلے ادھر منتقل ہوا کہ قرآن میں ابراہیم کی شخصیت بانیٔ
کعبہ کی حیثیت حاصل کرنے سے پہلے کئی دوروں سے گذر چکی ہے، اسپرنگر نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بدنام
کرنے اور آیندہ اس موضوع پر لکھنے والے مستشرق کے لیے ایک معمولی سی بنیاد ڈال دی، اس کے بعد
سنوک ہرگرونیہ نے اس کا سہارا پاکر ایک عظیم الشان عمارت تعمیر کر دی اور یہ دعویٰ کر دیا کہ قرآن کی ان سورتوں میں جو
پہلے نازل ہوئی ہیں، یا کی سورتوں میں (مثلاً: ذاریات آیت ۲۴، حجر آیت ۵۰، صافات آیت ۱۰۱، انعام
آیت ۷۴، اور مریم آیت ۴۲) میں حضرت ابراہیمؑ کی حیثیت محض ایک رسول کی ہے جو دوسرے انبیا
و رسلؑ کی طرح اپنی قوم کو ڈرانے کے لیے مبعوث ہوئے تھے، ان سورتوں میں اسمٰعیلؑ کے ساتھ ابراہیمؑ کے
کسی تعلق کا بھی ذکر نہیں ہے، اسی ضمن میں ہمارا مستشرق ان باتوں میں اشارۃً عرب میں رسول کی بعثت سے

بھی انکار کرجاتا ہے اور ثبوت میں (سجدہ آیت ۲، سبا آیت ۴۳ اور یٰسین آیت ۵) پیش کرکے کہتا ہے کہ آیات میں اس کا کہیں تذکرہ نہیں ہے کہ ابراہیمؑ کعبہ کے معمار یا پہلے مسلمان تھے۔

"لیکن مدنی سورتوں میں یہ حالت بدل جاتی ہے، اور ابراہیم حنیف مسلم اور ملت ابراہیمی کے بانی ہوجاتے ہیں جنھوں نے اسمٰعیلؑ کے ساتھ خانہ کعبہ کو بنایا، جیسا کہ (بقرہ آیت ۸۰ الخ اور آل عمران آیت ۸۰ الخ) سے ظاہر ہوتا ہے۔"

ان مفروضہ مقدمات کے بعد پھر یہ نتیجہ پیدا کیا جاتا ہے کہ اس اختلاف کا راز یہ معلوم ہوتا ہے کہ محمدؐ نے ابتداءً مکہ میں یہودیوں پر اعتماد کیا تھا، لیکن انھوں نے تھوڑے ہی دنوں کے بعد محمدؐ کے خیالات کو دشمنی پر محمول کیا، اس سے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو کسی دوسرے مددگار کی ضرورت پیش آئی، اس وقت ان کی ذکاوت اور عقل سلیم نے ابوالعرب ابراہیمؑ کی ایک نئی شان کی جانب توجہ دلائی جس کے وسیلے سے ان کو اس زمانہ کی یہودیت سے گلو خلاصی حاصل کرکے ابراہیمؑ کی یہودیت سے جو اسلام کا منشأ اور مولد ہے رشتہ جوڑنا آسان ہوگیا، اور جب مکہ والوں نے ان کے پیغمبرانہ خیالات کو قبول کرنا شروع کردیا، اس وقت ابراہیمؑ اس مقدس شہر کے مقدس گھر کے بانی ہوگئے۔"

ونسنک کے ان خیالات کو پڑھ کر دھوکا ہوجاتا ہے کہ اس نے جو کچھ لکھا ہے وہ صحیح ہے، اور اس نے اس تحقیق میں استقصاء کے ساتھ قرآن کی ایک ایک آیت کو پڑھ کر یہ رائے قائم کی ہے۔

لیکن اس کو حقیقت سے کوئی تعلق نہیں، اس نے اس دعویٰ میں انتہائی خیانت اور بددیانتی سے کام لیا ہے، اور اس کذب صریح سے اس کا مقصد صرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کی تکذیب ہے، اور اس زعم میں یہ آیات قرآنی اس کا ثبوت ہیں۔

وہ نہایت بے باکی کے ساتھ دعویٰ کرتا ہے کہ مکی سورتوں میں ابراہیمؑ کا ذکر معمار کعبہ کی حیثیت سے اور اسمٰعیلؑ کے ساتھ ان کے کسی تعلق کا ذکر نہیں ہے، اور مدنی سورتوں سے ملت ابراہیمؑ کا ذکر شروع

ہوتا ہے لیکن یہ تینوں دعوے سراسر جھوٹ ہیں۔

سورۂ ابراہیم خود مکی ہے، جس میں نہایت واضح طور پر کعبہ اور ابراہیمؑ اور اسماعیلؑ کے تعلق کا تذکرہ میں یوں ہے:

رَبَّنَآ اِنِّیٓ اَسْکَنْتُ مِنْ ذُرِّیَّتِیْ	اے ہمارے رب! میں نے اپنی کچھ اولاد
بِوَادٍ غَیْرِ ذِیْ زَرْعٍ عِنْدَ	بے کھیتی والی وادی میں تیرے معزز گھر کے پاس
بَیْتِکَ الْمُحَرَّمِ، رَبَّنَا لِیُقِیْمُوا	بسائی ہے، تاکہ وہ نماز پڑھیں پس تو لوگوں
الصَّلٰوۃَ فَاجْعَلْ اَفْئِدَۃً مِّنَ	کے دلوں کو ان کی طرف مائل کر دے اور ان کو
النَّاسِ تَھْوِیْٓ اِلَیْھِمْ وَارْزُقْھُمْ	پھلوں سے رزق دے، تاکہ یہ تیرا شکر ادا کریں،
مِّنَ الثَّمَرَاتِ لَعَلَّھُمْ یَشْکُرُوْنَ	اے ہمارے رب جو کچھ ہم چھپاتے ہیں اور
رَبَّنَآ اِنَّکَ تَعْلَمُ مَا نُخْفِیْ وَمَا	جو کچھ ظاہر کرتے ہیں اور اللہ پر کوئی چیز چھپی
نُعْلِنُ وَمَا یَخْفٰی عَلَی اللّٰہِ مِنْ شَیْءٍ	نہیں ہے، نہ زمین میں نہ آسمان میں، خدا
فِی الْاَرْضِ وَلَا فِی السَّمَآءِ، اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ	کا شکر ہے جس نے مجھے بڑھاپے میں اسماعیل اور
الَّذِیْ وَھَبَ لِیْ عَلَی الْکِبَرِ اِسْمٰعِیْلَ وَ	اسحٰق دیے، میرا رب دعا کا سننے والا ہے۔
اِسْحٰقَ اِنَّ رَبِّیْ لَسَمِیْعُ الدُّعَآءِ (ابراہیم)	.....

اسی طریقہ سے سورۂ انعام اور سورۂ نحل میں جو کی ہیں ملت ابراہیمی کا تذکرہ ہے! سورۂ انعام میں ہے:

قُلْ اِنَّنِیْ ھَدٰنِیْ رَبِّیْٓ اِلٰی صِرَاطٍ	(اے پیغمبر!) لوگوں سے کہہ دو کہ میرے
مُّسْتَقِیْمٍ دِیْنًا قِیَمًا مِّلَّۃَ اِبْرٰھِیْمَ	رب نے مجھ کو سیدھا راستہ دکھایا ہے
حَنِیْفًا وَمَا کَانَ مِنَ	اور وہی ٹھیک دین ہے جو ابراہیم کا
الْمُشْرِکِیْنَ۔ (انعام: ۱۶۱)	دین ہے، جو یکسو خدا کے ہو رہے تھے

(انعام — ۲) اور مشرکین میں نہ تھے۔

اور سورۂ نحل میں ہے:

ثُمَّ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ اَنِ اتَّبِعْ مِلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا وَّمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ۔ (نحل — ۱۲۳)

پھر ہم نے تمہاری طرف وحی بھیجی کہ ملت ابراہیمؑ کی پیروی کرو، جو یک خدا کے ہو رہے تھے، اور مشرکین میں نہ تھے۔

ان صریح آیات کے بعد ولیمسک کے دعویٰ سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ مستشرقین اسلامی موضوع پر لکھنے میں علمی دیانت سے کام نہیں لیتے، اور جہاں مذہبی ماخذ ان کے مقصد کے خلاف پڑتے فوراً اس سے انکار کر جاتے ہیں، جیسا کہ اوپر کی مثال سے واضح ہے، تنہا صرف ایک ہی واقعہ میں یہ حالت نہیں ہے، بلکہ وہ عموماً خیانت اور بد دیانتی سے کام لیتے ہیں۔

یہ بھی عجیب نادانی کی بات ہے کہ مستشرقین اسلام یعنی مشابراہیمی کو جس یہودیت سے ماخوذ بتاتے ہیں وہ حضرت ابراہیمؑ کی نسل کے بہت بعد کے ایک شخص یہوداہ کی جانب منسوب ہے، جن کا زمانہ حضرت ابراہیمؑ سے سینکڑوں برس بعد ہے، ایسی حالت میں ایک چیز اپنے صدیوں بعد کی پیدا شدہ چیز سے کس طرح ماخوذ ہو سکتی ہے، تعجب ہے کہ اس قسم کے خرافات اور واضح غلط بیانیوں کے بعد لوگ مستشرقین کی تحقیقات کو حجت سمجھتے ہیں، ان کی باتوں پر تو ایک لمحہ کے لیے اعتماد نہ کرنا چاہیے۔

اوپر کا بیان ڈاکٹر حسین ہمدانی کے خیالات کا خلاصہ ہے، ڈاکٹر زکی مبارک جن کی رائے میں مستشرقین سے فائدہ زیادہ پہونچتا ہے، اپنی رائے کی تائید میں یہ دلائل پیش کرتے ہیں:

مستشرقین سے نقصان سے زیادہ فائدہ پہونچتا ہے

مستشرقین کی جماعت ایک فاضل اور باکمال جماعت ہے، ان کے ساتھ ہمیں تعلق قائم رکھنا چاہیے اور ان سے تعاون کرنا چاہیے، جو لوگ ان سے علمی اور ادبی تعلقات قائم نہ رکھنے کی دعوت دیتے ہیں وہ یہ کہتے ہیں کہ:

مستشرقین مستعمرین کی فوج کا طلیعہ ہیں لیکن بالفرض اگر یہ صحیح بھی مان لیا جائے تو استعمار فی نفسہٖ کون سا جرم ہے، اور وہ اگر کوئی مضر اور قابل نفرت شے ہے تو اس کے انسداد کا یہ طریقہ تو نہیں کہ ہم مستعمرین کے محض دشمن بن جائیں، اور ان سے ہر طرح کے روابط و تعلقات منقطع کرلیں، بلکہ ہمیں اس کی مضرتوں کے روکنے کے مناسب وسائل اختیار کرنے چاہئیں، اور استعمار کے تدارک کے لیے مستعمرین کے علوم و فنون اور ان کے ان اسرار کا پتہ لگانا چاہیے جن کے ذریعہ وہ ہم پر وار کرتے ہیں، اور استعمار کا دام بچھاتے ہیں میرے نزدیک جو شخص اس کی زحمت گوارا نہیں کرتا اور انھیں ناقابل التفات سمجھ کر نظر انداز کر دیتا ہے وہ اپنا اور اپنی قوم دونوں کا دشمن ہے، اس لیے کہ ان کے لٹریچر اور خیالات سے ناواقفیت اور ان کے اغراض و مقاصد کے انسداد سے غفلت و بے پروائی کرنا ان کے مقاصد کو پورا کرنا اور انھیں غفلت میں دام ڈالنے کی جرأت دلانا ہے۔

یہ بھی علی الاطلاق صحیح نہیں ہے کہ سارے کے سارے مستشرقین دام استعمار کا حلقہ ہیں، اور وہ ساری عمر اسی کار خیر میں صرف کر دیتے ہیں، مستشرقیت کی ابتدا اس لیے ہوئی تاکہ یورپین نوجوانوں کو ایسے کاموں کی ترغیب دلائی جائے جس کے وسیلہ سے وہ نوآبادیات میں زندگی بسر کرسکیں، اور اس غرض کے لیے یورپ کے بڑے بڑے ملکوں میں عربی و فارسی وغیرہ بڑی بڑی زندہ مشرقی زبانوں کی تعلیم کے لیے خاص درسگاہیں قائم کی گئیں، جن کے تعلیم پائے ہوئے اکثر سفارتوں، تراجم کے دفتروں اور بعض درس و تدریس کی خدمات انجام دیتے ہیں، ان کی بڑی تعداد ایسے شعبوں میں نکل جاتی ہے جو معاش کے لیے مفید ہوں، اور بہت تھوڑی تعداد مشرقی علوم و آداب کے درس و مطالعہ کے لیے اپنا زندگی وقف کرتی ہے، اس شرذمۂ قلیل میں آیندہ چل کر بڑے بڑے علماء پیدا ہوتے ہیں، جو ایک عمر کی مشقت اور جد و جہد کے بعد صحیح معنوں میں عالم کہلانے کے مستحق ہوتے ہیں، ان کے علمی مذاق کی وجہ سے استعمار کی رگ اگر ہوتی بھی ہے تو دب جاتی ہے، اور وہ مشرق کے شرف و عظمت کے بڑے نقیب اور ان کی تہذیب و معاشرت

بلکہ ان کے مذہب کے بڑے حامی و مددگار بن جاتے ہیں۔

ان کے اس خالص اور بے آمیز مشرقی میلان کا ثبوت بعض مستشرقین کا خالص نظری مسائل کی جانب انہماک ہے، جس میں کہیں سے استعماری اغراض کی آمیزش نہیں ہوتی، مثلاً بہت سے مستشرقین بصریوں اور کوفیوں کے صرفی و نحوی مذاہب کے فروق کے درس و مطالعہ میں مشغول ہو جاتے ہیں، اور مصادر کے جمع کرنے اور ان کے نصوص و شواہد اور علمائے فن کے فیصلوں کے طبع و اشاعت میں برسہا برس گذار دیتے ہیں، بعض مختلف قبائل کی بولیوں اور ان کے لہجوں کے اختلافات کی تحقیق میں برسوں صرف کر دیتے ہیں، اور اسی قبیل کے بہت سے خالص علمی اور بے غرضانہ خدمات انجام دیتے ہیں، ان خدمات کو کون منصف مزاج استعماری اغراض کے ماتحت شمار کر سکتا ہے۔

سب سے بڑا اعتراض یہ ہے کہ مستشرقین غلطیاں کرتے ہیں، یہ اعتراض صحیح ہے، لیکن یہ غلطیاں عموماً کسی متن کی شرح میں ہوتی ہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ دوسری زبانوں کی طرح عربی زبان میں بھی خاص رموز اور باریکیاں اور ادائیں ہیں جن کو اہل زبان کے سوا دوسرا نہیں پا سکتا، ان ہی باریکیوں اور اداؤں کی ناواقفیت کی وجہ سے مستشرقین اشعار کے سمجھنے میں نہایت مضحک غلطیاں کرتے ہیں، اس موقع پر اس کی دو مثالیں پیش کی جاتی ہیں، مثلاً مشہور مستشرق مسٹر مارگلیوتھ نے ابو الفتح ابن العمید کے اشعار ذیل:

یقول لی الواشون کیف تحبہا	فقلت لہم بین المقصر والغالی
ولولاحذاری منہم لصدقتہم	وقلت ہوی لم یہوہ قط امثالی
وکم من شفیق قال مالک واجما	فقلت ألی مالی وتسأل مالی

کے فہم میں نہایت فاش غلطی کی ہے، اوپر کے دونوں شعر اور تیسرے شعر کے پہلے مصرع کے معنی بالکل صاف ہیں، البتہ دوسرے مصرع کے معنی نہیں نکلتے، اس کے سمجھنے میں مسٹر مارگولیتھ گڑبڑا گئے، اور اپنی فہم کے مطابق یہ اصلاح کردی فقلت انا مالی وان تسألی مالی، حالانکہ ان کی یہ تصحیح پہلی غلطی سے زیادہ مضحک ہے، اگر وہ ابن خلکان کو جس میں یہ مصرع صحیح لکھا ہوا ہے دیکھ لیتے تو انہیں معلوم ہو جاتا کہ یہ مصرع اس طرح ہے فقلت ترنی

لی وتسائل عن حالی .

دوسری غلطی مستشرقین کی ایک پوری جماعت سے جو موسیو ڈوزی کے ساتھ نفح الطیب کی تصحیح میں شریک تھی، سرزد ہوئی ہے، انھوں نے ابوالولید کے ان اشعار

الیک ابا حفص وما عن ملالة   ثنیت عنانی والحبیب حبیب

مقالا یطیر الحمیر عن جنباته   ومن تحته قلب علیک یذوب

کو جو نفح الطیب میں ہیں، کسی دوسری کتاب میں مقالاً کے لفظ کو مطالاً پڑھ کر لکھ دیا، کہ ان اشعار کے معنی صحیح نہیں نکلتے، اور معلوم ہوتا ہے کہ درمیان سے کوئی شعر حذف ہوگیا ہے، حالانکہ مقالاً ہی صحیح ہے، اور اسی سے صحیح معنی نکلتے ہیں، اس غلطی کی وجہ صرف یہ ہے کہ وہ مقالاً کی ترکیب نحوی کو نہ سمجھ سکے، اگر انھیں معلوم ہوتا کہ مقالاً پہلے شعر کے لفظ الیک کا مفعول بہ ہے تو یہ غلطی نہ ہوتی.

پہلی غلطی معجم الادبار میں ہے، مارگولیتھ نے نہایت اہتمام کے ساتھ شایع کیا ہے، اور دوسری غلطی نفح الطیب میں ہے، ممکن ہے تلاش کرنے سے دس پانچ اور زیادہ فاحش غلطیاں نکل آئیں، لیکن یہ خفیف غلطیاں اس عظیم الشان خدمت کے مقابلہ میں کیا حقیقت رکھتی ہیں جو مارگلیتھ اور موسیو ڈوزی نے معجم الادبار میں نفح الطیب جیسی اہم کتابوں میں نہایت صحت اور اہتمام کے ساتھ شایع کر کے عربی زبان کی انجام دی ہے، آخر الذکر کتاب اندلس کے اسلامی عہد کی علمی اور ادبی تاریخ کا سب سے پہلا ماخذ ہے، مصر میں بھی یہ کتاب چھپی ہے، لیکن نہایت مسخ شدہ شکل میں، جس میں فہرست تک کا پتہ نہیں ہے، ایسی حالت میں اس عظیم الشان اسلامی خدمت کے مقابلہ میں ان معمولی اغلاط کی کوئی حقیقت باقی نہیں رہ جاتی.

دوسرا اہم اعتراض یہ ہے کہ مستشرقین شریعت اسلام کی شرح میں غلطیاں کرتے ہیں، یہ اعتراض البتہ صحیح ہے، بہت سے مستشرقین اسلام کے متعلق ایسے خرافات لکھتے ہیں جو کسی طرح علماء اور محققین کے شایان شان نہیں ہیں، خصوصاً جب وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت پر کچھ لکھتے ہیں، لیکن اس میں بھی آپ کی زندگی کے خانگی،

اجتماعی اور تشریعی پہلوؤں پر ان کے خاص نظریے ہیں، جن سے بعض مذہبی پہلوؤں کی خدمت ہوتی ہے۔

میرا ماننا تو یہاں تک ہے کہ اسلام دشمن مستشرقین نے اپنی اسلام دشمنی کی وجہ سے بھی اس کی بڑی خدمات انجام دی ہیں، مثلاً اس سلسلہ میں انھوں نے قرآن، حدیث اور اس کے متعلقات پر نہایت عمدہ تالیفیں طبع کیں، ان کی فہرستیں بنائیں اور ان کی ایسی بہتر تبویب اور ترتیب کی کہ ہمارے شیوخ ازہر سے بھی ممکن نہ تھی، موسیو ونسنک نے بھی جو ہمارے دوست حسین ہراوی کے تیر ملامت کا سب سے زیادہ نشانہ ہیں، حدیث نبوی پر اپنی تالیف سے اسلام کی بڑی خدمت انجام دی، بالفرض اگر ہم منصفانہ طور پر یہ بھی مان لیں کہ اس کتاب کی اشاعت میں حق و صداقت کا جذبہ اور حسن نیت شامل نہ تھا تو بھی اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ اس سے غیر ارادی طریقہ سے اسلام کی خدمت ہو گئی، آج کل امریکہ اور یورپ میں آثار اسلامیہ کی اشاعت سے زیادہ اسلام کی کون سی خدمت ہو سکتی ہے، اور یہ خدمت مسلمانوں کا فرض تھا، لیکن افسوس انھوں نے اس فرض کو محسوس نہیں کیا، اور اس کو دوسروں پر چھوڑ دیا کہ وہ ان کی میراث میں جو تصرف چاہیں کریں۔

افکار کی زندگی ان پر بحث و تنقید میں ہے، افکار کے لیے یہ قابل افسوس نہیں ہے کہ لوگ اس پر تنقید یا اس کی مخالفت کرتے ہیں، بلکہ افسوسناک یہ ہے کہ اسے نظر انداز کر دیا جائے، اور رداً اور دفاعاً اس پر کچھ نہ لکھا جائے، اس لیے اسلام ان کے خیر سے استفادہ کی طرح ان کے شر سے بھی فائدہ اٹھاتا ہے، میں قیام پیرس کے زمانہ میں بدھ مذہب کے افسانوں اور خرافات کی اشاعت کی کثرت پر رشک کرتا تھا، اور دعا کرتا تھا کہ کاش خدا اسلام کو بھی ایسے خدام عطا کرتا، جو ان ممالک میں اس کے فضائل کی اشاعت کرتے۔

مستشرقین نے ہم سے تین صدی پہلے اسلام کے اسلامی اور ادبی درس و مطالعہ کی طرف توجہ کی، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ آج مصر بلکہ مشرق کا بڑے سے بڑا محقق ان کی علمی بحث و تحقیقات کو جو ہر شعبہ میں پھیلی ہوئی ہے نظر انداز نہیں کر سکتا۔

کس قدر شرم اور افسوس کی بات ہے کہ ازہر یونی کو جس کو اسلام کا ملجا و مامن سمجھا جاتا ہے، چند برس

پہلے اسلامی تاریخ پڑھانے کا ڈھنگ بھی نہ آتا تھا، کس قدر شرم کی بات ہے کہ آج بھی جامعہ مصریہ کی [illegible]
میں عربی زبان حاصل کرنے والے طالب علموں کی تعداد ساربن یونیورسٹی کے عربی طلبہ سے کم ہے،
کس قدر افسوس کا مقام ہے کہ پیرس کی السنہ مشرقیہ کی درسگاہ میں عربی کے متعدد ایسے مطبوعہ مخطوطے
ہیں کہ مصری دار الکتب میں ان کا نام بھی نہیں۔

مجھے اس کا اعتراف ہے کہ ان کی علمی فضیلت کی وجہ سے ہمارے ذہن و دماغ میں ان کے اثرات زیادہ پائدار ہوتے ہیں، اپنی قوم کو میرا مشورہ ہے کہ وہ ان مستشرقین کے نقش قدم پر ضرور چلیں لیکن اس کے ساتھ ہم کو یہ نہ بھولنا چاہیے کہ مستشرقین انسان ہیں، فرشتہ نہیں ہیں، ان کے بھی اغراض و مقاصد ہیں، اور وہ بھی انسانوں کی طرح غلطیاں کرتے ہیں، اور چونکہ ان کے پاس خیالات کے نشر و اشاعت کے لیے وسائل زیادہ وسیع ہیں، ان کی یہ غلطیاں پھیل جاتی ہیں، اور ان کا نقش زیادہ پائدار ہوتا ہے، میں مستشرقین کی غلطیوں کو ناقابل التفات نہیں سمجھتا، اور بے سوچے سمجھے ان کی پیروی کرنے کی دعوت نہیں دیتا، لیکن میرا یہ عقیدہ ہے کہ ان کی کوششوں سے لغوی اور اسلامی درس میں زندگی پیدا ہو گئی ہے، اور دنیا میں کوئی چیز خالص شر اور خالص خیر نہیں ہے، لیکن ان علمائے مستشرقین کے کاموں میں نفع کا پہلو غالب ہے۔

سلسلہ اسلام اور مستشرقین

جلد پنجم

اسلام اور مستشرقین کے موضوع پر فروری ۱۹۸۲ء میں ہندوستان کی تاریخ میں پہلی بار دارالمصنفین کے اہتمام میں عظیم الشان سیمینار ہوا تھا اس کے بعد اسی موضوع پر تالیفات کا جو نیا سلسلہ شروع کیا گیا ہے یہ اس کی پانچویں جلد ہے، اس میں مستشرقین کے اعتراضات کا جواب ہے، مولانا سید سلیمان ندوی کے وہ تمام مضامین جمع کر دیے گئے ہیں جو مختلف زمانوں میں [illegible] اور معارف میں نکلے تھے، [illegible]

حضرۃ الاستاذؒ کی اہم تصنیف
تاریخ ارض القرآن پر ایک نظر

از

سید صباح الدین عبد الرحمن

(۳)

پھر ریونڈ فارسٹر ہی کے متعلق سید صاحبؒ لکھتے ہیں:

"ریورنڈ فاسٹر تاکید فرماتے ہیں کہ ہم بغیر کسی شک و سوال کے بجز و یمامہ کو بنی جلان، سید بنی کو جینہ اور بنی بری کو کنانہ اور ولد قید تسلیم کرلیں، اس کا مضحکہ خیز ذیل ناقابل معاوضہ دیتے ہیں کہ (تقریباً دو ہزار برس کے بعد) برکہارٹ اور نیبوہر گذشتہ صدی کے یوروپین سیاحوں نے انہی مقامات میں ان ہی قبیلوں کو دیکھا ہے، حالانکہ صاف ظاہر ہے کہ ان میں خر یحییٰ ہے، سید بنی سید بن اور بنو بری، بنو برہے، جزیرہ عرب ان میں، اسید اور بربر دیگر اطراف کے مشہور قبائل ہیں (جزو ۱، ص ۸۰)

سید صاحبؒ کا قلم فارسٹر کی تنقید میں رکتا نہیں، اس کے بعد وہ جو کچھ لکھتے ہیں، اس میں طنز کا رنگ اور بھی گہرا ہو گیا ہے:

"سب سے زیادہ زور ریونڈ فارسٹر خزومی پر دیتے ہیں اور تسلیم کرانے کی کوشش کرتے ہیں کہ ان کا مسکن حجاز نہیں بلکہ خلیج عقبہ تھا، اور یہ اس لیے کہ رسلی کے ڈانڈوروس نے جو مسیح سے سو برس پہلے تھا، لکھا ہے کہ بنادرین کے ملک میں ایک معبد ہے، جس کو تمام عرب متبرک سمجھتے ہیں، اس معبد کو ان عالیشان لوگوں نے جن کے نام کا پہلا جز ریورنڈ فارسٹر (خزومی) کو بنا لیا ہے، مگر تعجب ہے کہ ایک ریونڈ نے کیا اپنے تعمیم

نقشہ اسے جزائر میں بنی زومین کو خاص حجاز میں مکہ سے مدینہ تک پھیلایا ہے۔" (ج ۱، ص ۸۰)

اس کے بعد سید صاحبؒ نے ایسے ناموں کی ایک فہرست درج کی ہے، جو یونانی لفظ بلحاظ فارسی کیا ہیں، فارسٹر کی رائے میں وہ کیا ہیں، اور خود سید صاحبؒ کی رائے میں کیا ہیں؟ مثلاً یونانی میں بنی زومین ہے، فارسٹر کی رائے میں یہ بنی عمران ہے، لیکن سید صاحبؒ اس کو بنی خزیمہ یا خزیمین قرار دیتے ہیں، اسی طرح یونانی لفظ سیدنی ہے، اس کو فارسٹر جہینہ اور سید صاحبؒ بنو سید یا سیدین کہتے ہیں، یونانی لفظ بنی بری کو فارسٹر بنو ثبر بنا دیتے ہیں، لیکن سید صاحب اس کو بنو بربر قرار دیتے ہیں، یونانی لفظ دیبائی کو فارسٹر کے نزدیک زبید اور سید صاحبؒ کے نزدیک ضبہ ہیں، اسی طرح اور مثالیں ہیں۔

سید صاحبؒ نے فارسٹر کی ہر چھوٹی بڑی غلطی کی گرفت کی ہے، مذکورۂ بالا فہرست میں یونانی لفظ واخسری مونزانی کو رینڈ فارسٹر نے دار القرامطہ قرار دیا ہے، اور اس کو واقع بحرین بتلایا ہے، اس پر سید صاحبؒ نے حاشیہ میں یہ نوٹ دیا ہے کہ غریب مستشرق کو معلوم نہیں کہ بحرین میں قرامطہ کا وجود بطلیموس کے آٹھ سو برس بعد ہوا ہے،

(ج ۱، ص ۸۱)

فارسٹر نے عدن کو عدنان سے نسبت دی ہے، سید صاحبؒ اس کی تردید کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ عدنان کو یمن سے کوئی تعلق نہیں ہے، اس کا مسکن تو عرب کا شمالی حصہ تھا، (ج ۱ ص ۱۴۴) اسی سلسلہ میں وہ ایک اور یوروپی سیاح نیوبہر کی تکذیب یہ لکھکر کرتے ہیں کہ وہ عدن کو نعیم کے دوان کے ساتھ تطبیق دیتا ہے لیکن شاید نیوبہر کو جغرافیاں کے اس درس کی خبر نہیں جس میں عدن و دوان ایک ساتھ واقع ہیں۔ (ج ۱، ص ۱۸۵)

فارسٹر نے یارح، یعرب اور جرہم کو ایک ہی نام بتایا ہے، لیکن سید صاحبؒ یہ لکھکر اس کی تردید کرتے ہیں کہ یارح اور یعرب کا اتحاد تو ظاہر ہے، لیکن یارح اور جرہم میں باہم کیا تعلق ہے، یہ غلطی اس لیے پیدا ہوئی ہے کہ یونانی لفظ میں جس کی تقلید تمام السنۂ یورپ میں ہے، "ی" "ج" سے بدل کر یرح کا جرح ہو گیا ہے، اس بنا پر ایک یوروپین کی نگاہ میں اگر جرح اور جرہم ایک نظر آئے تو تعجب نہیں، حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ جرہم خاص

سامی اللفظ نام ہے، یونانی نہیں، کیونکہ اسمائے قدیمہ کے متعلق عربوں کے معلومات براہ راست یہودیوں سے ماخوذ ہیں جن کی زبان عبرانی و سریانی تھی، یا خود ان کے عربی موروثی روایات ہیں، ان دونوں کے لحاظ سے "ی" اور "ج" کا مبادلہ غیر مسلم ہے، یہ مبادلہ سامی و عبری (عربی) اور غیر سامی (یونانی ولاطینی) کا مبادلہ کبھی نہیں ہوتا، (ج ۱، ص ۲۲۶)

فاسٹر نے ایک جگہ حضرت ایوبؑ کا شہر دیا بتایا ہے، وہ جس عربی عبارت کو پڑھ کر اس نتیجے پر پہونچنے میں اس کو سید صاحبؒ نے نقل کرکے لکھا ہے کہ فاسٹر کو یہ غلطی اس لیے ہوئی کہ وہ اس عبارت کو صحیح طور پر سمجھ نہ سکے (ج ۱ ص ۳۲)

نولدیکی کی بعض تحقیقی تلبیسات پر بھی سید صاحبؒ نے ضرب لگائی ہے، وہ عربوں کے فن انساب کا قائل نہیں، اور وہ لکھتا ہے کہ عربوں کی کتب انساب کو محمد کلبی اور اس کے بیٹے ہشام نے گھڑ لیا ہے، پھر وہ یہ لکھتا ہے کہ یہ کہا جاتا ہے کہ وسط ملک عرب میں قبائل بنی قیس صرف ایک شخص یعنی قیس کی نسل سے ہیں جو مسیح سے کچھ پہلے تھا، یہ لکھ کر وہ دعویٰ کرتا ہے کہ ہماری تحقیق یہ ہے کہ کوئی قبیلہ درحقیقت اپنے اس پدر اول سے واقف نہیں جس کی طرف وہ منسوب ہے، اپنی اس تحقیق کی تائید میں رابرٹسن کی رائے پیش کرتا ہے، جو یہ لکھتا ہے کہ یہ محقق ہو چکا ہے کہ چند قبائل زمانۂ ماضی غیر قدیم میں کسی تاریخی شخص کی طرف منسوب نہ تھے، (ج ۱ ص ۲۱ و ۲۰) سید صاحبؒ نے ان دونوں کی تحقیق کو یہ لکھ کر رد کیا ہے کہ عرب کا ہر وہ قبیلہ جو غیر مدبر کی طرف منسوب ہوتا وہ حقیر اور ذلیل سمجھا جاتا اور بطور نشان ملامت کے اس کا نام لیا جاتا، پھر سید صاحب کے خیال میں انساب کا یاد رکھنا تو عرب میں معمولی بات تھی، شعرائے عرب تو مختلف مواقع کے لیے انساب کو زبانی یاد رکھنے پر مجبور تھے، پھر وہ یہ بھی لکھتے ہیں کہ ایک شخص کی اولاد سے چند بطون و قبائل کا پیدا ہونا کوئی محال امر نہیں، خصوصاً جب اس کی مدت چھ سو برس تک پھیلی ہو (ج ۱، ص ۲۱)

سید صاحبؒ کا خیال ہے کہ ان مستشرقین کی اصلی نیت یہ ہے کہ ان قبیلوں کو وہ کسی دیوی، ستارہ، حیوان اور درخت کی طرف منسوب کریں، ایسے انتساب کو وہ طوطمیت کہتے ہیں، اس طوطمیت کے جواز

کے لیے ان کو ایسے قبیلوں میں بنو شمس، بنو اسد، بنو فہد، بنو ثعلب، بنو کلب، بنو نمل وغیرہ جیسے نام ملتے ہیں، سید صاحبؒ لکھتے ہیں کہ عرب میں اس قسم کے نام صرف چند ہیں، اور ان میں کلب (کتا) نمل (چیونٹی) ثعلب (لومڑی) کون سی گرامی قدر چیزیں ہیں، جن کے انتساب سے خاندان کی بنیاد قائم ہو، آج بھی بعض انگریزوں کے نام فکس اور بُل وغیرہ ہوتے ہیں، کیا یہ بھی طوطمیت ہے"؟ (ج ۱ ص ۲۲-۲۰)

زوارکی کا خیال ہے کہ جس زمانہ میں ثمود پوری ترقی پر تھے تو ان کے ملک کی زبان نبطی تھی، اس کو یہ خیال اس لیے پیدا ہوا کہ حجر ثمود کا دار الحکومت تھا، اس کی بعض عمارتوں کے کتبات کی زبان نبطی ہے، لیکن سید صاحبؒ کا خیال ہے کہ حجر میں جب تک ثمود رہے' ان کی زبان عربی آرامی تھی، جس کو زیادہ تر لوگ ثمودی زبان کہتے تھے، اور جب وہاں انباط آئے تو وہاں کی زبان نبطی ہو گئی، اسی لیے ان کی عمارتوں کے کتبات میں نبطی زبان پائی جاتی ہے، ورنہ یہ کون صاحب عقل تسلیم کر سکتا ہے کہ ثمود جب اپنی ترقی کے شباب پر تھے، تو اپنی یادگاروں کے لیے ایک غیر قومی زبان اختیار کر لی تھی"، (ج ۲ ص ۱۳۴)

مارگولیتھ کے بعض بیانات پر سید صاحبؒ کو غصہ آگیا ہے، ملت حنیف کے سلسلہ میں مارگولیتھ لکھتا ہے کہ

"سریانی میں اس کے (حنیف کے) معنی کافر کے ہیں، اور عبرانی میں منافق کے ہیں، مقدس پیروان محمدؐ نے اس کی لفظی تحقیق کی پیروی نہیں کی، (ج ۲ ص ۲۰۹)

اس بیان پر جتنی بھی برہمی ظاہر کی جائے کم ہے، اسی لیے سید صاحبؒ لکھتے ہیں:

"یورپ کے مشرقی تبحر کا عنوان بایں ہمہ ادعائے وسعت بہر حال تنگ ہے، اس لیے اس کی ہم کو شکایت نہیں کہ مایۂ ناز فرنگ نہ صرف کا غذ تحریک اسلام سے ناآشنا ہے' بلکہ آئین زبان عرب سے بھی آگاہ نہیں، دنیا میں کس نے اپنا امتیازی لقب دشمن کے نام دخاندان پر رکھا ہے؟ اصل یہ ہے کہ نری عربی دانی اور بات ہے' اور اسلامی واقفیت اور چیز ہے ؎

عشق بازان دیگر اند و عشق سازان دیگر اند　　　آنچہ در فرہاد می بینیم در پرویز نیست"

اس کے بعد سید صاحبؒ نے حنیف کی لغوی تحقیق کر کے بتایا ہے کہ اس کے کیا معنی ہیں، اس کا ذکر گذشتہ اوراق میں پہلے آچکا ہے،

سید صاحبؒ لکھتے ہیں کہ مارگولیتھ کے ساتھ مستشرقین یورپ نے بھی بکمال لیاقت ہم کو یہ بتایا ہے کہ اللہ اور اللات ایک ہی لفظ کی دو صورتیں ہیں، اللہ مذکر دیوتا کے لیے قریش میں مستعمل تھا، اور اللات یعنی دیوی، اس لفظ اللہ کی تانیث قریش نے بنائی تھی، (ص ۲۲۶) سید صاحبؒ کو اس پر بھی جھلاہٹ آگئی ہے اور وہ رقمطراز ہیں:

"ان عقلمندوں سے پوچھنا چاہیے کہ اللہ کی تانیث عربی قواعد کے موافق اللات کیونکر ہو سکتی ہے؟ اس کی تانیث اگر ممکن ہے تو الٰہۃ چاہیے، یا الالٰہۃ، اللہ کی ہائے اصلی کیونکر تانیث سے ساقط ہو گئی، ہمارا مشورہ مستحق قبول ہو تو اس فسانۂ لفظ کی پیدائش کے لیے عرب کی خشک سرزمین کے بجائے ملک شام کا سرسبز خطہ مناسب ہوگا، کیونکہ عرب کے اکثر دیوتا ملک شام ہی کے باشندے تھے، ہیروڈوٹس مورخ نے مسیح سے چار سو برس پہلے عرب کے ایک دیوتا کا نام الیلات بتایا ہے، حالانکہ اس وقت قریش کا وجود بھی نہ تھا، اس لیے ان کی زبان کا لفظ بھی اس وقت موجود نہیں ہو سکتا، (ج ۲، ص ۲۲۶)

مارگولیتھ کی تحقیق یہ بھی ہے کہ لفظ اللہ اصل میں قریش کے خاندانی دیوتا کا نام تھا، اس لیے محمدؐ کی توحید پرستی کے یہ معنی ہیں کہ انھوں نے دوسرے قبائل کے دیوتاؤں کو مٹا کر اپنے خاندانی دیوتا کو منوایا (ج ۲، ص ۲۲۰) سید صاحبؒ اس کا جواب یہ دیتے ہیں:

"یورپ کے مشرقی تبحر علمی کی یہ شرمناک مثال ہے، سب سے پہلے سوال یہ ہے کہ اس عظیم الشان عربی زبان میں حقیقی خدا کے مفہوم کے لیے کوئی لفظ موجود نہ تھا، تم کہتے ہو کہ محمدؐ سے پہلے عرب میں موحدین موجود تھے، بہتر ہے، لیکن کیا وہ اپنے خدا کے لیے اللہ کے سوا کوئی اور لفظ پیش کرتے تھے؟ موجودہ عیسائی ادبائے عرب کے بیانات کے مطابق عرب میں عیسائی شعراء بکثرت پیدا ہوئے ہیں، ہاں! سچ ہے عرب میں عیسائی شعراء

ہوئے ہیں، دیکھو کیا ان کی زبان سے لفظ اللہ تم نے نہیں سنا؟ قرآن نے اللہ تعالیٰ کی صفات خود مشرکین کے اقرار کے مطابق جو بیان کی ہیں وہ کیا کسی دیوتا پر صادق آسکتے ہیں؟ سب سے آخر یہ کہ اللہ کی اصل تو الالٰہ ہے، الٰہ تو صرف عربی میں نہیں بلکہ تمام سامی زبانوں میں خدا تعالیٰ ہی کے لیے مستعمل ہے کم از کم الوہ اور الوہیم سے تو ناواقفیت نہ ہوگی، قریش اپنے دیوتاؤں کے مجسمے بنا کر پوجا کرتے تھے کیا اس سب سے بڑے قریشی دیوتا کا بھی کہیں مجسمہ تھا؟" (ج۲، ص ۲۲۰)

ہالوے کا خیال تھا کہ حمیر قوم کا نام نہیں بلکہ قلعۂ شاہی کا نام تھا، رفتہ رفتہ اس نے حکومت کا اور پھر تمام قوم کا نام اختیار کر لیا، سید صاحب اس کو تسلیم نہیں کرتے، اس کے رد میں وہ لکھتے ہیں کہ لفظ مذکور اگر کسی مقام کا نام ہوتا تو اس کے پہلے لفظ ذو (مالک) یا لفظ حضر (شہر) یا لفظ بیت (قلعہ) آتا، جیسا کہ ذو ریدان، ذو سلحین، حضر مدن، بیت ایمن کے نام سے ظاہر ہے، یہ سب مقامات اور شہر کے نام ہیں، لیکن اس قسم کا لفظ حمیر کے ساتھ کہیں نظر نہیں آیا، مزید براں اب تک کتبات میں جس قدر شہروں اور قلعوں کے نام ملے ہیں وہ تمام تر عربی جغرافیوں میں مذکور ہیں، لیکن حمیر کا ذکر کہیں قلعہ یا شہر کی حیثیت سے نہیں (ج۱، ص ۲۲۵)

بعض یوروپین مصنفوں نے فاران کو جزیرہ نمائے سینا کے مغرب میں مصر سے متصل علاقہ قرار دیا ہے بعض نے کوہ سینا کے دامن میں اس کو جگہ دی ہے، لیکن سید صاحبؒ اس کی تردید کرتے ہوئے تورات کے حوالہ سے لکھتے ہیں کہ فاران سے مراد ملک حجاز ہی ہے، (ج۱، ص ۶۹) گذشتہ صفحہ میں اس کا ذکر آیا ہے کہ بعض یوروپین مصنفین میں بنو سام کے مسکن اول کے متعلق اختلاف ہے، کچھ ان کا مسکن افریقہ، کچھ آرمینیہ اور کردستان اور کچھ فرات بتاتے ہیں، لیکن سید صاحبؒ نے ان سب کی تردید کرتے ہوئے بڑے وثوق کے ساتھ بتایا ہے کہ ان کا پہلا مسکن عرب ہی تھا، (ج۱، ص ۱۱۵)

جرمن مستشرق اسپرنگر نے ۱۸۶۵ء میں قدیم جغرافیۂ عرب لکھی، اس میں بطلیموس کے جغرافیائی ناموں

کو صحیح ثابت کیا ہے، سید صاحبؒ نے جس طرح ریدنڈ فارسٹر سے اختلاف کیا، اسی طرح اسپرنگر کی تحقیق و تطبیق کو یکلخت تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں کہ قبائل عرب زیادہ تر بدویانہ زندگی کے عادی تھے، اس لیے ان کے مقامات کی تعیین نہایت مشکل ہے، پھر بطلیموس کی، قافلوں اور کاروانوں کی زبانوں سے ان کی تحقیق اور یونانی حروف و لہجہ میں ان کی تعبیر اور پھر انقلابات و حوادث روزگار، کا تواتر، کاتبوں کی جہالت اور ناآشنائی فن ان وجوہ سے قیاس نہیں کیا جاسکتا کہ ایک لفظ اپنے صحیح مخرج سے کہاں سے کہاں جا پڑا ہوگا، (ج ۱، ص ۲۹-۲۰)

الفاظ کی لغوی تحقیق | سید صاحبؒ نے اپنی اس کتاب میں السنۃ العرب قبل الاسلام میں جو کچھ لکھا ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اس کم عمری میں ماہر السنہ بھی ہو گئے تھے، اسی مہارت کی بنا پر انھوں نے اس میں بہت سے الفاظ کی لغوی تحقیق بڑی محنت سے کی ہے، ان کی آیندہ کی تصانیف میں بھی ان کا یہ وصف برابر ظاہر ہوتا رہا، وہ توجہ طلب الفاظ پر برابر رکتے ہیں، اور ان کی لغوی تصریح اور لسانی تشریح میں لذت محسوس کرتے ہیں، اس کی مثالیں سیرۃ النبیؐ میں بکثرت ملیں گی، اور ان کی نقوش سلیمانی میں ان کا یہ ذوق تو اپنے منتہا تک پہونچ گیا ہے، اس کتاب میں انھوں نے جن الفاظ کی لغوی تحقیقات کی ہے ان کے کچھ نمونے یہ ہیں، ہم ان ہی کے الفاظ میں ان کی تصریح کرتے ہیں:

سلاع: عرب کے ایک مشہور شہر کا نام، توراۃ میں سلاع آیا ہے، جو ادوم کی حکومت میں واقع تھا، سلاع کے معنی پتھر کے ہیں، عربوں کے ہاں اس کا نام الحجر ہے، اور یونانی میں اس کو بیٹرا کہتے ہیں، معنیً تینوں ایک لفظ ہیں۔ (ج ۱، ص ۶۵-۶۴)

عاد: السنۂ سامیہ میں لٹریچر کے لحاظ سے عبرانی سب سے قدیم زبان ہے، جس کا نتیجہ یہ ہے کہ قدیم الفاظ کی اصلیت عربی زبان سے زیادہ اس میں محفوظ ہے، لغوی حیثیت سے عربی میں عاد کے کوئی معنی نہیں، عبری میں عاد کی اصلیت موجود ہے، اس کے معنی بلند و مشہور کے ہیں، اور عجیب تر یہ کہ ارم اور رشم (سام) کے بھی یہی معنی ہیں، ان معنوں کا بقیہ اثر عربی میں بھی موجود ہے، ارم کے معنی پہاڑی اور نشان راہ کے پتھر کے

لغت میں مذکور ہیں، اور شمم سے شمم اور سموئل اب تک مستعمل ہے، توراۃ میں مادہ مذکر کے نام کے لیے اور مادہ عورتوں کے لیے کئی جگہ آیا ہے، جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ عہد قدیم میں یہ نام عموماً مستعمل تھا۔ (ج ۱، ص ۱۲۰)

ثمود : ثمود کی لفظی تحقیق شاید عربی میں صحیح نہ مل سکے، ثمد عربی میں آب قلیل کو کہتے ہیں، لیکن اس سے کوئی خاص مناسبت نہیں معلوم ہوتی، عبری میں ایک لفظ تامید ہے، جس کے معنی دائم اور خالد کے ہیں، عربی کی "ش" اور عبری کی "ت" ایک چیز ہے، عبری میں ش نہیں ہے، اس لیے اکثر وہ الفاظ جو عربی میں "ش" سے ہیں، عبری میں "ت" سے ہیں، اس بنا پر ثمود کے معنی عام سامی زبان میں وہی ہوں گے جو عربی میں خالد کے معنی ہیں، اور بہت سے قبائل عرب کے نام ہیں۔ (ج ۱، ص ۱۸۶)

معین : معین بھی ایک قبیلہ تھا، اس کے متعلق لکھتے ہیں کہ معین کے لفظی معنی منبع آب اور چشمہ کے ہیں، دیگر سامی زبانوں میں مثلاً عبری میں یہ لفظ معیان ہے، جو نہایت آسانی سے معان کی صورت میں بگاڑا جاسکتا ہے، جو اب تک شمالی عرب میں ایک آبادی ہے۔ (ج ۱، ص ۲۰۴)

یارح : یارح عبرانی ہے، عرب اس کو یعرب کہتے ہیں، السنۂ قدیمہ میں اس قسم کا تغیر لہجہ نہایت عام ہے، یہودی رواۃ عرب تمام قبائل یمن کو تنہا اسی یعرب کی اولاد قرار دیتے ہیں (ج ۱، ص ۲۲۵)

حضرموت : عبری زبان میں "ض" نہیں ہے، اس لیے حضرموت کا تلفظ اس میں حضرموت یا حصارموت بہ زیادت الف ہے، حضرموت کی اولاد نے جس قطعۂ عرب کو اپنا مسکن بنایا وہ حضرموت کے نام سے آج تک مشہور ہے۔ (ج ۱، ص ۲۲۸)

تبع : لفظ تبع لغویین عرب کے نزدیک تبع یا تبعیت سے مشتق ہے، ممکن ہے کہ تبع عربی لفظ بمعنی متبوع ہو، یعنی جس کی پیروی اور اطاعت لوگ کریں، لیکن تحقیق جدید یہ حبشی لفظ ہے، حبشی میں اس کے معنی قادر، جبار اور صاحب قوت کے ہیں، حکومت اسلام میں ٹھیک اسی معنی میں لفظ سلطان (قوت و غلبہ) رواج پایا ہے، اس لفظ کے غیر عربی ہونے کی تائید علاوہ اس کے کہ حبشی زبان میں یہ لفظ موجود ہے

یہ ہے کہ عربی زبان کے اس وزن پر کوئی لفظ واحد اور بمعنی مفعول نہیں آیا، مُرتَّع، مُجَدَّد وغیرہ الفاظ تو جمع ہیں مبالغہ کا یہ وزن ہے تو وہ معنی مفعول نہیں پیدا کرتا، اور سب سے آخر اس کے غیر عربی ہونے کی دلیل یہ ہے کہ عجمی ناموں کی طرح اس پر الف لام نہیں آتا، اگر یہ عربی صنف کا صیغہ ہوتا تو مانع الف ولام کیا ہے، لیکن یہ کہنا بھی صحیح نہیں کہ یہ صرف حبشی لفظ ہے، کتبات میں ملوک معین وسبا کے عہد میں یعنی کم از کم ہزار سال قبل مسیح میں تبع نظر آتا ہے، ایک بادشاہ معین کا نام تبع کرب بن تبع ایل مذکور ہے، ایک سبائی کتبہ میں تبع شمر حبیل ملک سا منقوش دیکھا ہے، دوسرے کتبہ میں تبع کرب کا لقب شاہی نظر سے گذرا ہے، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اسی معنی میں یہ لفظ اصلاً سبائی وحمیری ہے، (ج ۱، ص ۷۸ ـ ۲۸۹)

اصحاب الایکہ: قرآن مجید میں ایک قوم کا اصحاب الایکہ کے نام سے ذکر ہے، ایکہ کے لغوی معنی جنگل کے ہیں، اس قوم کے پیغمبر بھی حضرت شعیبؑ ہی تھے، بعض مفسرین کا خیال ہے کہ مدین اور اصحاب الایکہ ایک ہی چیز ہیں، ان کا قیاس ہے کہ ملک مدین کے پاس ایک جنگل تھا، جہاں مدین کی قوم کبھی کبھی قیام کرتی تھی، اس لیے اس کو اصحاب الایکہ (جنگل والوں کا نام) خطاب کیا گیا۔ (ج ۲، ص ۲۱)

ہاجرہ: اصل میں عبرانی لفظ ہاغار ہے جس کے معنی بیگانہ اور اجنبی کے ہیں (ج ۲، ص ۴۰)

اسمٰعیل: اسمٰعیل عربی میں شماع ایل ہے، شماع (سماع) سننا اور ایل (اللہ) لفظی معنی خدا کا سننا ہے، خدا نے چونکہ ابراہیمؑ کی اولاد اور ہاجرہ کی فریاد سنی، اس لیے بچہ کا نام شماعیل پڑا، (ج ۲ ص ۴۲)

قیدار: قیدار حضرت اسمٰعیلؑ کے دوسرے بیٹے کا نام تھا، عبری میں قیدار کے معنی سیاہی اور غم کے ہیں، عربی میں بھی لفظ کدر و کدورت ہے، شاید حضرت اسمٰعیلؑ نے یہ نام باپ سے جدائی اور صحرا نوردی کے غم کی یادگار میں رکھا ہو۔ (ج ۲، ص ۹۰)

قریش: عربی میں قریش کے متعدد معنی ہیں، اس کا ایک ماخذ تقریش و تقرش ہے جس کے معنی اکتساب وتحصیل ہیں، خیال ہے کہ چونکہ اس خاندان کا اصلی پیشہ تجارت تھا، اس لیے قریش کے نام سے موسوم ہے، قریش

ایک دریائی درندہ جانور کا بھی نام ہے، جو دوسرے دریائی جانوروں کا شکار کرتا ہے، اس قبیلے کے سردار فہر نے غلبہ استیلاء اور قوت کے اظہار کیلئے یہ لقب اختیار کیا، حضرت ابن عباس نے اسی دوسری تاویل کو اختیار کیا ہے،

(ج ۲، ص ۹۰ - ۹۱)

بعل : قریش کے مشترک خداؤں میں سے ایک کا نام تھا، جو دوسری سامی زبانوں میں بعل ہے اس کے معنی قوت اور تسلط کے ہیں، بعل کے دوسرے معنی قوی، سلطان اور مالک کے ہیں، عربی میں اسی سے بعل کے معنی شوہر کے ہیں، (ج ۲، ص ۱۵۵)

العزیٰ : یہ عز سے مشتق ہے، جس کے معنی غلبہ کے ہیں، عزیٰ کا اسم تفضیل مونث عزیٰ ہے یعنی بہت غالب آنے والی دیوی، عجب نہیں کہ یہ قریش اور ان کے ہم نسب قبائل کی لڑائی کی دیوی ہو، (ج ۲، ص ۲۲۸).

مناۃ : اس لفظ کا اشتقاق چند ماخذوں سے ہو سکتا ہے، سب سے کمزور پہلو یہ ہے کہ وہ منی سے مشتق ہو، جس کے معنی بہانے کے ہیں، اسی سے مکہ کے مقام منیٰ کا نام ماخوذ ہے، یعنی خون بہانے کی جگہ ہے، مناۃ شاید قربانی کا دیوتا تھا، جس کے نام سے خون بہایا جاتا ہوگا، لیکن بجز قیاس کے اس اشتقاق کی صحت کی کوئی اور دلیل نہیں، یاقوت نے اس کے مختلف اشتقاقات بتائے ہیں، ہمارے نزدیک ان میں سب سے صحیح یہ ہے کہ وہ منا سے مشتق ہے، اس کے معنی تقدیر کے ہیں، اور اس کے معنی ثانی موت کے ہیں، صاحب لسان العرب نے بتایا ہے کہ اس میں ۃ حرف علامت تانیث کے لیے ہے، گویا مناۃ تقدیر اور موت کی دیوی تھی، نبطی کتبات میں بھی مناۃ منوت کی صورت میں ہے، قرآن مجید میں اس کا املا منوۃ ہے، (ج ۲، ص ۲۲۹)

ود : اس کے معنی محبت کے ہیں، اس کے مقابل دوسری دیوی نکرۃ تھی جس کے معنی ناپسندیدگی اور عداوت کے ہیں، (ج ۲، ص ۲۲۹)

سواع : اس لفظ کا مشتق منہ کلام عرب میں نہیں ملتا، ممکن ہے کہ سَوْع سے مشتق ہو، جس کے معنی زمانہ کے ہیں، (ج ۲، ص ۲۲۹)

یعوق: عوق (روکنا) مضارع کا صیغہ ہے، اہل یمن میں یہ بت پوجا جاتا تھا، ان کے یہاں صیغۂ مضارع کو بطور علم استعمال کرنے کا خاص دستور تھا، چنانچہ یثرب، یشجب، یکسب، یعتر، یرعش، یہمن وغیرہ اصل نام کے ساتھ صفت کے طور پر مستعمل ہوتے ہیں، یعوق کے معنی روکنا ہے، یعنی مصیبتوں کو روکتا ہے (ج۲ ص ۲۲۹)

یغوث: یہ بھی یعوق کے قاعدہ سے علم ہے، غوث (فریاد کو پہنچنا) اس کا مصدر ہے، یغوث کے معنی فریاد رسی کرتا ہے، یغوث دیوتا کا نام کتبہ میں بھی ملتا ہے۔ (ج۲، ص ۲۲۹)۔

نسر: اس کے لغوی معنی گدھ کے ہیں، اسی شکل کا ایک مجموعۂ کواکب آسمان میں ہے، جس کو نسر کہتے ہیں، نسر دیوتا کی حیثیت سے سامی قوموں میں بہت مدت سے پوجا جاتا تھا، اہل بابل کے دیوتاؤں میں ایک نسر دک تھا، اس کا مجسمہ بھی پایا گیا ہے۔ (ج۲، ص ۲۲۹)

تتمہ | اوپر کی تفصیلات کو پڑھ کر ہمارے ناظرین گھبرا رہے ہوں گے، لیکن اس سے اندازہ ہوا ہوگا کہ مولانا شبلیؒ نے اپنے شاگردوں کو جو نصیحت کی تھی کہ معلومات اور مواد کو ہر کونہ اور ہر گوشہ سے اس محنت سے ڈھونڈ کر پھر کوئی گوشہ خالی نہ رہ جائے، اس پر تاریخ ارض القرآن ہر طرح پوری اترتی ہے، مولانا شبلیؒ کی یہ نصیحت بھی تھی کہ جو کچھ لکھا جائے اس پر اگر کسی نے کچھ لکھا ہے تو اس سے بالکل الگ ہو، تاریخ ارض القرآن کے متعلق تو یہ کہنے میں تامل نہیں کہ وہ اپنے موضوع کے لحاظ سے بالکل ہی یگانہ اور منفرد ہے، اور پھر ابن خلکان کی اس بات پر بھی کہ جو چیز لکھی جائے بڑی محنت سے لکھی جائے، تاریخ ارض القرآن پوری اترتی ہے۔

آخر میں یہ دیکھنا ہے کہ تاریخ ارض القرآن میں مولانا شبلیؒ کی یہ نصیحت کہاں تک پوری ہوتی ہے کہ معنی کے ساتھ عبارت کی چستی، طرز ادا کی شگفتگی، استعارات وتشبیہات کی ندرت ہو، یا ابن خلکان کا جو بیان ہے کہ عبارت میں لطافت اور بیان میں حسن ہو، اس کی پابندی تاریخ ارض القرآن میں ہو سکی ہے کہ نہیں، شروع سے آخر تک اس کتاب کی زبان خالص تحقیقی ہے، اس کا موضوع ایسا ہی ہے کہ اس میں طرز ادا کی شگفتگی اور عبارت کی لطافت اور بیان کا حسن پیدا ہونا بہت مشکل تھا، یہ چیزیں ان کی آئندہ تصانیف خصوصاً

سیرۃ النبیؐ، خطبات مدراس اور نقوش سلیمانی میں تو خاص طور سے پائی جاتی ہیں لیکن تاریخ ارض القرآن حصہ دوم کی توقع نہیں کی جا سکتی تھی۔

کچھ محققین ایسے ہوتے ہیں جو اپنی تحقیق کا اظہار کرنے میں زبان کو قربان کر دیتے ہیں، اور کچھ اہل قلم ایسے بھی ہوتے ہیں جو اپنی زبان کے حسن اور وقار کو برقرار رکھنے کی خاطر تحقیق کی زیادہ گہرائی اور گیرائی کو پسند نہیں کرتے، اس میں شک نہیں کہ سید صاحبؒ نے اپنی اس کتاب میں اپنی تحقیق و تدقیق کو زیادہ فوقیت اور اہمیت دی ہے، اس میں اپنی زبان اور اسلوب کے وہ جوہر نہیں دکھا سکے جو انھوں نے اپنی آیندہ تصانیف میں دکھایا ہے، مگر یہ اس کی مثال ہے کہ مشکل سے مشکل موضوعات پر تحقیق کر کے اردو زبان اور انداز بیان کو کیسے اس کا متحمل بنایا جا سکتا ہے۔

اس کے انداز بیان کی نشاندہی سید صاحبؒ ہی کی ایک تحریر سے کی جا سکتی ہے، انھوں نے یہ کتاب مولانا ابوالکلام آزادؒ کے ہفتہ وار الہلال سے علیحدہ ہونے کے بعد لکھی، وہ خود اپنے ایک مضمون میں رقمطراز ہیں کہ جب ۱۹۱۲ء میں مولانا ابوالکلام آزادؒ نے اپنا اخبار الہلال نکالا تو میں اس کے اسٹاف میں شامل ہوگیا، اخبار کے لٹریچر اور ادبی سطح کو یکساں رکھنے کے لیے میں نے اس کے طرز میں لکھنا شروع کیا، چنانچہ الہلال میں اس زمانہ میں جو تحریریں میرے قلم سے نکلیں ان میں مولانا ابوالکلام آزاد کا طرز اتنا نمایاں ہے کہ لوگ غلط فہمی سے اس کو مولانا ابوالکلام کے نام سے بے تکلف چھاپ رہے اور پڑھ رہے ہیں، اور میری پہلی کتاب تاریخ ارض القرآن میں بہت کچھ مٹانے پر بھی اس کی جھلک موجود ہے۔ (معارف جولائی ۱۹۵۰ء)

ذرا اس جھلک کو تلاش کرنے کی کوشش کی جائے، مولانا ابوالکلام آزادؒ کے طرز بیان کی خصوصیات ہیں کہ اس میں شوکت بیان اور جوش و خروش کا سیلاب امنڈتا چلا جاتا ہے، اس میں الفاظ کا شکوہ اور فقروں کی چمک دمک ہوتی ہے جس سے بڑی حرارت اور تاثیر پیدا ہو جاتی ہے، وہ اپنی تحریر کو قرآنی آیتوں سے سنوار کر کے پیرایۂ بیان کو بلیغ اور موثر بناتے ہیں، ان کی تحریروں میں بلاغت قرآنی کا اثر ہوتا ہے ان کے

اسلوب میں شوکت اور عظمت ہوتی ہے، فرح و فروغ الفاظ سے اپنی تحریروں میں رعد اور کڑک پیدا کر دیتے ہیں، اب دیکھنا یہ ہے کہ بہت کچھ شانے پر بھی سید صاحبؒ کی تاریخ ارض القرآن میں الہلال کی کون سی جھلک موجود ہے، اس میں جوش و خروش اور شوکت و عظمت کا سیلاب تو نہیں امنڈتا دکھائی دیتا ہے، الفاظ کا شکوہ بھی نہیں، یا فرح و فروغ الفاظ سے گرج اور کڑک بھی نہیں پیدا کی گئی ہے، ہاں اس میں قرآن کی آیتیں تو اس کثرت سے آئی ہیں کہ کبھی یہ شبہہ ہو جاتا ہے کہ یہ قرآنیات ہی کے سلسلہ کی کوئی کتاب ہے، اس کی تمہید ہی میں الہلال کا کچھ رنگ ضرور آگیا ہے جو ناظرین کی دسترس سے باہر ہے، ان کی خاطر اس کا اقتباس درج ذیل ہے:

"آج مسلمانوں کا وطن تمام دنیا ہے، تاہم مولد اسلام، موطن رسالت، مہبط قرآن دنیا کا صرف ایک ہی گوشہ ہے، یعنی عرب جس کو مادی زرخیزی کی رو سے گو بن کھیتی کی زمین اور وادی غیر ذی زرع کا خطاب دیا، لیکن جس کی روحانی سیر حاصلی کی فراوانی کا یہ عالم ہے کہ آج دنیا میں جہاں بھی روحانی کھیتی کا کوئی سرسبز قطعہ موجود ہے اسی کشت زار الٰہی کے آخری کسان کی تخم ریزی اور آب سیری کا نتیجہ ہے۔

اس مہبط وحی قرآنی اور موطن اول اسلام کی تقدیس اس بوڑھے پیغمبر ابراہیمؑ کے نام سے ہے، جس نے اپنے بیٹے اسمٰعیلؑ کے خون سے اس بن کھیتی کی زمین کو سیراب کرنا چاہا، جس کی سیرابی گردن کے خون سے مقدر نہ تھی، بلکہ دل کے خون سے تھی، جب دل کا خون اس پر برسا تو یہ شورہ بے حاصل قطعہ حسب پیشین گوئی سابق لہلہا اٹھا:

ذٰلِكَ مَثَلُهُمْ فِي التَّوْرَاةِ وَمَثَلُهُمْ	پیروان محمدؐ کی مثال توراۃ اور انجیل میں یہ ہے
فِي الْإِنْجِيلِ كَزَرْعٍ أَخْرَجَ شَطْأَهُ	کہ وہ ایک کھیتی ہے جس کا ڈنٹھل نکلا مضبوط
فَآزَرَهُ فَاسْتَغْلَظَ فَاسْتَوَىٰ عَلَىٰ	ہوا، تنے پر کھڑا ہوا، کاشتکار دیکھ کر خوش
سُوقِهِ يُعْجِبُ الزُّرَّاعَ لِيَغِيظَ	ہوتے ہیں، تاکہ کافر غمزدہ ہوں،

یومُ الفتح (الفتح : ۴)

"اس زمانہ کے اکثر حصے کی مادی غیوری و بے سامانی حکمت الٰہیہ کا مقتضا تھی کہ اسلام کے ظہور سے پہلے دست حوادث
دور رہے اس ارض مقدس کی عصمت محفوظ رہے، اور دست انسانی کے تمدن و صنعت کی بیداری
سے اس کی لوح سادہ پاک اور فطری رہے، تاکہ خود فطرۃ اللہ کا قلم صرف اپنے حروف و خطوط سے
اس کی گلکاری کر سکے، اور خدا کی فطرت کا خزانہ جو اس گلشن میں دفن تھا یعنی مذہب فطری کے
وجود تک محفوظ رہے۔"

اب یہ ناظرین خود بھی فیصلہ کر سکتے ہیں کہ اوپر کے اقتباس میں الہلالیت کا رنگ آسکا ہے کہ
نہیں، لیکن سید صاحبؒ جس سرزمین کا ذکر کر رہے تھے، اس سے ان کو کچھ ایسا عشق تھا کہ اس کے اظہار میں
اس سے زیادہ موثر پیرایۂ بیان اختیار کرنا چاہتے ہوں گے، لیکن اتنا ہی کچھ لکھ کر قلم کو روک لیا۔

ایک اور اقتباس درج ذیل ہے، جس میں شاید وہ تاثیر اور حرارت نظر آئے جو الہلال میں پائی
جاتی تھی، گو اس میں پرشکوہ الفاظ کی فراوانی نہیں، لیکن انداز بیان کی چمک دمک ضرور ہے:

"زمانۂ جاہلیت میں ایسے متعدد شعراء گذرے ہیں جن کے کلام میں عقل کی باتیں، الفاظ کی تہ میں ستاروں
کی طرح چمکتی ہیں، مثلاً لبید (قبل اسلام) زہیر، امیہ بن الصلت، علاف بن شہاب التمیمی، قس بن ساعدہ
والایادی وغیرہ، شعراء کے کلام میں توحید، حشر و نشر اور محاسن اخلاق کی تعلیم ملتی ہے، آج کل کے بعض
عرب عیسائی مصنفوں نے اس قسم کے عرب شاعروں کو عیسائی ثابت کرنے کی کوشش کی ہے، لیکن افسوس ہے
کہ انھوں نے اپنی کوشش کی بنیاد ریت پر قائم کی اور ایک دلیل بھی دعویٰ کی استواری میں پیش نہ کر سکے،
میرے خیال میں یہ شعراء حنفی العقائد تھے، چنانچہ ان میں سے بعض کے کلام میں اس کی تصریح بھی ملتی ہے،
لیکن یہ یاد رکھنا چاہیے کہ بعد کو بعض سادہ لوح مسلمانوں یا شریر لوگوں نے بہت سے جھوٹے
شعر بنا کر ان لوگوں کی طرف منسوب کر دیے ہیں، قرآن کی آیتوں کی آیتیں لے کر ان کو موزوں کر کے

ان کے نام سے شعر کہہ دیے ہیں، آج کل کے عربی داں عیسائی ان اشعار کو بڑی چالاکی سے اس ثبوت میں پیش کرتے ہیں کہ دیکھو محمدؐ نے شعرائے جاہلیت کے کلام کو الٹ پلٹ کر قرآن بنا دیا ہے' ان اشعار میں کتنے صحیح اور غلط ہیں، اور جعل سازی کی تمیز صرف عربی زبان کے باریک بین اور نکتہ شناس ادیب ہی کر سکتے ہیں، جو جاہلیین اور مولدین کے کلام کو بیک وقت دیکھ کر سمجھ لیتے ہیں کہ ان میں موتی اور پوت کون ہے؟ (ج ۲، ص ۲۱۶)

اوپر کے اقتباس میں الہلال کا پورا رنگ نہ ہو، لیکن یہ تحریر اس کی ہے جو ایک خشک موضوع کی تحقیقات میں گم ہے، مگر اس کی انشا پردازی کی دبی ہوئی صلاحیت ابھرتی نظر آتی ہے، اوپر کے اقتباس میں ایک خاص قسم کی چستی، لطافت، چمک دمک، حرارت اور تاثیر تو ضرور پیدا ہوگئی ہے، اس آب و رنگ سے یہ غمازی ہوتی ہے کہ آگے چل کر اس کی شجرکاری میں کیا کیا برگ و بار پیدا ہو کر رہیں گے'

علمی حلقے میں یہ بات تعجب سے سنی جائے گی اگر یہاں پر یہ لکھا جائے کہ اس میں سید صاحبؒ بڑے نقاد بھی نظر آتے ہیں، اس میں ان کی تنقید نگاری کا وہ رنگ تو نہیں، جو موجودہ دور کے نقاد زلفِ مشکیں اور ساقِ سیمیں پر اشعار کہنے والے شاعروں پر تنقیدیں لکھ کر اپنی تحریروں کا جوہر دکھاتے ہیں، یا ناول نگاروں اور افسانہ نویسوں پر اظہار رائے کر کے اپنی تنقید نگاری کی نکہت بادِ بہاری سے اپنے ناظرین کو خوش کرتے ہیں، لیکن اس میں ادبیات اسلامیہ میں تاریخ عرب، جغرافیۂ عرب، طوطمیت' ادبیاتِ اسرائیلیہ، ادبیات یونان و رومانیہ، انکشافات اثریہ، تاریخ قدیم کے اصول کی تعیین پر جو نقد و تبصرہ ہے اس کی بالغ نظری پر تنقید نگاری کے فن کو ناز ہو سکتا ہے، سید صاحبؒ کی اس کاوش فکر پر ان کو نقاد کہا جائے تو موجودہ دور کے نقاد اپنے قلمرو میں اس کو شاید بے جا شبخون قرار دیں، اور اس کے لیے مخصوص اصطلاح وضع کر کے اپنے فن کی عصمت اور عفت کو مامون اور مصون کرنے کی کوشش کریں گے لیکن اہل نظر حقیقت کو حقیقت کہنے سے گریز نہ کریں گے۔

آخر میں یہ کہنا ہے کہ تاریخ ارض القرآن کو لکھے ہوئے تقریباً ۸۶ برس ہو چکے ہیں، اس پر اب تک کسی قسم کی مخالفانہ تنقید یا تنقیص نہیں ہوئی ہے، شاید اس لیے کہ اس کا شروع سے آخر تک پڑھنا ہی صبر آزما ہے پھر کس میں دم خم ہے جو اس کی عیب جوئی اور خوردہ گیری کر کے اپنی طبع کا ر وقت نظر کا ثبوت دے جس کو تحقیق و تدقیق سے دلچسپی نہیں اس کے لیے تو یہ کتاب طلسم ہوش ربا یا فسانہ عجائب معلوم ہوگی، ہاں واقعی اگر کوئی علمی تلاش و جستجو اور تفحص کا دلدادہ ہے تو پھر یہ کتاب اس کے لیے نظر و فکر، دیدہ وری اور باریک بینی کا ایک خوان پر از نعمت ہے، اس میں تحقیق کو جو خلعت پہنایا گیا ہے، وہی اس کی اصل خوبی ہے۔

حضرت سید صاحبؒ کی یہ کتاب ۱۹۱۵ء میں لکھی گئی ہے، اس کو لکھے ہوئے کافی عرصہ ہو چکا ہے، اس اثنا میں ضرورت تھی کہ اس موضوع پر اہل قلم اور صاحب تحقیق کچھ اور اضافہ کرتے لیکن یہ موضوع شاید اتنا خشک اور صبر آزما سمجھا گیا کہ اب تک اس موضوع پر اردو میں کسی نے لکھنے کی زحمت گوارا نہیں کی، حالانکہ یورپ کے مستشرقین اس سلسلہ میں برابر کچھ نہ کچھ لکھتے رہتے ہیں۔

Land of The Bible پر کتابیں بہت کچھ لکھی گئی ہیں، اور لکھی جا رہی ہیں، لیکن اس موضوع پر ان کی تحقیقات زیادہ تر ظنیات اور قیاسات پر مبنی ہوتی ہیں، اس لیے ان میں تغیر و تبدل اور ترمیم و اضافہ کی گنجائش تو رہتی ہے تاریخ ارض القرآن میں سید صاحبؒ نے جو کچھ کلام پاک کو ماخذ بنا کر لکھا ہے وہ تو حرف آخر ہے، آثار قدیمہ اور کتبات جو دریافت ہوتے رہتے ہیں ان کے ذریعہ سے معلومات میں مزید اضافہ کیا جا سکتا ہے۔

وراقت؛ کتاب منزل بمنزل

از

مولانا محمد عبد الحکیم چشتی، کانو، نائیجریا

(۲)

اس کے علاوہ کتب فروش بھی کتابوں کی خرید و فروخت کے لیے مشرقی و مغربی ممالک میں گھومتے رہتے تھے، بعض اوقات صاحب کتب خانہ کسی ضرورت کے تحت اپنے ذخیرۂ کتب سے کتابیں ان کو بیچتے تھے[۱]، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ تاجر کتب جس طرح کتابیں کتب خانوں میں پہونچاتے تھے، اس طرح صاحب کتب خانہ سے کتابیں خریدا بھی کرتے تھے، یوں کتابوں کی گردش کا عمل جاری رہتا تھا۔

تاجر کتب نادر و اہم اور نئی نئی کتابیں بلاد مشرق (ایشیا و افریقہ) اور مغرب (یورپ) میں بھی لے جاتے، مالکان کتب خانہ سے ربط و ضبط بڑھاتے اور انھیں کتابیں پہونچاتے تھے، چنانچہ حلب کا ایک تاجر کتب عراق سے بوعلی سینا کی کتاب "القانون" کا نسخہ اندلس لایا، اس سے قبل یہ کتاب اندلس میں نہیں آئی تھی، اس نے ابو العلاء زہر بن عبد الملک اشبیلی متوفی ۵۲۵ھ کو دکھائی، مگر اس بالغ نظر کی نظر میں نہیں سمائی[۲]، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس دور کے تاجران کتب کی تجارت کا دائرہ کتنی وسعت اختیار کر گیا تھا۔

اہل علم علماء سے کتابیں ہی نہیں خریدتے تھے، بلکہ ان کا ان سے سماع کرتے اور سند بھی لیتے تھے، چنانچہ

---

[۱] عیون الانباء لابن ابی اصیبعہ ج ۲، ص ۱۶۴-۱۶۵ [۲] ایضاً ص ۱۰۴-۱۰۵

دو عبداللہ محمد المعروف بہ ابن زوج الحرہ المتوفی ۳۷۲ھ سے خطیب بغدادی نے جو کتابیں خریدی تھیں ان کا موصوف سے سماع بھی کیا تھا۔[1] یہ عہد عباسی میں کتابوں کے استعمال کا شاہد عدل ہے۔

تجارت صرف تیار مال کو ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرنے یا ایک فرد و جماعت سے لے کر دوسرے فرد یا جماعت کو بیچنے ہی کا نام نہیں ہے بلکہ اس کے مفہوم میں لین دین کے اندر تعاون کے رشتہ کو استوار کرنا اور اس میں نظم و نسق قائم رکھنا بھی داخل ہے، یہ نظم اور انتظام وانصرام سرکار کی زیر سرپرستی ہو یا نہ ہو، وراقوں اور تاجروں کی برادری میں اس کا شعور ضرور تھا، یہ شعور ہی تھا جو بغداد کے سوق الوراقین سے اسپین تک بستی بستی میں کتابوں کو پھیلا رہا اور تجارت کتب کو فروغ دے رہا تھا، اس طرح ابلاغ و ترسیل کے عمل کو جاری رکھنے میں آسانیاں بہم پہونچ رہی تھیں۔

کتابوں کی قیمت پر کنٹرول | عہد عباسی ہی میں نہیں بلکہ اس کے بعد کے دور میں بھی کتابوں کی قیمت کے بڑھنے اور گھٹنے پر نظر رکھی جاتی تھی، گو حکومت سرکاری طور پر کوئی اقدام نہیں کرتی تھی، لیکن صاحب تصانیف اس میں اخلاقی دباؤ ڈالتے تھے، اور اگر تاجران کتب نے کبھی کتابوں کی قیمت مناسب نہیں رکھی اور انھیں بیجا نفع اندوزی اور استحصال پر مصر ہوتے دیکھا گیا تو انھوں نے ایسی صورت میں اس کتاب کا بہتر بدل لانے کی کوشش کی، اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ قیمت معمول پر آگئی،

شرح کتابت | تیسری صدی ہجری کے اوائل میں عام طور پر وراق ایک درہم میں دس ورق لکھتا تھا، اور پانچ ورق فی درہم اجرت بہت گراں سمجھی جاتی اور گوارا نہیں کی جاتی تھی، چنانچہ فراء نے جب کتاب المعانی املا کرائی تو وراق پانچ ورق فی درہم پر نقل کرنے لگے، اس سے معلوم ہوا کہ اس نے انھیں بیجا نفع اندوزی سے روکا مگر یہ نہ مانے، آخر اس نے کتاب المعانی کو شرح مزید کے ساتھ املا کرانا شروع کیا، ابھی سو ورق املا کرائے تھے کہ وراق دس دس ورق فی درہم پر راضی ہو گئے۔[2]

---

[1] تاریخ بغداد للخطیب ج ۲، ص ۳۶۰-۳۶۱ [2] ایضاً ج ۱۴، ص ۱۵۰۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ علماء و ارباب فن علوم و فنون کی نشر و اشاعت، علم کی خدمت اور عوام کی سہولت کے پیش نظر کتابوں کی قیمت پر نظر رکھتے تھے، وراقوں اور تاجروں کو کتابوں کی معمول سے زیادہ قیمت وصول کرنے کی اجازت نہیں دیتے تھے۔

تیسری صدی ہجری کے اواخر میں ایک جزء تین درہم میں لکھا جاتا تھا، چنانچہ ابو عبداللہ احمد بن الفرح کندی حمصی المعروف بہ الحجازی المتوفی سنہ ۲۷۱ھ کے تذکرہ میں محمد بن عوف کا بیان ہے کہ میں نے ابوالیمان شعیب کی بے شمار کتابیں نقل کی تھیں، میں ایک جزء تین[۳] درہم میں لکھتا تھا[۱]

تیسری صدی ہجری کے اواخر میں ایک جزء ایک درہم میں فروخت ہونے لگا تھا، ابراہیم حربی (۱۹۸ھ ۔ ۲۸۵ھ = ۸۱۵ء ۔ ۸۹۸ء) سے ان کی دختر نے تنگدستی کی شکایت کی، انہوں نے اس سے یہی کہا تھا کہ جس کے پاس بارہ ہزار جزء لغت کے موجود ہوں اس کے پاس بارہ[۱۲] ہزار درہم ہیں، وہ فقیر نہیں ہوتا، میرے مرنے کے بعد ہر جزء ایک درہم میں بیچ سکتی ہو[۲] جزء کی مقدار ہر دور میں تقریباً مختلف رہی ہے لیکن تیسری صدی ہجری میں پچاس[۵] ورق کی کتاب کو لفظ جزء سے تعبیر کیا جاتا تھا، چنانچہ مورخ کا بیان ہے ابو محلم بغدادی نے مجھ سے ایک جزء مستعار لیا تھا جو تقریباً پچاس ورق پر مشتمل تھا[۳]، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ تیسری صدی ہجری کے اواخر میں بارہ ورق فی درہم اجرت نقل تھی، چنانچہ ابوبکر محمد بن مسلم بن عبداللہ قنطری زاہد المتوفی سنہ ۲۶۰ھ جامع سفیان ثوری کا نسخہ ستر[۷۰] درہم میں لکھتے تھے[۴] بعض خاص اسباب کے تحت بعد کے ادوار میں بھی جزء اسی حساب سے فروخت ہوا، چنانچہ چھٹی صدی ہجری میں اسعد بن الیاس المتوفی سنہ ۵۵۸ھ کے تیار کیے ہوئے خلاصے بولی لگنے پر ایک درہم فی جزء کے حساب سے بکے تھے[۵]، تاہم نامور مصنف کا اپنا لکھا ہوا ایک جزء تقریباً ایک دینار میں بکتا تھا، چنانچہ خلیل بصری کی کتاب العین، جو

---

[۱] تاریخ بغداد للخطیب ج ۴، ص ۳۴۱ ۔ [۲] ایضاً ج ۶، ص ۳۳ [۳] الفہرست لابن الندیم ص ۶۹، [۴] تاریخ بغداد ج ۳، ص ۲۵۶ [۵] عیون الانباء لابن ابی اصیبعہ ج ۲ ص ۲۹۳۔

اڑتالیس جلدیں تھی پچاس دینار میں فروخت ہوئی تھی۔[1]

مدینۃ السلام بغداد میں کتابت مذکورۂ بالا اجرت پر کی جاتی تھی، لیکن دیگر اسلامی ممالک میں بعض وجوہ سے کتابت کا نرخ مختلف تھا، چنانچہ بعض اوقات شناسان کتب کو اجرت کتابت زیادہ ادا کی جاتی، چنانچہ تیسری صدی ہجری کے نصف میں ابو زرعہ رازی نے مصر میں جب امام شافعیؒ کی تصانیف نقل کرائیں تو تقریباً اجرت کتابت فی کاغذ ایک درہم ادا کی تھی، موصوف کا بیان ہے:

میں ۲۲۲ھ میں حج کرتے ہوئے مصر کی طرف نکلا، وہاں ٹھہرنے کا بہت کم خیال تھا، لیکن علم و استفادہ کا یہاں زیادہ چلن دیکھا تو پندرہ مہینے ٹھہرا، امام شافعیؒ کی کتابوں کے سب سے زیادہ واقف کو ڈھونڈا تاکہ ان کا ذخیرۂ کتب نقل کرایا جائے، اس نے اسی درہم اجرت مانگی، میرے پاس دیبا کے دو کپڑے تھے، میں نے انہیں ساٹھ درہم میں بیچا، دس درہم میں سو ورق کاغذ خرید کر اسے دیا، کتابیں نقل کرائیں۔[2]

اس سے معلوم ہوا کہ تیسری صدی ہجری میں کہ ایک امام مجتہد کی تالیفات کا ذخیرہ نوے درہم میں فراہم کیا جا سکتا تھا۔

عہد عباسی میں جوں جوں معیار زندگی بلند ہوتا گیا، اشیائے صرف کی قیمتوں میں بھی اضافہ ہوا، اور وراقت و کتابت بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکیں، چنانچہ چوتھی اور پانچویں صدی ہجری میں تقریباً ایک ورق ایک درہم میں لکھا جاتا تھا، مشہور ادیب قاضی ابو سعید سیرانی المتوفی ۳۶۸ھ مجلس قضا و درس سے قبل ہر روز دس ورق جس کی اجرت دس درہم تھی لکھ کر اٹھتے تھے،[3] اور ابو علی حسن عکبری المتوفی ۴۲۵ھ پانچ درہم کا کاغذ خریدتے جو اتنا ہوتا تھا کہ اس میں متنبی کا دیوان لکھ لیا جاتا تھا، (اندازاً متوسط قلم سے موجودہ متوسط تقطیع کے تقریباً تین سو صفحات) وہ لکھنے کے بعد کم از کم ڈیڑھ سو درہم ورنہ عموماً دو سو درہم میں فروخت کرتے تھے، موصوف زود نویس تھے، تین

---

[1] الفہرست لابن الندیم ص ۴۴۳ [2] ابن ابی حاتم، کتاب تقدمۃ الجرح والتعدیل ص ۳۴۰ [3] نزہۃ الالباء لابن الانباری ص ۳۷۹، انباہ الرواۃ للقفطی ج ۱ ص ۳۱۳-۳۱۴، الجواہر المضیئۃ للقرشی ج ۱ ص ۱۹۶، ج ۲ ص ۲۲۶، وفیات الاعیان ج ۱ ص ۱۳۰، لسان المیزان لابن حجر ج ۲ ص ۲۱۸۔

دن میں ایک دیوان کے [illegible] نصف نقل نہ ہوتا، وہ ہفتہ میں کم لیتا تھا، اس سے عکبری نے [illegible] ہزار درہم کمائے تھے۔[1] اس سے ثابت ہوتا ہے کہ زود نویس کاتب تقریباً پچاس[2] درہم یومیہ اور غیر زود نویس کاتب پچیس[3] درہم یومیہ سے زیادہ پیدا کرتا تھا، اس سے وراقت، کتابت کے پیشے میں کمائی کا، وراقوں اور کاتبوں کی خوشحالی اور ان کے معیار زندگی کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

کتابوں کی قیمت کا ضروریات زندگی سے موازنہ

عہد عباسی میں کتابوں کا ذخیرہ بڑھانے اور کتب خانہ بنانے پر جو رقم خرچ کی جاتی تھی وہ ضروریات زندگی کے مقابلہ میں بہت زیادہ ہوتی تھی، اس کا اندازہ حسب ذیل واقعہ سے کیا جا سکتا ہے، مشہور محدث شعبہ ابن الحجاج (۸۲ھ / ۷۰۱ء - ۱۶۰ھ / ۷۷۶ء) کے مرنے کے بعد ان کے خچر، زین، لگام، بدن کے کپڑے اور جوتے سولہ درہم میں بکے تھے۔[1]

اس سے یہ حقیقت عیاں ہو جاتی ہے کہ اس زمانہ میں خچر، اس کا ساز و سامان، سوار کا جوڑا اور جوتا سولہ درہم میں آتا تھا، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ابتداء میں عہد عباسی میں عام پڑھے لکھے انسان کی ضروریات زندگی کی تکمیل اس معمولی رقم سے پوری ہو جاتی تھیں، اس لیے کہ اس دور میں خچر پانچ درہم میں، سستی قمیص چار درہم میں اور عمدہ قمیص آٹھ درہم میں ملتی تھی۔[2] ایک عام فقیہ (جیسے امام محمدؒ) کی تصانیف پر ساٹھ[3] دینار خرچ آتا تھا۔[4]

مذکورۂ بالا تاریخی شہادت اس امر کا نہایت بین ثبوت ہے کہ عہد عباسی میں اہل علم شائقین کتب سب سے زیادہ رقم کتب و کتب خانوں پر خرچ کرتے تھے، جو ان کی علمی و مادی ثروت کی شاہد عدل ہے۔

گراں قیمت کتابوں کے حوالے

عہد عباسی میں اسلامی قلمرو میں کتابیں عام نرخ پر ملتی تھیں لیکن حسب ذیل خصوصیات سے آراستہ کتابیں صحت و ندرت کی وجہ سے عام طور پر گراں قیمت میں دستیاب ہوتی تھیں۔

---

[1] تاریخ بغداد ج ۶، ص ۳۱۹ - ۳۲۰، الانساب للسمعانی، ورق ۳۹۵ [2] ایضاً ج ۹، ص ۲۶۲ [3] ایضاً ج ۹، ص ۲۶۱،

[4] تقدمۃ الجرح والتعدیل لابن ابی حاتم الرازی، ج ۱، ص ۱۶۳، توالی التاسیس لابن حجر ص ۷۶ -

(۱) مصنف یا شارح کے ہاتھ کی لکھی ہوئی کتاب، جیسے خلیل بصری کی کتاب العین جس کے متعلق مشہور تھا کہ وہ مصنف کا اپنا نسخہ تھا، پچاس دینار میں بکا تھا[1]

(الف) مصنف یا شارح یا تحقیق نگار کا اپنا لکھا ہوا نسخہ۔

(ب) 〃 〃 〃 کا صحت کردہ نسخہ۔

(ج) 〃 〃 〃 کے تلمیذ خاص کا نسخہ[2]

(د) 〃 〃 〃 کا صحیح کیا ہوا یا اس سے پڑھا ہوا نسخہ۔

(ہ) 〃 〃 〃 کے وراق کا لکھا ہوا نسخہ۔

(و) 〃 〃 〃 کے نسخہ سے منقول و مقابلہ کیا ہوا نسخہ۔

(ز) 〃 〃 〃 کی آخری عمر کا نسخہ۔ (بشرطیکہ حافظہ درست رہا ہو)

(ح) 〃 〃 〃 سے قریب العہد نسخہ۔

(۲) اہل علم کا تصحیح کیا ہوا نسخہ[3]

(۳) نامور وراق کا لکھا ہوا نسخہ۔

(۴) عالم یا علماء کے زیر مطالعہ رہا ہوا نسخہ۔

(۵) نامور عالم یا علماء کے حواشی سے آراستہ نسخہ[4]

(۶) مشہور صحیح نویس کا لکھا ہوا نسخہ، جیسے یوسف بن خوزا النجیرمی المتوفی ۴۲۳ھ کا لکھا ہوا دیوان جریر اور طبقات الشعراء ابن سلام میں سے ہر ایک مصر میں بیس دینار میں فروخت ہوتا تھا[5]

(۷) نامور خطاط کا لکھا ہوا نسخہ۔

---

[1] الفہرست لابن الندیم ص ۴۳ [2] تاریخ الادب العربی/ البحث العلمی ص ۴۳ - ۴۴ [3] ایضاً [4] ایضاً [5] انباہ الرواۃ للقفطی ج ۳، ص ۹۷۔

(۸) عمدہ کاغذ پر خوشخط لکھا ہوا نسخہ۔

(۹) کسی وزیر، امیر کبیر، عالم یا بادشاہ یا بزرگ کے خزائن کتب کا نسخہ[1]۔ اکثر شاہی کتب خانوں کی کتابوں پر "برسم خزانۃ الملک" کے الفاظ لکھے ہوتے تھے[2]۔ یا کسی وزیر، امیر یا بزرگ کا یا کسی کے کتب خانے کی کتابوں پر ان کا نام لکھا ہوتا تھا۔

(۱۰) بادشاہ، وزیر، عالم اور صاحب فن میں سے کسی کے نام معنون کیا ہوا نسخہ۔

(۱۱) ان مذکورۂ بالا شخصیات میں سے کسی کے لیے تیار کیا ہوا یا کرایا ہوا نسخہ۔

(۱۲) کسی کتاب کا مشکول (اعراب لگایا ہوا) نسخہ۔

(۱۳) نقش و نگار سے آراستہ کتاب، مطلا و مذہب نسخہ۔

(۱۴) خوشنما مجلد نسخہ[3]۔

(۱۵) مصور نسخہ[4]۔

(۱۶) امہات الکتب، ہر فن کی امہات الکتب بھی گراں قیمت میں دستیاب ہوتی تھیں۔

(۱۷) فنی کتابیں، چنانچہ بطلیموس کی فن ہیئت میں مشہور کتاب المجسطی کا نسخہ چوتھی صدی ہجری میں بیس[20] دینار میں فروخت ہوا تھا[5]۔ یا مثلاً ابوعلی ابن الہیثم بصری المتوفی سنہ ۴۳۰ھ کی نقل کردہ اقلیدس، کتاب المتوسطات اور کتاب المجسطی کا نسخہ ڈیڑھ سو دینار سے کم میں فروخت نہیں ہوتا تھا[6]۔

(۱۸) دائرۃ المعارف کی قسم کی کتابیں چنانچہ ابونعیم اصفہانی کی کتاب الحلیہ (جو تصوف کا دائرۃ المعارف ہے) ان کی حیات میں نیشاپور پہونچی تو چار سو دینار میں بکی تھی[7]۔

---

[1] الفہرست لابن الندیم ص ۴۹ [2] ایرج افشار، نسخ خطی اسلامی در سابقہ تاریخ آنہا، ہنر و مردم، شمارہ ۱۱۲ (آذر ماہ ۱۳۵۱ھ) ص ۴ [3] نفح الطیب للمقری ج ۲ ص ۱۰۱۔ [4] معجم الادباء ج ۶ ص ۱۴۷۔ ۱۴۸ [5] مصطفیٰ جواد، الثقافۃ العقلیۃ والحالۃ الاجتماعیہ فی عصر الشیخ ابوعلی بن سینا، مجلۃ المجمع العلمی العراقی ۱۹۵۴ء۔ شمارہ ۳، شمارہ ۱۰ (۱۳۷۳ھ) ص ۵۰۲ [6] عیون الانباء لابن ابی اصیبعہ ج ۲ ص ۱۵۰۔ ۱۵۱ [7] تذکرۃ الحفاظ للذہبی ج ۳، ص ۱۰۹۲۔

(۱۹) غیر زبانوں سے ترجمہ شدہ کتابیں، اس قسم کی کتابوں کی قیمت عربی کتب کی نسبت زیادہ ہوتی تھی، ہاتھوں ہاتھ نکلتی اور ملکوں میں تاجروں کے ذریعہ دور دور تک پہونچ جاتی تھیں[1]

(۲۰) وہ کتابیں جن کا چلن کم ہوتا یا جن کی طرف اہل علم کی رغبت کم ہوتی تھی، وہ بھی گراں ملتی تھیں،

(۲۱) کسی کتاب کا پہلا نسخہ جب کسی دیار میں پہونچتا وہ بعض اوقات بہت گراں قیمت میں بکتا، چنانچہ عبداللہ بن عبدالرحمٰن ابی زید قیروانی المتوفی ۳۸۶ھ/۹۹۶ء کا الرسالہ جو مالکی فقہ کے چار ہزار مسائل اور چار سو حدیثوں پر مشتمل مختصر و مقبول رسالہ ہے[2]، جب افریقہ سے ایشیا آیا اور مرکز خلافت بغداد پہونچا تو فقیہ ابوبکر محمد بن عبداللہ بہری المتوفی ۳۷۵ھ/۹۸۶ء کے حلقۂ درس میں اسے بیس[3] دینار میں خریدا گیا تھا[4]

قلمی کتابوں کی اہمیت و ندرت یا چلن یا رغبت کم ہونے کی وجہ سے گراں قیمت ہونے کے یہ وہ عوامل ہیں جو عہد عباسی میں کار فرما تھے، کم و بیش آج بھی ان پر عمل کیا جاتا ہے، اور یہی وہ اساسی اصول ہیں جن کو مسلمانوں نے قلمی نسخوں کی علمی تحقیقات میں بنیاد بنایا، ان کے قیمتی اصول آج بھی تحقیق متون میں ملحوظ رکھے جاتے ہیں اور کتب خانوں کی عظمت و شہرت کا باعث ہیں، ان اصول سے ابن الندیم کی کتاب الفہرست میں اعتنا کیا گیا ہے، البتہ تاریخ کتب خانہ میں ہم نے استقراء و تتبع سے پہلی مرتبہ ان کا احاطہ اور انھیں مرتب و یکجا کیا ہے۔

سستی کتابوں کے عوامل کتابیں عام طور پر مروجہ نرخ پر ملتی تھیں لیکن بعض اوقات حسب ذیل اسباب کی وجہ سے کتابیں سستی بھی مل جاتی تھیں۔

(۱) جب حملہ ہوتا اور فوج کشی سے تباہی آتی، مدرسے، کتب خانے اور علمی خانوادے برباد ہوتے، وزیروں، امیروں کے محلات لٹتے اوباش کتابیں لے جاتے اور انھیں کوڑیوں کے مول بیچتے تھے۔

---

[1] الفہرست لابن الندیم ص ۴۶۱ [2] عمر الجیدی، نظرات فی تاریخ المذہب المالکی من اوائل المصنفات فی المذہب المالکی، من اوائل المصنفات فی المذہب المالکی الرسالہ: دعوۃ الحق شمارہ ۲۲۰ جمادی و رجب ۱۴۰۲ھ ص [3] عبدالرحمٰن بن الدباغ، معالم الایمان فی معرفۃ اہل القیروان تونس ۱۳۲۰ھ ج ۳ ص ۱۴۲ [4] ایضا عمر الجیدی من اوائل المصنفات فی المذہب المالکی الرسالۃ دعوۃ الحق ص ۱۷۔

سنہ ۹۹۰ھ میں عراق پر حملہ ہوا تو نیم دانگ[1] میں ایک من کتابیں تول کے حساب سے بکی تھیں[2]،

(۲) کبھی ناواقف لوگ فی الفور اپنی ضرورت کے لیے کتاب سستی بیچتے اور خریدار با طلب سستے داموں خرید لیتے تھے، ابن سینا کو ایک ضرورت مند سے بلا طلب ابو نصر فارابی کی کتاب مابعد الطبیعۃ اسی طرح کوڑیوں میں ہاتھ آئی تھی[3]۔

(۳) جب کوئی عالم مرتا اس کے ذخیرۂ کتب میں کتابیں نسبتہً سستی فروخت ہوتی تھیں اس لیے اہل علم گنجائش نہ ہونے کے باوجود زیادہ تعداد میں کتابیں خریدتے تھے، چنانچہ ابن طرخان کے ترکہ سے ابو حیان توحیدی نے سنہ ۳۷۰ھ میں بہت سی کتابیں خریدی تھیں[4]۔

(۴) ناقص اور عیب دار کتابیں سستی فروخت ہوتی تھیں، کتابوں کے شوقین بعض نادار یا بخیل یا عیار و کتاب شناس شوقین عالم جب کتابوں کے ڈھیر سے کوئی کتاب نکالتے تو اوراق اس کتاب کی اہمیت و ندرت کو پا لیتا اور اسی لحاظ سے وہ کتاب کے دام مانگتا تھا، مگر یہ کتابیں سستی خریدنے کی غرض سے غیر اخلاقی حرکت سے بھی گریز نہیں کرتے تھے، کتاب دیکھتے دیکھتے اس کو پھاڑ دیتے اور ورق نکال لیتے، اور کسی نہ کسی طرح کتاب میں نقص پیدا کر کے اسے کم قیمت میں خرید لیتے تھے، چنانچہ مشہور نحوی ابن الخشاب المتوفی سنہ ۵۶۷ھ اسی طرح کتاب خریدتا تھا[5]، ابو الخیر مسیحی ابن ابی البقاء المتوفی سنہ ۶۰۰ھ کا بھی یہی وطیرہ تھا[6]۔

(۵) شریف خاندان کی بعض مصیبت زدہ خواتین اپنا بھرم قائم رکھنے اور ضروریات زندگی پورا کرنے اور بدنامی سے بچنے کی خاطر خاندانی ذخیرے چوری چھپے اونے پونے بکواتی تھیں، اس طرح لوگوں کو سستی کتابیں مل جاتی تھیں، چنانچہ ہندو شاہ نخجوانی کا بیان ہے کہ ایک عورت اوراق و کراریس اور بڑے کاغذات کا پلندہ

---

[1] دانگ، دانق کا معرب ہے یہ چھ رتی وزنی چاندی کا سکہ تھا۔ [2] راحۃ الصدور و آیۃ السرور، تالیف محمد بن علی الراوندی، تحقیق محمد اقبال، لیڈن، ای۔ جے۔ بریل سنہ ۱۹۲۱ء ص ۳۳۳ [3] انباہ الرواۃ للقفطی ص ۱۵۔ ۱۶ [4] اخلاق الوزیرین مثالب الوزیرین اخلاق الصاحب ابن عباد و ابن العمید لابی حیان التوحیدی تحقیق ابراہیم کیلانی دمشق دار الفکر سنہ ۱۹۶۱ء ص ۵۲ [5] معجم الادباء ج ۴ ص ۲۸۰۔ ۲۸۶ [6] اخبار الحکماء للقفطی ص ۳۳۲۔ ۳۳۳۔

بیچنے کے لیے میرے پاس لائی، بہت سستا دے گئی، میں نے اسے کھول کر دیکھا تو اس میں ابن مقلہ کے ہاتھ کا لکھا ہوا ایک دفتر تھا۔[1]

(۶) بعض وہ لوگ جو زیادہ پڑھے لکھے نہیں ہوتے انھیں ترکہ میں کتابیں ملتی تھیں، یہ کھڑے کھڑے سوق الوراقین میں دلالوں سے بولی لگوا کر کتابیں نکال دیتے تھے، اس قسم کی کتابیں بھی سستی مل جاتی تھیں۔[2]

(۷) کال (قحط) پڑتا، اور لوگوں کے پاس کھانے کو نہیں رہتا تو بھی لوگ کتابیں سستی بیچ کر پیٹ کی آگ بجھاتے تھے۔

تاتاریوں نے بغداد کو تباہ کیا، اہل بغداد دانے دانے کو ترس گئے، اہل حلہ اور اہل کوفہ بغداد میں کھانے کا سامان لاکر بیچتے، اور اس کے عوض قیمتی کتابیں بہت ہی سستی خرید کر لے جاتے، اس طرح ذخیرہ اندوزی سے وہ بہت جلد مالدار بن بیٹھے تھے۔[3] گویا قحط سالی نے زرعی معیشت کے کارکنوں (کسانوں) کے گھروں میں بھی کتابیں پہونچا دی تھیں۔

کتابوں کے سستا ہونے کے مذکورہ بالا عوامل آج بھی اسی طرح کارفرما ہیں جس طرح عہد عباسی میں کارفرما تھے۔

---

[1] تجارب السلف در تواریخ خلفا و وزرائے ایشان، از ہندو شاہ نخجوانی، تہران، مطبعہ فردین ۱۳۱۳ھ ص ۲۶۲،
[2] اخبار الحکما ص ۴۱۵ - ۴۱۶۔ [3] الحوادث الجامعہ والتجارب النافعہ لابن الفوطی، بغداد، المکتبۃ العربیۃ ۱۳۵۱ھ ص ۳۳۱۔

آثارِ علمیہ

گذارشِ احوالِ واقعی

از جناب شیخ نذیر حسین صاحب، مدیر اردو انسائیکلوپیڈیا آف اسلام، پنجاب یونیورسٹی، لاہور

معارف میں تین ساڑھے تین سال سے مستشرقین پر نہ ختم ہونے والا سلسلۂ مضامین جاری ہے، ان مضامین میں بیشتر مقالہ نگاروں نے وہی باتیں دُہرائی ہیں جو آج سے ساٹھ ستر برس پیشتر مولانا شبلیؒ اور مولانا سید سلیمان ندویؒ نے لکھی تھیں، انھوں نے کوئی نئی بات نہیں لکھی، بعض مقالہ پیش کرنے والوں نے ایک مصنف کی ایک ہی کتاب پر بحث و استدلال کی عمارت کھڑی کر دی ہے، ان سب کا قدر مشترک مستشرقوں کا تعصب اور اسلام دشمنی ہے، میرا گمان یہ ہے کہ ان فاضل مقالہ نگاروں کی اکثریت مستشرقوں کی تصحیح سے شایع شدہ کتابوں کی اہمیت اور دوسری خدمات سے ناواقف ہے، کاش کہ انھوں نے معجم البلدان (یاقوت) اور تاریخ الطبری کے یورپی ایڈیشنوں کے صرف انڈکس اور فرہنگ دیکھ لیے ہوتے۔

مستشرقین کی تنگ نظری اور بعضوں کے تعصب کا مجھ کو بھی اقرار ہے، ان کے بعض افکار و نظریات سے شدید اختلاف بھی ہے لیکن ایک بات عرض کرنے کی اجازت چاہتا ہوں کہ ان کی علمی کاوشوں کا بھی خوشدلی سے اعتراف کیا جائے، ڈچ اور جرمن مستشرقوں نے ہمارے علمی ورثے کو زندہ کیا ہے اور اس کو نئی آب و تاب سے پیش کیا ہے، ان میں ڈوزی، ڈخویہ، وسٹنفیلٹ اور براکلمان کی علمی خدمات کی قدر و قیمت سے آنکھیں بند کر لینا بے خبری، بے ذوقی اور کم نگاہی کی دلیل ہے، خدارا مجھے بتلایا جائے کہ عربی زبان و ادب کا ایک طالب علم لین (Lane) کی عربی، انگریزی لغت اور براکلمان کی تاریخ ادب عربی سے کیسے بے نیاز رہ سکتا ہے۔

ان بدنام مستشرقین نے ہمیں تاریخ ادب کا نیا مضمون دیا ہے، تاریخ ادبیات میں نثر نگاری کو شعر و شاعری کے

برابر دیدیا ہے، اکتابوں میں مذکورہ اسمار اور اعلام کے انڈکس کو رواج دیا ہے، حضرت ابراہیم علیہ السلام کے زمانہ کے شہر اور ۲ ملا کا پتہ چلایا ہے، اصحاب کہف کے مدفن اور غار کا سراغ لگایا ہے، اور سندھ میں محمد بن قاسمؒ کے بسائے ہوئے شہر منصورہ کے آثار دریافت کیے ہیں، برطانیہ کی وزارت بحریہ نے ۱۹۱۷ء میں جزیرۂ عرب کے جغرافیہ اور طبعی حالات پر ایک کتاب شایع کی تھی جس کی افادیت ساٹھ ستر برس گذرنے کے باوجود آج بھی قائم ہے۔

ہندوستان میں بنگال ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ نے ہندوستان کی فارسی کتب تاریخ کو بڑے اہتمام سے شایع کیا ہے، ان کے علاوہ زمخشری کی تفسیر الکشاف، تھانوی کی کشاف اصطلاحات الفنون، الاصابہ، دیوان الحماسہ، الفیہ کی شروح اور ہدایہ کا انگریزی ترجمہ، مشرقی علوم کے شایق انگریز حکام کی سرپرستی میں کلکتہ سے شایع ہوا تھا، ابوالفضل کی آئینِ اکبری ہندی، اسلامی ثقافت کا انسائیکلوپیڈیا ہے، بلاخ منؒ (Blochmann) کے قلم سے اس کا انگریزی ترجمہ صحت بیان اور خوبی زبان کے اعتبار سے ہر طرح قابل تحسین ہے۔

ہندوستان میں پرانے انگریز آئی سی ایس افسروں نے اس زمانہ میں گھوڑوں، خچروں اور اونٹوں پر سفر کر کے مختلف اضلاع کے گزٹیر اور مالگذاری اور بندوبست کی رپورٹیں مرتب کیں، جب ذرایع سفر محدود و مخدوش اور تمدنی زندگی کی موجودہ آسائشیں مفقود تھیں، یہ رپورٹیں آج بھی کارآمد ہیں، مختلف صوبائی زبانوں کی گرامریں اور لغات بھی ان کے علمی شوق کی یادگار ہیں۔

ان سطور کے لکھنے سے غرض مقصود تصویر کا صرف دوسرا رُخ پیش کرنا ہے، کسی کی بے جا مدح اور حمایت و مدافعت منظور نہیں۔

بزم نشینانِ معارف سے صرف اتنی گذارش ہے کہ وہ مستشرقوں کے تعصب اور اسلام دشمنی کا پردہ ضرور چاک کریں، ان کی پھیلائی ہوئی غلطیوں کی شوق سے تردید کر دیں لیکن ساتھ ہی ان کی علمی خدمات کو بھی سرسری نظر سے دیکھا کریں، کسی کی تغلیط اور تردید کے ساتھ اس جیسا کام بھی کر کے دکھائیں اور مرض کی تشخیص کرتے ہوئے اس کا علاج و دوا بھی پیش کریں۔

---

[1] سابق پرنسپل مدرسہ عالیہ کلکتہ،

باب التقریظ والانتقاد

زندہ رود کی تیسری جلد

از سید صباح الدین عبد الرحمٰن

جناب ڈاکٹر جاوید اقبال (چیف جسٹس لاہور ہائی کورٹ) کی زندہ رود کی تیسری جلد زیر نظر ہے، جو ان کے والد بزرگوار علامہ محمد اقبالؒ کی سوانح عمری کے زریں سلسلہ کی آخری کڑی ہے، اس سے پہلے جون سنہ ۱۹۸۰ء کے معارف میں اس کی پہلی جلد اور جنوری سنہ ۱۹۸۲ء میں اس کی دوسری جلد کا طویل ذکر آچکا ہے، پہلے بھی اس کی اہمیت یہ لکھ کر ظاہر کی گئی تھی کہ یہ ایک باپ کی کہانی بیٹے کی زبانی ہے، انیسویں اور بیسویں صدی میں جو ارباب کمال مسلمانوں کی زندگی کے معمار ہے ان میں سے کسی کے فرزند ارجمند کو اپنے والد بزرگوار کی سوانح عمری لکھنے کی سعادت اور توفیق نہیں ہوئی، علامہ محمد اقبالؒ اس حیثیت سے خوش نصیب باپ ہیں کہ ان کے لایق فرزند نے ان کی سوانح عمری لکھ کر نہ صرف ان کی روح کو خوش کیا، بلکہ ان کی ملت کو ایک بیش بہا اور دل نواز تحفہ پیش کیا، یہ وہی جاوید اقبال ہیں جن کو مخاطب کر کے ان کے والد بزرگوار نے کہا تھا ؎

خدا اگر دلِ فطرت شناس دے تجھ کو، سکوتِ لالہ و گل سے کلام پیدا کر
میں شاخ تاک ہوں میری غزل ہے میرا ثمر مرے ثمر سے مے لالہ فام پیدا کر

یہ تینوں جلدیں لکھ کر اس کے مصنف نے دلِ فطرت شناس کا ثبوت دیا ہے، اور اپنے والد بزرگوار کی

زندگی کے سکوت لالہ و گل سے ہم کلام ہو کر اور ان کے خیالات کی شاخ تاک اور ان کے افکار کی غزل کے ثمر سے نئے لالہ فام پیدا کر دیا ہے،

علامہ کے حالات بہت کچھ لکھے جا چکے ہیں، اور ان کے شاعرانہ کمالات اور افکار کا تجزیہ بھی برابر ہو رہا ہے، اور آیندہ بھی طرح طرح کے زاویوں سے ہوتا رہے گا، لیکن ڈاکٹر جاوید اقبال کی زندہ رود کی تینوں جلدوں کو منفرد حیثیت برابر اس لحاظ سے حاصل ہوتی رہے گی کہ ان میں علامہ کی جو صبح و شام نظر آتی ہے یا ان میں ان کے افکار کی صبوحی تحریر کے بلوریں جام میں جس طرح چھلکتی دکھائی دیتی ہے کسی اور کتاب میں نہیں پائی جاتی۔

زیر نظر جلد میں علامہ کی حیات کے اختتامی دور کے احوال ہیں، یہ ۱۹۲۶ء سے شروع ہوتی ہے اور ان کی رحلت کے سال ۲۱ اپریل ۱۹۳۸ء پر آکر ختم ہو جاتی ہے یعنی کل بارہ سال کی تاریخ ہے، اس کو پڑھنے سے ان کی زندگی کے تین پہلو سامنے آتے ہیں، آپ کی سیاسی زندگی، آپ کی نجی زندگی، اور آپ کی وہ زندگی جو انھوں نے اپنی گہری نظر اور عمیق فکر کے ساتھ گذاری، ان کی سیاسی زندگی کی تفصیلات زیادہ ہیں، بیچ بیچ میں ان کی نجی زندگی کی جھلکیاں دکھائی دیتی ہیں، پھر ان کی نظر و فکر پر بھی جا بجا مباحث ہیں۔

پہلی اور دوسری جلدوں کی طرح اس کی خوبی یہ بھی ہے کہ اس کو پڑھتے وقت ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہم کوئی مثنوی پڑھ رہے ہیں، جس میں اس کا ہیرو کبھی سیاست کے میدان عمل میں دکھائی دیتا ہے، کبھی بچوں کا شفیق باپ نظر آتا ہے، اور کبھی اس کا دل کون و مکان کے راز مضمر کو فاش کر کے ایک ابدی پیام چھوڑنے کے لیے متفکر ہے، ان تمام باتوں کو قلم بند کرنے میں لائق مصنف نے کبھی اپنی بذلہ سنجی، کبھی طرز ادا کی خوش سلیقگی، کبھی تحریر کی شگفتگی کا وہی رنگ اختیار کیا جو ان کے والد بزرگوار نے اپنے متعلق کہا تھا ؎

کہ ہے ظریف و خوش آیندہ و شگفتہ دماغ

کتاب کے زیادہ تر حصے میں علامہ کی سیاسی سرگرمیوں کی تفصیل ہے، ہندوستان میں ۱۹۲۶ء سے

۱۹۳۰ء تک سیاسی حالات بہت ہی پُر آشوب اور ہنگامہ خیز رہے، یہ زمانہ راقم کے عنفوان شباب سے شباب تک رہا، جب کہ وہ اس دور کے ملکی واقعات کو سیاست کے ملمی پردے پر دیکھتا رہا، اس کتاب میں اس مدت کی سیاست کی جو تفصیلات ہیں وہ متحرک تصویروں کی طرح پھر نظروں میں گھومنے لگتی ہیں، یہ مصنف کی بہت کمسنی کا زمانہ تھا، لیکن اس کے لکھنے میں ان کا انداز آنکھوں دیکھا حال کا ہے، یہ ان کی محنت اور تحریر کی خوبی ہے، اس دور کی سیاست مختلف زاویے سے بھی لکھی گئی ہے، اور لکھی جائے گی لیکن جو زاویہ مصنف نے پیش کیا ہے اس سے چاہے کوئی کتنا اختلاف کرے، اس کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا ہے، اور تمام زاویوں کے ساتھ اس زاویہ کا مطالعہ بھی بہرحال مفید ہوگا۔

بقول لائق مصنف علامہ کو فکری اعتبار سے سیاسیات سے گہری دلچسپی تھی لیکن ۱۹۲۶ء سے پیشتر انھوں نے عملی سیاست میں حصہ نہ لیا تھا، اس سے پہلے شاعر بن کر خوش تھے جیسا کہ انھوں نے خود کہا ہے ؎

مرے سخن سے دلوں کی ہیں کھیتیاں سرسبز جہاں میں ہوں میں مثال سحاب دریا پوش

وہ عملی سیاست میں اس وقت آئے جب ۱۹۲۶ء کے صوبائی انتخاب میں لیجیسلیٹو کونسل کے ایک رکن کی حیثیت سے کھڑے ہوئے، ان ہی کا بیان ہے کہ اس زمانہ میں اپنی قوم کے مصائب کے سبب سے ان کی راتوں کی نیند اچاٹ تھی، (ص ۳۰۲) ان مصائب کو دور کرنے کے لیے وہ پنجاب کی قانون ساز کونسل میں جانا چاہتے تھے، مگر اس انتخاب میں ان کے حریفوں نے ان کے خلاف الزام تراشی اور بہتان طرازی کی جو مہم چلائی (ص ۲۹۰) اور بعض اوقات جو شرمناک حرکتیں کیں، (۳۰۲) ان کو لائق مصنف نے گو دلچسپ انداز میں ضرور قلمبند کیا ہے، پھر بھی ان کی تفصیلات کو پڑھ کر دکھ ہوا، کہ اس فخر اسلام کی اہانت اس حد تک بھی ہو سکتی تھی، یا بعد میں مولوی ابو محمد دیدار علی نے ان پر جو کفر کا فتویٰ صادر کیا (ص ۳۴۳) اس سے اور تکلیف ہوئی۔

۱۹۲۶ء کے بعد ہندوستان کے اندر بڑے بڑے سیاسی واقعات ظہور پذیر ہوتے رہے، ان ہی میں عبدالرشید کے ہاتھوں سوامی شردھانند کا قتل، شدھی اور سنگٹھن کے جواب میں مسلمانوں کی تبلیغ اور تنظیم

جداگانہ اور مخلوط انتخاب کا جھگڑا، بمبئی سے سندھ کو الگ کرنے، صوبہ سرحد اور بلوچستان میں دستوری اصلاحات کا نفاذ، پنجاب اور بنگال کی کونسلوں میں مسلم اکثریت کی بحالی، مرکزی اسمبلی میں مسلم نمایندوں کے تناسب کا مطالبہ، کشمیر کی آزادی کی تحریک، رنگیلا رسول کے مصنف کا قتل، سائمن کمیشن کی آمد پر تعاون اور عدم تعاون کا سوال، آل پارٹیز کانفرنس کی تجاویز، نہرو رپورٹ، محمد علی جناح کے چودہ نکات، گول میز کانفرنس، شاردا بل، احمدی تحریک کے خلاف شورش، مسلم لیگ کی دھڑ بندی، مولانا محمد علی کی وفات، محمد علی جناح کی بددلی وغیرہ کی تفصیلات کا احاطہ مصنف نے محنت اور سلیقہ سے کیا ہے، علامہ پر جو سیاسی اثرات مترتب ہوتے رہے، ان کا تجزیہ بھی اچھی طرح کیا ہے، ان کو سمجھنے کے لیے ان کا مطالعہ ضروری اور مفید ہے، اور پھر انھوں نے مسلم ریاست کا جو تصور ۱۹۳۰ء میں پیش کیا، اس کی پوری تفصیل ہے، اس کو حق بجانب قرار دینے کے سلسلہ میں لائق مصنف کا بیان ہے کہ :

"اقبال نے مسلم ریاست کا تصور اس لیے نہیں پیش کیا تھا کہ وہ ہندوؤں سے کوئی بغض یا تعصب رکھتے تھے، وہ برصغیر کے سیاسی حالات کے ذاتی مشاہدہ اور تجربہ سے اس نتیجہ پر پہونچے تھے کہ دونوں مذہبی فرقوں میں اشتراک اقتدار کا کوئی قابل قبول سمجھوتہ ممکن نہیں، دو بھائیوں میں اگر اتفاق نہ ہو تو وراثت تقسیم کرنی پڑتی ہے، یہ انسانی زندگی، خاندانی یا اجتماعی زندگی کا خاصہ ہے۔" (ص ۱۰۴)

اس توجیہ پر ارباب سیاست بحث کر سکتے ہیں، ایک بہت اہم سیاسی واقعہ کی ایک توجیہ یہ بھی ہے پھر اس تصور کو عملی جامہ پہنانے میں جو سرگرمیاں دکھائی گئیں ان کی پوری تفصیلات اس کتاب میں ملیں گی، جو خوں ریز واقعات ہوئے، شاداب علاقوں کی جو بربادی ہوئی، عفت مآبی کی جو غارت گری ہوئی، بیواؤں کی جو سسکیاں سنائی دیں، یتیموں کے جو نالے بلند ہوئے، لائق مصنف ان تفصیلات کو اپنے ہم وطنوں کے لیے دُہرا دیتے تو اچھا تھا، تاکہ ان کو معلوم ہو جاتا کہ کتنی قربانیوں کے بعد یہ مملکت بنی، مصنف ان کو درج نہیں کر سکے ہیں شاید اس کو اپنے موضوع سے خارج سمجھا ہو، مگر جس علاقہ میں علامہ محمد اقبال مسلم ریاست قائم کر کے اسلامی شریعت کا

نفاذ چاہتے تھے، وہاں کے عوام تو نہیں لیکن مفاد پرست اور خود غرض اکابر اپنی اپنی علیحدہ پارٹیاں بنا کر ان کو شاید محض غزل خواں سے زیادہ سمجھنے کے لیے تیار نہیں تھے، اسی لیے اپنی موت سے پہلے اپنے رسولؐ سے زیادہ کی!

بآں روزے کہ گفتم پے نبردند — زشاخِ نخلِ من خرما نخوردند
من اے میرِ امم داد از تو می خواہم — مرا یاران غزل خوانے شمردند

اور جب یہ تصور پاکستان کی شکل میں نمودار ہوا تو اس کا حال لائق مصنف نے یہ لکھا ہے:

"اسلامی ریاست کے تصور کو مسلمانانِ ہند کے نصب العین کے طور پر مسلم لیگ کی قرارداد لاہور میں پیش کیا گیا، حصول پاکستان کے ایک سال کے بعد محمد علی جناح وفات پا گئے، ان کے بعد لیاقت علی خاں کے دور میں قرارداد مقاصد منظور کی گئی، لیکن مسلم لیگی یا دیگر سیاسی لیڈروں میں سے بیشتر اس اعلان کے باوجود کہ پاکستان ایک اسلامی ری پبلک ہے، پاکستان کو اسلامی مملکت ہرگز نہ بنانا چاہتے تھے،..... ایم۔ اے اصفہانی نے جب تحریر کیا تھا کہ یہ کہنا کہ اقبالؒ مسلم ریاست کے تصور کے خالق تھے، تاریخ کو مسخ کرنا ہے، تو آخر ان کا ذہن کس بات کی غمازی کر رہا تھا؟ نتیجہ یہ ہوا کہ ملک میں اسلامی عصبیت کے بجائے علاقائی تعصب کو فروغ ہوا، سیاست داں ناکارہ ثابت ہوئے تو بیوروکریسی نے اقتدار سنبھالا، اور بیوروکریسی کی نااہلی کے سبب فوج اقتدار میں آئی، انتخابات ہوئے تو غیر اسلامی نظریات کے حامل یا علاقائی تعصب کے بل بوتے پر اپنی سیاسی دکان چمکانے والے سیاستدانوں نے بالآخر ایک پاکستان کے دو ٹکڑے کر دیئے، اقبالؒ نے غلاموں کو اسلامی اتحاد کا سبق دے کر آزادی کا راستہ دکھایا تھا، وہ برصغیر میں اس اسلامی انقلاب کے داعی تھے، جو بالآخر پاکستان کے قیام پر منتج ہوا، حقیقت یہ ہے کہ قیام پاکستان جدید عالم اسلام میں احیائے اسلام کی بنیاد پر پہلا اسلامی انقلاب تھا، لیکن اس کی تکمیل نہ ہو سکی۔ (ص ۳۲۶)

کیسا دردناک تجزیہ ہے اور یہ سب کچھ وہی لکھ سکتا ہے جس کے سرچشمۂ زندگی میں سچے شبانہ کچھ باقی رہ گئی ہے۔

دکھ یہ ہے کہ [illegible] سے یہ صدا اٹھی تھی ؎

قوم مذہب سے ہے مذہب جو نہیں تم بھی نہیں — جذبِ باہم جو نہیں محفلِ انجم بھی نہیں

وہاں اب چند قومیتوں کے نعرے بھی سنائی دیتے ہیں، اور یہ بھی کہ پاکستان کے بنانے والے پاکستان کے رہنے والے نہیں تھے، بلکہ پاکستان کے باہر کے رہنے والے تھے، اس کے لیے قربانی دینے والوں میں جو زندہ ہیں ان کی اکثریت اب بھی اپنی خاموش زبان سے ان بھٹکے ہوئے آہوؤں کو سوئے حرم چلنے کی خاطر ان کے لیے یہ دعا کر رہی ہے ؎

احساس عنایت کر آثارِ مصیبت کا — امروز کی شورش میں اندیشۂ فردا دے

مگر علامہ محمد اقبال کے نام کو ابدیت پاکستان کی مملکت کے ساتھ نہیں ہے، اور نہ اس نام کو پاکستان کے مرکزی سکریٹریٹ اور اس کی عسکریت کی ضرورت ہے، یہ بانگِ درا کے ہر شعر میں محفوظ ہے، اسرارِ خودی اور رموزِ بےخودی کے جریدے میں اس کا دوام ثبت ہے، پیامِ مشرق کی سطروں میں اس کو پیامِ بقا مل چکا ہے، یہ زبورِ عجم کی صداؤں میں ہمیشہ سنائی دے گا، جاوید نامہ میں زندۂ جاوید رہے گا، بالِ جبریل کے نغموں میں سرمدی ہو چکا ہے، اس کی ضربِ کلیم کے ذریعہ اس کا ہنگامۂ خاموش برپا رہے گا، ارمغانِ حجاز سے اس کے افکار کا ارمغان حاصل ہوتا رہے گا۔

ان کی سیاسی سرگرمیوں سے ہٹ کر ذرا ان کو ان کے سیاسی اور دوسرے قسم کے سفروں میں دیکھا جا سکتا ہے، جس کو مصنف نے اپنے مخصوص انداز میں قلم بند کیا ہے، اس کتاب میں ان کے جتنے سفرنامے درج ہیں، ان کو سمیٹ کر علاحدہ کتاب میں شایع کر دیا جائے تو یہ ایک مستقل تصنیف ہو جائے گی، جو بہت ہی لطف و لذت کے ساتھ پڑھی جا سکتی ہے، ان میں تفصیل و اجمال اور اطناب و ایجاز دونوں کے مزے ملتے ہیں، جزئیات بھی سمیٹی گئی ہیں، لیکن اس حد تک جتنی کتاب کے ناظرین کا ذوق متحمل ہو سکتا ہے، بعض غلط فہمیاں بھی دور کی گئی ہیں، اور غلط بیانیوں کی تردید بھی کی گئی ہے، لیکن کسی لمحہ یہ محسوس نہیں ہوتا کہ کوئی جیتا

اپنے باپ کی خواہ مخواہ مدافعت کر رہا ہے، آج کل کی اصطلاح میں تحریر میں جو معروضی انداز ہونا چاہیے وہی اختیار کیا گیا ہے، اس سفر و سیاحت کا مطالعہ کرتے وقت کبھی ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کوئی ابن بطوطہ اپنا ہی سفرنامہ مرتب کر رہا ہے، کبھی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کا لکھنے والا سفر کرنے والے کے ساتھ ساتھ سایہ کی طرح رہا، اور جو اس نے خود دیکھا وہی سپرد قلم کر دیا ہے، حالانکہ لکھنے والے نے یہ ساری تفصیلات دوسروں کی کتابوں اور تحریروں ہی کو سمیٹ کر لکھا ہے، لیکن اس کے سمیٹنے میں ایک ماہر اہل قلم ہونے کا ثبوت دیا ہے، ان سفرناموں سے علامہ کی زندگی کے گوناگوں پہلو سامنے آتے ہیں،

انھوں نے جنوری ۱۹۲۹ء میں جنوبی ہند کا سفر تو بظاہر اپنے ان انگریزی خطبات کو دینے کے لیے کیا جو بعد میں "دی ریکنسٹرکشن آف ریلیجس تھاٹس ان اسلام" کے نام سے شایع ہوئے، مگر اس سفر کا ایک بڑا مقصد یہ بھی تھا کہ وہ سلطان ٹیپو شہید کی تربت کی زیارت کریں، اور اس زیارت سے جو سوز و گداز کی کیفیت ان پر طاری ہو اسے نظم کر کے لافانی بنا دیں، (ص ۳۴۴) اس سفر کی غیر معمولی مشغولیتوں کے ساتھ جب وہ سرنگاپٹم پہونچ کر سلطان کے مقبرے کے گنبد سلطانی میں داخل ہوئے، تو قرآن مجید کی وہ آیت پڑھی جو شہدا کے لیے نازل کی گئی ہے، کہ "جو اللہ کے راستہ میں مارے گئے انھیں مردہ مت کہو، وہ زندہ ہیں، پھر آنکھیں بند کر کے دیر تک قبر کے پاس کھڑے رہے، اور پوری عقیدت کے ساتھ فاتحہ خوانی کی، اس کے بعد روضہ کے قریب ایک چھوٹی سی مسجد کے باہر اپنے اور ساتھیوں کے ساتھ بیٹھ گئے، مہاراجہ میسور نے گانے والوں کا ایک طائفہ ساتھ کر دیا تھا، یہاں اس نے ان کا کلام بڑے سوز کے ساتھ گانا شروع کر دیا تو ان کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے جو تھمتے نہ تھے، اور حاضرین پر بھی رقت طاری تھی، اور جب وہاں سے رخصت ہوئے تو ان سے پوچھا گیا کہ کیا سلطان شہید نے کوئی پیغام دیا ہے؟ تو جواب دیا کہ ان کی معیت میں یہاں ایک لمحہ بھی بیکار نہیں گذرا، پھر فرمایا کہ یہ پیغام ملا ہے

درجہاں نتواں اگر مردانہ زیست ہمچو مرداں جاں سپردن زندگیست

یہ شعر اس واقعہ کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ جب سلطان سے یہ کہا گیا کہ وہ انگریزوں سے مصالحت کر لیں، تو جواب دیا کہ گیدڑ کی صد سالہ زندگی سے شیر کی ایک دن کی زندگی بہتر ہے، پھر راستہ میں ان کے ساتھ یہ چار شعر بھی موزوں کر لیے ؎

آتشے در دل دگر بر کردہ ام | داستانے از دکن آوردہ ام
در کنارم خنجرِ آئینہ فام | می کشم او را بتدریج از نیام
نکتہ گویم ز سلطانِ شہید | زاں کہ ترسم تلخ گردد روزِ عید
بیشتر رفتم کہ بوسم خاکِ او | تا شنیدم از مزارِ پاکِ او

در جہاں نتواں اگر مردانہ زیست

ہمچو مرداں جاں سپردن زندگیست

مصنف نے ان اشعار کو سمجھانے کے لیے ان کے ترجمے بھی دے دیے ہیں، علامہ پر یہ اثر تھا کہ ان کو تو محسوس ہوا کہ اس تربت کی حاضری سے ان کے دل میں ایک آگ بھڑک اٹھی ہے، اور ان کے پہلو میں ایک ایسا چمکدار خنجر رکھ دیا گیا ہے جس کو وہ آہستہ آہستہ نکالتے رہیں گے، اور جب وہ اپنی مصیبت بیان کریں گے تو لوگوں کی عید کی خوشیاں جاتی رہیں گی، ان کو اس مزار سے یہ پیام بھی ملا کہ مردوں کی طرح زندہ رہنا ممکن نہ ہو تو مردانہ وار جان قربان کر دینے میں زندگی ہے۔

ضربِ کلیم میں "سلطان ٹیپو کی وصیت" کے عنوان سے ایک نظم ہے، یہ جاننے کی خواہش ہوتی ہے کہ کیا یہ نظم بھی سلطان شہید کے مزار پر حاضری کے وقت کہی گئی ، یا بعد میں دل کے اندر نئی حرارت پیدا کرنے کی خاطر کہی گئی۔

علامہ نے جاوید نامہ میں سلطان ٹیپو کا کردار سلطان شہید کے نام سے پیش کیا ہے جس سے ان کے

سرنگاپٹم کے سفر کے دیرپا اثرات کا اندازہ ہوتا ہے، سلطان شہید پر بہت سے اشعار لکھے ہیں، حیات، مرگ اور شہادت کی حقیقت بیان کرتے ہوئے اس کے متعلق لکھا ہے ؎

آنکہ گفت ارش ہمہ کردار بود مشرق اندر خواب و او بیدار بود

دوسری گول میز کانفرنس کے سفر کے کوائف اور بھی دلچسپ انداز میں لکھے گئے ہیں جن کو پڑھتے وقت یہ خیال ہوتا ہے کہ یہ سفرنامہ ختم نہ ہونے پائے، ستمبر ۱۹۳۱ء کو انگلستان جاتے ہوئے وہ عدن اور پورٹ سعید میں وہاں کے اکابر سے ملتے رہے اور بہت سی سیاسی غلط فہمیاں دور کرتے ہوئے لندن پہونچے تو گول میز کانفرنس کی کارروائیوں میں حصہ لینے کی تفصیلات کے ساتھ انگلستان کے اکابر سے جو ان کی ملاقاتیں ہوئیں یا کیمبرج اور لندن کی علمی و معاشرتی نشستوں میں ان کی جو تقریریں ہوئیں ان کا ذکر بہت ہی پر کیف انداز میں کیا گیا ہے، پھر وہ روم گئے، جہاں کے مشاہیر سے ملنے کے علاوہ مسولینی سے بھی ملاقات کی جس کی تفصیل لائق مصنف نے بہت ہی تجزیاتی انداز میں لکھی ہے، علامہ کی دو نظمیں مسولینی پر ہیں، ایک تو بال جبرئیل میں ہے، جس کی ابتداء اس شعر سے ہوتی ہے ؎

ندرتِ فکر و عمل کیا شے ہے ذوقِ انقلاب ندرتِ فکر و عمل کیا شے ہے ملت کا شباب

دوسری ضرب کلیم میں ہے، جس کا آغاز اس طرح ہوتا ہے ؎

کیا زمانے سے نرالا ہے مسولینی کا جرم بے محل بگڑا ہے معصومانِ یورپ کا مزاج

یہ دونوں نظمیں متنازعہ فیہ بن گئی ہیں، کہ ان دونوں میں تناقض ہے، گو علامہ نے یہ کہہ کر مطمئن کیا ہے کہ اس بندۂ خدا میں ڈیول (شیطان) اور سینٹ (ولی) دونوں کی خصوصیات جمع ہوں تو اس کا میں کیا علاج کروں، (ص ۴۶۱) اس تناقض کا جواب تو مل جاتا ہے، لیکن اگر یہ معلوم ہو جائے کہ بال جبرئیل کی نظم کب کہی گئی، اور ضرب کلیم کی نظم کس موقع اور کن حالات سے متاثر ہو کر کہی گئی ہے، تو اس تناقض کا حل معلوم ہو جائے گا، گو علامہ کے قدردان ایسے نکل آئے ہیں جو یہ لکھتے ہیں کہ ان دونوں میں تناقض اس لیے

نہیں ہے کہ مصطفیٰ اس زمانہ میں اٹلی میں ڈوچے کے نام سے مشہور تھا، اس کے متعلق صحافیوں نے ان سے پوچھا تو فرمایا کہ ڈوچے ایک لوتھڑ ہے، مگر بغیر انجیل کے، اس سے اس کی پوری اسپرٹ سامنے آجاتی ہے، اور وہ انجام بھی جو اس کا ہوا۔

روم میں ہر قسم کے لوگوں سے مل ملا کر اور وہاں کی مجلسوں سے لطف اندوز ہو کر وہ نیپلز اور پمپئی، اور برنڈزی ہوتے ہوئے اسکندریہ پہونچے، جہاں کے اکابر سے ان کی ملاقاتیں رہیں، ان میں مصر کے مشہور صاحب طریقت بزرگ سید محمد قاضی ابو العزائم کی ملاقات کا ذکر بہت ہی پُرکیف ہے، ان کی ملاقات کے لیے حضرت ابو العزائم اپنے دو صاحبزادوں کے ساتھ اس ہوٹل میں تشریف لائے جہاں وہ مقیم تھے، ان کو دیکھ کر علامہ نے کہا میں خود زیارت کے لیے حاضر ہو جاتا، تو انھوں نے فرمایا خواجۂ دوجہاں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ جس نے دین سے تمسک کیا ہو اس کی زیارت کو جاؤ گے تو مجھے خوشی ہوگی، لہٰذا میں اس ارشاد کی تعمیل میں چلا آیا ہوں، تاکہ میرے آقا مجھ سے خوش ہوں، علامہ یہ سن کر بے تاب ہو گئے، انھیں چُپ سی لگ گئی، حضرت سید ابو العزائم دیر تک بیٹھے نصیحتیں کرتے رہے، اور وہ خاموشی سے سنتے رہے، جب وہ چلے گئے تو ان کی آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب بہہ نکلا کہ ایسا زمانہ بھی آگیا ہے کہ لوگ مجھ جیسے گنہگار کو متمسک بالدین سمجھ کر حضور خواجۂ دوجہاں کے ارشاد کے اتباع میں بغرض خوشنودی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ملنے آتے ہیں (ص ۴۴۶) قاہرہ میں اکابر کی ملاقاتیں جاری رہیں، پھر ہر قسم کی پذیرائی کے بعد وہاں سے روانہ ہوئے تو فسطاط میں امام شافعیؒ کی قبر پر جا کر فاتحہ پڑھی، اسماعیلیہ اور قنطرہ ہوتے ہوئے فلسطین پہونچے، جہاں ایک موتمر کے اجلاس میں ان کو شرکت کرنی تھی، یہ موتمر مسلمانوں کے اتحاد و تعاون، صحیح اسلامی اخوت کی نشو و نما اور مسلمانوں کو اجتماعی اسلامی فرایض کی طرف متوجہ کرنے اور ان کے عقائد کو الحاد سے محفوظ رکھنے کے لیے منعقد ہوا تھا، یہاں سات دن تک قیام کر کے اس میں حصہ لیا اور اپنی ایک تقریر میں فرمایا کہ میں جب کبھی سوچتا ہوں تو شرم و ندامت سے میری گردن جھک جاتی ہے کہ ہم مسلمان آج اس قابل

ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہم پر فخر کریں، ہاں جب ہم اس نور کو اپنے دلوں میں زندہ کر لیں گے، جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم میں داخل کیا تو اس وقت ہم اس قابل ہو سکیں گے کہ حضورؐ ہم پر فخر کریں، (ص ۴۶۹)

مصنف نے اس کی طرف توجہ دلائی کہ علامہ عربوں کے اتحاد پر جاوید نامہ میں مہدی سوڈانی کے منہ سے اپنے عقیدے کا اظہار پہلے بھی کر چکے تھے، گو اس وقت تک یہ مثنوی شایع نہیں ہوئی تھی، پھر فلسطین میں وہ فلسطینی عربوں کے جوش و خروش سے یقیناً متاثر ہوئے، اور انھوں نے ایک نظم لکھی جس کو مصنف نے بھی نقل کیا ہے، (ص ۴۷۰) اس کا پہلا شعر یہ ہے ؎

زمانہ اب بھی نہیں جس کے سوز سے فارغ میں جانتا ہوں وہ آتش ترے وجود میں ہے

یہ نظم ضرب کلیم میں بھی درج ہے، (ص ۶۲۱) اگر یہ فلسطین کے قیام کے زمانہ میں کہی گئی تو بال جبریل کے بجائے ضرب کلیم میں کیوں درج ہے، ضرب کلیم تو بال جبرئیل کے بعد شایع ہوئی، بال جبرئیل میں وہ نظم بھی ہے جس کا عنوان ذوق و شوق ہے، اس کے نیچے یہ لکھا ہوا ہے کہ ان اشعار میں سے اکثر فلسطین میں لکھے گئے، (ص ۴۰۳) مصنف نے اس نظم کا ذکر نہیں کیا ہے، بال جبرئیل میں یہ مسجد قرطبہ کے بعد اور مسولینی سے پہلے درج ہے، اس سے پتہ چلتا ہے کہ ان نظموں کا اندراج ترتیب زمانی کے لحاظ سے نہیں ہے، لیکن ان مجموعوں کی ترتیب خود علامہؒ نے دی تھی، جس سے ظاہر ہے کہ اس میں ان کا اپنا ذوق کارفرما تھا، لیکن ترتیب زمانی ہوتی تو ان کے افکار کی ارتقائی منزلیں آسانی سے سمجھ میں آجاتیں۔

تیسری گول میز کانفرنس کے لیے ان کا سفر ۱۷ اکتوبر ۱۹۳۲ء کو شروع ہوا، اور وہ ۲۵ فروری ۱۹۳۳ء کو لاہور واپس آئے، اس درمیان میں گول میز کانفرنس میں حصہ لینے کے بعد پیرس اور اسپین کی بھی سیاحت کی، مصنف کے قلم سے یہ بات دلچسپی سے پڑھی جائے گی کہ انھوں نے اپنے والد بزرگوار سے لندن سے گراموفون لانے کی فرمایش کی تھی تو اس کے جواب میں انھوں نے وہ نظم

لکھ بھیجی جو بال جبریل میں "جاوید کے نام سے" درج ہے، اس کا پہلا شعر یہ ہے ؎

دیار عشق میں اپنا مقام پیدا کر نیا زمانہ، نئے صبح و شام پیدا کر

یہ معلوم ہو جانے کے بعد اس کے پڑھنے میں کچھ اور کیفیت پیدا ہو جاتی ہے، یہ بال جبریل میں درج ہے، لیکن اس سے پہلے مصنف ہی کے نام سے وہ نظم درج ہے، جس کا پہلا شعر یہ ہے ؎

خودی کے ساز میں ہے عمر جاوداں کا سراغ خودی کے سوز سے روشن ہیں امتوں کے چراغ

معلوم نہیں یہ کس موقع پر لکھی گئی، پھر ضرب کلیم میں "جاوید سے" کے عنوان سے وہ غزل نما نظم ہے، جس کا پہلا شعر یہ ہے ؎

غارت گرِ دیں ہے یہ زمانہ ہے اس کی نہاد کافرانہ

یہ کب لکھی گئی نہیں معلوم ہو سکا، اگر مصنف ان سب کی وضاحت کر دیتے تو علامہ کو باپ کی حیثیت سے سمجھنے میں مدد ملتی،

اس سفر میں علامہ پیرس میں لوئی سینوں اور برگساں سے بھی ملے، سینوں نے منصور حلاج پر کام کیا تھا، اور اس کی کتاب، کتاب الطواسین کے عربی متن کو ایک مدلل مقدمہ اور مفید حواشی کے ساتھ شایع کیا تھا، مصنف کا بیان ہے کہ اس تصنیف کو پڑھ کر حلاج کے متعلق ان کا نظریہ بدل گیا (ص ۴۶۵) نظریہ کی اس تبدیلی کی نوعیت کا ذکر بھی مصنف کو کر دینا چاہیے تھا، وہ برگساں سے بھی ملے، جن سے نظریۂ واقعیت زمان پر خوب بحث ہوئی، اور جب علامہ نے ان کے روبرو اللہ تعالیٰ کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حدیث سنائی: لَا تَسُبُّوا الدَّهْرَ اِنَّ الدَّهْرَ هُوَ اللّٰهُ، تو اس کو سن کر برگساں بہت متاثر ہوئے، اور بار بار پوچھتے رہے کہ یہ قول واقعی درست ہے؟ (ص ۴۶۹)

انھوں نے نپولین کے مزار پر بھی حاضری دی، جس کا ذکر کرنا مصنف بھول گئے ہیں، بال جبریل میں "نپولین کے مزار پر" کے عنوان سے جو نظم ہے اس میں حوصلہ کردار پر زور دیا گیا ہے، نپولین کے ساتھ

تیمور کے سیلِ ہمہ گیر کا ذکر بھی ہے، پھر نظم کا رخ موڑ کر یہ لکھا گیا ہے کہ جوش کردار ہی سے صفِ جنگ گاہ میں مردانِ خدا کی تکبیر خدا کی آواز بن جاتی ہے، اور یہ بھی ہے کہ جوشِ کردار کے مقابلہ میں فرصتِ کردار کے ایک دو نفس کے عوض قبر کی شبہائے دراز ملتی ہے۔

فرانس ہی میں علامہ نے وہ نظم نما غزل لکھی جس کا مطلع یہ ہے ؎

ڈھونڈ رہا ہے فرنگ عیشِ جہاں کا دوام   وائے تمنائے خام وائے تمنائے خام

یورپ کے متعلق علامہ کے جو خیالات تھے وہ اس مطلع سے ظاہر ہیں، مگر اس میں جو اور اشعار ہیں، ان کو پڑھ کر یہ جاننے کی خواہش ہوتی ہے کہ کس موقع پر کن حالات سے متاثر ہو کر لکھے گئے، اس کے معلوم ہو جانے کے بعد ان کی تاثیر کی نوعیت شاید کچھ اور ہو جائے۔

پیرس سے علامہ اسپین پہونچے، جہاں ان کی مختلف مشغولیتوں کی تفصیل لطف و لذت سے پڑھی جا سکتی ہے، مصنف نے مسجد قرطبہ کی حاضری کی تفصیل لکھنے میں امعان نظر سے کام لے کر مستند روایتوں پر بھروسہ کیا ہے، یہاں علامہ پر جو کیفیت طاری ہوئی ہے، اس کا بہت ہی ولولہ انگیز ذکر ہے، اندلس کے قیام میں انھوں نے مسجد قرطبہ کے علاوہ کئی نظمیں لکھیں، دعا، عبدالرحمٰن کا بویا ہوا کھجور کا پہلا درخت، ہسپانیہ، طارق کی دعا، ان سب کا ذکر مصنف نے نہیں کیا ہے، جس طرح وہ خاص خاص نظموں کے ذکر میں اس کا تناظر پیش کرتے رہے ہیں، اگر ان کے قلم سے ان کے تناظر کا بھی ذکر آجاتا، تو ان تمام نظموں کے پڑھنے کی کیفیت اور لذت دو بالا ہو جاتی۔

علامہ کا یورپ کا یہ سفر آخری تھا، گر پھر عرض ہے کہ ان کے افکار کو سمجھنے کے لیے یہ ضروری تھا کہ انھوں نے یورپ کے مختلف مقامات میں جو نظمیں لکھی تھیں، ان کے موقع و محل کی تصریح کر دی جاتی، بالِ جبریل میں ایک چھوٹی سی نظم "یورپ سے ایک خط" کے عنوان سے ہے، اس کو اچھی طرح سمجھانے کی ضرورت تھی، بالِ جبریل ہی میں لینن، فرشتوں کا گیت، فرمانِ خدا، دین و سیاست، الارض للہ،

فلسفہ، مذہب کے عنوانات سے نظمیں ہیں، ان کے متعلق بھی یہ جاننے کی فطری خواہش ہوتی ہے کہ وہ کیا یورپ میں لکھی گئیں، یا وہاں سے واپسی پر منظوم ہوئیں، یا یورپ کے سفر سے پہلے ہی لکھی جا چکی تھیں،

پھر ایک غزل ہے جس کا مطلع یہ ہے ؎

خرد نے مجھ کو عطا کی نظر حکیمانہ　　　سکھائی عشق نے مجھ کو حدیثِ رندانہ

یہ تو واضح ہے کہ یورپ میں لکھی گئی، یہ صحیح ہے کہ ان موضوعات کے متعلق ان کے جو خیالات پختہ ہو چکے تھے، ان کا اظہار برابر کرتے رہے، ضربِ کلیم میں افرنگ زدہ، مکہ اور جنیوا، مغربی تہذیب، عورت، مردِ فرنگ، سیاسیاتِ مشرق و مغرب، کارل مارکس کی آواز، یورپ اور یہود، بالشویک روس، سیاستِ افرنگ، جمہوریت، یورپ اور سود، انتداب، لادینی سیاست، جمعیتِ اقوام اور شام و فلسطین وغیرہ کے عنوانات سے جو نظمیں ہیں ان میں تو افرنگی سیاست، تہذیب اور سیاسی نظر و فکر پر اور بھی زیادہ حملہ آور ہوئے ہیں، یورپ کی روشنی علم و ہنر کے قائل ہونے کے باوجود انھوں نے اس کو ظلماتِ بے چشمۂ حیواں پایا، تو اس پر اپنے خیالات کا اظہار برابر کرتے رہے ان نظموں کے لکھنے کی بھی زمانی ترتیب معلوم ہو جائے تو ان کو اور ان کے خیالات کو سمجھنے میں اور بھی زیادہ مدد ملے، اگر کسی مشکور سے ایسی فہرست تیار کی جائے جس میں ان کی تمام نظموں کا سنہ و سال واضح کر دیا جائے تو ان کے نظامِ فکر و فن کی گیسوئے تابدار اور بھی تابدار بن سکتی ہے، یہ کوئی مشکل کام نہیں، ان پر اتنا لٹریچر فراہم ہو چکا ہے کہ تھوڑی سی کوشش سے یہ ضروری کام انجام پا سکتا ہے، صرف لائق مصنف کی توجہ کی ضرورت ہے، غالب کی غزلوں کو ترتیبِ زمانی کے ساتھ مرتب کرنے کی کوشش ہوئی تو ان کے ذہنی ارتقاء کا اندازہ ہوا، اس ارتقاء کا پتہ تو ان کے فنِ غزل گوئی کی خاطر لگایا گیا، لیکن علامہ کا کلام تو فکرِ بلند بہ صفتِ برق اس لیے چمکتا ہے کہ ظلمتِ شب میں راہی بھٹکتے نہ پھریں، اور یہ کلام اس لیے بھی ہے کہ مسلمانوں میں چیتے کا جگر اور شاہین کا تجسس پیدا ہو، پھر اس کی ارتقائی منزلوں کو سمجھانے کے لیے ہر قسم کی محنت پیہم کی

ضرورت ہے۔

۱۹۳۳ء میں وہ افغانستان گئے، ان کے ساتھ سر راس مسعود اور حضرۃ الاستاذ مولانا سید سلیمان ندویؒ بھی مدعو تھے، وہاں کے حکمراں نادر شاہ نے تعلیمی امور کے مشورے کے لیے ان حضرات کو اپنے یہاں بلایا، اس سفر کا حال بھی مصنف نے اسی دلچسپ طریقے سے قلمبند کیا ہے، جیسا کہ ان کے اور سفروں کا کیا ہے،

یہ وفد کابل پہونچا تو وہاں ہر قسم کے سرکاری اعزازات اور مدارات ہوئے، وہاں کے اکابر اور علمی حلقے کے مشاہیر نے ان کو سر آنکھوں پر بٹھایا، اس سفر کے دلچسپ کوائف وہ ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کس طرح غزنین میں محمود غزنوی کے مزار پر حاضر ہوئے، حکیم سنائی کی آخری آرام گاہ کی زیارت کی، بابر کی تربت پر پہونچے، حضرت علی ہجویریؒ کے والد ماجد کی تربت پر دعائے مسنونہ پڑھی، مجذوب فقیر لائے خوار کی تربت پر بھی پہونچے، پھر قندھار پہونچے کہ خرقۂ شریف کی زیارت کریں، احمد شاہ ابدالی کے مقبرے کو دیکھا، پھر قندھار سے ارغنداب کا دلکش منظر دیکھتے ہوئے چمن پہونچے، اور جب علامہ اپنے وطن پہونچے تو انھوں نے اپنی سیاحت کے تاثرات اور جذبات کا اظہار اپنی تالیف مسافر میں کیا، جو ۱۹۳۴ء میں شایع ہوئی، لیکن جس وقت یہ لکھی جا رہی تھی اس وقت نادر شاہ قتل کیے جا چکے تھے، یہ مثنوی ایک غزل کے سوا زیادہ تر مثنوی معنوی کے بحر میں ہے، اور بقول حضرۃ الاستاذ مولانا سید سلیمان ندویؒ خیبر، سرحد، کابل، غزنین اور قندھار کے عبرت انگیز مناظر و مفاخر پر شاعر اقبال کے آنسو ہیں، اور بابر، سلطان محمود، حکیم سنائی اور احمد شاہ درانی کی خاموش تربتوں کی زبان حال سے سوال و جواب ہیں، اس کا آغاز نادر شاہ شہید کے مناقب سے اور اختتام محمد ظاہر شاہ سے توقعات کے اظہار پر ہے، (ص ۵۲۹)

اسی سفر میں کابل میں انھوں نے وہ غزل لکھی جس کا مطلع یہ ہے ؎

مسلماں کے لہو میں ہے سلیقہ دل نوازی کا مروت حسن عالمگیر ہے مردانِ غازی کا

اس کا مقطع ان کے حسب حال تھا:

کہاں سے تو نے اے اقبال سیکھی ہے یہ درویشی کہ چرچا بادشاہوں میں ہے تیری بے نیازی کا

یہ غزل بال جبرئیل میں درج ہے، اس سے علامہ کی بلند سیرت کا بھی اندازہ ہوگا۔

اس سفر میں حضرت الاستاد مولانا سید سلیمان ندویؒ مفکر اسلام سے جس طرح متاثر ہوئے اس کا اندازہ ان کے اس غمناک نثری نوحہ سے ہوگا، جو انھوں نے علامہؒ کی وفات پر لکھا تھا، اس کے کچھ ٹکڑے یہ ہیں:

"شاعری کی دنیا میں چالیس برس چہچہا کر یہ بلبل ہزار داستان اب ہمیشہ کے لیے خاموش ہوگیا، وہ ہندستان کی آبرو، مشرق کی عزت اور اسلام کا فخر تھا، آج دنیا ان ساری عزتوں سے محروم ہوگئی، وہ عارف فلسفی، عاشق رسول شاعر، فلسفۂ اسلام کا ترجمان، اور کاروانِ ملت کا حدی خوان صدیوں کے بعد پیدا ہوا تھا، اس کے دہن کا ہر ترانہ بانگ درا، اس کی جان حزیں کی ہر آواز زبور عجم، اس کے دل کی ہر فریاد پیام مشرق، اس کے شعر کا ہر پر پرواز بال جبرئیل تھا، اس کی فانی عمر گو ختم ہوگئی، لیکن اس کی زندگی کا ہر کارنامہ زندۂ جاوید رہے گا۔"

اس نوحہ سے یہ بھی اندازہ ہوگا کہ وہ کیا سمجھے جاتے تھے، اور بیرونی ملکوں میں ان کی پذیرائی اسی حیثیت سے ہوتی تھی، یہ ان کے لیے درس ہے جو ان کی زندگی اور شاید ان کی زندگی کے بعد بھی ہر قسم کی الزام تراشی اور بہتان طرازی میں مشغول رہے، یا ہیں، یا ان کو غلط فہمیوں کا شکار اور ساحرین برطانیہ کے سحر میں مبتلا سمجھتے رہے۔

اب ذرا اس کتاب کے ذریعہ سے ان کی خانگی زندگی کا بھی تھوڑا سا مشاہدہ کیا جائے، جن کی اخلاقی اور روحانی قدروں کو جاننے کے لیے ان کے شیدائی ان کے شاعرانہ کمالات اور علمی افکار ہی کی طرح بےچین رہتے ہیں، ان کے افکار پر تو اب تک بہت کچھ لکھا جا چکا ہے، لیکن ان کی خانگی زندگی کا جو حال ان کے

فرزند ارجمند نے قلمبند کیا ہے، وہ اوروں کی تحریروں سے زیادہ وقیع ہے، بلکہ جس دلچسپ انداز میں پیش کیا گیا ہے، وہ کسی اور کتاب میں نہیں، پھر اس کی خوبی یہ ہے کہ ان کی خانگی زندگی پر لائق مصنف نے کوئی پردہ ڈالے بغیر سب کچھ قارئین کے سامنے پیش کر دیا ہے، وہ اپنی والدہ ماجدہ کے متعلق لکھتے ہیں کہ وہ پرانی وضع کی خاتون تھیں، نماز پڑھتیں، روزے رکھتیں اور رمضان میں باقاعدہ قرآن مجید کی تلاوت کیا کرتیں، ضعیف الاعتقاد بھی تھیں، جن، بھوت، سایہ اور جادو وغیرہ سے بہت ڈرتی تھیں، مصنف کی سالگرہ پر ہمیشہ بکرے کی قربانی دیا کرتیں (ص ۱۴۶) گھر کے تمام افراد کے لیے کھانا خود پکاتی تھیں، ان کی مدد کے لیے فوجی دروازہ کی ایک ادھیڑ عمر کشمیری خاتون رحمت بی بی تھیں، جنھیں ہر چھوٹا ماں وڈی (بڑی اماں) کہہ کر بلاتا تھا، محلہ کی لڑکیاں ان سے قرآن مجید پڑھنے آتیں، اور گھر کے کام کاج میں ہاتھ بٹاتیں، ان میں سے بعض کی شادیاں انھوں نے ہی کروائی تھی، (ص ۲۹۵) علامہ نے ان کو کبھی اپٹوڈیٹ بنانے کی کوشش نہیں کی، ان کو شمع محفل بنانے کے بجائے ان کو ان کے حقوق ادا کرنے کی بڑی فکر رہتی، ایک بار وہ درد گردہ میں مبتلا ہوئے تو ان کو خیال ہوا کہ زندگی کا کیا ٹھکانہ، ان کے لیے دس ہزار کی رقم سنٹرل کو آپریٹو بینک لاہور میں یہ لکھ کر جمع کر دی کہ یہ روپیہ ان کے ہیں، اس رقم سے خود ان کا کوئی تعلق نہیں رہے گا، ان کے کچھ زیورات فروخت کر دیے تھے، اس کے بدلے میں بھی پندرہ سو روپیے اور جمع کر دیے، پھر ان کے نکاح کے وقت مہر کی کوئی رقم مقرر نہیں کی گئی تھی، انھوں نے اپنی مرضی سے ان کا حق مہر پندرہ ہزار روپیے مقرر کیے اور جب تک یہ رقم وصول نہ ہوئی ان کو ہر قسم کی جائداد منقولہ اور غیر منقولہ سے وصول کرنے کے حق کے علاوہ ان کی ہر قسم کی جائداد پر قابض اور متصرف رہنے کا حق بھی دیا، (ص ۳۱، ۴۳۶-۳)

مصنف کی والدہ کی بے حد خواہش تھی کہ رہنے کے لیے کوئی مکان بن جاتا، کیونکہ پورا خاندان کرایہ کے مکان میں رہتا تھا، علامہ نے ان کی خواہش کو پورا کرنے کے لیے میو روڈ پر ایک قطعۂ زمین خریدا کر کوٹھی کی تعمیر ان کے، یعنی مصنف کی والدہ کے روزمرہ خرچ سے بچی ہوئی اور ان کے زیورات کی فروخت سے

مسلماں کے لہو میں ہے سلیقہ دل نوازی کا　　مروت حسن عالمگیر ہے مردان غازی کا

اس کا مقطع ان کے حسب حال تھا ؂

کہاں سے تونے اے اقبال سیکھی ہے یہ درویشی　　کہ چرچا بادشاہوں میں ہے تیری بے نیازی کا

یہ غزل بال جبرئیل میں درج ہے، اس سے علامہ کی بلند سیرت کا بھی اندازہ ہوگا۔

اس سفر میں حضرت الاستاد مولانا سید سلیمان ندویؒ مفکر اسلام سے جس طرح متاثر ہوئے اس کا اندازہ ان کے اس غمناک نثری نوحہ سے ہوگا، جو انھوں نے علامہؒ کی وفات پر لکھا تھا، اس کے کچھ ٹکڑے یہ ہیں:

"شاعری کی دنیا میں چالیس برس چہچہا کر یہ بلبل ہزار داستان اب ہمیشہ کے لیے خاموش ہوگیا، وہ ہندوستان کی آبرو، مشرق کی عزت اور اسلام کا فخر تھا، آج دنیا ان ساری عزتوں سے محروم ہوگئی، وہ یعنی عارف فلسفی، عاشق رسول شاعر، فلسفۂ اسلام کا ترجمان، اور کاروان ملت کا حدی خوان صدیوں کے بعد پیدا ہوا، اس کے وطن کا ہر ترانہ بانگ درا، اس کی جان حزیں کی ہر آواز زبور عجم، اس کے دل کی ہر فریاد پیام مشرق، اس کے شعر کا ہر پر پرواز بال جبرئیل تھا، اس کی فانی عمر گو ختم ہوگئی، لیکن اس کی زندگی کا ہر کارنامہ زندۂ جاوید رہے گا۔"

اس نوحہ سے یہ بھی اندازہ ہوگا کہ وہ کیا سمجھے جاتے تھے، اور بیرونی ملکوں میں ان کی پذیرائی اسی حیثیت سے ہوتی تھی، یہ ان کے لیے درس ہے جو ان کی زندگی اور شاید ان کی زندگی کے بعد بھی ہر قسم کی الزام تراشی اور بہتان طرازی میں مشغول رہے، یا ہیں، یا ان کو غلط فہمیوں کا شکار اور ساحرین برطانیہ کے سحر میں مبتلا سمجھتے رہے۔

اب ذرا اس کتاب کے ذریعہ سے ان کی خانگی زندگی کا بھی تھوڑا سا مشاہدہ کیا جائے، جن کی اخلاقی اور روحانی قدروں کو جاننے کے لیے ان کے شیدائی ان کے شاعرانہ کمالات اور علمی افکار ہی کی طرح بے چین رہتے ہیں، ان کے افکار پر تو اب تک بہت کچھ لکھا جا چکا ہے، لیکن ان کی خانگی زندگی کا جو حال ان کے

فرزند ارجمند نے تخلیق کیا ہے، وہ اوروں کی تحریروں سے زیادہ وقیع ہے، بلکہ جس دلچسپ انداز میں پیش کیا گیا ہے، وہ کسی اور کتاب میں نہیں، پھر اس کی خوبی یہ ہے کہ ان کی خانگی زندگی پر لائق مصنف نے کوئی پردہ ڈالے بغیر سب کچھ قارئین کے سامنے پیش کر دیا ہے، وہ اپنی والدہ ماجدہ کے متعلق لکھتے ہیں کہ وہ پرانی وضع کی خاتون تھیں، نماز پڑھتیں، روزے رکھتیں اور رمضان میں باقاعدہ قرآن مجید کی تلاوت کیا کرتیں، ضعیف الاعتقاد بھی تھیں، جن، بھوت، سایہ اور جادو وغیرہ سے بہت ڈرتی تھیں، مصنف کی سالگرہ پر ہمیشہ بکرے کی قربانی دیا کرتیں (ص ۲۹۴) گھر کے تمام افراد کے لیے کھانا خود پکاتی تھیں، ان کی مدد کے لیے نوجی دروازہ کی ایک ادھیڑ عمر کشمیری خاتون رحمت بی بی تھیں، جنھیں ہر چھوٹا ماں وڈی (بڑی اماں) کہہ کر بلاتا تھا، محلہ کی لڑکیاں ان سے قرآن مجید پڑھنے آتیں، اور گھر کے کام کاج میں ہاتھ بٹاتیں، ان میں سے بعض کی شادیاں انھوں نے ہی کروائی تھی، (ص ۲۹۵) علامہ نے ان کو کبھی اپٹوڈیٹ بنانے کی کوشش نہیں کی، ان کو شمع محفل بنانے کے بجائے ان کو ان کے حقوق ادا کرنے کی بڑی فکر رہتی، ایک بار وہ درد گردہ میں مبتلا ہوئے تو ان کو خیال ہوا کہ زندگی کا کیا ٹھکانہ، ان کے لیے دس ہزار کی رقم سنٹرل کوآپریٹو بینک لاہور میں یہ لکھ کر جمع کر دی کہ یہ روپیے ان کے ہیں، اس رقم سے خود ان کا کوئی تعلق نہیں رہے گا، ان کے کچھ زیورات فروخت کر دیے تھے، اس کے بدلے میں بھی پندرہ سو روپیے اور جمع کر دیے، پھر ان کے نکاح کے وقت مہر کی کوئی رقم مقرر نہیں کی گئی تھی، انھوں نے اپنی مرضی سے ان کا حق مہر پندرہ ہزار روپیے مقرر کیے اور جب تک یہ رقم وصول نہ ہوئی ان کو ہر قسم کی جائداد منقولہ اور غیر منقولہ سے وصول کرنے کے حق کے علاوہ ان کی ہر قسم کی جائداد پر قابض اور متصرف رہنے کا حق بھی دیا، (ص ۳۰، ۴۳۶)

مصنف کی والدہ کی بے حد خواہش تھی کہ رہنے کے لیے کوئی مکان بن جاتا، کیونکہ پورا خاندان کرایہ کے مکان میں رہتا تھا، علامہ نے ان کی خواہش کو پورا کرنے کے لیے میورروڈ پر ایک قطعۂ زمین خریدا کوٹھی کی تعمیر ان کے یعنی مصنف کی والدہ کے روزمرہ خرچ سے بچی ہوئی اور ان کے زیورات کی فروخت سے

حاصل کی ہوئی اور بینک میں ان کے نام سے جمع کی ہوئی رقموں سے ہوئی، اپریل [illegible] میں خاندان اس میں منتقل ہوا لیکن ۲۳ مئی ۱۹۳۵ء میں مصنف کی والدہ کا انتقال ہوگیا، اور وہ اپنی نئی کوٹھی کو بعد صرف ایک مہینہ دیکھ سکیں، مصنف کی عمر اس وقت گیارہ سال کی تھی، ان کی بہن منیرہ ان سے کئی سال چھوٹی تھیں، مصنف بہت ہی دردانگیز الفاظ میں لکھتے ہیں کہ جب ان کی والدہ کی تجہیز و تکفین کی تیاریاں ہونے لگیں تو وہ اپنی بہن منیرہ کا ہاتھ پکڑے روتے ہوئے اپنے والد ماجد کے کمرے کی طرف گئے، وہ اپنی چارپائی پر نیم دراز تھے، بہن بھائی دروازہ تک پہونچ کر ٹھٹھک گئے، یوں روتے دیکھ کر انھوں نے انگلی کے اشارہ سے قریب آنے کے لیے کہا، پھر اپنے پہلوؤں میں دونوں کو بٹھالیا، اپنا ہاتھ پیار سے اکلوتے بیٹے کے کندھے پر رکھ کر تھرے کر خستگی سے گویا ہوئے: تمھیں یوں نہ رونا چاہیے تم تو مرد ہو، مرد رویا نہیں کرتے، اس کے بعد اپنی زندگی میں پہلی بار بھائی بہن کی پیشانیوں کو چوما۔

اس کے بعد کی جو تفصیل ہے اس کو پڑھ کر میری طرح اس کتاب کے قارئین کو بھی تکلیف ہوگی، وہ لکھتے ہیں کہ جنازہ میں ان کے والد کے چند احباب شریک تھے، (ص ۵۲۹) اس آبروئے مشرق اور فخر برصغیر کی زوجۂ حیات کی رحلت پر تو ان کی غم گساری کی خاطر پورے شہر کو ٹوٹ پڑنا چاہیے تھا لیکن ایسا کیوں نہیں ہوا، وہ سمجھ میں نہیں آتا، تدفین کے وقت علامہ انتہائی پریشانی کے عالم میں ایک پختہ قبر پہ دونوں ہاتھوں سے سر تھامے بیٹھے رہے، پھر ان کے مزار کے لیے جو قطعۂ تاریخ لکھا اس کا ایک مصرع یہ تھا ؂

لالے کا خیاباں ہے مرا سینۂ پُر داغ

مرحومہ کی وصیت یہ تھی کہ وہ دونوں بچوں کو ایک دن کے لیے بھی اپنے سے جدا نہ کریں اس پر ان کا عمل رہا، ان کی وفات کے بعد ایک بار زنانخانے میں آئے، جب مصنف کو بخار آگیا تھا، ایک کمرہ میں ان کی والدہ کی بڑی تصویر لگادی گئی تھی تو اس کو دیکھ کر خوش ہوئے، (ص ۶۱۹)

ان کو اپنی اولاد سے شروع سے بڑی محبت رہی، جب ان کی اہلیہ امید سے ہوئیں تو حضرت مجدد

الف ثانی کے مزار پر حاضری دی اور دعا کی، اور جب اللہ تعالیٰ نے ان کو بیٹا عطا کیا تو فوراً اپنے سارے کبوتر احباب میں بانٹ دیے، اور کبوتر بازی کے شغل کو اس لیے ترک کر دیا کہیں یہ بھی بڑا ہو کر کبوتر اڑانے کی عادت نہ ڈال لے، (ص ۲۹۴) مصنف نے اپنے بچپن میں والدین کی محبت و سرزنش کا حال بہت ہی خوش مذاقی سے لکھا ہے، ان کو چھپانے کی کوشش نہیں کی ہے، لکھا ہے کہ ان کی والدہ اپنی محبت میں ان کو آٹھ نو برس کی عمر تک اپنے ہاتھ سے کھانا کھلاتی رہیں، ان کے والد بزرگوار ان سے برابر یہ کہہ کر تکرار کرتے کہ یہ جوان ہو کر اپنے ہاتھ سے کھانا نہ کھا سکا تو کیا ہوگا، ان کی والدہ پر اس کا کوئی اثر نہ ہوتا، البتہ کھلاتے وقت جب کبھی وہ ان کے قدموں کی آہٹ سن لیتیں تو اپنا ہاتھ پھرتی سے کھینچ کر آگے چمچہ رکھ دیتیں ....

(ص ۲۷۶)

مصنف اس کے لکھنے میں بالکل نہیں ہچکچائے ہیں کہ اپنے بچپن میں اپنے والد بزرگوار کے ہاتھ سے کس کس طرح مار کھائی، ایک بار کی مار کا حال بہت ہی دلچسپ انداز میں کیا ہے، ایک روز وہ چپکے سے گھر میں کچھ کہے بغیر سینما دیکھنے چلے گئے، ساڑھے نو بجے رات کو چپ چھپا کر گھر پہونچے تو اپنے والد بزرگوار کے سامنے پیش کیے گئے، وہ غصہ کی شدت سے کانپ رہے تھے، مارنے کے لیے ہاتھ اٹھایا تو والدہ بیچ میں آکر کھڑی ہوئیں، اب ایک طرف ان کے والد بزرگوار تھے اور دوسری طرف ان کی والدہ تھیں، وہ جب مارنے کے لیے ہاتھ اٹھاتے تو والدہ ان کا ہاتھ پکڑ لیتیں، پھر دوسرا ہاتھ اٹھاتے تو وہ لپک کر اس کو بھی پکڑ لیتیں، وہ خود اپنے والد کی ٹانگوں سے چپکے ہوئے تھے، ان کی والدہ سراسیمگی کے عالم میں اچک اچک کر ان کے والد بزرگوار کا ہاتھ پکڑتی رہیں تو ان کے والد صاحب کو ہنسی آگئی، (ص ۲۷۰) مصنف لکھتے ہیں کہ عام طور سے وہ خفا ہوتے تو احمق، بے وقوف ہی کہہ کر ڈانٹتے بعض اوقات غصہ کی حالت میں پنجابی یا اردو کے بجائے انگریزی میں ڈانٹتے، (ص ۲۷۰) ان کی محبت کا یہ عالم بھی رہا کہ بیٹا ایک بار منھ کے بل گر پڑا جس سے اس کا نچلا ہونٹ اندر سے کٹ گیا، خون جاری

ہو گیا۔ اس کو دیکھ کر شفیق باپ کو غش آ گیا، (۴۰۸)

اپنی مالی پریشانیوں کے باوجود بچوں کے لیے بینک میں کچھ نہ کچھ رقم جمع کرتے رہے، جب مصنف کی والدہ بستر مرگ پر تھیں تو جاوید منزل کو مصنف کے نام سے ہبہ کر دیا، اور جب تک زندہ رہے اس کا کرایہ اپنے نابالغ بیٹے کے نام سے جمع کرتے رہے، پھر ان کے نام سے جو نظمیں لکھی ہیں ان سے بھی کیسی محبت ٹپکتی ہے، اللہ تعالیٰ کی یہ بے پایاں رحمت بیٹے پر رہی کہ ان کے والد بزرگوار کی دعائیں بڑی حد تک قبول ہوئیں،

مصنف نے اپنے والد بزرگوار کی مالی حالت کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ان کی تمام زندگی معاشی تنگی میں گذری، آخری چند برسوں میں علالت کے سبب وکالت چھوٹ گئی تھی، بیوی فوت ہو چکی تھیں، گھر کے اخراجات ان کو دو نابالغ بچوں کی نگہداشت اور تعلیم کے اخراجات برداشت کرنے پڑتے تھے، (ص ۴۰۵)

ان کی مالی پریشانیوں کا حال پڑھ کر قارئین کو ضرور دکھ ہوگا، آج ان کے نام پر جیسے روپیے خرچ کیے جا رہے ہیں، اگر اس کا عشر عشیر بھی انتظام کر کے ان کی مالی فراغت کا سامان کر دیا جاتا تو معلوم نہیں وہ ساز زندگی اور راز حیات کا کیا کیا پیام دے جاتے، اور سینۂ کائنات کے راز کو کس کس طرح فاش کر گئے ہوتے، مگر یہ بھی اچھا ہی ہوا کہ وہ قلندر بن کر زندگی بسر کرتے رہے، کہیں مالی فراغت حاصل ہو جاتی تو کیا عجب کہ ان کا بدن بیدار اور روح خوابیدہ ہو جاتی، پھر ملت کے لیے بڑا المیہ ہوتا، ان کی مالی پریشانیوں کے باوجود جو ہر لحظہ نیا طور اور نئی برق تجلی دکھائی دیتی رہی ان کا اصل سرمایۂ حیات ہے، ان کے معاصروں میں بعض ایسے اکابر بھی تھے، جن کو جاہ و ثروت سب کچھ حاصل ہوا لیکن ان کو یاد کر کے کہا جا سکتا ہے ؎

ترا وجود ہے قلب و نظر کی رسوائی

علامہ اپنے متعلق جو یہ کہہ گئے ہیں کہ ؎

مرا طریق امیری نہیں فقیری ہے خودی نہ بیچ فقیری میں نام پیدا کر

تو ان کی فقیری کی وجہ سے ان کا جو نام ہوا، وہ ان کے ہم وطنوں اور ہم مذہبوں کا سرمایۂ حیات ہے

نہ تخت و تاج میں نے لشکر و سپاہ میں ہے جو بات مرد قلندر کی بارگاہ میں ہے

ان کی زندگی کا جو آنکھوں دیکھا حال ان کے نامور فرزند نے لکھا ہے اس کے جستہ جستہ ٹکڑوں سے قارئین کو کیف و نشاط ضرور حاصل ہوگا۔

ایک عرب روزانہ ان سے ملنے آیا کرتے تھے، قرآن مجید پڑھ کر سناتے، ایک بار انھوں نے سورۂ مزمل پڑھی تو اتنا روئے کہ تکیہ آنسوؤں سے تر ہو گیا، قرآن مجید سنتے وقت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا اسم مبارک کسی کی نوک زبان پر آجاتا تو ان کی آنکھیں امنڈ آیا کرتی تھیں، رات گئے تک وہ جاگتے رہتے کیونکہ انھیں عموماً رات کو تکلیف ہوتی تھی، اور جب شعر کی آمد ہوتی تو وہ اور بھی زیادہ بے چین ہوجاتے، چہرہ کا رنگ بدل جاتا، بستر پر کروٹیں بدلتے رہتے، کبھی اٹھ کر بیٹھ جاتے، کبھی گھٹنوں میں سر دے دیتے، بسا اوقات وہ رات کے دو بجے علی بخش (ملازم) کو تالی بجا کر بلاتے، اور اسے اپنی بیاض اور قلم دوات لانے کو کہتے، جب وہ لے آتا تو بیاض پر اشعار لکھ دیتے، اشعار لکھ چکنے کے بعد ان کے چہرے پر آہستہ آہستہ سکون کے آثار نمودار ہوجاتے، اور آرام سے لیٹ جایا کرتے، ان کی عادت سر کے نیچے بازو رکھ کر بستر پر ایک طرف سونے کی تھی، اس حالت میں ان کا ایک پاؤں عموماً ہلتا رہتا جس سے دیکھنے والا یہ اندازہ کرسکتا کہ وہ ابھی سوئے نہیں، بلکہ کچھ سوچ رہے ہیں، جب گہری نیند سوجاتے تو زور سے خراٹے لیا کرتے تھے، صبح کی نماز بہت کم چھوڑتے تھے، گرمیوں میں دالان میں رکھے ہوئے تخت پوش ہی پر نیت باندھ لیتے، دھوتی اور بنیائن زیب تن ہوتی، اور سر پر تولیہ رکھ لیتے، سردیوں میں دھوتی اور قمیص پر دھسہ اوڑھ لیا کرتے تھے، ان کے کمرے کی حالت پریشان رہتی تھی، بستر ان کی دھوتی اور بنیائن کی طرح میلا ہوجاتا تو بھی بدلوانے کا خیال نہ آتا، چارپائی پر نیم دراز

پڑے رہنے میں بڑے مطمئن رہتے، بارہا دوپہر کا کھانا کسی کتاب کے مطالعہ میں منہمک ہونے کے سبب بھول جایا کرتے، اور جب وہ کتاب ختم ہو جاتی تو علی بخش کو بلا کر معصومانہ انداز میں پوچھتے: کیوں بھئی! میں نے کھانا کھا لیا ہے؟ (ص ۶۱۹-۶۱۸) مرض الموت کے زمانہ کا حال بھی فاضل مصنف نے جس طرح لکھا ہے وہ بھی پڑھنے کے لائق ہے، وہ لکھتے ہیں:

قلب، گردے اور جگر سب ماؤف ہو چکے تھے، نیند آتی نہ تھی، اور مسلسل بے خوابی کا عالم طاری تھا۔ وقت کاٹنا مشکل تر ہوتا جا رہا تھا، پاس بیٹھے احباب سے کہتے کہ باتیں کیے جائیں، کبھی دیوان علی سے بلے شاہ کی کوئی کافی یا ہدایت اللہ کی سی حرفی یا یوسف زلیخا سننے اور کبھی سید نذیر نیازی کو تاریخ اسلام کا کوئی واقعہ بیان کرنے یا کوئی ایسا افسانہ سنانے کی ہدایت کرتے جس میں بغداد، قاہرہ اور غرناطہ یا قرطبہ کا ذکر آتا ہو بعض اوقات کھانستے کھانستے غشی کی کیفیت طاری ہو جاتی، ایک دفعہ تو بے خبری میں پلنگ سے فرش پر گر گئے، ان ہی ایام میں دمہ کے پے درپے دورے کے بعد نیم بیہوشی کے عالم میں راقم نے انھیں دو مرتبہ اپنی خوابگاہ میں مرزا اسد اللہ خان غالب اور مولانا جلال الدین رومی سے باتیں کرتے سنا تھا، دونوں مرتبہ علی بخش کو بلوا کر پوچھا کہ مرزا غالب یا مولانا رومی ابھی اٹھ کر گئے ہیں، دیکھنا کہیں چلے تو نہیں گئے، علی بخش کے اس جواب پر کہ یہاں تو کوئی بھی نہیں تھا، فرمایا: چلو ٹھیک ہے۔ (ص ۶۷۰)

اپنی وفات سے پہلے اپنے ایک وصیت نامہ میں لکھا کہ میں عقائد دینی میں سلف کا پیرو ہوں نظری اعتبار سے فقہی معاملات میں غیر مقلد ہوں، عملی اعتبار سے امام ابوحنیفہؒ کا مقلد ہوں (ص ۵۵۸) ان کی بڑی آرزو تھی کہ وہ حج کریں، ایک خط میں حیدرآباد کے وزیر اعظم سر اکبر حیدری کو لکھتے ہیں:

"ایک ہی خواہش جو ہنوز میرے جی میں خلش پیدا کرتی ہے یہ رہ گئی ہے کہ اگر ممکن ہو سکے تو حج کے لیے کہ جاؤں، اور وہاں سے اس ہستی کی تربت پہ حاضری دوں، جس کا ذات الٰہی سے بے پایاں شغف میرے لیے وجہ تسکین اور سرچشمۂ الہام رہا ہے، میری جذباتی زندگی کا سانچہ کچھ ایسا واقع ہوا ہے کہ انفرادی انسانی شعور

کی ابدیت پر مضبوط یقین رکھے بغیر ایک لمحہ بھی زندہ رہنا میرے لیے ممکن نہیں، مجھے یقین پیغمبر اسلام کی ذات گرامی سے حاصل ہوا ہے، میرا ذرہ ذرہ آنحضورؐ کی احسان مندی کے جذبات سے لبریز ہے، اور میری روح ایک ایسے بھرپور اظہار کی طالب ہے جو صرف آنحضورؐ کے روضہ مقدس پر ہی ممکن ہے۔ اگر خدا نے مجھے توفیق بخشی تو میرا حج اظہار تشکر کی ایک شکل ہوگی۔" (ص ۶۰۹ ـ ۶۰۸)

حج کرنے کی آرزو تو ان کی پوری نہیں ہوئی، لیکن انھوں نے ارمغان حجاز میں حضور رسالت مآبؐ کے عنوان سے مکہ اور مدینہ کا جو خیالی سفر کرکے اس دربار سے اپنے جن والہانہ جذبات کا اظہار کیا ہے، کیا عجب کہ بارگاہ ایزدی سے ان کو وہی ثواب اور رتبہ ملے جو عشق الٰہی اور عشق رسولؐ میں سرشار ہو کر حج کرنے والے ایک حاجی کو ملتا ہے۔

ان کی علالت کے زمانہ کی پریشانیوں کا حال مصنف نے جس طرح قلمبند کیا ہے اس کو پڑھ کر یہ دکھ بھرا جذبہ طاری ہوتا ہے کہ حرف راز کا سکھانے والا نفس جبرئیل کا رکھنے والا، حریم ذات میں اپنی نوائے شوق سے شور برپا کرنے والا بیمار نہ پڑتا، اس کی زندگی اس کے سینے کے داغ سے لالے کا خیاباں بننے کے بجائے اس کی غزلوں کے تغزل کی طرح شروع سے آخر تک نشاط انگیز رہتی۔ مصنف نے اس دانائے راز کے جنازہ کی جو تفصیل لکھی ہے اس کو پڑھتے وقت قارئین کو ایسا معلوم ہوگا کہ وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں، کہ وزرائے حکومت، حکام اعلیٰ، عدالتوں کے جج، کالجوں کے پروفیسر، اساتذہ، طلبہ، شعراء، ادباء، صحافی، مشائخ، علماء، صناع اور پیدل اور سوار پولیس، سرخ پوش رضاکار، نیلی پوش والنٹیئر، خاکساروں کے بیشں اور شہر کے ساٹھ ہزار آدمی جنازے کے ساتھ جا رہے ہیں، لیکن اس کے ساتھ میری طرح قارئین کو یہ بھی دکھ ہوگا کہ لوگوں نے اس میت کے ساتھ جس عقیدت کا اظہار کیا، اگر یہی عقیدت ان کی زندگی میں ظاہر ہوتی رہتی تو مصنف کو اپنے والد بزرگوار کی زبانی ان کی طویل علالت کی یہ دردناک کہانی نہ لکھنی پڑتی کہ:

"بعض احباب نے علاج کے لیے جرمنی اور آسٹریا جانے کا مشورہ دیا ہے لیکن میں سمجھتا ہوں کہ وہاں کے اخراجات میری استطاعت سے باہر ہوں گے، مزید براں یہ بات میرے بچوں کے ساتھ زیادتی کے مترادف ہوگی کہ عمر کے ان ڈھلتے ہوئے سالوں میں جب کہ میری زندگی کا کام عملاً انجام کو پہونچ چکا ہے میں اپنی ذات پر اس قدر خرچ کروں" (ص ۶۰۰)

یہ صحیح ہے کہ اس مرغ لاہوتی کو اس رزق سے موت بہتر ہوتی جس سے اس کی پرواز میں کوتاہی ہوتی مگر ان کے کلام کے مجموعوں ہی کو پوری فیاضی اور قدردانی سے خرید کر ان سے اپنی محبت و شیفتگی کا ثبوت دیا جاتا تو مصنف کو یہ لکھنا نہ پڑتا کہ کوٹھی کی تعمیر کے لیے مزید روپیوں کی ضرورت تھی، ان کی خواہش تھی کہ جامعۂ ملّیہ ان کی طباعت پر رضامند ہو جائے تو انھیں اس اڈیشن کی رقم یکمشت اور فوراً ادا کر دی جائے، لیکن جامعہ ملیہ کی مالی مشکلات کے باعث یہ مسئلہ حسب منشا طے نہ ہو سکا، (ص ۵۴۲)

مصنف نے اپنے والد بزرگوار کی شیریں حکایتوں اور پرسوز روایتوں کو کچھ ایسی شیرینی اور دلسوزی سے قلمبند کیا ہے، کہ اس کتاب پر میرا یہ ریویو مضمون کی شکل میں منتقل ہو گیا، یہ طویل ہوتا جا رہا ہے، پھر بھی اس کی بہت سی باتوں کا ذکر باقی رہ گیا ہے، انھوں نے ان کی ملی نظر اور مذہبی فکر کے متعلق جو کچھ لکھا ہے اس پر اظہار رائے رہ جاتا ہے، یہ کتاب علامہ کے آخری بارہ سال کی زندگی کے واقعات پر مشتمل ہے، اس مدت میں ان کے اہم ترین اور زرین کارناموں میں ان کی زبور عجم (۱۹۲۷ء) جاوید نامہ (۱۹۳۲ء) بال جبریل (۱۹۳۵ء)، ضرب کلیم (۱۹۳۶ء) مسافر (۱۹۳۴ء) پس چہ باید کرد اے اقوام شرق (۱۹۳۶ء) ارمغان حجاز (۱۹۳۸ء) کی اشاعت تھی، لائق مصنف نے ان پر اپنی کتاب میں زیادہ تفصیلی بحث نہیں کی ہے، یہ صحیح ہے کہ ان پر اب تک بہت کچھ لکھا جا چکا ہے، لیکن وہ ان پر جو کچھ لکھتے وہ لذیذ سے لذیذتر اسی طرح ہوتا جس طرح انھوں نے اپنے والد بزرگوار کی جانی بوجھی زندگی کے کوائف کو بنا دیا ہے، ان ہی مجموعوں سے ان کی آفاقیت کا اظہار ہوتا ہے، جن کے مطالعہ کے بعد کوئی ان کو ایک پنجابی شاعر قرار دے کر پنجاب کے پنجرے میں

بند نہیں کر سکتا ہے۔ (ص ۴۲۶) اس کتاب کی دوسری جلد میں وعدہ تھا کہ علامہ کے مسئلۂ وحدت الوجود اور صوفیانہ خیالات پر سیر حاصل بحث ہوگی، زیر نظر کتاب میں وہ اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ:

"اقبال نے وحدت وجود کو رد کرنے کے بعد تو وحدت شہود کے مسلک کو اپنایا اور نہ وحدت وجود کے مسلک کی طرف واپس ہوئے۔" (ص ۶۶۸)

مگر اسی کتاب میں جب وہ پیرس میں لوئی میسیون سے علامہ کی ملاقات کا ذکر کرتے ہیں تو لوئی میسیون کے تاثرات کا حوالہ دیتے ہوئے اس کی زبانی یہ روایت بھی قلمبند کی ہے:

"اقبال نے پیرس میں میرے ساتھ ملاقات کے دوران اس بات کا اقرار کیا تھا کہ وہ وحدت الوجودی نہیں بلکہ وحدت الشہودی ہیں۔" (ص ۴۹۶)

راقم نے زندہ رود کی جلد دوم پر ریویو کرتے ہوئے عرض کیا تھا کہ علامہ نے اس وحدت الوجود کو ضرور رد کیا جس میں غیر اسلامی رنگ پیدا ہو گیا تھا، لیکن وہ اسلامی وحدت الوجود کو کسی حال میں رد نہیں کر سکتے تھے، ان کے یہاں جو عشق کا تخیل ہے وہ وہی ہے جو وحدت الوجود کی قرآنی تعبیر میں ہے، وہ خودی کے ذریعہ سے خدا تک پہونچنے کی تلقین کرتے ہیں، ان کے یہاں تو اس کی برابر تلقین کی گئی ہے کہ زندگی کا موتی انسان کے جسم خاکی میں گم ہو کر رہ گیا ہے، اور اب یہ فیصلہ کرنا ہے کہ یہ دنیا خود آدمی ہے یا خداوند تعالیٰ ہے، اور جب کبھی ان کا یہ شعر ذوق زبان پر آئے گا کہ

در خاکدانِ ما گہرِ زندگی گم است　　　این گوہرِ ما گم شدہ مائیم یا کہ اوست

تو یہ خیال آئے گا کہ انھوں نے مروجہ غیر اسلامی توحید وجودی کو تو پسند نہیں کیا، لیکن ممکن ہے کہ ان کے تخیل میں کوئی ایسا توحید وجودی ہو جو ان کا اپنا ہو اور خالص اسلامی رنگ کا ہو، علامہ کے افکار میں اس مسئلہ کے علاوہ عقل، حواس خمسہ، عرفان، عشق، خودی، مکان، زمان، مرد کامل، مرد مومن، علم اور مذہبی مشاہدات، ذات الٰہیہ کے تصور، جبر، اختیار، حیات بعد الموت، اسلامی ثقافت کی روح اور الاجتہاد فی الاسلام، نئے علم کلام فقہ اسلامی

کی نئی تدوین کی ضرورت، احیائے تمدن، اسلامی معاشی جمہوریت، اسلامی طرز حکومت وغیرہ پر برابر بحثیں ہوتی رہیں گی، ان مباحث میں نظری و فکری اختلافات بھی ہوں گے، لیکن لائق مصنف نے اپنی اس کتاب میں جس سلیس، عام فہم لیکن دل نشین انداز میں ان مسائل کو سمجھانے کی کوشش کی ہے وہ ہر طرح لائق ستائش ہے، علامہ کی کتاب 'دی کنسٹرکشن آف ریلیجس تھاٹس ان اسلام' کو سمجھنا ہر کس و ناکس کے بس کی بات نہیں، فاضل مصنف نے اس کے مختلف خطبات کو بھی جس طرح سمجھایا ہے اس سے عام قارئین کو سمجھنے میں بڑی مدد ملے گی، اس کے لیے علمی حلقہ کو ان کا ممنون ہونا چاہیے،

اس کتاب کے ختم کرنے کے بعد ممکن ہے کہ اس کے بعض قارئین اس کے کچھ حصہ سے اختلاف کریں، لیکن یہ شروع سے آخر تک جس انداز میں لکھی گئی ہے، اس سے اس کا نیاسے وہ ضرور متاثر ہوں گے کہ اس میں جو کچھ لکھا گیا ہے اس میں تصنع نہیں ہے، بیٹے نے باپ کی سوانح عمری لکھی ہے، لیکن ان کی زندگی کے کسی پہلو پر پردہ نہیں ڈالا ہے، تاویل یا حسن تاویل سے بھی کام نہیں لیا ہے، ان کی جن باتوں سے لوگوں نے اختلاف کیا، ان کا بھی ذکر کرتے گئے ہیں، ان کی گھریلو زندگی کے سارے پہلوؤں کو پیش کر دیا ہے، مگر جس کے متعلق وہ یہ سب کچھ لکھ رہے تھے، اس کی ادائے محبوبی میں کچھ ایسی دلنوازی رہی ہے کہ ان کے ذکر میں ان کی تحریروں میں دل نوازی کیونکر نہ پیدا ہو جاتی، یہی اس کتاب کی بڑی خوبی ہے۔

اقبال کامل

علامہ اقبال پر اردو میں روح اقبال کے بعد دوسری اہم اور لائق مطالعہ کتاب ہے، اس میں علامہؒ کے مفصل سوانح حیات کے علاوہ ان کی اردو شاعری، فارسی شاعری، اور ان کی شاعری کے اہم موضوع فلسفۂ خودی و بےخودی، نظریۂ لیت وغیرہ پر تفصیل کے ساتھ روشنی ڈالی گئی ہے۔ مولفہ مولانا عبدالسلام ندوی۔ قیمت ۲۲ روپئے

"منیجر"

مطبوعات جدیدہ

عربی نگارشات عالیہ : تالیف و ترجمہ جناب شیخ نذیر حسین صاحب، متوسط تقطیع، کاغذ، کتابت و طباعت عمدہ، صفحات ۲۴۴، قیمت درج نہیں، پتہ مرکز معارف اسلامی لاہور، پاکستان۔

عربی اس عہد کی مقبول اور نہایت مروج زبان ہے، جو مسلمانوں کے مذہب و ثقافت کی ترجمان، اسلامی علوم و معارف کا مخزن اور ہر قسم کے علمی، دینی، اخلاقی، تاریخی، تمدنی اور ادبی مضامین سے معمور ہے، جناب شیخ نذیر حسین مدیر اردو دائرۂ انسائیکلو پیڈیا آف اسلام کو اس کا اور اردو زبان کا نہایت ستھرا ذوق ہے، اور وہ عربی سے اردو میں ترجمہ کرنے کا اچھا سلیقہ و تجربہ بھی رکھتے ہیں، اس سے قبل عربی کے مشہور عالم و ادیب ڈاکٹر احمد امین مصری کی بعض کتابوں کا اردو ترجمہ کرکے وہ اچھی شہرت حاصل کر چکے ہیں، اب انھوں نے عربی زبان کی علمی و ادبی حیثیت سے بلند پایہ متعدد نگارشات کا اردو ترجمہ کیا ہے جو دینی و اخلاقی حیثیت سے بہت سے سبق آموز اور گوناگوں علمی، تاریخی، ادبی اور تمدنی معلومات پر مشتمل ہیں، اس کتاب کی ابتدا قرآن مجید کی نہایت موثر اور معنی خیز آیتوں کے ترجمے سے کی گئی ہے، پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پاکیزہ سیرت و شمائل اور آپ کے اور خلفائے راشدینؓ کے خطبات کا اردو ترجمہ کیا گیا ہے، اس کے بعد ہر دور کے مختلف طبقوں کے مشاہیر و اعلام کی مایۂ ناز تصنیفات سے نہایت بلیغ اور شاندار تحریروں کا انتخاب پیش کیا گیا ہے، محدثین، ائمۂ دین اور حکمائے اسلام میں امام حسن بصریؒ، امام شافعیؒ، امام بخاریؒ، امام ترمذیؒ، امام غزالیؒ، امام ابن جوزیؒ،

ابن تیمیہؒ، امام ابن قیمؒ اور شاہ ولی اللہؒ کے رشحات قلم اور صوفیہ و مشائخ میں شیخ عبد القادرؒ اور شیخ محی الدین ... کے جواہر پاروں کے ترجمے دیے ہیں۔

اصحاب سیر اور مورخین میں ابن ہشام، بلاذری، طبری، ابو حنیفہ دینوری، مسعودی، ابن اثیر، ابن شداد، ابن خلکان، ابن خلدون اور احمد بن محمد مقری کی منتخب تحریروں کے ترجمے درج ہیں، ادیبوں اور انشاپردازوں میں ابن مقفع، جاحظ، ابن قتیبہ، احمد بن یوسف کاتب، ابن عبد ربہ، ابن حیان، ابو الفرج اصبہانی، بدیع الزمان ہمدانی، ابو حیان توحیدی، حریری، قاضی فاضل اور ضیاء الدین ابن الاثیر کے ادب پاروں کے اردو ترجمے دیے ہیں، اور سیاحوں میں ابن فضلان، ابن جبیر اور ابن بطوطہ کے سفرناموں سے دلچسپ اور معلوماتی ٹکڑوں کے ترجمے پیش کیے ہیں، گذشتہ اور موجودہ صدی کے ممتاز عربی مصنفین اور ارباب قلم میں شیخ محمد عبدہ، مصطفیٰ منفلوطی، مصطفیٰ صادق رافعی، احمد فرید رفاعی، سید رشید رضا، امیر شکیب ارسلان، امام حسن البناؒ، حسن زیات، ڈاکٹر طہٰ حسین، محمد کرد علی، ڈاکٹر احمد امین، عبد الوہاب عزام، عباس محمود عقاد، سید قطبؒ، محمد تقی بشیر ابراہیمی، اور مولانا سید ابو الحسن علی ندوی کی زوردار اور بلیغ تحریروں کے نمونے دیے ہیں، اس سے کتاب کے تنوع و جامعیت کے علاوہ فاضل مرتب و مترجم کے حسن انتخاب اور علم و مطالعہ کی وسعت اور خود عربی زبان کی معنویت، گہرائی اور اثر انگیزی کا پتہ چلتا ہے، گذشتہ تیرہ صدیوں کی عربی نگارشات کا یہ انتخاب ہر لحاظ سے پاکیزہ، بلند اور دلکش ہے، شیخ صاحب نے بڑی خوش مذاقی اور محنت شاقہ سے رنگ برنگ کے مختلف پھولوں کو یکجا کرکے یہ حسین گلدستۂ علم و ادب تیار کیا ہے، حواشی میں انھوں نے ہر نثر نگار کے مختصر حالات بھی لکھے ہیں، اس میں ان کے علمی و ادبی درجہ کا تعین کرکے اس کے طرز نگارش کی خصوصیات دکھائی ہیں، خود مترجم کا اسلوب نگارش اور ترجمہ کی زبان بھی سلیس، شگفتہ اور دلآویز ہے، مگر اس میں دو ایک معمولی فروگذاشتیں بھی ہیں، جیسے ص ۱۶ پر جن آیتوں کا ترجمہ دیا گیا ہے اس کا عنوان 'جہاد میں ثبات' کے بجائے 'محمدؐ اور ان کے اصحاب کے اوصاف' مناسب ہوتا، ص ۱۶۱ و ص ۲۴۴ پر سیرت عمر بن عبد العزیزؒ کو مترجمہ مولوی ابو العرفان ندوی لکھا ہے، جو مولانا عبد السلام ندویؒ کی تصنیف ہے،

ص ۲۹۷ پر لکھا ہے "عبادلہ میں حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ اور عمرو بن العاصؓ کے صاحبزادگان شامل تھے"۔ اس فہرست میں عبداللہ بن مسعودؓ، عبداللہ ابن عباسؓ اور عبداللہ ابن زبیرؓ کے اسماء قلم انداز ہوگئے ہیں، رہے حضرت ابوبکرؓ کے صاحبزادے عبداللہ، تو غالباً ان کا انتقال بہت پہلے ہوچکا تھا، چنانچہ روایات میں ان کا نام نہیں ملتا، اور وہ اس فہرست میں شامل نہیں کیے جاتے۔

اردو شاعری میں مستعمل تلمیحات و مصطلحات

مرتبہ ڈاکٹر سید حامد حسین صاحب، تقطیع متوسط، کاغذ، کتابت وطباعت بہتر، صفحات ۲۲۰، مجلد، قیمت ۳۰ روپیے۔

پتے (۱) بھوپال بک ہاؤس، بدھوارہ، بھوپال (۲) مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی۔

اس کتاب میں اردو شاعری میں مستعمل اصطلاحات اور تلمیحات کی بقدر ضرورت تشریح و وضاحت کی گئی ہے، یہ دو حصوں میں منقسم ہے، پہلے حصہ میں تاریخی واقعات قرآن مجید و حدیث شریف کے حوالوں اور نبیوں سے متعلق تلمیحات کا ذکر ہے، اور خاص طور پر مرثیوں میں مذکور اشخاص کے بارہ میں معلومات درج ہیں، یہی وجہ ہے کہ اس حصہ میں واقعۂ کربلا اور اس سے متعلقہ افراد کا بکثرت تذکرہ ہے، دوسرے حصہ میں نجوم، رمل، فلکیات، منطق و فلسفہ اور تصوف وغیرہ کی اصطلاحات کا مفہوم واضح کیا گیا ہے، اس حیثیت سے یہ کتاب مفید ہے، اور اس سے اردو شاعری میں رائج اشارات، تلمیحات اور اصطلاحات کو سمجھنے میں بڑی مدد ملے گی، مگر یہ موضوع مزید کدوکاوش اور بحث و تحقیق کا متقاضی ہے، تاریخی واقعات کی تشریح کے ضمن میں ان کے وثوق و اعتبار کی صراحت ضروری تھی، اسی طرح کسی واقعہ کو صرف شیعی روایت و عقیدہ کے مطابق نقل کرنا ہی کافی نہ تھا، جیسے "ثقلین" کی تشریح میں لکھا ہے "مراد قرآن اور اہل بیت" (ص ۶۶) اور نور محمدی کی یہ تشریح کی ہے کہ "حضرت آدمؑ کی پیدائش سے چار ہزار سال قبل خدا نے ایک ہی نور سے رسولِ خداؐ اور حضرت علیؓ کو پیدا کیا تھا" (ص ۲۴۰) اور پھر واقعۂ قرطاس (ص ۲۴۳) کے سلسلہ میں حضرت عمرؓ کے اختلاف کو ذکر کرنے کی ضرورت نہ تھی خصوصاً جب یہ معلوم ہے کہ اختلاف کی روایت صحیح نہیں سمجھی جاتی اور

اس پر مولانا شبلیؒ نے الفاروق جلد اول ص ۴۲ تا ۵۰ میں بڑی لمبی بحث کی ہے، اس لمبی بحث کے بعد اس روایت کا ذکر کر دینا نہ کوئی علمی خدمت ہے نہ ادبی، بلکہ خواہ مخواہ کو اپنے سے بدظن کرنا ہے، آل یاسین کی تشریح میں لکھتے ہیں "سورۂ صافات کی اس آیت کی طرف اشارہ ہے جس میں کہا گیا ہے سلام علی اٰل یاسین، مفسرین کا قول ہے کہ اٰل یاسین سے مراد آل محمد ہیں" (ص ۱۳۵ و ص ۲۵۵) حالانکہ معروف و متواتر قرأت کے مطابق یہ آل یاسین کے بجائے اِل یَاسِین ہے، جس سے مراد حضرت الیاسؑ ہیں، آل یاسین نہایت شاذ اور غیر معروف قرأت ہے جس کو ہرگز متواتر و مشہور قرأت پر ترجیح نہیں دی جا سکتی، ص ۲۴۲ پر سورۂ قٓ رکوع ۲ کی پہلی آیت نَحْنُ اَقْرَبُ اِلَیْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِیْدِ کو غلطی سے سورۂ آل عمران رکوع ۱۱ کی آیت بتایا ہے۔

نفس مطلب:۔ مرتبہ جناب سید محمد حسنین صاحب تقطیع متوسط، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، صفحات ۲۰۸، قیمت بیس روپیے۔ پتے:۔ (۱) کتاب منزل، سبزی باغ، پٹنہ ۴....۸ (۲) انجمن ترقی اردو، اردو گھر، راؤز ایونیو، نئی دہلی۔

پروفیسر سید محمد حسنین صدر شعبہ اردو مگدھ یونیورسٹی اردو کے اچھے اہل قلم اور کئی کتابوں کے مصنف ہیں، یہ نئی کتاب ان کی ان تحریروں کا مجموعہ ہے، جو بعض ادبی تقریبات کے لیے لکھی گئی تھیں، لائق مصنف نے مضامین کے تنوع اور رنگارنگی کے باعث ان کو چار حصوں میں تقسیم کیا ہے، پہلے حصہ میں تنقید و تحقیق سے متعلق مضامین درج ہیں، دوسرے حصہ میں تعلیم و تدریس کے مسائل پر بحث و گفتگو ہے، ایک حصہ میں ادبی جلسوں کے خطبے دیے گئے ہیں، اور آخری حصہ میں اردو کی چار مشہور کتابوں پر مصنف نے تبصرہ کیا ہے، پہلے حصہ میں نو مضامین ہیں، ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ مصنف کی اردو تنقید و ادب پر اچھی نظر ہے، اور وہ ان موضوعات پر شائع ہونے والی نئی کتابوں کا دلچسپی سے مطالعہ بھی کرتے رہتے ہیں، اس حصہ کے دو مضامین میں "قلم کا رنگ۔ تحریر کا آہنگ" اور "تحریر، نثر اور نثر غالب" اس حیثیت سے اچھے ہیں کہ ان میں تحریروں کی ہیئت، رنگ و روپ، وضع اسلوب اور خصوصیات وغیرہ پر جو بحث کی ہے اس پر عمل پیرا ہو کر اہل قلم تحریر میں بے راہ روی سے محفوظ رہ سکتے ہیں،

دوسرے حصہ میں اردو اساتذہ کا منصب بھی واضح کیا ہے، اوران کے فرائض بھی بتائے ہیں، اگر اردو کے اساتذہ مصنف کی باتوں پر عمل کریں تو آج کل کی بہت سی خرابیاں دور ہوسکتی ہیں، اس حصہ میں اردو کی عام اور بنیادی تعلیم پر مفید بحث کی گئی ہے، مصنف کے خطبوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اردو کے موجودہ مسائل اور مشکلات سے اچھی طرح واقف ہیں، اوران کو حل کرنے کے لیے تڑپ اور دردمندانہ جذبہ رکھتے ہیں، مصنف کے تبصرے بھی باوزن ہیں، ان میں کتابوں کی خوبیوں کے ساتھ خامیاں بھی دکھائی ہیں، جوش ملیح آبادی کی کتاب "یادوں کی برات" پران کا تبصرہ اس کا نمونہ ہے، مصنف کی تحریر میں شگفتگی ہے، اوران کا اپنا ایک خاص البیلا انداز بھی ہے، مگر ان کے یہاں اس طرح کے الفاظ کا استعمال بھی ملتا ہے جو ذوقِ سلیم پر گراں گذرتا ہے۔ مثلاً خارجیتی داخلیتی (ص ۲۳) ناثر دناثرین (ص ۴۷ و ۵۳) کہانوی اصناف (ص ۵۵) جامعاتی شاخوں (ص ۱۴۲) حیرتی (ص ۲۰۶) فرق کی جمع افراق (ص ۸۳) اور صدق کی جمع اصداق (ص ۸۸) اور رمزئی و مساعی (ص ۴۶) وغیرہ۔ ممکن ہے کہ اب یہ نئے ادیبوں کی زبان ہو، لیکن مصنف تو غالباً پرانے اساتذہ ہی کے قائل ہیں، ان کے لیے ان ہی کی زبان کا مقلد ہونا مناسب تھا۔

توضیحی فہرست کتب خانہ ہمدرد اشاعت ہائے خاص اردو رسائل | مرتبہ جناب حکیم نعیم الدین زبیری صاحب تقطیع کلاں، کاغذ، کتابت وطباعت اعلیٰ، صفحات ۲۰۲ مجلد، مع خوبصورت گردپوش، قیمت چالیس روپیے، پتہ:۔ ہمدرد فاؤنڈیشن پریس، ہمدرد سینٹر ناظم آباد کراچی ۱۸

حکیم محمد سعید صاحب کی ہمت عالی اور بلند حوصلگی کسی ایک ہی دائرہ میں محدود ہوکر قانع رہنا پسند نہیں کرتی بلکہ اپنی سرگرمیوں اور جولانیوں کے نئے نئے میدان تلاش کرتی رہتی ہے، ہمدرد کا وسیع اور عظیم الشان کتب خانہ ان ہی کی سعی و عمل، علمی سرپرستی اور حسن ذوق کا نتیجہ ہے، جس میں کتابوں کے علاوہ رسائل کا بھی وافر ذخیرہ موجود ہے، یہ کتب خانہ ہمدرد کے اردو رسالوں کے تقریباً بارہ سو خاص نمبروں کی توضیحی فہرست ہے، جس کو ہمدرد فاؤنڈیشن کے ڈائرکٹر ریسرچ اکیڈمک اور کتب خانہ کے نگراں مولانا حکیم نعیم الدین زبیری نے محنت و خوش ذوقی

سے مرتب کیا ہے، انھوں نے حروف تہجی کے اعتبار سے پہلے رسالوں کے نام لکھے ہیں، پھر زمانی ترتیب سے ان کے جو خاص اشاعتیں کتب خانہ میں موجود ہیں ان کا تذکرہ کیا ہے، ہر خاص نمبر کے ماہ و سال، جلد و شمارہ و نمبر صفحات کی تعداد اور مدیر کے نام کی صراحت بھی کی ہے اور اس کے اہم مضامین کے عنوانات اور مضمون نگاروں کے نام بھی درج کیے ہیں، اس فہرست میں معارف کے سلیمان نمبر اور متعدد اہم اور قدیم رسالوں کے مفید اور کم یاب نمبروں کا ذکر ہے، جس سے علمی و تحقیقی کام کرنے والوں کو بڑی مدد ملے گی، مختلف کتب خانوں کے مطبوعات و مخطوطات کی فہرستوں کی اشاعت کا تو عام رواج ہے، مگر رسائل کے خاص نمبروں کی فہرست کی اشاعت غالباً یہ پہلی مرتبہ ہوئی ہے، شروع میں جناب مسعود احمد برکاتی کے قلم سے اس کا مختصر تعارف بھی درج ہے، اس میں مختلف حیثیتوں سے رسائل و جرائد کی اہمیت دکھا کر ان کے تحفظ کی ضرورت و اہمیت بیان کی ہے۔

مصائب کا مداوا: شرح و ترجمانی ڈاکٹر عبداللہ عباس ندوی، تقطیع متوسط، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، صفحات ۶۴، شائع کردہ دار العلوم حرم، مدرسہ صولتیہ، مکہ مکرمہ۔

شیخ یوسف بن محمد توزری الجزائری چھٹی صدی ہجری کے ایک عالم اور صاحب دل بزرگ تھے، ان کی تصنیفات میں القصیدۃ المنفرجۃ مناجات کے طرز کی ایک نظم ہے، اس میں ہر حال میں جادۂ تسلیم و رضا پر ثابت قدم رہنے اور مصائب و آلام کے ہجوم میں بھی جزع و فزع سے پرہیز اور یاس و حرمان کا شکار نہ ہونے کی تلقین کی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ ہر چیز کا وقت مقرر ہے، اس لیے مصائب بھی بالآخر ختم ہو کر رہیں گے، ایک بندۂ حق آگاہ کا فرض یہ ہے کہ وہ مشکل وقت میں بھی اللہ سے لو لگائے رکھے، اور دعاء و تضرع سے غافل نہ رہے، یہی اس کے درد کی دوا اور مرض کا مداوا ہے، شیخ کے موثر اور دلکش پیرایۂ بیان سے دعاء و انابت کا خاص داعیہ پیدا ہوتا ہے، اسی لیے بعض مصری علماء اس کے ورد کا اہتمام کرتے ہیں، اور علامہ حسنین محمد مخلوف سابق مفتی اعظم مصر نے اس کی شرح بھی لکھی ہے، قصیدہ کی دلکشی و اثر انگیزی کی وجہ سے ڈاکٹر عبداللہ عباس ندوی استاذ جامعہ ام القریٰ مکہ کی توجہ بھی اس کی جانب مبذول ہوئی، اور انھوں نے اس کی سلیس و شگفتہ اردو شرح و ترجمانی کی، ڈاکٹر صاحب اردو و عربی

دونوں زبانوں کے ادیب ہیں، انھوں نے قصیدہ کے خیالات و مضامین کی وضاحت کرتے ہوئے جا بجا مناسب و برمحل اردو، فارسی اور عربی اشعار بھی نقل کیے ہیں، جن سے لطف دوبالا ہوگیا ہے، وہ علم و ادب کی طرح تصوف و معرفت کے لذت شناس بھی ہیں، اس کی وجہ سے بھی ان کی شرح و ترجمانی میں خاص کیف، حلاوت اور لذت پائی جاتی ہے۔

عبداللطیف اعظمی حیات وخدمات | مرتبین :۔ انور صدیقی، شمیم حنفی، شیر الحق، مظفر حنفی، عبد الحق خان، محمد انس، شاہد علی خان، خالد محمود صاحبان تقطیع خورد، کاغذ، کتابت و طباعت اچھی، صفحات ۸۰، مجلد، قیمت اٹھارہ روپیے، پتہ ماہنامہ کتاب نما جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵۔

جناب عبداللطیف اعظمی طویل مدت سے اردو زبان و ادب اور جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کی خدمت اخلاص و سرگرمی سے انجام دے رہے ہیں، اس کے اعتراف کے طور پر ماہنامہ "کتاب نما" نے یہ خصوصی شمارہ شائع کیا ہے، جو عبداللطیف صاحب کے جامعی احباب کے علاوہ خود ان کی اور ان کی بیگم کی نگارشات پر مشتمل ہے، شروع میں جناب اخلاق الرحمن قدوائی سابق گورنر بہار کا پیغام ہے، اور آخر میں عبداللطیف صاحب کی تصنیفات اور اب تک کے مشاغل کا اجمالی ذکر ہے، مگر کسی مضمون میں ان کی تصنیفات پر بحث و تبصرہ کرکے ان کی اہمیت اور ادبی قدر و قیمت نہیں دکھائی گئی ہے، البتہ اکثر میں عبداللطیف صاحب کے مزاج و طبیعت کی نمایاں خصوصیات کا ذکر ہے، جیسے کام کی لگن، فرض شناسی اور اس میں عدم رو رعایت، مطالعہ و تحقیق سے دلچسپی، کثرت کلام، بحث و مباحثہ کی عادت اور ادیبوں اور شاعروں کی تاریخ ولادت کی جستجو و تعیین میں انتہائی موشگافی وغیرہ، جس طرح عبداللطیف صاحب بڑے دلچسپ اور باغ و بہار آدمی ہیں اسی طرح ان پر لکھے جانے والے مضامین بھی دلچسپ ہیں، مگر اکثر مضامین میں شوخی دبے تکلفی مذاق کی حد تک بڑھ گئی ہے، انور صدیقی صاحب نے دوسری شخصیتوں سے بھی شوخی پر اتر آئے ہیں، انھوں نے مدرسۃ الاصلاح سرائے میر اور ندوۃ العلماء لکھنؤ کو ان مدرسوں میں شمار کیا ہے جن کا طریقہ تعلیم درس نظامی ہے، یہ صحیح نہیں ہے۔

ہندوستانی فارسی ادب، از پروفیسر سید امیر حسن عابدی صاحب تقطیع متوسط، کاغذ، کتابت

و طباعت بہتر، صفحات ۳۳۲، مجلد مع گرد پوش، قیمت ۴۰۰ روپیے، ناشر انڈو پرشین سوسائٹی ۱۸۴۰ ،

شیخ چاند اسٹریٹ، لال کنواں دہلی ۱۱۰۰۰۶۔

پروفیسر سید امیر حسن عابدی صدر شعبۂ فارسی دہلی یونیورسٹی فارسی زبان و ادب کے متبحر عالم ہیں، انھوں نے فارسی زبان و ادب کی متعدد اہم اور نادر کتابوں کو اپنے عالمانہ مقدموں کے ساتھ شائع کرنے کے علاوہ اس موضوع پر سیکڑوں علمی اور تحقیقی مضامین بھی لکھے ہیں، اب ان کے شاگرد اور رفیق کار ڈاکٹر شریف حسین قاسمی نے زیر نظر مجموعہ میں ان کے مقالات کا انتخاب شائع کیا ہے، یہ چودہ مضامین پر مشتمل ہے، پہلے مضمون میں فارسی زبان و ادب کی ترویج و ترسیع میں ہندوستان کا حصہ دکھایا گیا ہے، یہ مضمون گو مختصر ہے مگر اس میں زیر بحث موضوع کی اکثر ضروری اور اہم باتوں کا تذکرہ ہے، ابتدا سے شروع سے اب تک فارسی زبان میں ہونے والے کاموں کا اجمالی جائزہ بھی ہے، اس سلسلہ میں اہم مؤلفین اور مؤلفات کے نام بھی گنائے گئے ہیں، مگر اس مقالہ میں یہ معمولی کسر رہ گئی ہے کہ مرزا غالب کے بعد کے فارسی گو شعرا میں علامہ اقبال اور اقبال سہیل کا تو تذکرہ ہے مگر علامہ شبلی اور بعض دوسرے فارسی گو شعرا کا ذکر رہ گیا ہے، دوسرے مضمون میں فردوسی کے شاہنامہ کی فارسی زبان و ادب میں اہمیت دکھانے کے بعد ہندوستان میں اس کی غیر معمولی پذیرائی اور اس سے والہانہ شغف کا حال بیان کیا ہے، اس سلسلہ میں شاہنامہ کے مختلف قلمی نسخوں کا ذکر بھی کیا ہے، تیسرے مضمون میں سنسکرت زبان سے فارسی زبان میں ترجمہ کیے جانے والے تحریری کاموں کا وقت بہ وقت جائزہ لے کر دکھایا ہے کہ ہندوستانی مصنفات فارسی زبان و ادب کی خدمت گذاروں کی سرگرمیوں کا [illegible] ہیں، چوتھے مضمون میں امیر خسرو کی مثنوی [illegible] کے تکملہ کے متعلق جناب ہاشمی فریدآبادی کے اس خیال کی دلائل سے تردید کی ہے [illegible] کی بجائے حیاتی [illegible]

چند مضامین میں بعض شعرا سے اہم تصنیفات کا ذکر ہے [illegible] ایک مضمون میں اردو کے مشہور شاعر [illegible]

[illegible] اور شاعری پر بحث کی [illegible] مضامین بھی ہیں، ایک [illegible]

[illegible] تقسیم ہیں اور اس [illegible]

[illegible]

[illegible]

حیات سلیمان

یہ محض جانشین شبلی مولانا سید سلیمان ندوی کی سادہ سوانح عمری ہی نہیں ہے بلکہ ان کے گوناگوں مذہبی، علمی، قومی، ملی، سیاسی حالات اور کارناموں کا ایک دلآویز مرقع ہے جس میں سید صاحبؒ کے دور کی نصف صدی کی ملی و قومی سیاسی و علمی، ادبی و لسانی تحریکیں مثلاً ہنگامۂ مسجد کانپور، تحریک خلافت، تحریک ترک موالات، جنگ آزادی، مسئلۂ ملوکیت حجاز وغیرہ کی تفصیل بھی ضمناً آگئی ہے، اسی کے ساتھ دارالمصنفین جو سید صاحبؒ کی زندگی کا سب سے بڑا کارنامہ ہے، اس کی تاسیس سال بہ سال اس کی ترقی کی روداد کے ساتھ ان کے قیام بھوپال، سفر پاکستان، قیام پاکستان کے دوران کی علمی خدمات کا تذکرہ اور پھر مختلف وفود کے رکن و صدر کی حیثیت سے سفر یورپ، سفر حجاز، سفر افغانستان وغیرہ کی مفصل روداد بھی سید صاحبؒ کے خطبات اور تحریروں کی روشنی میں قلمبند ہو گئی ہے، یہ کتاب اپنے اسلوب و طرز انشاء کے لحاظ سے بالکل حیات شبلی کا مثنیٰ ہے، ویسی ہی دلکش، دلچسپ اور دلنشین۔

مولفہ مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی قیمت ۴۲ روپے

سلوک سلیمانی

مولانا سید سلیمان ندویؒ کے عزیز ترین پاکستانی مسترشد مولانا سید سلیمان اشرف خان صاحب سلیمانی صدر شعبۂ عربی پشاور یونیورسٹی نے سلوک سلیمانی پر ایک اجمالی نظر کے عنوان سے ایک طویل مقالہ لکھا تھا جو معارف ستمبر ۱۹۵۹ء سے جنوری ۱۹۶۰ء تک مسلسل نکلتا رہا، یہ علمی حلقوں میں بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھا گیا، اسی مضمون کو مزید اضافوں کے ساتھ مولانا اشرف صاحب نے کتابی صورت میں سلوک سلیمانی کے نام سے دو جلدوں میں شائع کیا ہے، ان میں حضرت سید صاحبؒ کی سلوک و معرفت سے متعلق تعلیمات کو مرتب کر کے توضیحات و تعبیرات کی شکل میں پیش کیا گیا ہے، ان دونوں جلدوں کو افادۂ عام کی خاطر دارالمصنفین نے بھی چھاپ کر شایع کیا ہے۔

قیمت جلد اول ۳۰ روپے   قیمت جلد دوم ۲۵ روپے

ہندوستانی فارسی ادب: از پروفیسر سید امیر حسن عابدی صاحب، تقطیع متوسط، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، صفحات ۳۲۰، مجلد مع گرد پوش، قیمت ۴۰ روپیے، ناشر انڈو پرشین سوسائٹی ۱۸۲۰، شیخ چاند اسٹریٹ، لال کنواں دہلی ۱۱۰۰۰۶۔

پروفیسر سید امیر حسن عابدی صدر شعبۂ فارسی دہلی یونیورسٹی فارسی زبان و ادب کے متبحر عالم ہیں، انھوں نے فارسی زبان و ادب کی متعدد اہم اور نادر کتابوں کو اپنے عالمانہ مقدموں کے ساتھ شائع کرنے کے علاوہ اس موضوع پر سیکڑوں علمی و ادبی تحقیقی مضامین بھی لکھے ہیں، اب ان کے شاگرد اور رفیق کار ڈاکٹر شریف حسین قاسمی نے زیر نظر مجموعہ میں ان کے مقالات کا انتخاب شائع کیا ہے، یہ چودہ مضامین پر مشتمل ہے، پہلے مضمون میں فارسی زبان و ادب کی ترویج و توسیع میں ہندوستان کا حصہ دکھایا گیا ہے، یہ مضمون گو مختصر ہے مگر اس میں زیر بحث موضوع کی اکثر ضروری اور اہم باتوں کا تذکرہ ہے، اور شروع سے اب تک فارسی زبان میں ہونے والے کاموں کا اجمالی جائزہ بھی ہے، اس سلسلہ میں اہم مؤلفین اور مؤلفات کے نام بھی گنائے گئے ہیں، مگر اس مقالہ میں یہ معمولی کسر رہ گئی ہے کہ مرزا غالب کے بعد کے فارسی گو شعراء میں ڈاکٹر اقبال اور اقبال سہیل کا تو تذکرہ ہے مگر علامہ شبلی اور بعض دوسرے فارسی گو شعراء کا ذکر رہ گیا ہے، دوسرے مقالہ میں فردوسی کے شاہنامہ کی فارسی زبان و ادب میں اہمیت دکھانے کے بعد ہندوستان میں اس کی غیر معمولی پذیرائی اور اس سے والہانہ شغف کا حال بیان کیا ہے، اس سلسلہ میں شاہنامہ کے مختلف قلمی نسخوں کا ذکر بھی کیا ہے، تیسرے مضمون میں سنسکرت زبان سے فارسی زبان میں ترجمہ کیے جانے والے تحریری کاموں کا دقت نظر سے جائزہ لے کر دکھایا ہے کہ ہندوستان کی مصنفات فارسی زبان و ادب کے خدمت گذاروں کی سرگرمیوں کا خاص محور رہی ہیں، چوتھے مضمون میں امیر خسرو کی مثنوی تغلق نامہ کے تکملہ کے متعلق جناب ہاشمی فریدآبادی کے اس خیال کی دلائل سے تردید کی ہے کہ تکملہ محمد حیاتی کاشی کے بجائے حیاتی گیلانی نے، چند مضامین میں بعض شعراء اور اہم تصنیفات کا پہلی مرتبہ مفصل تعارف کرایا گیا ہے، ایک مضمون میں اردو کے مشہور شاعر نظیر اکبرآبادی کے فارسی رسائل اور شاعری پر بحث کی ہے، جدید فارسی زبان و ادب سے متعلق بھی دو محققانہ مضامین درج ہیں "ایران کا سماجی اور انقلابی ادب" اور "ایران کا نیا رنگ نثر" یہ سب مضامین عابدی صاحب کی تلاش و جستجو اور تحقیق کا نتیجہ ہیں اور ان سے فارسی زبان و ادب سے ان کی شیفتگی کے علاوہ اس میں گہری نظر کا اندازہ ہوتا ہے، یہ مجموعہ فارسی زبان و ادب کے شیدائیوں کے لیے خاص طور پر لائق مطالعہ ہے۔

"ض"

حیات سلیمان

یہ محض جانشین شبلی مولانا سید سلیمان ندوی کی سادہ سوانح عمری ہی نہیں ہے بلکہ ان کے گوناگوں مذہبی، علمی، قومی، ملی، سیاسی حالات اور کارناموں کا ایک دستاویزی مرقع ہے جس میں سید صاحبؒ کے دور کی نصف صدی کی ملی و قومی سیاسی و علمی، ادبی و لسانی تحریکوں مثلاً ہنگامۂ مسجد کانپور، تحریک خلافت، تحریک ترک موالات، جنگ آزادی، مسئلۂ ملوکیت حجاز وغیرہ کی تفصیل بھی ضمناً آگئی ہے، اسی کے ساتھ دارالمصنفین جو سید صاحبؒ کی زندگی کا سب سے بڑا کارنامہ ہے، اس کی تاسیس سال بہ سال اس کی ترقی کی روداد کے ساتھ ان کے قیام بھوپال، سفر پاکستان، قیام پاکستان کے دوران کی علمی خدمات کا تذکرہ اور ہندوستان مختلف وفود کے رکن و صدر کی حیثیت سے سفر یورپ، سفر حجاز، سفر افغانستان وغیرہ کی مفصل روداد بھی سید صاحبؒ کے خطوط اور تحریروں کی روشنی میں قلمبند ہوگئی ہے، یہ کتاب اپنے اسلوب و طرز انشاء کے لحاظ سے بالکل حیات شبلی کا مثنیٰ ہے، ویسی ہی دلکش، دلچسپ اور دلنشین۔

مولفہ مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی قیمت ۴۲ روپے

سلوک سلیمانی

مولانا سید سلیمان ندویؒ کے عزیز ترین پاکستانی مسترشد مولانا سید سلیمان اشرف خان صاحب سلیمانی صدر شعبۂ عربی پشاور یونیورسٹی نے "سلوک سلیمانی پر ایک اجمالی نظر" کے عنوان سے ایک طویل مقالہ لکھا تھا جو معارف میں ستمبر ۱۹۷۵ء سے جنوری ۱۹۷۶ء تک مسلسل نکلتا رہا، یہ علمی حلقوں میں بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھا گیا، اسی مضمون کو مزید اضافوں کے ساتھ مولانا اشرف صاحب نے کتابی صورت میں سلوک سلیمانی کے نام سے دو جلدوں میں شائع کیا ہے، ان میں حضرت سید صاحبؒ کی سلوک و معرفت سے متعلق تعلیمات کو مرتب کی توضیحات و تعبیرات کی روشنی میں پیش کیا گیا ہے، ان دونوں جلدوں کو افادۂ عام کی خاطر دارالمصنفین نے بھی چھاپ کر شائع کیا ہے۔

قیمت جلد اول ۳۰ روپے   قیمت جلد دوم ۲۵ روپے

تصانیف حضرت سید سلیمان ندوی

۱. سیرۃ النبی جلد سوم: معجزات کی حقیقت پر [illegible]

۲. سیرۃ النبی جلد چہارم: رسالت اور منصب نبوت کے مختلف فرائض۔ • ۴۰

۳. سیرۃ النبی جلد پنجم: عبادات نماز، زکوٰۃ، روزہ، حج، جہاد پر سیر حاصل بحث۔ • ۳۲

۴. سیرۃ النبی جلد ششم: اسلامی تعلیمات، فضائل و رذائل اور اسلامی آداب کی تفصیل۔ • ۴۸

۵. سیرۃ النبی جلد ہفتم: معاملات پر مشتمل متفرق مضامین و مباحث کا مجموعہ۔ • ۱۸

۶. رحمت عالم: مدرسوں اور اسکولوں کے چھوٹے بچوں کے لیے سیرت پر ایک مختصر جامع رسالہ۔ ۵

۷. خطبات مدراس: سیرت پر آٹھ خطبات کا مجموعہ جو مسلمانان مدراس کے سامنے دیے گئے تھے۔ ۱۱

۸. سیرت عائشہؓ: حضرت عائشہ صدیقہؓ کے حالات مناقب و فضائل۔ • ۱۹

۹. حیات شبلیؒ: مولانا شبلی کی بہت مفصل اور جامع سوانح عمری۔ • ۴۸

۱۰. ارض القرآن (۱): قرآن میں عرب اقوام و قبائل کا ذکر ہے ان کی تاریخی تحقیق۔ • ۱۸

۱۱. ارض القرآن (۲): [illegible] کا بیان۔ • ۱۳

۱۲. خیام: خیام کے سوانح و حالات اور اس کے فلسفیانہ رسائل کا تعارف۔ • ۳۳

۱۳. عربوں کی جہاز رانی: بمبئی کے خطبات کا مجموعہ۔ • ۱۲

۱۴. عرب و ہند کے تعلقات: ہندوستانی اکیڈمی کے تاریخی خطبات (طبع دوم عکسی) • ۳۰

۱۵. نقوش سلیمانی: سید صاحب کے منتخب مضامین کا مجموعہ، [illegible] • ۲۴

۱۶. یادرفتگان: ہر شعبۂ زندگی کے مشاہیر کے انتقال پر سید صاحب کے تاثرات۔ (زیر طبع) ....

۱۷. مقالات سلیمان اول: ہندوستان کی تاریخ کے مختلف پہلوؤں پر مضامین کا مجموعہ۔ • ۳۶

۱۸. مقالات سلیمان دوم: تحقیقی و ادبی مضامین کا مجموعہ۔ • ۲۳

۱۹. مقالات سلیمان سوم: مذہبی و قرآنی مضامین کا مجموعہ (بقیہ جلدیں زیر ترتیب ہیں) • ۲۳

۲۰. بریدِ فرنگ: سید صاحب کے یورپ کے خطوط کا مجموعہ

۲۱. دروس الادب حصہ اول و دوم: عربی کے ابتدائی طالب علموں کے لیے [illegible] ۲-۴

رجسٹرڈ نمبر اے۔ زیڈ۔ ایم۔ این۔ پی۔ ۱۶۰

نومبر ۱۹۸۶ء

معارف

مجلس دار المصنفین کا ماہوار علمی رسالہ

مرتبہ

سید صباح الدین عبد الرحمٰن

قیمت تیس روپیے سالانہ

دفتر دار المصنفین اعظم گڈھ

(پن ۲۷۶۰۰۱)

جلد ۱۳۶ ماہ صفر المظفر ۱۴۰۶ھ مطابق ماہ نومبر ۱۹۸۵ء عدد ۵

مضامین

مقالات

وفیات

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

شذرات

ترقی اردو بورڈ کراچی کی طرف سے اردو لغت (تاریخی اصول پر) کی پانچ جلدیں اس وقت پیش نظر ہیں، جو ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی کی عنایتوں سے دارالمصنفین کو بھیجی گئی ہیں۔

پاکستان میں ۱۹۵۸ء میں ترقی اردو بورڈ قائم ہوا، جس کی اور علمی سرگرمیوں کے ساتھ اس کے ذمہ یہ کام بھی سپرد کیا گیا تھا کہ آکسفورڈ ڈکشنری (کلاں) کے نمونے پر اردو کی ایک جامع لغت کی تدوین ہو، اس کے لیے مجلس اعلیٰ، مجلس انتظامی اور عملۂ ادارت قائم ہوئے، اس کی مجلس اعلیٰ کے صدر جناب ڈاکٹر ممتاز حسن مرحوم تھے، ارکان میں بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق مرحوم بھی تھے، اور اس کے مدیر اعلیٰ و معتمد ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی (صدر شعبۂ اردو، کراچی یونیورسٹی) ہوئے، اس کی مجلس انتظامی کے مدیر اعلیٰ ڈاکٹر مولوی عبدالحق مرحوم تھے، پاکستان کے تمام قابل ذکر دانشور اس کی تدوین میں شریک کیے گئے، اس کی پہلی جلد ۱۹۷۷ء میں شایع ہوئی، اس کے شروع میں جناب محمد ہادی حسن صدر ترقی اردو بورڈ کا تعارف ہے، پھر اردو لغات اور لغت نویسی کے عنوان سے ڈاکٹر مولوی عبدالحق مرحوم کی ایک تحریر ہے، اور اس کے بعد ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی کا ایک بہت ہی طویل، پرمغز اور سیر حاصل مقدمہ ہے، جس میں اردو زبان کے مختلف ادوار کی تاریخ بہت ہی امعان نظر کے ساتھ سمیٹ کر پیش کی گئی ہے۔

اس میں لغت نویسی کے یہ اصول رکھے گئے ہیں کہ زبان کا ہر لفظ، ترکیب اور محاورہ جو اس کا جزو ہے خواہ آج بولا جاتا ہے یا متروک ہو چکا ہے، یا زبان میں نیا نیا داخل ہوا ہے، خواہ وہ روزمرہ بول چال کا ہو یا کوئی علمی یا فنی اصطلاح ہو، اسے لغت میں شامل کرنا چاہیے، اصطلاحات کے معاملہ میں انتخاب کا کوئی خاص اصول نہ ہو، البتہ جدید علوم و فنون کی جو اصطلاحیں اب عام ہو چکی ہیں یا ہو رہی ہیں ان کو اس لغت میں شامل کرنا چاہیے، اسی طرح خاص مقامی الفاظ یا محاورے جو اردو میں شامل ہو گئے ہیں اور اردو کے معیاری اور مستند ادب یا بول چال میں آگئے ہیں یا آرہے ہیں، ان کو بھی اس لغت کا جزو ہونا چاہیے، اس کے بعد یہ شرط بھی رکھی گئی کہ ہر لفظ کے

متعلق یہ بتایا جائے کہ وہ کب، کس طرح اور کس شکل میں اردو زبان میں آیا، اور اس وقت سے تا حال اس کی شکل وصورت اور معانی میں کیا کیا تغیر ہوا؟ ۔

اسی کے ساتھ یہ بھی اصول رکھا گیا کہ ہر لفظ کے تحت اس میں عہد بہ عہد بدلی ہوئی صوتی یا معنوی تبدیلیوں کی بھی نشان دہی ہو، اس کے لیے قدیم وجدید مصنفین کے قلمی اور مطبوعہ ذخیرۂ تصنیف وتالیف سے مدد لی جائے، پھر ہر لفظ کی تشریح سندوں اور مثالوں سے ہو، مترادفات کا کوئی خاص وجود تسلیم نہ کیا جائے، کیونکہ بعض الفاظ میں معنی کے چند اجزا مشترک ہوتے ہیں، ورنہ ہر لفظ نہ صرف معنی کے اعتبار سے بلکہ محل استعمال اور سیاق وسباق کے اعتبار سے بھی منفرد ہوتا ہے، پھر اس کا بھی خیال ہو کہ اردو زبان کے لغات میں سنسکرت، پراکرت، عربی، ترکی، پرتگالی اور انگریزی وغیرہ کے علاوہ برصغیر کی آریائی زبانوں اور مقامی بولیوں کے جو الفاظ شامل ہیں، ان سب کی اصل کی تلاش دستیاب ہونے والے ماخذوں سے اچھی طرح ہو۔

ان ہی اصولوں کے ساتھ اس لغت کی تدوین جاری ہے، ایک مثال سے اس کی وضاحت ہوجائے گی۔

لفظ ادیب کے ساتھ بریکٹ میں پہلے فت (ا، ی مع لکھا گیا ہے، اس کے بعد صف ہے، اس سے مراد یہ ہے کہ الف پر فتحہ یعنی زبر ہے، ی معروف سمجھی جائے، اور پورا لفظ صف یعنی صفت قرار دیا جائے، پھر اس کے معنی علم ادب ولغت کا عالم، زبان دان، نظم ونثر اور ان کے متعلقات کا ماہر بتایا گیا، سند میں مومن کا یہ شعر پیش کیا گیا ہے ؎

مرے کلام سے ہیں گونہ گونہ فائدہ مند ادیب ونبض شناس ومنجم وفاضل

پھر نثر میں اردو کے ایک لازمی نصاب سے یہ جملہ نقل کیا گیا ہے: "ان کے والد اور دادا فارسی اور اردو کے بزرگ شاعر اور ادیب تھے" پھر اس لفظ کے یہ معنی بھی بتائے گئے ہیں: معلم، استاد، اتالیق، ادب اور تہذیب سکھانے والا، سند میں ایک شعر سودا کا اور دوسرا شعر ریاض البحر سے پیش کیا گیا ہے ؎

دیکھ کر تیور مرے طفلی میں کہتا تھا ادیب ایک دن مجنوں صفت یہ سر بصحرا ہوئے گا

انسان پر کھلے جو نصیحت کا راز نعمت   سمجھ کے کھائے طمانچہ ادیب کا

پھر نثر میں یہ جملہ درج کیا گیا ہے کہ "دادا بھائی کا رتبہ ایک ادیب کا ہے، جو ..... زبان دانان ملک کو بھی سبق دے سکتے ہیں"۔ پھر اس لفظ کے معنی انشا پرداز اور ادبی مضامین اور مقالے لکھنے والا، اور نثر نگار، بھی بتائے گئے ہیں، مثالیں نذیر کے لیکچروں کے مجموعے کے دیباچہ اور سیف و سبو کے مقدمہ سے دی گئی ہیں: "ضرور نہیں کہ جو بڑا منشی یا ادیب ہو وہ بڑا لیکچرار بھی ہو، یہ آج کل کا وہ مروج طرز نقد ہے جس میں ناقد ادیب و شاعر سے تقریباً بے نیاز ہو کر صرف اپنی جانب متوجہ رہتا ہے"۔

اس میں ساری کہاوتوں کی بھی تشریحات ہیں، اچھیا پچھیا، اچھن پچھن، اچلا چال، اچل بچل جانا، اچ کے بچے کرنا، اور ابرن سبرن، وغیرہ جیسے روزمرے کی بھی تصریحات کر دی گئی ہیں۔

ابارنا، ابارنی، اباریا، اباز پر، اباز پری، ابدح، ابدھوت، ابرنا، ابو جک اور اپارا وغیرہ بھی اردو کے الفاظ قرار دیے گئے ہیں انگریزی الفاظ میں اڈ ڈنٹ، اٹامیت، پرابلم، پراپرٹی، ایجوکیشن اور اٹروبین وغیرہ بھی اس لغت میں شامل کر لیے گئے ہیں، عربی الفاظ میں اتسار، اتساع، اتکار، اتہم، اثارت، امتحان، اجرات اور ابتلاع وغیرہ بھی اردو ہی کے سمجھے گئے ہیں اور ان کے لیے سندیں پیش کی گئی ہیں، اس طرح اردو کے الفاظ کی تعداد بہت بڑھ جاتی ہے۔

پہلی جلد الف مقصورہ سے شروع ہوئی تھی، پانچویں جلد ت مسلسل پر ختم ہوئی ہے، اب تک اس کے پانچ ہزار سات سو چوبیس (۵۷۲۴) صفحات ہو چکے ہیں، معلوم نہیں ابھی کتنی جلدیں اور ہوں گی، اور کتنے صفحات اور درکار ہوں گے، جس عرق ریزی، مستعدی اور تن دہی سے یہ عظیم الشان کارنامہ ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی کی نگرانی میں انجام پایا ہے، اگر وہ جہانگیری اور شاہجہانی دور میں ہوتے تو یقیناً سونے میں تلوا دیے جاتے، ترقی اردو بورڈ کی اس پیش کش کے بعد اردو زبان اب دنیا کی عظیم ترین زبانوں کی صف میں آجائے گی، اس کے لیے بورڈ ہر طرح کی مبارکباد کا مستحق ہے۔

مقالات

مسلمانوں کا ذخیرۂ علوم وفنون

اور

مستشرقین

از مولانا ابوالکلام آزاد

مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم نے رسالہ الندوہ اکتوبر ۱۹۰۵ء میں ایک مضمون لکھ کر مستشرقین کی خدمات کو سراہا ہے اس کو ہم ذیل میں نقل کرتے ہیں امید ہے کہ یہ تحریر دلچسپی سے پڑھی جائے گی،" ص ۔ ع"

"مسلمانوں کے لیے درحقیقت یہ بات سخت قابل شرم ہے، کہ جس میدان میں انھیں ہمت کا قدم رکھنا تھا، آج اغیار وہاں بازی لے گئے ہیں، عربی زبان نہ صرف مسلمانوں کی مذہبی زبان ہے، بلکہ مسلمانوں کی جان، روح، عنصر جو کچھ کہو عربی ہے، مسلمانوں کے تمام علوم وفنون اسی خزانہ میں محفوظ ہیں، لیکن کتنے افسوس کی بات ہے، کہ آج اس بے بہا خزانہ پر یورپ کا قبضہ ہے، اور مسلمان خالی ہاتھ اس کی اس جرأت کو تک رہے ہیں، درحقیقت مسلمانوں کی غفلت سے عربی کا تمام سرمایہ تباہ ہونے والا تھا، اگر یورپ اس کی حفاظت پر آمادہ نہ ہو جاتا، تاریخ وادب کی وہ بے بہا کتابیں جن کو الگ کر دینے کے بعد عربی کا

اور اس کے ساتھ مسلمانوں کا کشکول خالی ہو جاتا ہے، صرف یورپ کی سرپرستی سو آج
دنیا میں نظر آرہی ہیں، صرف یہی نہیں، کہ یہ سرمایہ یورپ کی بدولت بربادی سے
محفوظ رہا، اور بجائے ایک کرم خوردہ نسخہ کے دنیا میں ہزاروں نسخے پیدا ہو گئے، بلکہ
عربی زبان اور عربی علوم کے متعلق یورپ کی زبانوں میں جس قدر معلومات اور تحقیقات
کا ذخیرہ جمع ہو گیا ہے، ان کو ہمارے علماء کے دماغوں میں ایک لمحہ کے لیے بھی جگہ
نہ ملی ہوگی، عربی کی علم اللسان لغت، صرف، نحو، عروض، اور قوافی کے متعلق جیسیوں
کتابیں اس تحقیق اور جامعیت کے ساتھ لکھی گئی ہیں، کہ اگر اس کا نصف حصہ بھی
ہماری زبان میں آجائے، تو بیش بہا معلومات سے ہم مالا مال ہو جائیں۔

ڈاکٹر لائٹنر ہماری اس افسوسناک غفلت کو محسوس کرکے لکھتے ہیں، کہ
مسلمان ہیں تو بہت مگر وہ جانتے کیا ہیں، اگر آج عربی کی کوئی عمدہ تاریخ یا کوئی
عمدہ دیوان، درکار ہو، تو یورپ سے مانگنا پڑے گا، ابن خلدون، ابن رشد ابن بطوطہ
حاجی خلیفہ، ابن اثیر، اور مقریزی جو اسلام میں آسمان علم کے آفتاب ہیں، یہاں ان کو
کوئی جانتا بھی نہیں، تابط شرا، امراء القیس بحتری، اور ابو تمام کا دیوان کتنے آدمیوں نے
پڑھا ہوگا، یورپ میں صدہا آدمی یہ کتابیں پڑھتے ہیں، اور ترجمۂ قرآن تو لاکھوں،

ڈاکٹر لائٹنر کو تو صرف اس کا افسوس ہے، کہ اگر عربی کی کوئی عمدہ کتاب درکار ہو
تو مسلمانوں کو یورپ سے مانگنا پڑے لیکن ہمیں یہ افسوس ہے، کہ مسلمانوں کو یہ بھی نہیں
معلوم کہ یورپ نے عربی کی کون کون سی نایاب کتابیں چھاپی ہیں، اور انھیں چھاپ کر
ہم پر اور ہمارے علوم پر کتنا بڑا زبردست احسان کیا ہے، اس لیے ہم چاہتے ہیں کہ
اس مضمون کے ذریعہ علمائے اسلام کو یورپ کی ان خدمات سے واقف کریں۔

جن کی بدولت آج انھیں، اس امر کا موقع حاصل ہے، کہ اپنے علمی ذخیرہ سے فائدہ اٹھا رہے ہیں، اس مضمون کے دو حصے ہیں، پہلے حصہ میں یہ دکھلایا ہے، کہ یورپ کو عربی اور عربی علوم پر کب توجہ ہوئی، اور صرف و نحو، لغت و ادب کے متعلق کون کون سی قابل ذکر کتابیں یورپ کی زبانوں میں ترتیب دی گئیں، دوسرے حصہ میں ان کتابوں کی مفصل فہرست دی ہے، جو یورپ کی کوششوں سے چھپ کر شائع ہو گئیں

(ابوالکلام)

یورپ کو عربی اور عربی علوم کی طرف کب توجہ ہوئی، اور کیونکہ ہوئی، یہ بجائے خود ایک دلچسپ مضمون ہے، جس کے بیان کرنے کی یہاں نہ گنجائش ہے، اور نہ ضرورت، صرف اس قدر بتلانا، سلسلۂ مضمون کے لحاظ سے ضروری ہے، کہ عربی سے یورپ کب روشناس ہوا، اور کیونکر عربی علوم و فنون مشرق سے مغرب میں منتقل ہو گئے، دنیا کے حیرت انگیز واقعات میں غالباً یہ واقعہ بھی عجیب و غریب ہے، کہ یورپ کی شائستگی کی بنا ایک ایسی پولیٹکل خوں ریزی نے رکھی جو دنیا کا سب سے زیادہ نقصان کرنے والی جنگ تسلیم کی گئی ہے، گیارہویں صدی عیسوی میں جب مسلمان ترقی کے نہایت درجہ تک پہنچ چکے تھے، یورپ میں ہر طرف تاریکی تھی، لیکن صلیبی لڑائیوں نے یکایک یورپ کو موقع دیا، کہ مسلمانوں کی شائستگی کا مطالعہ کرے، بیت المقدس اور انطاکیہ میں جب رومی سلطنت قائم ہو گئی، اور مسلمانوں سے ملنے جلنے کے ذرائع وسعت کے ساتھ پیدا ہو گئے، تو یورپ کی آنکھیں کھلیں، اور مسلمانوں کی شائستگی کا اسے پہلا تجربہ ہوا، شام میں قسمت آزمائی کرنے کے بعد جب یورپ کے جانبازوں نے مغرب کا رخ کیا تو یہ اثر بھی اپنے ساتھ لے گئے، کہ مسلمان علمی و عملی ترقیات کے دنیا میں اکیلے مخزن ہیں، اور تہذیب و شائستگی کا سرچشمہ اسلامی دنیا کے سوا اور کہیں نہیں مل سکتا۔ اس اثر کا یہ نتیجہ ہوا کہ یورپ میں مسلمانوں کی ترقی اور شائستگی پر عام توجہ پیدا ہو گئی، اور یہ توجہ

برابر بڑھتی گئی، کیونکہ صلیبی حملوں کی بدولت بار بار یورپ کا اسلامی ممالک میں گذر ہوا، اور ہر مرتبہ مسلمانوں کی علمی ترقی کے حیرت انگیز آثار نظر آئے، اس لیے ایک طرف تو یورپ نے مسلمانوں کی تباہی کا بیڑہ اٹھایا، اور دوسری طرف اپنے حریف کی شاگردی پر آمادہ ہوگیا۔

اس ذکر میں ایک عجیب بات یہ ہے کہ چونکہ اس زمانہ میں یورپ میں عام تعلیم نہ تھی، اور لاطینی و یونانی زبانوں کی تعلیم پادریوں اور ارکین سلطنت کے لیے مخصوص تھی، اس لیے مغرب سے مشرق کی طرف جس گروہ کا علمی تلاش میں اوّل قدم اٹھا، وہ مذہبی پیشواؤں کا مقدس گروہ تھا، حیرت یہ ہے، کہ یہی گروہ آگے چل کر الحاد اور بے دینی کے پریشاں خواب دیکھنے لگا، اور اسلامی فلسفہ کی اشاعت اس کی تعبیر بتلائی گئی، حالانکہ ابتدا میں اشاعت کا ذریعہ بھی یہی نادان گروہ ہوا۔

گیارہویں صدی کے اوائل سے مسلمانوں کے علوم و فنون پر یورپ کو توجہ ہوئی، اور چودہویں صدی کے اواخر تک فلسفہ کی تمام کتابیں لاطینی زبان میں ترجمہ کی گئیں[1]، ابتدا میں متعدد محکمے قائم کیے گئے، کہ لاطینی داں یہودیوں کی مدد سے فلسفہ کی کتابیں ترجمہ کیجائیں، پھر پوپ الکزنڈس پنجم کے حکم سے عربی اور دیگر مشرقی زبانوں کی تحصیل کے لیے یورپ سے نوجوان طلبہ اندلس روانہ کیے گئے[2]، اندلس میں چونکہ خود عیسائی اور یہودی فلسفہ میں مسلمانوں کے شاگرد رشید تھے، اس لیے یورپ کے طلبہ ان کی اعانت سے فائدہ اٹھا کر بہت جلد عربی اور عبرانی میں قابلیت حاصل کر لیتے، اور فارغ التحصیل ہو کر علمی کتابوں کے ترجموں میں مشغول ہو جاتے[3]، جن لوگوں نے یورپ کے مختلف حصوں سے اندلس کا سفر کیا، اور عربی زبان سے واقفیت پیدا کر کے علمی تراجم میں مشغول ہوئے ان کے نام آج تاریخ کے صفحات پر موجود ہیں، ان میں بہت سے طالب علم ایسے ہیں، جنھوں نے طلب علم میں حب الوطنی کے تقید سے خود کو ہمیشہ کے لیے آزاد کر لیا، اور ساری عمر طلیطلہ کے پرائیویٹ

---

[1] سیاحۃ المعارف ص ۲۹۰ [2] ایضاً ص ۲۹۰ و ۳۲۱ [3] ایضاً ص ۲۹۰ و ۳۲۱

مدرسوں اور قرطبہ کے دارالعلوموں میں صرف کر دی، کچھ طالب علم ایسے ہیں، جو فارغ التحصیل ہونے کے بعد مشرق کے ممتاز ملکوں کی خاک چھانتے پھرے، اور ایک عرصہ کی تلاش و تحقیق کے بعد جب سرزمین مغرب میں قدم رکھا، تو اسلامی علوم و فنون کی معلومات سے ان کا کاسۂ دماغ لبریز تھا۔

ہارڈمن کریمون اس زمانہ کا مشہور طبیب اور ہیئت داں ہے، یہ اپنے وطن اٹلی سے نکل کر محض عربی کے شوق میں طلیطلہ پہنچا، اور ایک عرصہ کی اقامت کے بعد جب کافی واقفیت حاصل کرلی تو ستر کتابوں کا عربی سے لاطینی میں ترجمہ کیا۔

پیٹرز مارمٹ ایک فرانسیسی راہب تھا، جس کو جغرافیہ کا شوق دامن گیر ہوا، اسی شوق میں اندلس کا سفر کیا، افریقہ کی خاک چھانی، اور مدت کی آوارگردی کے بعد مسلمانوں سے اس علم کو حاصل کیا۔

ڈنیل مارلی اور پیٹرز ماکر نے اسی طرح اندلس کا سفر کرکے عربی زبان سے واقفیت پیدا کی، آخر الذکر نے قرآن شریف کا لاطینی ترجمہ بھی کیا، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سوانح عمری بھی لاطینی میں ترتیب دی[1]، ان کے علاوہ اور بہت سے لوگوں کے نام تاریخ میں پائے جاتے ہیں، جن میں سے بعض کے ترجمے اور تصنیفات اس وقت تک یورپ میں موجود ہیں[2]، ان کوششوں نے یورپ کو مسلمانوں اور مسلمانوں کے علوم سے واقف کر دیا اور اسلامی فلسفہ نے عام طور پر مقبولیت حاصل کرلی۔

لیکن چونکہ یورپ میں اس وقت تک عربی زبان کی کوئی باضابطہ درسگاہ نہ تھی، اس لیے عربی زبان سے وہی خوش قسمت اشخاص واقفیت حاصل کرسکتے تھے، جن میں مشرقی ممالک کے سفر اور وہاں کے کثیر اخراجات اور دقتوں کے متحمل ہونے کی طاقت تھی لیکن سولہویں صدی سے عربی زبان کی باضابطہ تعلیم خود یورپ میں شروع ہوگئی، ۱۶۲۲ء میں پندرہویں گریگوری

---

[1] سیاحۃ المعارف ص ۳۰۰ [2] انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا۔

پوپ نے روم میں ایک انجمن قائم کی، جس کا مقصد اگرچہ مسیحی عقائد کی اشاعت تھا، مگر اس کے قیام سے بہت بڑا ضمنی فائدہ یہ ہوا، کہ عربی زبان کی تعلیم پر یورپ کو توجہ ہوگئی، اس کے بعد ہی ۱۶۲۶ء میں خاص پوپ اربانس کے حکم سے اس انجمن کے متعلق مشرقی زبانوں کا ایک مدرسہ قائم کیا گیا، تاکہ نوجوان پادری مشرقی زبانوں کی تعلیم پاکر اشاعت مذہب کی غرض سے باہر جاسکیں، اس مدرسہ میں خاص طور پر عربی و سریانی زبانوں کے پروفیسر مشرقی ممالک سے بلوا کر مقرر کیے گئے تھے، عربی کتابیں پہلے پہل دنیا میں اسی مدرسہ کی بدولت چھپ کر شائع ہوئیں، تعلیم کے لیے ضرورت ہوئی کہ صرف ونحو اور ادب کی کتابیں بکثرت مہیا ہوں، اس لیے چند رسالے خود پروفیسروں نے لکھے، اور کچھ کتابیں قدیم زمانہ کی لکھی ہوئی دستیاب کیں، اور انھیں اہتمام سے طبع کرا کر شائع کیا،

صرف ونحو عربی کی کتابیں جو یورپ میں لکھی گئیں

اس انجمن نے عربی کے لیے جو کچھ کیا، وہ درحقیقت ایک مذہبی کام تھا لیکن اسی زمانہ میں کچھ لوگ ایسے پیدا ہوگئے، جنھوں نے محض ذاتی کوشش اور مذاق سے عربی زبان میں قابلیت بہم پہنچائی، اور پھر صرف ونحو اور ادب ولغت کی کتابیں لکھ کر یورپ میں اس مذاق کو عام کیا، ان لوگوں میں پہلا شخص آر پی نیو نامی ایک عالم ہے، جو ہالینڈ کا باشندہ تھا، مشرقی زبانوں کے شوق میں وطن سے نکل کر دور دراز ملکوں کی سیاحت کی، اور متعدد زبانوں کو حاصل کرکے ۱۶۱۳ء میں ہالینڈ واپس آیا، ہالینڈ میں چونکہ اس کی قابلیت کی شہرت پیشتر ہی ہوچکی تھی، اس لیے ہالینڈ پہنچتے ہی لیڈن یونیورسٹی کا پروفیسر ہوگیا، اس کی زندگی کا بڑا کارنامہ یہ ہے کہ ہالینڈ کے مدرسوں میں عربی زبان کی تعلیم داخل ہوگئی، اور صرف ونحو عربی میں سب سے پہلے ایک رسالہ ترتیب دیا۔[1]

آر، پی، نیو کے بعد لافن دارنر نامی ایک شخص نے عربی کی طرف خاص توجہ کی، یہ عالم ۱۶۱۹ء میں

---

[1] سال ولادت ۱۵۸۴ء، اور وفات ۱۶۲۴ء ہے، صرف ونحو کے علاوہ اور تصنیفات حسب ذیل ہیں عربی تعلیم کا ابتدائی رسالہ، عربی اور عبرانی کا باہمی تعلق، عہد جدید کا عربی میں ترجمہ، چند کتابوں کا عربی سے لاطینی میں بھی ترجمہ کیا لیکن ان کا تفصیلی حال معلوم نہیں۔

پیدا ہوا، اور ۱۶۶۵ء میں وفات پائی، ۱۶۲۲ء میں مشرقی ممالک کا سفر کر کے عربی کی نادر کتابیں جمع کیں، اور لیڈن یونیورسٹی کے کتب خانہ میں داخل کر دیں۔

سترہویں صدی کے اواخر تک اسی طرح خاص خاص لوگوں کی کوشش سے عربی لٹریچر کا مذاق ترقی کرتا رہا لیکن اٹھارہویں صدی کے اوائل سے یورپ میں عربی کا دوسرا دور شروع ہوا جس نے موجودہ زمانے کی عظیم الشان توجہ کی بنیاد رکھی، اس دور کا افتتاح ایک فرانسیسی عالم پروفیسر سل وسٹر کی تصنیفات سے ہوا، جو نہ صرف عربی کا ماہر تھا، بلکہ مشرق کی دیگر مشہور زبانوں میں بھی کافی مہارت رکھتا تھا، علاوہ اور تصنیفات کے اس کی ایک قابل قدر تصنیف عربی کی مبسوط صرف ونحو ہے، جس کی دو ضخیم جلدیں ۱۸۱۰ء میں چھپ کر شائع ہوئیں، اس کتاب میں مصنف نے ایک مفید التزام یہ کیا ہے، کہ جن جن صرفی ونحوی مسائل کو لکھا ہے، ان کے متعلق بطور شواہد کے عربی اشعار بھی پیش کر دیے ہیں۔[۱]

---

[۱] اس کا پورا نام ان توان آیزک سیل وسٹر دے ساسی ہے بچپن میں صحت کی حالت اچھی نہ تھی، اس لیے ابتدائی تعلیم ایک پرائیویٹ استاد سے حاصل کی، باوجود اسکے ذہن اس قدر تیز تھا، کہ کم عمری ہی میں یونانی اور لاطینی میں کافی لیاقت پیدا کر لی، بارہ برس کی عمر میں ایک فاضل راہب کی ملاقات ہوئی، جس کا نام لے، فی، ڈیگ، باین تھا اس راہب کی صحبت سے مشرقی زبانوں کا شوق پیدا ہوا، اور دس برس کی محنت اور مطالعہ سے مشرق کی سات مشہور زبانوں میں غیر معمولی قابلیت حاصل کر لی، ۱۷۸۰ء میں جبکہ اسکی عمر صرف ۲۰ برس کی تھی، انجیل کے بعض قیمتی مسائل کا پتہ لگایا اور ۱۷۸۵ء میں اکاڈیمی آف انسکرپشن (یعنی قدیم کتبہ جات کی انجمن) کو دو قابل قدر یادگاریں نذر دیں، ان دو کارناموں نے اسکی شہرت دور دور تک پہنچا دی یورپ کی تمام علمی انجمنیں اسکی قدر دانی کے لیے آمادہ ہو گئیں، یہ وہ زمانہ تھا کہ فرانس میں ہر طرف پولیٹیکل بے چینی پیدا ہو گئی تھی، اور عنقریب بغاوت کی آگ مشتعل ہونے والی تھی، ۱۷۸۹ء میں یکایک یہ آگ بھڑک اٹھی، اور فرانس میں انقلاب ہو گیا اس بداطمینانی کے زمانہ میں وہ مشرقی لٹریچر کی بعض اہم تحقیقات میں مشغول تھا، کچھ عرصہ کی خونریزی (بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۳۲)

اس دور میں چند اسباب ایسے جمع ہو گئے، جن سے عربی پر یورپ کو غیر معمولی توجہ ہو گئی، منجملہ ان کے ایک بڑا سبب انگریزوں کا ہندوستان پر تسلط ہے اگرچہ پہلا تا ان ہند کا یہ زمانہ انحطاط تھا، مگر پھر بھی عربی تعلیم کا مذاق عام طور پر موجود تھا، یہانتک کہ لکھنؤ اور دہلی کے جو علماء آج زیادہ مشہور ہیں، وہ اسی آخری دور کی یادگار ہیں، اس لیے انگریزوں کو بھی عربی پر توجہ ہوئی، اس توجہ سے جو مفید نتائج پیدا ہوئے، ان میں ایشیاٹک سوسائٹی

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۳۱) کے بعد جب دوبارہ بادشاہت قائم ہوئی، تو گورنمنٹ کی طرف سے اس کی خاص طور پر قدردانی کی گئی، اور جنیوا بھیجا گیا، تاکہ ان مشرقی نسخوں کا مطالعہ کرے، جو اس شہر میں محفوظ تھے ۱۸۰۶ء میں جنیوا سے واپس آیا، اور اپنی تحقیقات کی رپورٹ اکاڈمی میں پیش کی۔ پھر ۱۸۰۶ء میں فارسی لٹریچر کا پروفیسر مقرر کیا گیا، اور نپولین اول شاہ فرانس نے بیرن کے عہدہ پر سرفراز کیا، اس عرصہ میں فرانس کی پولیٹیکل حالت میں دوبارہ انقلاب شروع ہوا، اور ۱۸۱۱ء میں بادشاہت کا خاتمہ ہو کر نئے سرے سے بوربون قائم ہوئی، اس زمانہ سے دے ساسی کی نئی زندگی شروع ہوتی ہے، اول سررشتہ تعلیم کی کونسل کا ممبر مقرر کیا گیا، پھر ایشیاٹک سوسائٹی پیرس کا پریزیڈنٹ منتخب ہوا، یہ ایک ایسی علمی جماعت تھی، جس کی بالذات بھی وہ بہت کچھ مدد کیا کرتا تھا، دی فلپ کے عہد میں شاہی توجہ پھر مبذول ہو گئی، اور شاہی کتب خانہ کے مشرقی حصہ کا محافظ اور اکاڈمی آف انس کرپشن کا لائف سکریٹری مقرر کیا گیا، اسی ممتاز محقق نے منجملہ دیگر کتابوں کے عربی صرف و نحو پر ایک ضخیم کتاب لکھی جو پندرہ سال کی مسلسل محنت کا نتیجہ ہے، اس کی زندگی کا ایک بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اسی کی کوششوں سے پیرس میں، دو سنسکرت اور چینی زبانوں کے پروفیسر مقرر ہوئے، اور اسی کی تجویز و ہدایت سے روس اور جرمنی میں مشرقی زبانوں کی تعلیم شروع ہوئی، سال ولادت ۱۷۵۸ء اور سال وفات ۱۸۳۸ء، صرف و نحو کے علاوہ دیگر تصنیفات حسب ذیل ہیں، تذکرہ شعرائے عجم، اصول عامۂ صرف و نحو، اس میں مختلف مصنفین عرب کے کلام نظم و نثر کا انتخاب ہے،

بنگال اور بمبئی کا نام خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہے، لیکن اس کا مفصل بیان آگے آئے گا۔ یہاں اس قدر لکھ دینا کافی ہے، کہ انگریز بھی فرانسیسیوں کے ساتھ اس دوڑ میں برابر کے شریک ہے مشہور انگریزی عالم لمسڈن[1] نے کلکتہ میں چند مولویوں کی مدد سے ایک خود کتاب صرف ونحو پر لکھ کر ۱۸۱۳ء میں شائع کی، اسی طرح کلکتہ میں دو اور رسالے اسی زمانہ کے قریب قریب شائع ہوئے، جن میں سے ایک رسالہ میں عربی کی چھوٹی بڑی حکایتیں جمع کی تھیں، اور دوسرے رسالہ میں الف لیلہ کے تیسرے حصہ کا انتخاب اور ترجمہ تھا[2]، اس دور میں صرف ونحو کی تین کتابیں اور قابل ذکر لکھی گئیں۔

۱۔ علامہ ای والڈ جرمنی کی صرف ونحو عربی، ۱۸۳۱ء سے ۱۸۳۳ء تک چھپ کر لیپزگ سے شائع ہوئی۔

۲۔ علامہ کاسپری کی صرف ونحو پہلی مرتبہ ۱۸۴۸ء میں چھپ کر لیپزگ سے شائع ہوئی، پھر علامہ گسٹس نے ترمیم وتہذیب کے بعد ۱۸۵۲ء میں دوبارہ شائع کیا، یہ کتاب اس قدر مقبول ہوئی، کہ ۱۸۸۷ء تک اس کے پانچ اڈیشن نکل چکے تھے۔

۳۔ پھر ۱۸۵۹ء میں ایک انگریز عالم رایٹ نے کاسپری کی صرف ونحو کو چند مطالب بڑھا کر انگریزی ترجمہ کے ساتھ دو جلدوں میں مرتب کیا، جو لنڈن میں چھپ کر شائع ہوئی۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۳۲) ایک عربی قصہ کا ترجمہ، قدامت فارس، مذہب دروز کے حالات، یہ آخری تصنیف ہے، اس میں شام کے ایک پُر اسرار مذہب کے حالات درج کیے ہیں، انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا اورینٹل۔

[1] اس کا پورا نام لمسڈن میتھیو ایل، ایل، ڈی ہے، فورٹ ولیم کالج کلکتہ کا عربی اور فارسی کا پروفیسر تھا، عربی کے علاوہ فارسی میں بھی اس کی ایک صرف ونحو موجود ہے، ۱۸۳۰ء میں ایسٹ انڈیا کی ملازمت ترک کرکے انگلستان گیا اور علمی مشاغل میں مصروف رہا، ولادت ۱۷۷۷ء وفات ۱۸۳۵ء۔ [2] وقائع ولیم ناسولیس، مصنفہ مولوی کبیر الدین احمد مرحوم کا دیباچہ۔

یورپ کے علماء نے جب عربی زبان پر توجہ کی، تو ان کو صرف و نحو کی ایسی کتابوں کی تلاش ہوئی، جو ان کے لیے مفید ہوں، جب ایسی کتابیں نہیں ملیں، تو خود انھوں نے کوشش کر کے کتابیں تصنیف کیں، اور آنے والے زمانہ کے لیے عربی زبان کی تعلیم کا سامان مہیا کیا، اس دور میں جتنی کتابیں لکھی گئیں، وہ اسی کوشش پر مبنی ہیں۔

لیکن بڑا احسان جو یورپ نے عربی زبان پر کیا، وہ ان محققانہ لغتوں کی ترتیب ہے، جن کی نظیر عربی میں نہیں مل سکتی؛

یورپ نے عربی کے جو لغت ترتیب دیے، ان میں سب سے پہلا لغت جو یورپ میں شائع ہوا جیجیوس نامی ایک فاضل مستشرق کی تصنیف ہے، جو اٹلی کا رہنے والا تھا، پھر علامہ جولیس نے اس کی تقلید کی، اور سنہ ۱۶۵۳ء میں اپنا عربی لغت لیڈن سے شائع کیا، یہ دونوں لغت چونکہ صرف عربی کے تھے، اس لیے علامہ مانینس نے دو نہایت ضخیم جلدوں میں مشرق کی تین مشہور زبانوں عربی، فارسی، ترکی کا ایک جامع لغت تیار کیا، اور ہر لفظ کا مطلب لاطینی اور جرمن دونوں زبانوں میں درج کیا، اس لغت کا نام کنز اللغات اشرفیہ ہے، سنہ ۱۶۸۰ء میں وائنا دار السلطنت آسٹریا سے چھپ کر شائع ہوا۔

اس کے بعد علامہ فرائیتگ نے چار جلدوں میں اور کازی مرسکی نے فرنچ میں اور بادجیہ اور لین نے انگریزی میں چار لغت تیار کیے، جو سنہ ۱۸۳۰ء سے سنہ ۱۸۸۱ء تک چھپ کر شائع ہوئے، ان میں پہلا لغت یورپ میں زیادہ مشہور اور متداول ہے۔

ان سات لغتوں میں چھ لغت عربی کے عام لغتوں کی طرح ہیں، جن میں کوئی خاص تحقیق یا جامعیت نہیں پائی جاتی، لیکن ساتواں لغت علامہ لین کا اس لحاظ سے قابل تعریف ہے، کہ اس مصنف نے نہایت کوشش سے عربی کے تمام قاموس جمع کیے، اور انگریزی میں ایک جامع لغت تیار کیا۔

لیکن جس بے نظیر لغت نے عربی کو ہمیشہ کے لیے اپنا مرہون منت بنالیا، وہ مشہور فرانسیسی مستشرق پروفیسر دوزی کا قاموس ہے، یعنی اضافہ لغت عربی پر، شمس العلماء مولانا شبلی نعمانی کے کتبخانہ میں یہ لغت میری نظر سے گذرا۔ دو ضخیم جلدوں میں وہ تمام الفاظ اور مصطلحات جمع کیے ہیں جو عربی کے کسی لغت میں نہیں ملتے۔ کامل پچاس برس کی محنت اور تلاش سے یہ بے نظیر لغت طیار ہوا، تاریخ و ادب اور علوم و فنون کی سیکڑوں کتابیں چھان ڈالیں، اور جہاں کہیں اس قسم کے الفاظ ملے، جمع کر لیے، پھر سیکڑوں کتابوں کی ورق گردانی کر کے نہایت کوشش سے ان کا سراغ لگایا، اور تحقیق و تنقید کے بعد جو مفہوم ثابت ہوا، اسے لفظ بہ لفظ درج کیا، پہلی جلد کی ابتدا میں ان کتابوں کی فہرست دی ہے، جن سے اس لغت کی ترتیب میں مدد لی گئی، اس کے دیکھنے سے اس محقق کی تلاش و تحقیق کا سرسری اندازہ ہوسکتا ہے، کہ کون کون سی نایاب کتابیں جمع کیں، اور کس طرح ان سے مبہم اور مشکوک الفاظ کا پتہ لگایا۔

مسلمانوں نے جب اسپین فتح کر کے ایک متمدن سلطنت کی بنا ڈالی تو آٹھ سو برس کے اثر نے اسپین کی ملکی زبان میں عربی کے سیکڑوں لفظ داخل کر دئے، یہ الفاظ آج بھی اسپینی زبان میں موجود ہیں، مگر اختلاف لب و لہجہ نے ان کی صورت اس طرح بدل دی ہے کہ ان کا سراغ لگانا آسان نہیں ہے پروفیسر دوزی نے مدت کی محنت سے ایک لغت تیار کیا ہے جس میں عربی کے وہ تمام الفاظ جمع کیے ہیں، اور دکھلایا ہے، کہ ان لفظوں نے موجودہ صورت کیوں کر اختیار کی، اور عربی میں ان کی اصلی صورت کیا تھی۔

افسوس ہے کہ یہ دونوں بے نظیر لغت فرنچ میں ہیں، اور ہم براہ راست ان سے فائدہ نہیں اٹھا سکتے۔

ادب عربی کے منتخبات ان کتابوں کے علاوہ ایک اور چیز قابل ذکر ہے، یورپ نے عربی علم و ادب کے

نہایت مفید منتخبات ترتیب دئے ہیں، اور ان منتخبات میں ادب کی بعض اون کتابوں کا انتخاب ہے، جو اس وقت تک چھپ کر شائع نہیں ہوئیں، اور یورپ کے خاص خاص کتب خانوں میں محفوظ ہیں، ان میں سے بعض منتخبات میں عربی کی قدیم شاعری کے نمونے دیے ہیں، بعض میں ضرب الامثال اور عرب کی اصطلاحات جمع کی ہیں، اس قسم کی چودہ کتابوں کے نام اس وقت ہمارے پیش نظر ہیں، جن میں سے دو کتابیں بیروت میں اور باقی لندن، برلن، اور پیرس وغیرہ میں چھپی ہیں۔

<u>لغت دارجہ کی صرف و نحو</u> آج کل جو عربی عام طور پر نجد کے علاوہ تمام عرب میں مستعمل ہے اس کو لغت دارجہ کہتے ہیں، یورپ نے دارجہ کے بھی صرف و نحو لکھے ہیں، اور نہایت اہتمام سے لکھے ہیں۔

سب سے پہلے کانس نامی مستشرق نے ۱۸۷۵ء میں دارجہ کی صرف و نحو لکھی، اور اسپین میں چھپ کر شائع ہوئی، پھر دو جبے نے لکھ کر دمشق سے شائع کی، اسی طرح ۱۸۹۰ء تک بارہ کتابیں شائع ہو چکی ہیں، جن میں صرف ایک کتاب مصر کے ایک مسلمان عالم کی تصنیف ہے، جو غالباً یورپ ہی کی تحریک سے لکھی گئی۔

<u>لغت دارجہ کے مجموعۂ امثال</u> صرف و نحو کے علاوہ لغت دارجہ کی ان ضرب المثلوں کو بھی جو عام زبانوں پر چڑھی ہوئی ہیں، یورپ کے بعض عالموں نے نہایت کوشش سے جمع کیا ہے اور عرب کے مختلف حصوں کے مجموعے الگ الگ ترتیب دیے ہیں، مثلاً علامہ لینڈبرگ نے خاص شام کی ضرب المثلیں جمع کی ہیں، یا جو نے صرف مکہ معظمہ کے امثال ترتیب دیے ہیں، ان مجموعوں کے علاوہ سوسین نامی ایک مصنف نے ایک جامع مجموعۂ امثال ترتیب دیا ہے، جس میں عام طور پر دارجہ کے تمام امثال اور حکیمانہ مقولے جمع کیے ہیں۔

امثال کے علاوہ جو قصے اور چھوٹی چھوٹی حکایتیں عرب کے مختلف حصوں میں مشہور ہیں، اور جن سے ان کے اخلاق و عادات اور معاشرت کا پتہ چل سکتا ہے، جرمنی کے چند مستشرقوں نے ان کو بھی نہایت تلاش سے جمع کیا ہے، اس قسم کی تین کتابیں زیادہ مشہور ہیں۔

۱۔ سوسین کا مجموعۂ حکایات جس میں موصل اور ماردین کی حکایتیں جمع کی ہیں، یہ رسالہ دو مضمون کی صورت میں جرمنی کے ایک اخبار میں شائع ہوا

۲۔ سوسین ہی کا ایک مجموعہ جو [illegible] میں لندن سے چھپ کر شائع ہوا، ۳۔ لینڈبرگ کا مجموعہ جو [illegible] میں شائع ہوا۔

مولانا سید سلیمان ندویؒ کے علمی کارناموں پر ایک نظر

از

پروفیسر خلیق احمد نظامی

کہتے ہیں معاصرت ایک حجاب ہے، جہاں نظارہ بھی نقاب کا کام کرتا ہے، اور شخصیت کتنی ہی دلکش اور عظیم کیوں نہ ہو، اس کے حقیقی خد و خال اور اس کی فکر کے دور رس اثرات معاصرین کی نگاہوں سے اوجھل ہی رہتے ہیں، لیکن بعض اوقات کسی شاعر کی حساس روح اس "روبند عصر" کو چاک کر دینے میں کامیاب ہو جاتی ہے، اور معاصر شخصیت کو اس کی پوری عظمت و شان میں دیکھ لیتی ہے، حضرت شاہ ولی اللہؒ کی عظمت کا احساس سب سے پہلے حضرت مرزا مظہر جان جاناںؒ کو ہوا، آنے والی نسلوں نے جو کچھ دیکھا، مرزا صاحبؒ کے حساس دل نے پہلے ہی اس کی جھلک دیکھ لی تھی، مولانا سید سلیمان ندویؒ کے علمی تبحر اور ان کے کارناموں کے عظیم الشان اثرات کا مشاہدہ سب سے پہلے علامہ محمد اقبالؒ کی چشم جہاں بین نے کیا، اور وہ بے اختیار پکار اٹھے:

"علوم اسلامیہ کی جوئے شیر کا فرہاد آج ہندوستان میں سوائے سید سلیمان ندویؒ کے اور کون ہے؟"

سید صاحبؒ کے علمی کارناموں کی قدر اور ان کی شخصیت کا احترام تو معاصرین کے دل میں پہلے سے تھا، لیکن کسی نے نہ ان کی صدائے تیشہ سنی تھی، نہ ان کی جوئے شیر کو کسی نے دیکھا تھا، علامہ محمد اقبالؒ کی آواز نے ایک دم سے چونکا دیا، اور معاصرت کے حجاب گرنے شروع ہو گئے، اور ایسا محسوس ہوا کہ ؎

یک چراغیست دریں خانہ کہ از پرتو آں   ہر کجا می نگری انجمنے ساختہ اند

سید صاحبؒ ۱۸۸۴ء میں پیدا ہوئے تھے، ۱۹۵۳ء میں انھوں نے داعی اجل کو لبیک کہا، اس مدت میں ہندوستان کے سیاسی حالات نے کیا کیا رنگ بدلے، اور وقت کا قافلہ کن کن نازک منزلوں سے گذرا، لیکن "تیشۂ فرہاد" کبھی ان کے ہاتھ سے نہ چھوٹا، اور اپنی زندگی کا جو مقصد پہلے دن قرار دیا تھا، اس پر آخر تک جمے رہے، بلکہ اس میں وقت کے ساتھ ساتھ زیادہ چمک اور تابناکی پیدا ہوتی رہی اور ستر سال بعد جب جان جان آفریں کے سپرد کرنے کا وقت آیا تو ان کی تصانیف کے ہزاروں صفحات ان کے عزم کو کن کو خراج تحسین ادا کر رہے تھے، اور ان کی روح زبان حال سے خسرو کا یہ شعر پڑھ رہی تھی ؎

ساختہ ام ایں ہمہ لعل و گہر　　　ز خوئے پیشانی و خون جگر

کتنے ہی بنجر اور غیر ذی زرع میدان تھے، جو ان کی جد و سعی سے "غزالانِ فکر کا مرغزار" بن چکے تھے، اور کتنی ہی گذرگاہیں تھیں جہاں ان کی دوربینی نے روشنی کے مینار سے کھڑے کر دیے تھے، جو اعلان کر رہے تھے ؎

علم را بر تن زنی مارے بود　　　علم را بر دل زنی یارے بود

مولانا سید سلیمان ندویؒ کی ذات مجسم علم تھی، ایسا علم جو پاکیٔ عقل و خرد کا امین اور عفت قلب و نگاہ کا پاسبان ہوتا ہے، انھوں نے اپنے شاگردوں اور رفقار کی ایک ایسی جماعت تیار کر دی جس نے خدمت علم کے جذبے سے سرشار ہو کر اپنی زندگیاں اس کام میں صرف کر دیں، اور ان کے دامن کمال میں بعض بہترین دماغوں نے پرورش پائی، ہندوستان میں علوم اسلامیہ کی نشأۃ ثانیہ میں ان کے شاگردوں کا کام کوئی دیانت دار مورخ بھلا نہ سکے گا، کسی عالم اور استاذ کے لیے اس سے بڑھ کر کوئی چیز باعث فخر و مسرت نہیں ہو سکتی کہ اس کے شاگرد اس کی جلائی ہوئی شمع سے تاریک گذرگاہوں کو اس طرح روشن کر دیں کہ اس کا نام زمان اور مکان کی قیود سے بے نیاز ہو جائے۔

مولانا سید سلیمان ندویؒ نے اپنا علمی سفر اس منزل سے شروع کیا جہاں مولانا شبلیؒ نے اپنا رخت سفر کھولا تھا، وہ "چندے مقیم آستان غیر" رہ کر آستانۂ نبوت پر پہونچے تھے، مولانا سید سلیمان ندویؒ نے اپنے کام کا آغاز

ہی وہاں سے گیا، شفیق استاد نے اپنی علمی زندگی کا حاصل ان کے سپرد کیا، اور اس کام کی تکمیل کی ہدایت کی جس کے متعلق خود کبھی کہا تھا ؎

فرشتوں میں یہ چرچا تھا کہ حالِ سرورِ عالمؐ		دبیرِ چرخ لکھتا یا کہ خود روح الامیں لکھتے
صدا یہ بارگاہِ عالمِ قدوس سے آئی		کہ یہ ہے اور ہی کچھ چیز لکھتے تو ہمیں لکھتے

کس قدر مشکل تھا یہ کام اور کتنی بڑی تھی یہ ذمہ داری جو ان پر ڈالی گئی تھی، لیکن ان کے بے پناہ خلوص، غیر معمولی جذبۂ مشقت اور مقصد کی سچی لگن نے اس بارِ امانت کو اس طرح اٹھالیا کہ دیکھنے والے حیرت میں رہ گئے، استاد کی تمنا پوری ہوئی، اور انھوں نے سیرۃ کو قرآن کی روشنی میں اس طرح پیش کیا کہ عالمِ قدس کی بانگِ قلم اس میں سنائی دینے لگی، علامہ محمد اقبالؒ نے سچ کہا ہے ؎

بے محنتِ پیہم کوئی جوہر نہیں کھلتا		روشن شررِ تیشہ سے ہے خانۂ فرہاد

مولانا سید سلیمان ندویؒ کی علمی سرگرمیوں کا مرکز و محور ہمیشہ ذاتِ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم رہی، اپنے شیخ کو ایک بار انھوں نے لکھا تھا کہ سیرۃ نبویؐ میں مصروفیت نے ذاتِ نبویؐ سے ایک جذبۂ محبت پیدا کردیا ہے، یہ جذبۂ محبت ان کی تصانیف میں خونِ زندگی کی طرح دوڑتا نظر آتا ہے، اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان کی تصانیف نے اسی سے آب و رنگ حاصل کیا ہے، ارض القرآن، سیرۃ النبیؐ کا مقدمہ، سیرۃ عائشہؓ، اس کا تتمہ، عربوں کی جہاز رانی، صاحبِ سیرت کی تعلیم کے اثر و نفوذ کو سمجھنے کی کوشش، عرب و ہند کے تعلقات دیارِ رسولؐ سے اپنا رشتہ جوڑنے کا جذبہ، سیرت امام مالکؒ، روحِ حجازی سے قریب پہونچنے کی بے چینی، ہر کام میں عشقِ رسولؐ پکارتا سنائی دیتا ہے کہ حظر بہ مصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست۔

بیسویں صدی کے نصف اول میں علماء و فضلاء کی کمی نہ تھی، شاید ہی کوئی فن ہو جس کے مشاہیر موجود نہ ہوں تفسیر، حدیث، فقہ، کلام، تاریخ، ہر فن کے مشہور استاد یہاں موجود تھے، لیکن سیرۃ النبیؐ کو اپنی زندگی کا مقصد بنانے کی سعادت مولانا سید سلیمان ندویؒ ہی کے لیے مقدر تھی، انھوں نے جو بھی علوم حاصل کیے تھے، انھیں اس

کام میں صرف کر دیا، وہ بجا طور پر کہہ سکتے تھے ؎

طلال عالمیاں دم بہ دم دگرگون ست   منم کہ مدت عمرم بیک ملال گذشت

سید صاحبؒ کا سب سے پہلا مقالہ جو مدینہ کی "انجمن الاصلاح" میں پڑھا گیا تھا، "علم اور اسلام" پر تھا، (بعد کو یہ مضمون علی گڑھ منتھلی میں شائع ہوا) ان کا سب سے پہلا مضمون "وقت" پر تھا، جو لاہور کے رسالہ "مخزن" میں چھپا تھا، یہ سب اتفاقات سے زیادہ فطرت کے خاموش اشارے تھے کہ ان کی جدوجہد کا محور اسلام، قلم اور وقت کے تقاضوں کی تشخیص ہوگا، انھوں نے اپنی ساری زندگی ان ہی تینوں کی خدمت میں بسر کی، وقت کے تقاضوں کو پورا کرنا بھی علم اور اسلام کی خدمت کے مترادف تھا، اور شاہ ولی اللہؒ کا یہ قول کبھی ان کی نظر سے پوشیدہ نہیں ہوا:

"نصیحت ونیک خواہی مسلماناں در ہر زمان و در ہر مکان رنگے دیگر دارد، و اقتضائے دیگری نماید، و لہٰذا علمائے دین و کبرائے اہل یقین در تفسیر و حدیث و عقائد و فقہ و سلوک تصانیف متنوع ساختہ اند، و در تالیف گوناگون پرداختہ۔" (دیباچہ فتح الرحمٰن ص ۱)

"مخزن" اور "علی گڑھ منتھلی" میں ان کے سب سے پہلے مضامین کا چھپنا بھی معنی خیز تھا، آنے والے وقت میں ان کے علمی تبحر سے جدید اور قدیم دونوں علوم کے ماہرین کو مستفید ہونا تھا، سر عبد القادر نے بقول مولانا سید سلیمان ندویؒ "مخزن" میں جدید و قدیم ادب نوازوں کو ایک میز پر جمع کر دیا تھا، جو آواز وہاں سے اٹھتی تھی وہ قدیم اور جدید دونوں ایوانوں میں سنائی دیتی تھی سید صاحبؒ طبقۂ علماء میں شاید پہلے شخص تھے جن کی علمی کاوشوں کو جدید اور قدیم دونوں مکتب خیال کے لوگوں نے یکساں عزت کی نگاہ سے دیکھا، اور ان کی تحقیق کی ندرت، فکر کی جودت اور دلائل کے استحکام کا لوہا مانا، ان کے الندوۃ کے بعض مضامین اشتراکیت اور اسلام، مسئلۂ ارتقاء، قیامت وغیرہ سے ایسا اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے عصر حاضر کے بعض مسائل پر غور و فکر ابتدائی زمانہ ہی سے شروع کر دیا تھا۔

یوں تو مولانا سید سلیمان ندوی کی پچاس سال سے زیادہ پر پھیلی ہوئی علمی زندگی میں صدہا کتابیں اور

مصنف ایسے ہوں گے جن سے ان کے نظریات اور رجحانات نے اثر قبول کیا ہوگا، لیکن ان کی فکر کی بنیاد دو کتابوں پر تھی، مولانا اسمٰعیل شہیدؒ کی تقویۃ الایمان جس سے گہرا قلبی اور ذہنی تعلق بچپن ہی میں پیدا ہو گیا تھا، اور دوسرے امام مالکؒ کی موطا جس سے شاہ ولی اللہؒ کی طرح انھوں نے روح حجازی کو سمجھنے کا کام لیا تھا، حیات امام مالکؒ اس لیے نہیں لکھی گئی تھی کہ مولانا شبلیؒ "النعمان" لکھ چکے تھے، بلکہ اس کے پیچھے اجتہاد کی اس روح کو بیدار کرنے کا جذبہ کام کر رہا تھا، جس کی نشان دہی شاہ ولی اللہؒ نے اس طرح کی تھی:

"بیقین معلوم شد کہ طریقۂ اجتہاد امروز مسدود است، إلا از یک وجہ کہ موطا را پیش گیرند" (المصفیٰ)

راہ اجتہاد میں موطا ہی ایک چشمۂ نور تھا جس کی روشنی میں فکر کا قافلہ آگے بڑھ سکتا تھا، سید صاحبؒ نے اس کے ذریعہ اس ماحول سے اپنا ذہنی ربط قائم کیا جس میں اسلامی فکر اور اداروں کی نشو و نما ہوئی تھی، حضرت تھانویؒ کو ایک خط میں اعتزال سے سلفیت تک اپنے ذہنی سفر کا حال بتا کر امام مالکؒ کے اصولوں پر ہمیشہ کاربند رہنے کا اعتراف کیا ہے، انھوں نے حافظ ابن تیمیہؒ، حافظ ابن قیمؒ اور شاہ ولی اللہؒ کے خرمن کمال سے خوشہ چینی ضرور کی لیکن اپنی منزل اور محمل کا نشان ہمیشہ امام مالکؒ ہی سے پوچھا۔

مولانا سید سلیمان ندویؒ کے ذہن کی تربیت مولانا شبلیؒ نے کی اور دل کی پیر تھانویؒ نے، یہ دو جلیل القدر ہستیاں ہیں جنھوں نے علٰحدہ علٰحدہ اپنے حلقۂ فکر میں وقت کی رفتار پر اپنا نقش چھوڑا ہے، سید صاحبؒ کی علمی بصیرت کی یہ کرامت ہے کہ استاد اور پیر کے درمیان فکری خلیج کو اس طرح پاٹ دیا کہ بُعد کا گمان ہی ختم ہو گیا، مولانا شبلیؒ کی مسند علم اور پیر تھانویؒ کے سجادۂ شیخت دونوں کو ان سے رونق حاصل ہوئی، ایک نے اپنا عمامہ ان کے سر پہ رکھا، دوسرے نے اپنا عصا ان کے ہاتھ میں دیا، نغانی کا یہ شعر بے اختیار زبان پر آجاتا ہے ؎

مسیحا یار و خضر ہمنشیں رہنما و ہم عناں یوسف نغانی آفتاب من بہ این اعزاز می آید

علم و عرفان کا یہ نادر الوجود سنگم، ہماری ذہنی تاریخ میں ہمیشہ یادگار رہے گا۔

مولانا سید سلیمان ندویؒ کی تصانیف کا ذکر کرنے سے پہلے ضروری ہے کہ ان کے تحقیقی اصولوں اور علمی

طریقہ کار پر ایک نظر ڈال لی جائے۔

(۱) سید صاحبؒ کا احاطۂ علم اور دائرۂ معلومات بہت وسیع تھا، وہ ایک زندہ دائرۃ المعارف تھے جس سے علم و عرفان کی شعاعیں پھوٹتی تھیں، جس موضوع پر گفتگو کرتے ٹھہر ٹھہر کر، سمجھا سمجھا کر سننے والے پر "فتادو سامعہ در موجۂ کوثر و تسنیم" کا عالم طاری ہو جاتا، ان کی گفتگو میں اس سمندر کی خاموش روانی تھی جس کی تہ میں موتیوں کے خزانے بھرے ہوں، قرآن، حدیث، فقہ، تاریخ، چاروں کا گہرا مطالعہ علیحدہ علیحدہ کیا تھا، پھر ان سب کو مربوط کر کے حکمت دین کی اکائی میں ڈھال دیا تھا، ان علوم کا ایک جگہ اس طرح جمع ہو جانا کہ وہ علمی شخصیت کا جزو بن جائیں ان کا امتیازی وصف تھا، وسیع مطالعے، مستحضر علم اور قوی حافظے نے ان کی علمی شخصیت کا وقار بہت اونچا کر دیا تھا،

(۲) سید صاحبؒ نے جمع مواد کو تحقیقی کام کی اساس اور بنیاد قرار دیا تھا، ان کا خیال تھا کہ اس کے بغیر تمام نظریات خام اور نقش ناتمام رہتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ ان کی تصانیف معلومات کا خزانہ ہیں، کسی موضوع پر قلم اٹھانے سے پہلے وہ سارے متعلقہ لٹریچر کو کھنگال ڈالتے تھے، ایک اہم بات ان کی تصانیف کے سلسلہ میں یہ ہے کہ ان کی کوئی تصنیف ایک وقت میں مرتب نہیں ہوئی، وہ برسہا برس مواد جمع کرتے رہتے تھے، پھر اس موضوع پر اپنے خیالات کو ضبط تحریر میں لاتے تھے، عرب و ہند کے تعلقات جیسے موضوع کو بیس بیس پچیس پچیس سال تک اپنے ذہن میں رکھا، اور جہاں سے بھی معلومات حاصل ہوئیں ان کو نوٹ کر لیا، اصطرلاب پر ان کے مضامین تاج محل کے معماروں سے متعلق ان کی تحقیق، خلافت اور ہندوستان کے تعلقات پر ان کی تفصیلات مدت کے غور و فکر اور جہد و سعی کا پتہ دیتے ہیں، وہ انگریزی کتابوں کے معلومات کو بھی ذہن میں رکھتے تھے، اور مستشرقین کے افکار و نظریات پر تنقید و تبصرہ کرتے ہوئے آگے بڑھتے تھے، سید صاحبؒ کے دو اصول تھے جو آج بھی اہل قلم کے لیے مشعل ہدایت بن سکتے ہیں: (۱) وہ اپنی تصنیف کا مواد بڑی محنت سے اور مدتوں جمع کرتے رہتے تھے، (۲) جب مسودہ تیار ہو جاتا تھا تو اس کو کچھ مدت کے لیے دراز میں رکھ کر بھول جاتے تھے، یہ بات خود

انھوں نے راقم الحروف کو بتائی تھی، اس طرح کچھ عرصہ بعد جب مسودہ نکالتے تو خود اپنے ناقد بن جاتے تھے، اور عرفی کی اس ہدایت پر عمل کرنے لگتے تھے ؎

خواہی کہ عیب ہائے تو روشن شود ترا ۔۔۔ یک دم منافقانہ نشیں در کمینِ خویش

اس طرح عبارت اور دلائل کا توازن جو وقتی انہماک میں کبھی کبھی برہم ہو جاتا ہے، اس کو بڑی نفاست اور خوش اسلوبی سے صحیح کر دیتے تھے، ان کی تصانیف میں خیالات کے توازن کا بڑا سبب یہی اصول تھا۔

(۳) مولانا سید سلیمان ندویؒ ماخذ کی تلاش میں بڑی صعوبتیں برداشت کرتے تھے، انھوں نے صدہا ذاتی ذخیرے اور درجنوں پبلک لائبریریاں ہندوستان اور بیرون ہندوستان میں دیکھی تھیں، جب لندن میں تھے تو وہاں بھی کافی وقت کتابوں کے مطالعہ اور تلاش میں صرف کیا، لکھتے ہیں: "اس عمارت میں جہاں سینکڑوں حقیقی اور مجازی زیارت گاہیں ہیں، ایک زیارت گاہ کا نام انڈیا آفس لائبریری ہے، یہ لائبریری ہندوستان کی علمی تاریخ کا مجسمہ ہے" (معارف جون سنہ ۱۹۲۰ء ص ۴۰۸) پھر جب اردو کی مطبوعہ کتابوں کی فہرست دیکھی تو اس طرح اپنے تعجب کا اظہار کیا: "اردو زبان غدر کے پہلے ہی سے ایک علمی زبان بن رہی تھی، دوسری بات یہ نظر آئی کہ اس زبان کو علمی زبان بنانے میں مسلمان اور ہندو دونوں اہل علم کا برابر کا ساجھا ہے، یہ وہ زمانہ تھا جب ہندوستانی یونیورسٹیوں کی تاریخ نے ہندوؤں اور مسلمانوں کو دو حصوں میں منقسم نہیں کیا تھا، بلکہ جب صرف ایک سالم اور متحد ہندوستان دنیا میں موجود تھا" (ص ۴۱۰) یہ الفاظ سنہ ۱۹۲۰ء کے ہیں۔

ان کا دستور تھا کہ کتب خانوں کی سیر خود کرتے، اور جب واپس آتے تو ناظرین معارف کو اس کی سیر دکھاتے، اس سلسلہ میں گو مولانا حکیم سید عبدالحی صاحبؒ کی مساعی اپنے عہد کے مشرقی اور مغربی علوم کے سب ماہرین سے بڑھ گئی تھیں، لیکن سید صاحبؒ بھی ماخذ کی تلاش میں بڑی جدوجہد کرتے تھے، نزہۃ الخواطر اور عرب و ہند کے تعلقات فراہمی مواد کا ایسا شاہکار ہیں جن سے ہندوستانی علماء کا سر اونچا ہو گیا ہے،

(۴) مولانا سید سلیمان ندویؒ کو تصنیف و تالیف کے کام میں کسی طرح کی سہولت پسندی گوارا نہیں تھی،

معاصروں کی مخالف ہوئی راہ پر چلنے سے بچتے تھے، اور اپنا راستہ خود نکالتے تھے، خواہ اس میں ان کو کتنی ہی دشواریاں کیوں نہ پیش آئیں، ان کا مسلک یہ تھا:

تراش از تیشۂ خود جادۂ خویش براہِ دیگراں رفتن عذاب است

ایک بار سید صباح الدین عبد الرحمٰن صاحب نے ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے فوجی نظام پر تحقیقی کام میں دشواری کا ذکر کیا تو فرمایا کہ دشوار گذار راہیں طے کرنے کے بعد ہی تحقیق کے رموز سے واقفیت ہو سکتی ہے، لیکن مولانا سید سلیمان ندویؒ کا یہ کمال ہے کہ تصنیف و تالیف میں اس قدر محنت اور مشقت کے باوجود کہیں آبلہ پائی کی شکایت یا تھکن کا اثر ان کی تحریروں میں محسوس نہیں ہوتا، پڑھنے والوں کو ان کی محنت کے ثمر تو نظر آتے تھے لیکن جس طرح وہ خون جگر سے اس کشت ویران کی آبیاری کرتے تھے، بہت کم لوگ اس کو دیکھ سکتے تھے،

(۵) مولانا سید سلیمان ندویؒ مسائل فقہ پر مجتہدانہ نظر رکھتے تھے، وہ عصری رجحانات پر غور و فکر کرتے تھے، اور مسائل پر رائے قائم کرنے میں بڑی احتیاط اور تدبر سے کام لیتے تھے، علامہ محمد اقبالؒ نے جب بھی فقہی مسائل پر ان کی رائے معلوم کی، ان کے جوابات کو نہ صرف شافی پایا، بلکہ ان میں فکر کی نئی روشنی محسوس کی، اجماع، قیاس، نص، ناسخ و منسوخ وغیرہ پر اقبالؒ نے ان کے خیالات سے استفادہ کیا، اور شاہ ولی اللہؒ کی حجۃ اللہ البالغہ کے بعض اجزاء کا مفہوم بھی ان سے سمجھا، علامہ اقبالؒ نے Reconstruction of Religious Thought in Islam میں جس انداز سے بعض مباحث کو اٹھایا ہے، اس پر مولانا سید سلیمان ندویؒ کے افکار کا اثر محسوس ہوتا ہے، بعض جگہ علامہ محمد اقبالؒ کی فکر اجتہادی منزلوں کو قطع کرتے کرتے ایک دم سے رک گئی ہے، ممکن ہے کہ سید صاحبؒ ہی نے بعض مسائل میں ایک حد سے آگے بڑھنے سے روکا ہو، علامہ محمد اقبالؒ کی نظر میں مولانا سید سلیمان ندویؒ کے افکار کی جو اہمیت تھی اس کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ وہ اپنی عادت کے خلاف سید صاحبؒ کے مکتوبات کو بڑی حفاظت سے رکھتے تھے، (اقبال نامہ، ج ۱، ص ۱۴۶)

بھوپال ان کی مجتہدانہ فکر کے سفر میں ایک منزل تھا، انکار کو عملی جامہ پہنانے کی، اپنی راہ سے ہٹنا مقصود نہیں تھا، مولانا مسعود عالم ندویؒ کو ۲۰ر دسمبر ۱۹۴۷ء کے ایک خط میں بھوپال سے لکھتے ہیں، یہاں بھی بفضل الٰہی کچھ دینی کام انجام پا رہے ہیں۔" (فاران اپریل ۵۴ء ص ۲۸)۔

(۶) عالم اسلام کی تحریکوں اور فکری رجحانات سے باخبر رہنے کے لیے مولانا سید سلیمان ندویؒ بڑی جستجو کرتے تھے، علامہ محمد اقبالؒ سے اس سلسلہ میں تبادلۂ خیال بھی ہوتا رہتا تھا، مفتی عالم جان کی تحریک کی نوعیت پر علامہ محمد اقبالؒ نے سید صاحبؒ کی رائے دریافت کی تھی، افغانستان میں قدیم و جدید نظریات کے تصادم کو خود انھوں نے دیکھا تھا، ترکی کے اصلاحی رجحانات پر گہری نظر رکھتے تھے اور گو تحریک خلافت کے پس منظر نے اس کام کو مشکل بنا دیا تھا، وہ کھلے دماغ سے ان کا مطالعہ کرتے تھے، قیام لندن کے زمانہ میں شامی، مصری، تونسی علماء سے طویل گفتگوئیں رہی تھیں، مفتی اعظم فلسطین اور وہ خود موتمر عالم اسلامی کے نائب صدر منتخب کیے گئے تھے، وہ اس ذہنی اور فکری ہیجان سے پوری طرح واقف تھے، جو اسلامی دنیا میں برپا تھا، ویسے عالم اسلام کی تحریکوں، دینی رجحانات، عوامل و نظریات کا جو براہ راست مطالعہ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی صاحب نے کیا ہے وہ کسی دوسرے ہندوستانی عالم کو میسر نہیں آیا، اور مولانا سید سلیمان ندویؒ کی نگاہ نے بھی ان اثرات کا اندازہ لگا لیا تھا، جو مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے عرب ممالک میں اس وقت پیدا کر دیے تھے، ایک خط میں ۴ر جنوری ۱۹۵۰ء کو مولانا سید سلیمان ندویؒ ان کو حجاز کے تجربات کے سلسلہ میں لکھتے ہیں:

"بے شبہ جو چیز آپ کے لیے آثار سعادت میں سے ہے وہ یہ ہے کہ بحمد اللہ تعالیٰ ۵۰ سال گذرنے کے بعد آپ کے نام اور کام کو میں نے زندہ پایا، بلکہ آپ کی نسبت سے مجھے بزرگی ملتی رہی۔"

(۷) سید صاحبؒ کی علمی خصوصیات کا ایک اہم پہلو یہ بھی تھا کہ انھوں نے مغرب کے علمی رجحانات اور سائنس کے انکشافات سے اپنے آپ کو بے خبر نہیں رکھا تھا، سائنسی ایجادات پر وہ کھلے دماغ سے غور کرتے تھے اور

ان کے اثرات کا جائزہ لیتے تھے، انکے رسالہ معارف کے صفحات آج علمی کے عنوان سے مختلف معلومات سے بھرے ہوئے ہیں، مثال کے طور پر جون ۱۹۲۰ء کا معارف لے لیجیے، اس میں مرجے۔سی۔ بوس علامہ کی تحقیقات علمی کا ذکر ہے، دانا نجم کی جواں سال موت پر

خوش درخشید و لے دولت مستعجل بود

کہہ کر رنج کا اظہار کرتے ہیں، انچسٹر یونیورسٹی میں چندہ جمع کرنے کی تدابیر کا ذکر تعجب سے کرتے ہیں، یورپ میں ریویو نگاری کے اصول پر بحث کرتے ہیں، نائٹروجن کے متعلق جدید تحقیقات کا ذکر کرتے ہیں، ڈاکٹر آگسٹن والر ڈاکٹر رابرٹ بل، پروفیسر میکسول لی فرائے کی تحقیقات سے روشناس کراتے ہیں، *Radiographie* ——— *Cancer Machine* کی ایجاد کی خبر دیتے ہیں، نیویارک میڈیکل سوسائٹی کے صدر ڈاکٹر فینک کے لکچرس کا تذکرہ کرتے ہیں، کرۂ ارض اور کرہ مریخ سے متعلق سائنس کی تحقیقات بیان کرتے ہیں، ڈاکٹر ملیز کے مصنفہ کی تفصیل سے آگاہ کرتے ہیں، یہ ایک مہینے کے معارف کے معلومات کا حال ہے، بعض اوقات عالمی علمی رفتار میں اس دلچسپی کو دیکھ کر ذہن ان عوامل و اسباب کے تجزیہ کی تلاش کرنے لگتا ہے، جن کے باعث یہ رجحانات کسی مثبت نتیجہ پر نہ پہونچ سکے، اور مغربی اور مشرقی علوم کے درمیان کوئی پل نہ بنایا جا سکا، مولانا سید سلیمان ندویؒ مغربی علوم کے نظریات سے واقفیت کو بقول اقبالؔ "زلب را حیدر کرار کن" کا کام لیتے تھے۔

(۸) سید صاحبؒ اسلامیات کے سلسلہ میں ہندوستانی یونیورسٹیوں اور طلبہ کے اس طریقہ کار کو کہ مستشرقین کی کتابوں کو بنیاد بنا کر تحقیق کی جاتی ہے، بڑی تشویش کی نگاہ سے دیکھتے تھے، اس سلسلہ میں انھوں نے خاص طور پر انسائیکلوپیڈیا آف اسلام، میکڈونالڈ کی (*Mac Donald*) *Development of Muslim Theology jurisprudence and Constitutional Theory* ——— کی *Aghnides* اور *Dictionary of Islam* کی (*Hughes*) ہیوجز کا ذکر کیا ہے، ان کا کہنا تھا کہ اس طرح نہ صرف *Mohammadan Theories of Finance*

مستشرقین کی غلطیاں دہرائی جاتی ہیں، بلکہ تحقیقی زاویے محدود ہوکر رہ جاتے ہیں، اور اسلامی فکر اور اداروں کو صحیح پس منظر میں دیکھنے کی صلاحیت مردہ ہوکر رہ جاتی ہے۔

(۹) مولانا سید سلیمان ندویؒ خود کو سرتاپا مشرقی درس گاہوں کا پروردہ اور نمائندہ" (مقالات ص ۳۸) کہتے تھے اور یہ صحیح بھی تھا، لیکن ان کا انداز بیان، طرز استدلال اور ترتیب معانی و مطالب بالکل جدید طرز پر ہوتی تھی، موضوع بحث سے گریز یا غلط مبحث کا ان کی تحریروں میں دور دور نشان نہیں ملتا، وہ معاصر ماخذ کے سہارے تفسیر و تعبیر کا قدم آگے بڑھاتے تھے، فرانسیسی ادیبوں کے متعلق کہا جاتا ہے کہ ان کی تحریریں، انداز بیان و مطالب میں صاف شفاف دریا کی روانی کی مانند ہوتی ہیں، اردو لٹریچر میں مولانا سید سلیمان ندویؒ کو یہ شرف حاصل ہے کہ وہ بڑی جاذب انداز ایسے سحر اور پرتاثیر انداز میں لکھتے تھے، کہ اس کی کوئی دوسری مثال پیش کرنا مشکل ہے، تحریر کی یہ خوبی نفس مضمون پر کامل عبور کا نتیجہ ہوتی ہے۔

(۱۰) مولانا سید سلیمان ندویؒ کو قدرت نے اخذ و استنباط کی غیر معمولی صلاحیت ودیعت کی تھی، دوران مطالعہ جب کوئی ایسا واقعہ نظر سے گذرتا جو ان کے موضوعات تحقیق سے متعلق ہوتا تو ان کا مرتب ذہن فوراً اس کو مناسب جگہ منتقل کر دیتا تھا، اور یہ کیفیت اس طرح ان کی عادت ثانیہ بن گئی تھی کہ تقریر بھی کرتے تو مرتب، مربوط اور مدلل، اگر ضبط تحریر میں آجائے تو منظم مقالہ کا گمان ہو، ایسا محسوس ہوتا تھا کہ یہ ترتیب ان کی کوشش کا نتیجہ نہیں، بلکہ ان کے منظم مطالعہ اور گہرے فکر سے ایک مربوط شکل اختیار کر لیتی تھی، پھر یہ بھی ایک عجیب بات ہے کہ ان کی بعض بہترین تصانیف عرب و ہند کے تعلقات، عربوں کی جہاز رانی عمر خیام، ابتداءً لیکچرس کی صورت میں پیش کیے گئے تھے،

(۱۱) مولانا سید سلیمان ندویؒ نے اپنی علمی تحقیقات میں "دل" کو پاسبان عقل بنا کر رکھا تھا، نہایت مدلل گفتگو کرتے جو اول سے دلیل کو محکم بناتے، لیکن دل کی پاسبانی ہر جگہ رہتی، بہت دنوں کی بات ہے، راقم نے اس وقت شاید ایک دو مضمون لکھے ہوں گے، سید صاحبؒ کی خدمت میں پیش کیے، ملاحظہ

فرماکر لکھا:

"آپ کی طرز تحقیق اور جمع معلومات سے خوشی ہوئی، دماغ سے پہلے دل کی ضرورت ہے، وہ مورخ جو دماغ رکھتے ہیں اور دل نہیں رکھتے، ان کے آثار قلم کی موجیں سراب ہیں، تاریخ تمام تر کچا مواد ہے، اس سے جیسا سامان دل چاہے تیار کر لیجئے"

ان جملوں میں تنبیہ بھی تھی اور نصیحت بھی، خود ان کا مسلک بھی اس میں جھلکتا تھا، اس وقت یہ حقیقت آپ سے چھپانا نہیں چاہتا کہ اس وقت یہ بات قدامت پسندی اور مذہبیت کے غلو کا اثر محسوس ہوئی تھی لیکن جوں جوں وقت آگے بڑھتا گیا، اس نصیحت کی صداقت واضح ہوتی گئی، میرٹھ میں ایک بار انھوں نے پورا دن میری قلمی کتابوں کا ذخیرہ دیکھنے میں گذارا، اپنی چھوٹی سی نوٹ بک میں نوٹس لکھتے جاتے تھے، اور بتاتے جاتے تھے کہ ایک ہی مواد کس طرح متضاد مقاصد کے لئے استعمال کیا جا سکتا ہے، اور جب تک انسان کا دل تاریخ کے بکھرے ہوئے مواد میں ربط نہ پیدا کرلے اس میں جان نہیں پڑ سکتی، محض مواد کے سہارے نہ فکر انسانی کی تہ تک پہونچا جا سکتا ہے، نہ انسانی اعمال کا جائزہ ممکن ہے، اس وقت میرٹھ کا ذکر آیا تو ایک واقعہ اور بیان کر دوں میں نے سید صاحبؒ کو ایک عربی مخطوطہ دکھایا، جس کی خصوصیات سے میں خود ناواقف تھا، اس کی سطریں مختلف روشنائی سے کئی کئی ٹکڑوں میں لکھی ہوئی تھیں، اور پھر ہر نیچے کی سطر اسی ترتیب سے تھی، تقریباً ایک گھنٹہ اس مخطوطہ کو دیکھتے رہے پھر مسکرا کر فرمایا: یہ علم کی جادوگری تو دیکھیے، ایک کتاب میں مختلف فنون جمع کر دیے ہیں، مسلسل پڑھیے تو ایک فن ہے، اوپر سے نیچے پڑھیے تو دوسرا فن، آخری حصوں کو ملا کر پڑھیے تو تیسرا، پھر چند سطریں پڑھ کر سمجھائیں، اس وقت اندازہ ہوا کہ مختلف علوم پر ان کی نظر کتنی گہری اور مطالعہ کتنا وسیع تھا، تحقیق کے میدان میں ان کی ہمت افزائی اور ذرہ نوازی کے احساس کو الفاظ میں بیان کرنا آسان نہیں،

(۱۴) مولانا سید سلیمان ندویؒ کو شدید احساس تھا کہ ہندوستان کے قرون وسطیٰ کی تاریخ انگریز مورخوں کے ہاتھوں مسخ ہو گئی ہے، اس کو از سر نو ترتیب دینے کی ضرورت ہے، مدراس میں انڈین ہسٹری کانگریس کو

خطاب کرتے ہوئے انھوں نے کہا تھا :

"اب ہندوستان کی جو تاریخ لکھی جائے اس کا مقصد ہندوستان کے متفرق اجزا کو باہم جوڑنا ہو، توڑنا نہ ہو، حال کو ماضی کی ناگواری کی تلخی کو بڑھا کر کیوں برباد کیا جائے اور کیوں مستقبل کیلئے کوشش جاری رہے کہ وہ کبھی خوش آیند نہ ہوسکے۔"

یہ بوڑھے مورخ کی آواز تھی، جو ۱۹۴۲ء میں بلند ہوئی تھی، لیکن صدا بصحرا ثابت ہوئی، اور تاریخ کو مسخ کرنے کا کام پہلے سے تیز تر ہوگیا۔

مولانا سید سلیمان ندویؒ کی تصانیف موضوع کے اعتبار سے سیر، تاریخ، ادب اور جغرافیہ میں تقسیم کی جاسکتی ہیں، گو ان کی فکری وحدت کی طرف ہم نے شروع ہی میں اشارہ کردیا ہے، "سیرۃ النبیؐ" کا خواب مولانا شبلیؒ نے دیکھا تھا، دم واپسیں ان کے لب پر "سیرۃ، سیرۃ" تھا، انھوں نے اپنے شاگرد کو وصیت کی کہ اس کام کو سب سے پہلے مکمل کیا جائے، مولانا شبلیؒ نے سیرت کا کام تحقیق کی بہت اونچی محراب پر سجایا تھا، اور جلد اول کی طباعت سے پہلے اس سلسلہ کے جو مضامین "الہلال" میں شایع کیے تھے، ان میں اعلان کیا تھا :

"تیرہ سو برس کی وسیع مدت میں ایک کتاب بھی اس فن (سیرت) میں ایسی تصنیف نہیں کی گئی جس میں صرف صحیح روایتوں کا التزام کیا جاتا۔ محدثین نے تنقید تحقیق کی ضرورت کو احادیث احکام کے ساتھ خاص کردیا ہے۔"

یہ بہت بڑا اعلان تھا، اور بہت بڑی ذمہ داری، اس کی روشنی میں سیرت نبویؐ کا سارا سرمایہ تحقیق و تنقید کی نئی کسوٹیوں پر پرکھنا ضروری ہوگیا تھا، مولانا شبلیؒ نے اس کام کے لیے اپنی جان نذر کی تھی، بھوپال سے مناسبت کی بنا پر یہ قطعہ پورا تاسن لیجیے؎

مصارف کی طرف سے مطمئن ہوں میں بہرصورت
کہ ابرِ فیضِ سلطانِ جہاں بیگم زرافشاں ہے

رہی تالیف و تنقیدِ روایت ہائے تاریخی
تو اس کے واسطے حاضر مرا دل ہے مری جاں ہے

غرض وہ ہاتھ ہیں اس کام کے انجام میں شامل کہ جس میں ایک نقیب نوا ہے ایک مطلع ہے
مولانا شبلیؒ نے حافظ ابن تیمیہؒ کی کتاب التوسل کی روشنی میں اسی بہت سی احادیث کو نظر انداز کر دیا
جو اصول اسناد پر پوری نہیں اترتی تھیں مولانا سید سلیمان ندویؒ استاد کی بتائی ہوئی شاہراہ پر گامزن ہوئے اور
تحقیقی پیمانوں کو انھوں نے اور زیادہ مضبوط بنا دیا، جلد اول کے طبع چہارم میں لکھتے ہیں:

"اس دفعہ جب نئے نسخے کے چھاپنے کی ضرورت ہوئی تو خیال آیا کہ اس کتاب کے مسودہ کو اصل ماخذوں سے ملا کر دیکھا جائے، اور مقابلہ اور مطابقت کی جائے، یہ بڑا مشکل کام تھا، بیسوں کتابوں کو پھر سے دیکھنا اور ہزاروں صفحات کو الٹنا، مختلف روایتوں کو پرکھنا اور ضرورت کے مقام پر حاشیے لکھنا، خود ایک مستقل تصنیف کے برابر محنت تھی۔" (ص ۲)

جس مقام پر مصنف کے نظریہ سے اختلاف تھا، وہاں حاشیے بڑھا کر اختلاف کو ظاہر کیا کہ علمی دیانت کا تقاضا تھا، فروتر ماخذ کی جگہ بالاتر کے حوالے دیئے کہ جدید تحقیقی اصولوں کا مطالبہ تھا، جو کتابیں مصنف کی زندگی میں طبع نہ ہوئی تھیں (مثلاً ابن کثیر کی البدایہ والنہایہ) ان کو پوری طرح استعمال کیا، مبادا ماخذ کی تشنگی کتاب کے علمی مرتبے کو متاثر کر دے، پھر جب اور جلدوں کی تکمیل کا وقت آیا تو گو مولانا شبلیؒ کا دیا ہوا چراغ ان کے ہاتھ میں تھا لیکن وہ اپنی تحقیق سے بھی نئے عنوانات پیدا کرتے رہے، سیرت کی آخری تین جلدیں جو میں منصب نبوت اور تعلیمات اخلاقی پر گفتگو کی ہے، دینی فکر، تحقیقی نظر اور تنقیدی صلاحیتوں کا شاہکار ہیں، علم کی جس وحدت کا ذکر ہم اوپر کر آئے ہیں اس کا بہترین نمونہ یہ جلدیں ہیں، ان کی تکمیل میں قرآن، حدیث، فقہ اور تاریخ سب نے اپنے خزانۂ معلومات ان کے حوالے کر دیے ہیں، اور اسلامی اخلاق کا پورا فلسفہ مرتب کرنے کے بعد حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کو معلم اخلاق کی حیثیت سے اس طرح پیش کیا ہے کہ حضرت عائشہؓ کے اس قول کی پوری تصدیق ہو جاتی ہے کہ قرآن اور سیرت رسولؐ دونوں ایک ہیں، سیرت کے پیچھے بے شمار کتابوں کا ماخذ بنے ہیں نبی کریمؐ کی ذات اقدس، اسلام کی تعلیمات اور اس کے اثرات کو اس طرح عصر حاضر کے مزاج اور ضروریات کے

مطابق کسی اور مصنف نے پیش نہیں کیا تھا، اس سے مستشرقین کی صدہا افترا پردازیوں کا سدباب ہوا ہے، اور ہزارہا غلط روایات کی جو خود مسلمانوں میں رائج تھیں، اصلاح ہوئی ہے، مولانا ابوالکلام آزادؒ نے ایک مرتبہ سیرت نبویؐ سے متعلق بعض روایتوں پر تنقید کرتے ہوئے لکھا تھا:

"ایران میں بعض لوگوں نے وعظ گوئی کو ایک مستقل فن بنا دیا، اور چونکہ قابل اور اہل قلم بھی تھے، اس لیے اپنی مجالس کو کتب سیر و قصص کی صورت میں مدون بھی کر دیا، مثلاً ملا حسین واعظ الکاشفی اور ملا معین الدین ہروی علی الخصوص آخرالذکر شخص جو فی الحقیقت انشا پردازی و حکایت طرازی و اقتباس روایات ضعیفہ و موضوعہ و تاویلات رکیکہ قرآن و سنت، و عبور در رسوخ اسرائیلیات و روایات یہود میں اپنا جواب نہیں رکھتا تھا، شاید بہت سے لوگوں کو یہ معلوم نہیں کہ آج اردو زبان میں جس قدر مولود لکھے گئے ہیں اور رائج ہیں وہ سب کے سب بے واسطہ یا بالواسطہ اسی ملا معین ہروی کی کتابوں معارج النبوۃ، تفسیر سورۂ یوسف موسوم بہ نقرہ کار، قصہ حضرت موسیٰ علیہ السلام موسوم بہ اعجاز موسوی وغیرہ سے ماخوذ ہیں۔"

(الہلال ۲۲ر فروری ۱۹۱۳ء ص ۸)

سیرۃ النبیؐ کا عظیم الشان کارنامہ تاریخ بھلا نہیں سکتی کہ اس کے ذریعہ اسلامی ذہن، اسرائیلیات کے گورکھ دھندوں سے نکل کر صحیح اسلامی تعلیمات کی روشنی میں آگیا، اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس تاریخ کے آئینہ میں اس طرح جگمگا اٹھی کہ مذاہب عالم کو اس کی عظمت و شان کے آگے سر خم کرنے پڑ گئے، مولانا سید سلیمان ندویؒ نے اس حقیقت کو پوری طرح اور موثر طریقہ پر واضح کیا کہ ذات نبویؐ ہر انسان کے لیے خواہ وہ کسی زمان و مکان، مرتبہ و حیثیت سے تعلق رکھتا ہو، یکساں طور پر سرچشمۂ ہدایت ہے، شاید ہی کسی دوسری زبان میں سیرۃ النبیؐ کے پایہ کی کتاب لکھی گئی ہو، اس میں روایات کی صحت، بیان کی دلکشی، مباحث کا تنوع، تحقیق کی جستجو، اور صحیح اسلامی فکر کی کارفرمائی حیرت انگیز ہے، خطبات مدراس میں حقیقتاً ان جلدوں کا عطر کشید ہو کر آگیا ہے، مذہبی عنوانات پر ایسا طرز تخاطب کہ معتقد اور مخالف سب کے دل سچائی کی آواز سن لیں، سید سلیمان ندویؒ کا اعجاز ہے،

آخری زمانہ میں ایک بار ان خطبات کے متعلق انھوں نے یہ مصرع پڑھ کر اس کی تالیف کا پورا پس منظر واضح کر دیا تھا۔

من قماش فروشِ دلِ صد پارۂ خویشم

سید صاحبؒ نے اپنی تحریروں سے یہ ثابت کر دیا کہ واقدی جس پر مارگولیتھ نے اپنی تحقیق کی ساری عمارتیں تعمیر کی ہیں، ایک داستان گو سے زیادہ نہیں، "سیرۃ النبیؐ" نے سید سلیمان ندویؒ کو عالم اسلام کی فکری تاریخ میں ایک ممتاز مقام عطا کیا ہے۔

سیرت عائشہؓ کو حقیقت میں سیرۃ النبیؐ کا تتمہ سمجھنا چاہیے، یہ کام طالب علمی میں شروع کیا تھا، پونے کے قیام کے زمانہ میں مولانا شبلیؒ اس کی تکمیل کا تقاضا کرتے رہے، مولانا اسلم جیراج پوری نے اسی زمانہ میں سیرت عائشہؓ لکھی تو مولانا شبلیؒ نے مولانا سید سلیمان ندویؒ کو ہدایت کی:

"اس کو دیکھ لو، اس سے بہت الگ رہے، یا بہت آگے نکل جائے"

ان دو جملوں میں استاد کی پوری ذہنی کیفیت اور شاگرد سے توقعات کی پوری تصویر ابھر آئی ہے، مولانا سید سلیمان ندویؒ نے جس تحقیقی انداز میں یہ سیرت لکھی تھی، اس کا اعتراف اقبال نے بھی کیا، زیوروں میں زکوٰۃ کے وجوب اور عدم وجوب کے مسئلہ پر جو رائے سیرت عائشہ میں ظاہر کی گئی تھی، اس سے پیر تھانویؒ کے ارشاد پر رجوع کر لیا گیا، لیکن اور تفصیلات میں وہ کتاب اپنے موضوع پر ہمیشہ قدر کی نگاہوں سے دیکھی گئی ہے۔

ان کا مختصر رسالہ "رسول وحدت" اپنے موضوع پر بے مثال ہے، اس میں وحدت الٰہی، وحدت کتاب، وحدت انسانیت اور آخر میں وحدت دین و دنیا پر جس طرح گفتگو کی گئی ہے اس سے اسلام کی عالمگیر حیثیت واضح ہو گئی ہے، اس رسالہ کا مختلف زبانوں میں ترجمہ بھی ہوا ہے،

"سیرت امام مالکؒ" کی تدوین میں جو جذبہ کارفرما تھا وہ ایسے شخص کے حالات زندگی سے باخبر کرنا تھا جس کی تالیف میں حجازی فکر جلوہ گر تھی، موطا تاریخی، فقہی، محدثانہ تینوں حیثیتوں سے فکر اسلامی میں اعلیٰ مقام

رکھتا ہے، شاہ ولی اللہؒ کی تو یہ رائے تھی کہ

"صحیح بخاری و صحیح مسلم ہر چند در بساط کثرت احادیث وہ چند موطا باشند، لیکن طریق روایت احادیث و تمیز رجال در اعتبار و استنباط از موطا آموختہ اند" (المصفیٰ)

مولانا سید سلیمان ندویؒ شاہ ولی اللہؒ ہی کے کتب فکر سے تعلق رکھتے تھے، اور موطا کو دینی فکر کی اساس بنا کر مسائل پر رائے دیتے تھے، حقیقۃً انھوں نے امام مالکؒ پر الندوہ میں ایک طویل مضمون لکھا تھا، بعد کو اس میں اضافہ کیا، اور کتاب کی صورت میں شایع کر دیا۔

"عرب و ہند کے تعلقات" وہ گراں بہا علمی یادگار ہے جو سید صاحبؒ کے نام کو بحیثیت مورخ، ہمیشہ زندہ رکھے گی، انھوں نے چیونٹیوں کے منھ سے شکر کے دانے چن کر مٹھائی تیار کی ہے، اس کی تیاری میں ان کی محنت اور اس کی ترتیب میں ان کی مورخانہ بصیرت حیرت انگیز ہے، عرب و ہند کے تجارتی، علمی اور مذہبی تعلقات پر انھوں نے ۱۹۲۹ء میں جو لکھا تھا اس کے بہت سے بیانات کی تائید حال میں "Geniza Records" کی دریافت سے ہوئی ہے، اس کتاب میں بعض ایسے مباحث بھی آ گئے ہیں جن پر مستقل کام کیا جا سکتا ہے، مثلاً عربی ماخذ سے ایلیٹ کے ادھورے کام کی تکمیل تاکہ "یونانی اور فارسی تاریخوں کے درمیان جو چند صدیوں کا غار رہ جاتا ہے وہ پٹ جائے" (ص ۴۳) برامکہ کے متعلق یہ تحقیق کہ وہ بدھ مذہب سے تعلق رکھتے تھے (ص ۱۱۴) یا F. Rosen کے اس خیال کی تردید کہ لفظ "ہندسہ" ہند سے مشتق ہے (ص ۱۴۴) یا عرب، ترک اور مغل فاتحوں کا فرق (ص ۱۸۰) جس سے فتوحات کی نوعیت، فاتحین کے مقاصد جنگ پر روشنی پڑتی ہے، اور تاریخ ہند کو سمجھنے اور قرون وسطیٰ میں ہندوؤں سے تعلقات کی حقیقی نوعیت واضح ہو جاتی ہے، عرب فاتحوں کا یہ فیصلہ کہ ہندو مشابہ اہل کتاب تھے، (ص ۱۹۴) بڑا اہم تھا، اس کے امکانات پر تفصیلی گفتگو آج تک نہ ہو سکی، پھر ایک پورا باب "ہندوستان میں مسلمان فتوحات سے پہلے" انتہائی بصیرت افروز ہے، اس باب میں ان کا دائرۂ تحقیق زیادہ تر سراندیپ، ساحلی علاقوں اور گجرات تک محدود ہے، لیکن محض یہ

رہے کہ مسلمانوں کی آبادی فتوحات سے قبل اس ملک میں موجود تھی، فی نفسہ اہم ہے، مولانا سید سلیمان ندویؒ کے اس نظریہ سے متاثر ہوکر راقم الحروف نے شمالی ہندوستان میں نومسلم آبادیات کا پتہ لگانے کی کوشش کی، اور بالآخر تاریخی شواہد سے یہ ثابت ہوگیا کہ اجمیر، ناگور، قنوج، بدایوں وغیرہ میں فتوحات سے قبل مسلمانوں کی نوآبادیاں قائم ہوگئی تھیں، ان مباحث کے علاوہ جن پر مستقل تحقیق کی ضرورت ہے، بعض ایسے اشارے بھی اس کتاب میں ہیں جن کی روشنی میں بعض تاریخی واقعات اور بھی اہمیت اختیار کرلیتے ہیں، مثلاً سندھ میں قبائل کی نوعیت اور وہاں کے حالات پر ان کا اثر، سندھ میں عرب حکومت کا قیام، قرامطہ کے اثرات اسماعیلی فرقوں کا نشوونما وغیرہ وغیرہ، اگر سنہ ۱۹۲۹ء کے بعد کی بعض اہم انگریزی تاریخی تصانیف کا جو ہندوستان میں شائع ہوئی ہیں جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ سید صاحبؒ کے خاموش اشاروں نے کس کس کو راہ دکھائی ہے، سنہ ۱۹۱۸ء میں انھوں نے "مسلمانوں کے عہد میں ہندوؤں کی علمی ترقی" پر مفصل مضمون لکھ کر تحقیق کا نیا عنوان فراہم کردیا تھا جس سے متاثر ہوکر بعض کتابیں انگریزی میں ضرور لکھی گئیں، لیکن کام پوری طرح آگے نہ بڑھ سکا۔

تاریخ جغرافیہ کے پس منظر کے بغیر بے روح رہتی ہے، یورپ کی جدید تحقیقات نے ایک نئے علم Geopolitics (سیاست ارضی) کی بنیاد ڈالی ہے، اس کی روشنی میں یورپ، امریکہ اور جاپان میں مورخین کی جماعتیں بڑی مفید تحقیقات میں مصروف ہیں۔

مولانا سید سلیمان ندویؒ کے زمانہ میں یہ علم وجود میں نہیں آیا تھا، لیکن تعجب ہوتا ہے کہ ان کا ذہن جغرافیہ کی اہمیت کو انہی خطوط پر محسوس کررہا تھا، جو بالآخر اس فن کو ایک واضح اور متعین شکل دینے میں موثر ثابت ہوئے، تاریخ ارض القرآن حقیقۃً سیرۃ النبیؐ کا مقدمہ تھا جو حجم بڑھ جانے کے باعث علیحدہ شایع کردیا گیا، تاریخ ارض القرآن اور عربوں کی جہاز رانی میں تاریخ، جغرافیہ اور ارضی سیاست کے باہمی تعلق پر بعض دلچسپ اشارے ہیں، عیسائی مصنفین نے Bibilicol Lands پر متعدد کتابیں لکھی ہیں، لیکن ارض القرآن پر مسلمانوں نے کوئی تحقیقی کام اس سے پہلے غالباً نہیں کیا تھا، لیکن Biblical

دلہ ۰۰ ۱ پر تحقیق کا کام اب تک جاری ہے، تاریخ ارض القرآن میں جو کچھ لکھا گیا ہے اس پر مزید تحقیق نہیں کی گئی، گو مغرب کی جدید تحقیقات کی روشنی میں اس کام کو آگے بڑھانے کی ضرورت ہے، ارض القرآن نے کلام پاک کے بیانات کی تاریخی اور جغرافیائی مطابقت اس طرح کر دی ہے کہ بہت سے نئے پہلو سامنے آگئے ہیں، تحقیقی جستجو کا یہ کمال ہے کہ جب عربوں کی جہاز رانی پر گفتگو کی تو سب سے پہلے عربی بحری لغات کی ایک فہرست تیار کر دی جس میں فارسی، ہندی، چینی، یونانی اور لاطینی الفاظ کا فرق اور ماحول پیش کر دیا، پھر قدیم عرب شعراء کے کلام سے جہاز رانی کی تفصیلات حاصل کرنے کے بعد قرآن پاک میں جہاں جہاں کشتی، سمندر، بادبان وغیرہ کا ذکر ہے اس طرح جمع کر کے پیش کیا کہ بحری دنیا اور اس کے مسائل کی ایک تصویر آنکھوں کے سامنے آگئی، سورۂ بنی اسرائیل (۷) اور سورۂ لقمان (۴) میں جس طرح بحری خطرات کا ذکر ہے، اس سے دلچسپ نتائج مرتب کیے، پھر بتایا کہ نہر سوئز کا تخیل سب سے پہلے عمرو بن العاصؓ کے ذہن میں آیا تھا، پھر بندرگاہوں کے بیان سے پوری تحقیق میں ایک جان ڈال دی، ابن خلدون نے سمندروں کے سلسلہ میں جو کچھ لکھا ہے، اس کے تفصیلی اقتباسات سے مسلمانوں کے جغرافیائی ذہن کی ایک تصویر بنانے کی کوشش کی، شاید وہ وقت آئے جب ارضی سیاست کا کوئی طالب علم اس کتاب کو ایک نئے پیکر میں ڈھال کر تصورات کی ایک نئی دنیا پیش کر دے۔

تصوف پر مولانا سید سلیمان ندویؒ کے قلم سے کوئی مستقل تصنیف نہیں ہے، بعض مضامین میں اشارے ضرور ملتے ہیں، حقیقت یہ ہے کہ تصوف پر لکھنے کا جب وقت آیا تو تصنیف و تالیف سے ان کی طبیعت بھر چکی تھی، علاوہ ازیں جو کیفیت ان پر طاری ہو گئی تھی اس کا زبان قلم پر لانا بھی آسان نہ تھا اس لیے خاموشی کو ہمراز بنا کر انھوں نے تصوف پر اظہار خیال سے گریز کیا، میں نے ایک بار تصوف میں اپنی دلچسپی اور اس پر کام کرنے کی خواہش کا اظہار کیا تو فرمایا: "کیا آم کو چکھے بغیر اس کا ذائقہ بیان کیا جا سکتا ہے؟"

ایسا محسوس ہوتا ہے کہ تصوف پر ان کے خیالات مختلف منزلوں سے گذرے تھے، ۱۹۱۷ء میں

تصوف سے متعلق ان کے خیالات ناقدانہ تھے، اور غالباً یہی وجہ تھی کہ اقبالؔ کی اسرارِ خودی اور رموزِ بے خودی پر انھوں نے اقبالؔ کی ہمنوائی کی، ۱۳ر نومبر ۱۹۱۷ء کے ایک خط میں اقبالؔ لکھتے ہیں:

"میں مدت کے مطالعہ اور غور و فکر کے بعد انھی نتائج پر پہونچا ہوں جو آپ کے والا نامہ میں درج ہیں، جو کام آپ کر رہے ہیں وہ جہاد فی سبیل اللہ ہے، اللہ اور اس کے رسولؐ آپ کو اس کا اجر عطا فرمائیں گے، اس میں ذرا بھی شک نہیں کہ تصوف کا وجود ہی اسلام میں ایک اجنبی پودا ہے، جس نے عجمیوں کی دماغی آب و ہوا میں پرورش پائی ہے"

(اقبال نامہ ج ۱، ص ۷۸ - ۷۷)

لیکن ایک وقت آیا جب دونوں اپنے اس موقف سے ہٹے، اور تصوف کے دامن میں پناہ لی، اقبالؔ نے حقیقی تصوف میں تعمیرِ خودی کا راز پایا، اور مولانا سید سلیمان ندویؒ نے اس کو دین کی روح اور ایمان کا کمال قرار دیا۔

مولانا سید سلیمان ندویؒ کے ادبی ذوق اور شعر و سخن میں دلچسپی کے متعلق کچھ کہنا بالکل لا حاصل ہے، انھوں نے "ہندوستان میں ہندوستانی" اور الفاظ کی تہذیب پر جو پر مغز مضامین لکھے ہیں وہ تحقیق کی نئی راہ دکھاتے ہیں، "نقوشِ سلیمانی" میں اردو زبان اور ادب سے متعلق ان کے خطبات و مقالات معلومات کا گنجینہ ہیں۔

ایرانی شاعری بہت سے ادبی رجحانات اور مذہبی افکار کا منبع و مخزن تھی اور اس کا مطالعہ ہماری تہذیب کا جزو تھا، خود مولانا شبلیؒ نے "شعرالعجم" لکھ کر فارسی شاعری میں نیا ذوق پیدا کر دیا تھا، بقول مولانا ابوالکلام آزاد وہ فارسی کے آخری شاعر تھے۔

مولانا سید سلیمان ندویؒ کا مزاج محققانہ تھا، شاعرانہ نہ تھا، مولانا شبلیؒ کی طرح انھوں نے فارسی میں سوز و گداز سے تڑپتے ہوئے اشعار نہیں کہے، لیکن ناقدانہ بصیرت اور عرفان شعر کا ان کو خاصا حصہ ملا تھا۔ خیام پر ان کا کام ادبی ذوق اور شاعرانہ بصیرت اور محققانہ کمال کا آئینہ دار ہے، خود فرمایا کرتے تھے کہ "میں نے تو یہ کتاب محض اس اظہار کے لیے پیش کی ہے کہ اہل مغرب کو معلوم ہو جائے کہ ان کو جس ریسرچ پر ناز ہے، مشرقی علماء اس میں ان سے کسی طرح پیچھے نہیں"، انھوں نے خیام کے فلسفہ کو نئے رنگ میں پیش کیا ہے، اور مروجہ نظریات میں جو مستشرقین کی دین تھے، ایک انقلاب برپا کر دیا، اقبال کا یہ کہنا کہ اس موضوع پر کوئی مشرقی یا مغربی عالم اضافہ نہیں کر سکتا، سب سے بڑا خراج تحسین ہے جو ان کو ادا کیا جا سکتا ہے۔

مولانا سید سلیمان ندویؒ کی علمی خدمات کا صحیح اندازہ لگانے کے لیے نظر ان کی تصانیف تک محدود نہیں رہنی چاہیے، معارف میں ان کے مقالات، شذرات، اخبار علمیہ ان کے انداز فکر اور وسیع معلومات کے آئینہ دار ہیں، خود معارف نے جو مقام پیدا کیا، وہ مولانا سید سلیمان ندویؒ کی مساعی کا رہین منت ہے، مولانا ابوالکلام آزاد نے ایک بار کہا تھا کہ "بحمداللہ

مولانا شبلیؒ کی تمنائیں رائگاں نہ گئیں۔"

حقیقت یہ ہے کہ مولانا سید سلیمان ندویؒ نے سیر، تاریخ، ادب، ہر میدان میں اپنی تحقیق اور معلومات کے نہ مٹنے والے نقش چھوڑے ہیں، اس صدی کے نصف اول میں ان کی شخصیت علوم اسلامی کی جوئے شیر بن کر کوہ و صحرا کو سیراب کرتی نظر آتی ہے، اقبالؔ نے سچ کہا ہے

خرید سکتے ہیں دنیا میں عشرتِ پرویز
خدا کی دین ہے سرمایۂ غمِ فرہاد

حیات سلیمان

مؤلفہ مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی

جانشین شبلی اور معمار دارالمصنفین علامہ سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ کے سوانح وحالات اور ان کے گوناگوں مذہبی، علمی، تعلیمی، ملی، سیاسی خدمات اور کارناموں کا دلآویز مرقع، اسلوب اور طرز انشاء اور تحقیق و تلاش و جستجو کے لحاظ سے حیات شبلی کا ثانی، دلکش، دلچسپ، دل پذیر اور قابل مطالعہ، جس میں ان کے پورے دور کی تمام ملی و قومی و سیاسی و ادبی و لسانی تحریکوں کی تفصیل کے ساتھ دارالمصنفین کی تاسیس، اس کے عہد بہ عہد ترقی کی روداد، قیام بھوپال، مختلف وفود کے رکن و صدر کی حیثیت سے سفر یورپ، سفر حجاز، سفر افغانستان، سفر پاکستان اور چند روزہ علالت کے بعد وفات اور تدفین وغیرہ کے حالات بھی آ گئے ہیں۔

قیمت:۔ ۴۳ روپیے

"منیجر"

وراقت کتابت منزل بمنزل

از : مولانا محمد عبد الحلیم چشتی، کانو، نائیجیریا

(۳)

عہد عباسی کے کتب فروشوں کی خصوصیات

(۱) اس دور میں کتب فروش، و وراق عام طور پر عالم ہوتے تھے، وہ کتابیں صحیح نقل کرکے مناسب داموں پر فروخت کرتے قدردانوں اور ضرورت مندوں کی علمی ضروریات کی تکمیل کرتے، پسندیدہ کتابیں مہیا کرتے تھے، طلب و رسد کے فروغ اور علوم و فنون کی نشر و اشاعت کی غرض سے دلال کتب، اہل علم، اہل خیر اور شائقین کتب کے مکانوں پر کتابیں پہنچاتے تھے، چنانچہ وراقوں کی جماعت ابونصر سہل بن مرزبان تریلی نیشاپوری کے محل سرا میں کتابیں دکھانے آتی تھی،[۱] یاقوت رومی، جمال الدین قفطی کو کتابیں پہنچاتے تھے،[۲] اہل علم جہاں کہیں جاتے کتابیں نقل کرنے کے لیے وراقوں کی جماعت ساتھ لیجاتے تھے۔[۳]

۲۔ عہد عباسی میں بعض کتب فروش اور وراق کتابوں کی تجارت ہی نہیں کرتے بلکہ گوناگوں موضوعات پر تحقیقی و علمی کتابیں بھی تصنیف و تالیف کرتے تھے جیسے یاقوت رومی وغیرہ

۳۔ دور عباسی میں بعض کتب فروشوں نے تجارت کتب کے ساتھ علم کتاب داری کو بھی بہت ترقی دی چنانچہ ابن الندیم وراق نے چوتھی صدی ہجری میں عربی زبان کی قومی کتابیات (بمعنی عام) (National Bibliography) "الفہرست" مرتب کی جس میں

---

[۱] یتیمۃ الدہر للثعالبی ج ۲ ص ۲۹۲ [۲] معجم الادباء ج ۵ ص ۴۸۴ [۳] الانساب للسمعانی ورق ۳۵۳۔

عباسی قلمرو کے علمی و تحقیقی سرمایہ خاص طور پر دارالخلافہ بغداد اور موصل وغیرہ کا جائزہ پیش کیا اور ان کتابوں کا جو اس کی نظر سے گذری تھیں کہیں اجمالی اور کہیں تفصیلی تعارف کرایا، مصنفین کے حالات بھی قلمبند کئے، جس سے چوتھی صدی ہجری تک گوناگوں علوم و فنون اور ہر علم کے مختلف شعبوں میں جو کتابیں لکھی گئی تھیں ان کے متعلق بیش قیمت معلومات ملتی ہیں، اور معلوم ہوتا ہے کہ گوناگوں اصناف علوم پر کتنی تالیفات ہو چکی تھیں۔

۴۔ عہد عباسی کے بعض وراق نے وراقت کے پیشہ کے ساتھ علوم و فنون کا نہایت مبسوط دائرۃ المعارف بھی ترتیب دیا تھا، چنانچہ ابوالوفا علی بن عقیل بغدادی المتوفی ۵۱۳ھ نے اسلامی تاریخ میں کتاب الفنون کے نام سے نہایت جامع دائرۃ المعارف تالیف کیا تھا، جس کے متعلق ارباب تذکرہ کا بیان ہے، کہ یہ دو سو اور آٹھ سو مجلدات کے مابین تھا۔[۱]

۵۔ عہد عباسی کے وراق ابن الندیم وغیرہ کتابوں کے اندرونی اسرار و خزائن سے بھی اچھی طرح واقف ہوتے تھے، اور اپنی کتابیات کے ذریعہ اہل علم کو بھی باخبر رکھنے کی کوشش کرتے تھے۔[۲]

وراق و کتب فروش عالم کے علمی و ادبی ذوق سے اس کی اولاد اور خاندان بھی متاثر ہوتا تھا، چنانچہ اندلس کے اندر چوتھی صدی ہجری میں تاجر کتب ابا دبن عبداللہ عوفی وادی اشی کی دو بیٹیاں حمدہ اور زینب بلند پایہ شاعرہ تھیں، حمدہ خنساء مغرب کے لقب سے ممتاز تھیں اور دیگر اصناف علوم میں ماہر تھیں۔[۳]

۶۔ گشتی اشاعت، عہد عباسی کے وراقوں نے گشتی اشاعت کتب mov able Pub-lishing)

---

[۱] کتاب الذیل علی طبقات الحنابلہ لابن رجب القاہرہ ۱۳۷۲ھ ج ۱ ص ۵۶ علامہ عبدالعزیز المیمنی جو راقم السطور کے پاس محفوظ ہے، [۲] تقریظ بر مقالہ عہد رسالت سے دور اموی تک اسلامی کتب خانوں کا ارتقاء [۳] معجم الادبا ج ۳ ص ۲۴۴ نفحات الرحیات المکتبی ج ۱ ص ۹۸ [۴] نفح الطیب للمقری ص ۳۳-۳۵ اعلام النساء لکحالہ ج ۱ ص ۲۹۲-۲۹۳، ج ۲ ص ۱۵ شلبی
Ameer ali A short history of the Saraceens 1961. P. 569-

کا آغاز کیا، چنانچہ وراقوں کی جماعت اہل علم کے ہمراہ جاتی اور کتابیں نقل کرکے شائع کرتی تھی۔[1]
ازمنۂ قدیمہ ومتوسطہ میں یہ تو ہوتا تھا کہ ایک منزل پر کوئی معبد و محل یا ادارہ ہوتا، اس میں کاتب خود اپنے فن کا مظاہرہ کرتا تھا لیکن ان ادوار قدیمہ ومتوسطہ میں کہیں بھی ایسی کوئی مثال نہیں ملتی کہ کاتب وخوشنویس (Scribe) جماعتوں کی صورت میں ایک جگہ سے دوسری جگہ اپنا کام کرتے ہوئے جاتے ہوں، اور منزلوں پر منزلیں طے کرتے، اپنا ہنر جاری رکھتے ہوں، اس سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ تحریک ابلاغ علم وکتب کی ابتداء اسلام سے ہوئی، اور مسلمانوں نے علم کی تلاش میں کوچہ، شہر، ملک ہی نہیں بر اعظموں کو بھی چھان مارا تھا۔ ان کا یہ سیر وسفر خالی نہیں ہوتا تھا، وہ اگر خود خطاط نہیں ہوتے تھے تو اپنے ساتھ وراق وخطاط رکھتے تھے، وہ جگہ جگہ کتابیں نقل کرتے رہتے۔ اس طرح ان کے فن کی بھی نمائش ہوتی رہتی تھی۔[2]

عہد عباسی میں تجارت کتب فن کی حیثیت سے اتنی ترقی کر چکی تھی کہ بقول بعض ابن الندیم کو بک سیلر کیٹلاگ (Book-Seller catalogue) تیار کرنا پڑا تھا، لہٰذا اس کیٹلاگ کے اسباب وعلل میں صرف تجارت ونفع اندوزی کارفرما تھی، بلکہ علم کتابداری کی تاریخ میں بک سیلر کیٹلاگ کی ابتداء اسی "الفہرست" سے قرار پاتی ہے۔ ابن الندیم نے اس میں بعض کتب اور مصنفین کے متعلق بیاض اس لیے چھوڑی تھی کہ وہ اس کے تجربہ ومشاہدہ میں نہیں آئے تھے، ان مقامات پر نہ وہ خود جا سکا تھا نہ وہ ان مصنفین سے مل سکا تھا، نہ ان کتابوں کو دیکھ سکا تھا، نہ وہ ان کے متعلق اپنے دوستوں سے معلومات حاصل کر سکا تھا، لہٰذا دیانتدارانہ طور پر اس نے ان مقامات کو چھوڑ دیا تھا[3]، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کتابیات کی ترتیب میں دیانتداری کے

---

[1] الانساب للسمعانی، ورق ۳۰۳، و ۴۵۶) ۔ تذکرۃ الحفاظ للذہبی ج ۲ ص ۵۰۹ [2] ایضاً

[3] الفہرست لابن الندیم، ۲۳۹، ۲۵۲، ۲۵۴، ۲۵۶، ۲۵۸، ۲۵۹، ۲۶۲، ۲۶۴، ۲۶۸، ۲۶۹، ۲۷۲، ۲۷۴، ۲۶۹، ۲۸۱، ۲۸۳، ۲۸۶، ۲۸۹، ۲۹۱، ۲۹۲، ۲۹۸، ۳۰۲، ۳۰۵، ۳۰۶، ۳۱۵، ۳۱۶، ۳۱۸، ۳۲۸، ۳۳۹، ۳۷۰، ۳۸۱، ۳۹۰، ۳۹۴، ۳۹۵، ۴۱۳، ۴۱۴۔

پہلو کو ملحوظ رکھا جاتا تھا، بہرحال ہمارے مذکورہ بالا ادعا کے جملہ نتائج کی تصدیق ابن کریم بھی کرتا ہے وہ ابن الندیم کے متعلق کہتا ہے،

"اسلام سے پہلے کی تاریخ میں یہ باتیں ہمیں کسی کتب فروش کے بارے میں نہیں ملتی ہیں"۔[۵]

عہد عباسی کے کتب فروشوں اور وراقوں کی یہ وہ خصوصیات و کارنامے ہیں جو اپنی مثال آپ ہیں، بعض قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ عہد عباسی کے تاجروں میں ضابطۂ اخلاق وغیرہ بھی پایا جاتا تھا، جس کا سرسری سا جائزہ پیش کیا جاتا ہے۔

۱۔ ضابطۂ اخلاق (Code of Ethics) گو آج مرتب شکل میں ہمارے پاس موجود نہیں لیکن وہ کوڈ (Code) ہی تھا، جس کی وجہ سے جعل سازیاں منظر عام پہ آتی تھیں اور ایک تاجر سے دوسرے تاجر کو یہ خبریں پہنچتی تھیں، چنانچہ وہ اس قسم کے کام کے لیے خاص الفاظ جیسے وضع، تمزید، اختلاق، انتحال اور ایسے افراد کے لیے "واضع" مختلق، منتحل و متزید کے اصطلاحی الفاظ بول کر ایک دوسرے کو صورت حال سے باخبر کرتے تھے۔ محدثین اور وراقوں میں ان کا استعمال زیادہ پایا جاتا ہے، اس طرح اہل علم اور وراقوں کو جلد ہی ان جعل سازوں اور ان کی جعل سازیوں کا علم ہو جاتا تھا حالانکہ اس دور میں آج کل کے ذرائع ابلاغ یکسر مفقود تھے۔[۶]

۲۔ تحقیق اور جائزہ (Need of Research and Surveys)

فن کتب فروشی میں تحقیق و جائزہ کی ابتدا مسلمانوں نے کی تھی، وہ اس دور میں کتب خانوں کا جائزہ لینے کی بھرپور کوشش کرتے تھے، جن کا مظاہرہ ان الفاظ سے ہوتا ہے جو وہ کتب خانوں کے ذخائر کی کمیت و کیفیت کی نشان دہی کے لیے استعمال کرتے تھے، یہ نشان دہی جائزہ کے

---

[۵] مسلمانوں کی صنعت و حرفت، و زراعت، ص ۶۶ - ۷۰، [۶] ابن الندیم، ص ۱۲۹ و ۳۵۵ (تلخیص)

بیز ناممکن تھی، اس لیے یہ کہا جاسکتا ہے، کہ ان کا سہرا بھی مسلمانوں کے سر ہے جس کی تفصیل باب اول میں گزر چکی ہے۔

یہاں یہ امر بھی ملحوظ خاطر رہنا چاہئیے کہ یہ جائزہ صرف اہل علم اور شائقین کتب ہی نہیں لیتے تھے، بلکہ وراق و کتب فروش بھی لیتے تھے، چنانچہ اہل علم اور شائقین کتب کے مرنے کے بعد ان کے ذخائر کتب کی تعداد کے بارے میں ان کے پاس معلومات ہوتی تھیں، اس لئے انھیں سودا کرنے میں آسانی ہوتی تھی[1]، اس سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے، کہ عہد عباسی کے وراقوں میں اس امر کا شعور موجود تھا کہ وہ کاروباری اصول کے تحت فن کتب فروشی ہی پر نظر نہیں رکھتے تھے، بلکہ کتابیاتی نقطۂ نگاہ سے بھی ان کی نظر اتنی گہری ہوتی تھی کہ وہ جعل سازوں سے جلد واقف ہو جاتے تھے، اور ان کے استحصال کا تدارک کرنے کے لئے اہل علم کو اس صورت حال سے آگاہ کرتے تھے، جعل سازی اور جعل سازوں کے لئے ان کے اصطلاحی الفاظ اس امر کا بین ثبوت ہیں۔

کتابیات، مختصرات و دیگر حوالہ جاتی مواد

عہد عباسی میں ذخائر کی وسعت کے پیش نظر ان کا احاطہ کرنے کے لیے کتابیات کی داغ بیل پڑ چکی تھی، مختصرات (Abstracts) اور کتابیات (Bibliography) کا رواج عام ہو گیا تھا۔ یونین کیٹلاگ بھی تیار کیا جانے لگا تھا جس کا ایک ابتدائی نمونہ ابن الندیم کی الفہرست ہے، ہر فن کی مصطلحات فن پر علیحدہ مختصر رسالے لکھے جانے لگے تھے، جیسے ابن سینا کا رسالہ الحدود جو فن طب کی مصطلحات میں ہے، ابوالبرکات نسفی کی طلبۃ الطلبہ اور خوارزمی کی مفاتیح العلوم بھی اسی نوع کی کتابیں ہیں، جو طبع ہو چکی ہیں نیز ہر قسم کی معلومات کے لیے دائرۃ المعارف بھی مرتب کیے جاتے تھے۔

---

[1] انباہ الرواۃ۔ للقفطی ج ۲ ص ۶۲

۳۔ اجتماعی تشہیر (Cooperative Advertisement) عہد عباسی میں املا و روایت کے ذریعہ اجتماعی تشہیر کی جاتی تھی، اس کا مرکز مسجدیں، املا کی مجالس و درسگاہیں تھیں، سوق الوراقین کے وراق، گماشتے اور دلال کتب متن کے بارے میں تبصرے کرتے تھے، ان سے کتابوں کی تشہیر ہوتی تھی، اور ان مراکز میں اہتمام کے گماشتوں، وراقوں اور دلالوں کی آمد و رفت اجتماعی تشہیر کا باعث تھی، محلسرا اور دربار میں وراق خبریں اور کتابیں پہنچاتے تھے۔[3]

اس طرح وراقوں کی معرفت کتابوں کی انفرادی و اجتماعی تشہیر کا سلسلہ جاری تھا۔

۴۔ مختلف مسلک و نظریات رکھنے والی جماعتیں جیسے معتزلہ، ناصبیہ، حشویہ وغیرہ حکومت کا تعاون سے فن تجارت کتب کو بڑھانے کے لیے تعاون کرتی تھیں، چنانچہ معتزلہ کے ہمنوا فرمانروا اس مسلک کو فروغ دیتے، ان کی سرپرستی کرتے، ان کے مسلک کی کتابیں خرید کر جمع کرتے تھے،[4] اور ہم مذاق بادشاہوں، وزیروں کی وجہ سے انھیں ایک گونہ سرکاری سرپرستی حاصل تھی،[5] حکومت کتابیں خرید کر شاہی خزانۃ الکتب میں ذخیرہ کرتی، پھر عوامی کتب خانوں، نامور عالموں کو کتابیں اور مصحف پہنچاتی تھی،[6] حکومت خود کتابیں اور شرحیں لکھواتی، ان پر وظائف دیتی تھی،[7] ان کی مرویات اور کتب کو وقف عام کراتی تھی،[8] چنانچہ فرار کو بیت الحکمہ میں کتابیں املا کرانے کے لئے رکھا گیا تھا۔[9]

۱؎ تاریخ بغداد، ج ۱۴ ص ۵۰ ۲؎ معجم الادباء ج ۵ ص ۴۰۴، اعلام النبلاء للطباخ ج ۴ ص ۲۷۲
۳؎ رسائل الخوارزمی، ص ۲۱۲، الخطط المقریزیہ ج ۲ ص ۲۵۰، ۴؎ تاریخ بغداد ج ۱۰ ص ۶، کتاب بغداد لابن طیفور ص ۱۸۱، النجوم الزاہرہ ج ۲ ص ۲۱۳، ۵؎ مرآۃ الزمان لسبط ابن الجوزی، ج ۸ ق ۲ ص ۱۳۱-۱۳۹، الوافی بالوفیات ج ۲ ص ۲۶ ۶؎ الفہرست لابن الندیم ص ۱۰، ۷؎ معجم الادباء ج ۱ ص ۵۰ انباہ الرواۃ للقفطی ج ۱ ص ۱۳۳ ۸؎ جذوۃ المقتبس للحمیدی ص ۱۱ و ۱۲، البیان المغرب لابن عذاری ج ۱ ص ۵۲ الوافی بالوفیات ج ۳ ص ۲۳۵ ۹؎ تاریخ بغداد ج ۱۴ ص ۱۵۰۔

زجاجی کو جامع المنطق کی شرح لکھنے پر دو درہم روزانہ وظیفہ جاری کیا گیا تھا[1] موطا کی تالیف پر منصور نے سرکاری تعاون کی یقین دہانی کرائی تھی[2] لیکن امام موصوف نے اپنے مسلک کا سب کو پابند کرنے سے گریز کیا، اور سرکاری پیشکش کو قبول نہیں کیا تھا[3] بقی بن مخلد المتوفی ۲۷۶ھ کو ان کے مشرق (ایشیا) سے لائے ہوئے علمی ذخیرے کو وقف عام کرنے کا حکم دیا گیا تھا[4]

عہد عباسی کے معیاری ناشرین | عہد عباسی میں اسلامی قلمرو میں حسب ذیل قسم کے ناشرین کو معیاری و مستند ناشرین کی حیثیت حاصل تھی، ان کی لکھی ہوئی اور شائع کی ہوئی کتابوں کو صحت و ضبط میں استناد کا درجہ حاصل تھا، ان کی لکھی ہوئی کتابوں پر لوگ ٹوٹے پڑتے تھے[5]

۱۔ مصنفین و شارحین، اپنی کتابوں کے مستند ناشر تھے۔ جو کتابیں وہ املاء کراتے تھے، یا ان کی تصنیفات اور شرحیں جو ان کی زیر نگرانی نقل کی جاتی تھیں اور ان پر ان کے دستخط ثبت ہوتے تھے، وہ جامع معیاری و مستند نسخے سمجھے جاتے تھے[6]

۲۔ صاحب طرز خوشنویس جیسے ابن مقلہ ابن البواب وغیرہ

۳۔ نامور خوشنویس اور کاتب[7]

۴۔ درست نویس[8]

۵۔ علماء اور مصنفین کے وراق[9]

---

[1] الفہرست لابن الندیم ص ۹۰ معجم الادباء ج ۱۱ ص ۵۵، انباہ الرواۃ للقفطی ج ۱ ص ۱۱۲ [2] المدارک للقاضی عیاض ج ۱ ص ۱۹۱، ۱۹۲ [3] ایضاً جامع بیان العلم لابن عبد البر ج ۱ ص ۱۳۲۔ تزیین الممالک للسیوطی ص ۴۶ [4] جذوۃ المقتبس ص ۱۷۱، ۱۷۲، البیان المغرب لابن عذاری ج ۱ ص ۵۷، الوافی بالوفیات ج ۳ ص ۲۵۵ [5] انباہ الرواۃ للقفطی ج ۱ ص ۳۳۲ [6] معجم الادباء ج ۹ ص ۲۲۲ [7] ترجمہ الالباء ص ۳۰۳، انباہ الرواۃ للقفطی ج ۲ ص ۳۱۵، معجم الادباء ج ۵ ص ۱۴۲ [8] معجم الادباء ج ۲ ص ۱۳۱ [9] الوافی بالوفیات ج ۲ ص ۳۴۳۔ معجم الادباء ج ۶ ص ۶۵-۶۶۔

۳۔ نسخے ضابط اشکال الفاظ صحت کے ساتھ اعراب لگانے والے، اہل علم

۴۔ روایان کتب جیسے امام بخاری کے شاگرد فربری وغیرہ کے نسخے[1] یا ابوعبید کی کتابوں کے صحیح کے ایڈیشن، ابوعبیدہ معمر کے تلمیذ ابوغسان کے ایڈیشن۔

۵۔ خاص خاص اصناف علم کے ناشر جیسے ابوسعید حسن بن حسین سکری المتوفی ۲۷۵ھ دواوین عرب کا ناشر تھا، یہ جس کا دیوان لکھتا اس کے کلام کا کوئی حصہ چھوڑتا نہ تھا[2]

ابو یحیٰی زکریا بن یحیٰی جاحظ کی کتابوں کا ناشر تھا[3]

۶۔ وہ ارباب تدریس جن کے پاس اہل علم سفر کر کے آتے تھے وہ اپنی مرویات اور اپنے اساتذہ کی تالیفات کے مستند ناشر تھے، ان کے تلامذہ میں بعض ان کتابوں کے ناشر تھے، وہ کتابیں لکھتے نقل کرکے بیچتے بھی تھے۔

عہد عباسی میں اسلامی قلمرو میں، فروغ تجارت کتب کے عوامل حسب ذیل تھے۔

۱۔ مسلمانوں میں کتاب وسنت سے جذباتی لگاؤ نے کتابی صورت میں علوم وفنون کی نشر واشاعت کا بے پایاں جذبہ پیدا کیا۔

۲۔ روز افزوں تعلیمی حلقوں کی وسعت اور نصابی وغیر نصابی کتب کی طلب،

۳۔ علمی وتحقیقی ضروریات کی تکمیل کے لیے کتابوں کی ضرورت۔

۴۔ وقف کے ترقی پذیر سلسلے کی فراوانی۔

۵۔ ہدایا

۶۔ جمع کتب کا شوق۔

۷۔ بڑے پیمانے پر کتب خانوں کے قیام کا اہتمام۔

---

[1] فتح الباری، ج ۲ ص ۵۵ [2] معجم الادباء ج ۳ ص ۶۲ [3] ایضاً ج ۶ ص ۷۵۔

۸۔ مکانی زیبائش کے لیے کتابوں کی احتیاج

۹۔ وراقت و کتابت کا سودمند ذریعۂ معاش کی حیثیت اختیار کر جانا۔

۱۰۔ وراقت و کتابت کا معاشرہ میں منفعت بخش کاروبار کے علاوہ تحقیق و تسکین ذوق کا بھی اہم ذریعہ بن جانا۔

ان حقائق کی روشنی میں وان کریمر کا یہ کہنا۔

"اس سے معلوم ہوتا ہے کہ خالص تجارتی نقطۂ نظر سے کتابوں کی تجارت کتنی تھی، اور اس نے کتنی ترقی کی تھی"[۵۱]

ہمارے اخذ کئے ہوئے نتائج کی تصدیق کرتا ہے۔

<u>اشاعت کتب کی صورتیں</u> | اوائل عہد عباسی میں کتابوں کی نشر و اشاعت کی منجملہ اور صورتوں کے ایک صورت یہ بھی تھی کہ مولف اپنی تالیفات خود خواہشمندوں تک پہنچاتا تھا، چنانچہ ابوعمرو اسحاق بن مرار شیبانی المتوفی سنہ ۲۱۰ھ نے اسّی سے اوپر شعرائے عرب کا کلام مدون کیا تھا، موصوف کا معمول تھا کہ جس قبیلے کے شاعر کا کلام قلمبند کرتے اسی کے قبیلہ میں خود پہنچاتے تھے اس سے اس کے دیوان کی خوب اشاعت ہوتی تھی[۵۲] اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اوائل عہد عباسی میں اسّی قبیلوں میں ہر قبیلے میں کتب خانے کے قیام کے لیے موصوف کی بے نظیر خدمات ناقابل فراموش ہیں۔

عہد عباسی میں کتابوں کی توسیع و اشاعت میں اجازت روایت کتب نے بھی نہایت اہم کردار ادا کیا ہے، "اجازہ" قابلیت کی سند و اجازت جو استاد کی علمی املاک کے تصرف کو ثابت کرتی تھی کبھی تحریری ہوتی کبھی "وراثۃ" اور کبھی بالواسطہ پہنچتی تھی[۵۳]، یہ کبھی اول کتاب میں،

---

۵۱ مسلمانوں کی صنعت و حرفت، زراعت تجارت از وان کریمر ترجمہ جمیل الرحمٰن، ص ۸۲۔

۵۲ تاریخ بغداد، ج ۶، ص ۳۳۰۔

کبھی آخر کتاب میں اور کبھی جداگانہ ورق پر لکھی جاتی، اس پر استاد کے دستخط ثبت ہوتے تھے۔ محدثین نے اجازہ کی جو گوناگوں صورتیں روا رکھی ہیں، ان سے علوم و کتب کی مستند نشر و اشاعت ہوئی، محدثین نے اجازہ کی جو صورتیں بیان کی ہیں وہ درج ذیل ہیں۔

۱۔ شیخ کتاب کو سنکر یا پڑھ کر یا پڑھوا کر طالب کو زبانی روایت کتاب کی اجازت دے یہ اجازت بالمشافہ ہے۔[۱]

۲۔ شیخ اگر لکھ کر اجازت دے تو اسے اجازت بالمکاتبہ کہا جاتا ہے۔

۳۔ شیخ اگر اپنا اصلی نسخہ یا اس کی نقل طالب کو دے یا طالب کے پاس جو اصلی نسخہ شیخ کا ہو اسے لے کر طالب دے تو اسے مناولہ کہا جاتا ہے، خواہ مالک بنائے خواہ عاریۃً دے تاکہ طالب اس کو نقل کر کے اس کا مقابلہ کر لے۔[۲]

۴۔ کسی طالب کو اگر کوئی ایسی کتاب کہیں سے مل گئی جس کا کاتب کوئی معلوم محدث ہو تو اسے وجادہ کہا جاتا ہے، اس میں طالب وجدت بخط فلاں (میں نے فلاں کے قلم سے لکھا ہوا پایا) لکھکر ہی روایت کر سکتا ہے، ایسی صورت میں اخبرنی فلاں (مجھے فلاں نے خبر دی) کے الفاظ سے روایت کرنا جائز نہیں۔[۳]

۵۔ کسی محدث نے بوقت وفات یا بوقت سفر کسی کو وصیت کی کہ میری یہ کتاب

---

[۱] الالماع للقاضی عیاض، ص ۶۹-۷۹، معرفۃ علوم الحدیث للحاکم، ص ۲۵۶-۲۶۱، المحدث الفاصل الرامہرمزی، ص ۴۴۰، مقدمۃ ابن الصلاح، ص ۱۴۳-۱۴۶، الباعث الحثیث لاحمد محمد شاکر ص ۱۱۹-۱۲۱، توضیح الافکار للامیر الصنعانی، ج ۲ ص ۳۰۵-۳۰۰ [۲] الالماع للقاضی عیاض، ص ۸۰، الکفایۃ للخطیب ص ۳۳۰، توضیح الافکار للامیر، ج ۲ ص ۳۲۵ [۳] المحدث الفاصل الرامہرمزی، ص ۴۵۰-۴۵۸، الالماع ص ۱۱۵، علوم الحدیث لابن الصلاح، ص ۱۶۰ تا ۱۶۳ و ۱۷۶، الباعث الحثیث، ص ۱۲۷، تدریب الراوی للسیوطی، ج ۲ ص ۴۰-۴۴، توضیح الافکار للامیر الصنعانی، ج ۲ ص ۳۴۴۔

یا کتابیں فلاں شخص کو دی جائیں تو اسے وصیۃ بالکتاب کہا جاتا ہے، متقدمین ایک فریق صرف وصیت سے موصی لہ کے واسطے ان کتابوں سے روایت کرنا جائز سمجھتا ہے، مگر جمہور اس کی اجازت نہیں دیتے۔[4]

۶۔ اگر کسی شخص نے یہ کہا "میں نے فلاں شہر والوں کو اجازت دی" اس میں چونکہ ایک قسم کا انحصار ہے، اس بنا پر اس شہر والوں کو اس سے روایت کرنا درست ہے۔[5]

اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ محدثین نے چند معمولی احتیاط کے ساتھ ہر ممکن صورت میں علم کے ابلاغ اور کتاب کی نشر و اشاعت کی سعی بلیغ کی ہے، اسی لئے محدثین کے یہاں کتب خانوں کی تعداد سب سے زیادہ رہی ہے۔

عہد عباسی کے ابتدائی دور میں زنادقہ کے تخریبی ادب سے بھی کتابوں کی اشاعت بڑھی تھی، زندیقوں نے اسلام کا لبادہ اوڑھ کر ملحدانہ نظریات کی اشاعت کے لیے تصنیف و تالیف کا سلسلہ شروع کیا، وہ اپنے ناپاک عزائم کی تکمیل کی خاطر کتابیں نہایت نفیس کاغذ، بہترین سیاہی اور بہترین خط میں لکھوا کر کھلی مارکیٹ میں لانے لگے تاکہ ان کی کتابیں نفاست، خوبصورتی اور حسن خط کی وجہ سے بلا روک ٹوک کتب خانوں اور شائقین کتب کے گھروں میں پہنچیں اور اہل علم کی مرکز توجہ بنیں، اس طرح ان کے افکار و نظریات کی تشہیر ہوتی تھی۔

اشاعت کتب کی موڈرن ٹیکنیک کی بنیاد عہد عباسی میں

اس ترقی یافتہ دور میں کتابوں کی نکاسی کے موثر ذرائع اور کامیاب ترین ٹیکنیک، بہتر کاغذ کا استعمال، بہتر سیاہی، بہتر کتابت و طباعت

---

[4] الالماع، ص ۱۱۵-۱۱۶، ما لا یسع المحدث جہلہ لعمر المیانجی تحقیق صبحی سامرائی، بغداد، شرکۃ الطبع والنشر الاھلیۃ ۱۳۸۶ھ ص، مقدمہ ابن الصلاح، ص ۱۶۶-۱۶۸، المحدث الفاصل الرامہرمزی، ص ۴۵۹-۴۶۰، تدریب الراوی ج ۲ ص ۴۳-۴۴، الکفایہ فی علوم الروایہ، ص ۳۵۲۔ [5] الالماع ص ۱۰۴۔

اور وہ تہذیب گیٹ اپ (Cut-up) خوبصورت روشنائی اور جلد کی وہ شان جو عہد عباسی کے اوائل میں زنادقہ کی سرگرمیوں سے معراج کمال کو پہنچ گئی تھی، جاحظ کا بیان ہے،

"زنادقہ کی کتابیں بہترین سفید کاغذ پہ نہایت عمدہ سیاہی سے بہت نفیس خط میں لکھی جاتی تھیں[۱] حالانکہ ان کی کتابیں علم و حکمت سے خالی ہوتی ہیں، نہ ان میں کوئی کمادت ہوتی ہے، نہ کوئی اچھی بات ملتی ہے، نہ کوئی ادبی صفت پائی جاتی ہے، اور نہ کوئی حکمت و فلسفہ ہوتا ہے، نہ کوئی کلامی مسئلہ ان میں نظر آتا ہے، نہ کسی صنعت کی تعریف ہے، نہ کسی اوزار کے بنانے کی ترکیب لکھی ہے، نہ کھیتی باڑی کی تعلیم ہے، نہ فن حرب کی تدابیر سے بحث ہوتی ہے، نہ مذہبی مناظروں سے کوئی تعرض ہوتا ہے، وہ نور و ظلمت کے ذکر سے بھری ہوتی ہے شیاطین کی افزائش نسل کی داستان جن و بھوت کے جنسی طریقوں کے بیان سے پُر ہوتی ہیں، یہ سب فضول، بیکار باتیں ہیں، خرافات ہیں، ہنسی ٹھٹھے کے قصے ہیں، ان میں نہ کوئی اچھی نصیحت ملتی ہے، نہ کوئی دلچسپ خبر، نہ معاش کی تدابیر سے بحث ہوتی ہے، نہ سیاست عامہ کا ذکر اور نہ کوئی خاص ترتیب پر وہ مبنی ہوتی ہیں، اب دیکھو کونسی کتاب سب سے زیادہ جاہل رکھنے والی ہے۔"[۲]

لغو اور مخرب اخلاق لٹریچر پر پابندی اسلامی تعلیمات پر مبنی ادب کی حفاظت اس کی ذخیرہ سازی شریعت کی رو سے نہایت پسندیدہ اقدام ہے، یہ حالات کے پیش نظر کبھی فرض و واجب کبھی مستحب اور کبھی مباح ہوتی ہے،[۳] جس ادب سے قوم میں تفرقہ و اختلاف رونما ہونے کا خطرہ ہو،[۴] یا وہ اخلاق پر برا اثر ڈالتا ہو، اسے پروان چڑھانے کی اسلام میں کوئی گنجائش نہیں ایسے گمراہ کن ادب پر پابندی لگائی جاتی ہے، اسے کوئی تباہ کرتا ہے تو اس پر شرعاً جرمانہ بھی نہیں آتا۔[۵] کیونکہ اس قسم کے لٹریچر سے معاشرہ بگڑتا ہے

[۱] کتاب الحیوان، الجاحظ، ج ۱ ص ۵۵، ضحی الاسلام لاحمد امین ج ۱ ص ۔۔۔ الجاحظ کتاب الحیوان ج ۱ ص ۔۔۔

[۲] الطرق الحکمیۃ فی السیاسۃ الشرعیۃ لابن القیم تحقیق محمد جمیل غازی القاہرۃ مطبعۃ المدنی ۱۳۸۱ھ ص ۳۴۳

[۳] ایضاً ص ۳۰۰ [۴] ایضاً ص ۳۰۰

اور لوگوں کی اخلاقی حالت برباد ہوتی ہے، اس وجہ سے علماء زنادقہ کے لغو، مخرب اخلاق اور تخریبی لٹریچر پر پابندی کا حکومت سے مطالبہ کرتے تھے۔ پھر حکومت ان کی کتابوں کو نذر آتش کراتی تھی، یہی وہ زریں و رہنما اصول ہے جس کی بنیاد تیسری صدی ہجری کے اوائل میں مسلمانوں نے رکھی تھی، اور آج بھی دنیا میں اس پر عمل کیا جاتا ہے، چنانچہ اس ترقی یافتہ دور میں بھی سوقیانہ ادب و مخرب اخلاق کتابوں کی اشاعت کی حکومت اجازت نہیں دیتی، اور ایسی کتابیں قابل ضبطی قرار دیتی ہے، نیز پڑھا لکھا طبقہ بھی اس کو ناقابل التفات سمجھتا ہے، کیونکہ یہ خرافات کا پلندہ ہوتا ہے، اس سے معاشرتی زندگی میں بگاڑ پیدا ہوتا ہے، اسلام نے مسلمانوں کو ان باتوں سے روکا ہے۔

اوائل عہد عباسی کے پسندیدہ و مروج علوم

اوائل عہد عباسی میں حدیث، فقہ، ادب، فلسفہ و حکمت اور صنعت و حرفت سے متعلق علوم کا چرچا تھا، اور اسی قسم کی کتابوں کو پسند کیا جاتا تھا، اس امر کا اندازہ ایک نامور ناقد پاکستانی ابراہیم بن السندی کے زنادقہ کی کتابوں پر تبصرہ سے کیا جا سکتا ہے، وہ کہتا ہے۔

> "زنادقہ کی کتابیں ان انواع علوم و معارف سے خالی ہوتی ہیں جن کا عوام میں چلن اور مانگ ہے، وہ حکمت کی، فلسفہ کی، فقہ حدیث کی، ادب کی اور رہنمائی کی کتابیں ہیں، ایسی کتابیں پسند کی جاتی ہیں، جن کا تعلق لوگوں کی صنعت حرفت، تجارت اور کامرس سے، ریاضیات و ارتفاقات سے ہے، یہ علوم میں بیدار مغزی، اور آداب کا موجب ہیں۔"[1]

ان انواع علوم کے علاوہ دوسری کتابوں پر رقم خرچ کرنا مفید و سود مند نہیں سمجھا جاتا تھا[2]

---

[1] کتاب الحیوان للجاحظ، ج ۱ ص ۵۵ [2] ایضاً ص ۵۶۔

جو کتابیں مذکورۂ بالا معلومات کی حامل نہیں ہوتی تھیں انھیں غیر مفید، مضر و مخرب اخلاق کتابیں تصور کیا جاتا تھا[1]، اور آج بھی ناقابل التفات سمجھا جاتا ہے اور ان پر پابندی عائد کی جاتی ہے۔

اسلام میں تبصرہ | اسلام میں ائمہ جرح و تعدیل نے تبصرہ کا آغاز کیا، انھوں نے اہل علم کے اخلاق اور ان کے علمی کارناموں پر سب سے پہلے نقد و تبصرہ کیا تاکہ جس حد تک ان سے استفادہ ممکن ہو کیا جا سکے عہد عباسی میں بالغ نظر فن دان، تبصرہ نگاروں کا مختصر تبصرہ قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا، اور اسے تذکرہ و تراجم کی کتابوں میں نقل کیا جاتا تھا جیسا کہ ابن ابی حاتم کی کتاب الجرح والتعدیل، خطیب کی تاریخ بغداد، سمعانی کی کتاب الانساب، معاجم و اثبات شیوخ اور کتب فہارس سے عیاں ہے، یہ تبصرے اجمالی بھی کئے جاتے تھے، اور تفصیلی بھی، اجمالی، مثلاً علم اور جملہ تالیفات کے متعلق ایک آدھ فقرہ، دوسرے بعض کتاب کے لیے جداگانہ و تفصیلی، ہر کتاب کے لیے جدا تبصرہ ہوتا تھا، اس نوع کے تبصرے تعارف انتخاب کتب و خریداری اور اضافۂ کتب میں رہنمائی کرتے تھے۔

ارباب فن اور ان کے علمی کارناموں پر ابراہیم حربی کا تبصرہ "اہل بصرہ اہل عربیت ہیں، ان میں اصحاب اہوا ہیں مگر چار اصحاب سنت ہیں (۱) ابو عمرو بن العلاء (۲) خلیل بن احمد (۳) یونس بن حبیب (۴) اصمعی[2]۔ اس تبصرہ کی وجہ سے اہل سنت ان کو سند سمجھتے، ان کی تالیفات سے اعتنار کرتے انھیں جمع کرتے اور کتب خانوں کی زینت بناتے تھے، حافظ حمیدی کا علوم و کتب پر تبصرہ علم علل کے موضوع پر سب سے بہتر دار قطنی کی کتاب اور علم المؤتلف والمختلف پر بہترین تصنیف امیر ابن ماکولا کی ہے، وفیات الشیوخ کے موضوع پر کوئی کتاب نہیں ہے، میں نے چاہا کہ میں اس موضوع پر کتاب لکھوں تو امیر ابن ماکولا نے اس کو حروف معجم پر

---

[1] کتاب الحیوان للجاحظ ۱۵ص، ۵۔ [2] تاریخ بغداد الخطیب ج ۱ ص ۱۸۰، ۲۰ معجم الادباء، ج ۱، ص ۵۹ تذکرۃ ذہبی۔ ج ۴ ص ۱۲۲۰۔

ترتیب دے کر سنن پر مرتب کر دیا[۵۱]

انفرادی کتاب پر اجمالی تبصرہ مثلاً خطیب کا بیان ہے کہ میں نے کتاب التاریخ ابن ابی خیثمہ سے زیادہ فوائد کے اعتبار سے کوئی کتاب نہیں دیکھی[۵۲]۔ یا مثلاً عبداللہ بن المبارک المتوفی ۱۸۱ھ کا قول ہے کہ ابو حمزہ محمد سکری المتوفی ۱۶۷ھ اور ابن طہمان صحیح الکتب تھے[۵۳]۔ یا مثلاً صاعد بن احمد جیانی کا قول ہے کہ قدیم و جدید علوم میں فن کی جامع تین کتابیں ہیں، ایک بطلیموس کی ہیئت افلاک میں، دوسری ارسطاطالیس کی علم منطق میں، تیسری سیبویہ بصری کی الکتاب ہے[۵۴]۔ یا مثلاً ابو علی حسن بن داؤد المتوفی کہتے تھے کہ اہل بصرہ کو حسب ذیل چار کتابوں پر ناز ہے۔ (۱) جاحظ کی کتاب البیان والتبیین اور اس کی کتاب الحیوان۔ (۲) سیبویہ کی الکتاب (۳) خلیل کی کتاب العین اور (۴) حرام و حلال کے ساٹھ ہزار مسائل جنھیں امام محمد نے قیاس عقلی سے لکھا اور لوگوں کو ان سے استغنا نہیں، اور فراء اور ابن الاعرابی کی تصانیف[۵۵]۔

<u>انتخاب و خریداری کتب</u> عہد عباسی میں عالمگیر تحریک کتب خانہ سازی اور عوامل و محرکات کتب خانہ کے گذشتہ مباحث سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ کتابوں کی خریداری کی معاشرہ میں حوصلہ افزائی کی جاتی تھی، تحصیل علم کے زمانے میں جبکہ جامعات میں ہر طالب علم کو کتب خانے سے مطالعہ کے لیے درسی وغیرہ درسی کتابیں مفت مہیا کی جاتی تھیں، طلبہ کو درسی کتابیں خریدنے کی ترغیب دی جاتی، اور خرید کتب کے جذبہ کو ابھارا جاتا تھا[۵۶]۔ علماء نے تصریح کی ہے

---

۵۱ کتاب الصلۃ لابن بشکوال، ج ۱ ص ۲۰۰، ۵۲ تاریخ بغداد للخطیب ج ۴ ص ۱۶۳ ۵۳ ایضاً ج ۳ ص ۲۶۹، ۲۷۰ ۵۴ معجم الادباء لیاقوت ج ۷ ص ۸۲ ۵۵ تاریخ بغداد للخطیب ج ۲ ص ۱۷۷، ۵۶ تذکرۃ السامع والمتکلم لابن جماعہ۔ ص ۱۶۴

کہ اگر کوئی کتاب خریدنے کی استطاعت رکھتا ہے، تو کتابیں نقل کرنے میں وقت صرف نہیں کرنا چاہیے، اور نہ کتاب کو عاریت پر لینا چاہیے۔[1] اس سے ثابت ہوتا ہے کہ درسی کتب کو خریدنے کے اصول کی بنیاد عہد عباسی میں رکھی گئی تھی۔

عہد عباسی میں اہل علم کو کتابیں خریدنے سے قلبی مسرت ہوتی تھی، وہ کتابوں پر "ملکتہا والحمد للہ" (اللہ کا شکر ہے اس نے مجھے اس کتاب کا مالک بنایا)، اور "والنسخۃ عندی وللہ الحمد" کے الفاظ لکھ کر اس علمی نعمت کے ملنے پر خدا کا شکر ادا کرتے اور چند توصیفی کلمات کہہ کر اپنے شوق و روحانی مسرت کا اظہار کرتے تھے،[2] اگر کوئی عالم کسی اچھے خطاط و ضابط کی لکھی ہوئی کتاب کا مالک ہوجاتا تو وہ گویا، شاہ آل بویہ سے مقابلہ کرتا تھا۔[3] یہ کتابوں کی خریداری سے اعتنا کی دلیل ہے۔[4]

کتابوں کی خریداری کوئی اپنے لیے کرے یا کسی ادارے کے لیے خریدے وہ ان اصول کو ملحوظ رکھتا تھا، جن کا تذکرہ "گران قیمت کتب" کے زیر عنوان کیا گیا ہے، انتخاب و خریداری میں انہی اقسام کی کتابوں کو ترجیح دی جاتی تھی، ذاتی، سرکاری و عوامی کتب خانوں میں بعض کتابوں کے کئی کئی، بعض کے دہائیوں،[5] اور بعض کے سینکڑوں کی تعداد میں نسخے جمع کئے جاتے تھے۔[6]

عہد عباسی میں یا دوسری صدی ہجری میں کتابوں کی خریداری اتنی بڑھ گئی تھی کہ کتابوں کے خریدنے (Acquisition) سے پہلے پانچ رہنما اصول کو سامنے رکھا جاتا تھا

۱؎ تذکرۃ السامع والمتکلم لابن جماعہ، ص ۱۶۴، ۲؎ انباہ الرواۃ للقفطی، ج ۲ ص ۱۳۰، ۱۸۰

۳؎ ایضاً ص ۱۴۹، ۴؎ تذکرۃ السامع والمتکلم ص ۱۶۴ ۵؎ الخطط المقریزی ج ۲ ص ۳۴۰

۶؎ ایضاً

(۱) ان کے اوّل و آخر اور درمیانی حصے کو دیکھا جاتا۔ (۲) ابواب اور کراسوں کی جانچ پڑتال کی جاتی چنانچہ امام شافعی المتوفی سنہ ۲۰۴ھ فرماتے تھے کہ کتاب کو دیکھا کر اس میں (۳) الحاق (۴) اصلاح و (۵) وصحت کے آثار پاؤ تو یہ اس کی صحت کی دلیل ہے اور بعض علماء کہتے تھے کہ کتاب میں روشنی اصلاح و درستی سے آتی ہے[۱]، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ انتخاب خرید کتب میں مذکورۂ بالا رہنما اصول کو بھی ملحوظ رکھا جاتا تھا۔

مذکورۂ بالا وجوہ سے عہد عباسی میں صحت وضبط، الفاظ کا درست املاء اور صحیح اعراب ہی قلمی کتابوں کی صحت کا صحیح معیار تھا، تذکرہ نگار ایسے فنکاروں کے تذکرے میں ان کی اس فنکارانہ مہارت کی طرف اشارہ کرتے ہیں، اس لیے کہ انتخاب کتب میں اس پہلو کو پیش نظر رکھا جاتا تھا، چنانچہ بعض بلاد کے اہل علم کا ضبط پست و کمزور ہوتا تو اس کی نشاندہی کی جاتی تھی چنانچہ ابن الفرضی نے محمد بن احمد قیروانی المعروف بابن الخزاز المتوفی سنہ ۳۹۵ھ کے متعلق تصریح کی ہے۔

کان خطہ ضعیفا وضبطہ کضبط القرویین۔[۲]	موصوف کا خط زوردار نہیں تھا ان کا ضبط بھی اہل قیروان کا سا پست درجے کا ضبط تھا۔

اس لئے اس امر کی تصریح کی جاتی تھی کہ فلاں فلاں کی تصحیح کردہ کتابیں حجت وسند میں اعلیٰ درجہ رکھتی ہیں، مثلاً ابن بشکوال نے ابو علی حسین غسانی قرطبی المتوفی سنہ ۴۹۸ھ کے متعلق لکھا ہے۔

صحح من الکتب من لم یصححہ غیرہ من الحفاظ کتبہ حجۃ بالغۃ۔[۳]	موصوف نے کتب حدیث کی اتنی تصحیح کرائی ہے کہ حفاظ میں ان کے علاوہ کسی نے نہیں کرائی، انکی درست کرائی ہوئی کتابیں

۱؎ تذکرۃ السامع والمتکلم ص ۱۰۰، ۱۰۳، ۲؎ تاریخ العلماء الرواۃ لابن الفرضی، طبع مصر، ج ۲ ص ۱۱۳ ۳؎ کتاب الصلۃ لابن بشکوال، ج ۱ ص ۱۴۲۔

یا مثلاً ابن الفرضی نے ابو عمر یوسف ملی المتوفی ۳۷۲ھ کے متعلق لکھا ہے۔

کان حسن الخط، جید الضبط — موصوف اچھے خوشنویس تھے الفاظ کو

اماما فی ھذا الفن[1] — اچھی طرح ضبط کرتے تھے اور اس

فن میں امام تھے۔

انتخاب و خرید کتب میں مدد کی غرض سے ارباب تذکرہ صاحب طرز خطاطوں کے طرز خط سے واقفیت کی بنا پر ان ارباب کمال کی نشاندہی کرتے تھے، جو استادانِ فن کی تحریریں اور نمونہائے خط اپنے ذخائر میں جمع کرتے تھے، تاکہ وقت ضرورت مقابلہ کر کے خط کو دیکھا جا سکے۔ چنانچہ ثعالبی نے ابو محمد یحییٰ بن عبد اللہ ارزلی بغدادی کے متعلق جو ادیب و شاعر تھا، تصریح کی ہے کہ موصوف کے پاس بغداد میں اس قسم کا ذخیرہ محفوظ تھا۔[2]

صاحب طرز خطاط کی لکھی ہوئی کتاب کو پسند کیا جاتا یہ گراں قیمت میں ملتی تھی، اس لئے کہ صاحب طرز خطاط اگر کوئی رقعہ کسی امیر کو لکھکر بھیجتا، انعام سے سرفراز کیا جاتا تھا، چنانچہ فاطمہ بنت علی المعروف بنت اقرع المتوفیہ ۴۸۰ھ جو ابن البواب کی روش پر لکھتی تھی، ایک مرتبہ ایک رقعہ لکھکر عمید الملک کو بھیجا تو اس نے انھیں ایک ہزار دینار بھیجے تھے۔[3] اس لئے تذکرہ نگار بسا اوقات صاحب طرز و زود نویس خطاط کی لکھی ہوئی کتابوں کی تعداد کی طرف اشارہ کر جاتے ہیں، تاکہ ان کی بکثرت لکھی ہوئی کتابوں کو دیکھکر انتخاب و خرید کتب کے موقعہ پر شک نہ ہو، چنانچہ عبد الرحمن بن احمد شیرازی المعروف بعطار المتوفی ۴۲۵ھ کے متعلق تصریح کی گئی ہے، کہ موصوف نے اپنے قلم سے ایک ہزار مجلدات لکھی تھیں۔[4] ابو العرب محمد بن احمد تمیمی المتوفی ۳۳۳ھ حافظ حدیث، فقیہ، زود نویس و بسیار نویس نے ساڑھے تین ہزار کتابیں

---

[1] تاریخ العلماء والرواۃ تاریخ الفرضی ج ۲ ص ۲۰۵ [2] تتمۃ الیتیمۃ للثعالبی ج ۲ ص ۱۰۲ [3] البدایہ والنہایہ لابن کثیر ج ۱۲ ص ۱۳۴ [4] فوات الوفیات لکتبی ج ۱ ص ۵۵۰ - ۵۵۸۔

اپنے قلم سے لکھی تھیں[1]۔

اگر کوئی صاحب طرز خطاط ادیب لغوی ونحوی بھی ہوتا تو اس کی نقل کی ہوئی کتاب کو زیادہ اہمیت حاصل ہوتی تھی، اس کے خریدار زیادہ ہوتے تھے، چنانچہ ابو الحسن علی بن نصر بن تقی مصری المتوفی ۳۵۳ھ کا لکھا ہوا، الجمہرہ لابن درید کا نسخہ جلال کبلی بغدادی کے ترکہ میں محکمۂ وظائف مصر کے نگراں منقذ تبریزی نے مصر میں بیس دینار میں خریدا تھا۔ یہ بھی انھیں اس منصب پر ممتاز ہونے کی وجہ سے سستا ملا تھا، ورنہ اس کی قیمت زیادہ ملتی[2]، یا مثلاً یاقوت موصلی المتوفی ۶۱۸ھ کا جو اپنے وقت کا نامور ادیب وصاحب طرز خطاط تھا، خط نسخ میں صحاح جوہری کا لکھا ہوا نسخہ سو دینار میں بکتا تھا[3]، اس وجہ سے ادیبوں کے ساتھ صاحب طرز و نامور خوشنویسوں کا تذکرہ بھی کیا جاتا تھا[4]، اور جو ارباب کمال مشرقی ومغربی دونوں خطوں میں خوب لکھتے تھے، جیسے ابو الحکم ابن غلندہ اشبیلی المتوفی ۵۸۱ھ ان کی نشاندہی کی جاتی تھی[5]، جو اہل علم اور وراق قابل خواندگی خط میں لکھتے تھے، مثلاً قاضی ابو جعفر محمد بن اسحاق بن علی بجائی زوزنی المتوفی ۴۶۳ھ ادب کی صحیح وقابل خواندگی خط میں کتابیں نقل کرتے تھے[6]، چنانچہ مورخ عبد الغافر فارسی نے موصوف کے ہاتھ کی لکھا ہوا، ثعالبی کی کتاب یتیمۃ الدھر کا نسخہ دیکھا تھا، جو تیس دینار نیشاپوری میں فروخت ہوا تھا، حالانکہ وہ اس سے زیادہ قیمت کا تھا[7]۔

---

[1] طبقات علماء افریقیہ وتونس تالیف ابو العرب محمد التمیمی والی تحقیق علی الشابی ونعیم حسن الیافی بیروت الدار التونسیہ ۱۹۶۸ء ص ۲۴۳ ۔ والمقدمہ بالدیباج المذہب لابن فرحون ص ۲۵۰ ۔ [2] انباہ الرواۃ القفطی ج ۲ ص ۳۲۳ معجم الادباء لیاقوت، ج ۵ ص ۲۴۴ ـ ۳۳۲ (لمہ) معجم البلدان ج ۲ ص ۴۰۳ ـ [3] بغیۃ الوعاۃ للسیوطی، جلد ۲ ص ۱۱ [4] وفیات الاعیان لابن خلکان ج ۲ ص ۲۰۴ البدایہ والنہایہ لابن کثیر ج ۱۳ ص ۹۶ [5] شذرات الذہب لابن العماد، ج ۵ ص ۳۸ [6] ابن خلکان ج ۲ ص ۱۰۳ العبر للذہبی ج ۴ ص ۲۶ [7] معجم الادباء۔ لیاقوت ج ۴ ص ۱۳۱
[8] ایضاً ج ۲ ص ۴۰۰ [9] ایضاً ،،

مذکورۂ بالا واقعہ سے معلوم ہوا کہ جو اہل علم حدیث یا فقہ یا لغت و ادب یا اور کسی فن کی کتابیں لکھنے میں ممتاز ہوتے تھے، ان کی اس خصوصیت کی طرف اشارہ کرتے تھے، اس لئے کہ یہ باتیں انتخاب کتب و خرید کتب (Acquisition) میں اہل علم اور خازنوں کی رہنمائی کرتی تھیں نقطے اور اعراب کو بھی، انتخاب و خرید کتب میں ملحوظ رکھا جاتا تھا، جو ارباب کمال اس فن میں ممتاز ہوتے تھے، انھیں النقاط کہا جاتا تھا،[۱] نقطے اور اعراب کے لگائے جانے سے کتاب کی زینت و آرایش بڑھ جاتی تھی، اس لئے وہ گراں قیمت میں فروخت ہوتی تھی، اور انتخاب میں اسے ترجیح حاصل رہتی تھی، چنانچہ کتب تاریخ و سیر میں اہل علم و ارباب کمال کے اس پہلو کی طرف بھی اشارہ کیا جاتا تھا۔[۲]

اس طرح مصور کتاب سے بھی کتاب کی زیب و زینت میں غیر معمولی اضافہ ہوتا ہے، اسے بھی انتخاب میں ترجیح حاصل رہتی تھی، چنانچہ محمد بن احمد المعروف با بن صابر المتوفی ۶۲۳ھ دواوین کو بالتصویر شائع کرتے تھے[۳] لیکن یہ بہ خط (سقیم الخط) ، غلط نویس، بسیار نویس، اہل علم کی نقل کردہ کتاب کو پسند نہیں کیا جاتا تھا، اس لئے ایسے عالم، ادیب اور نحوی کی اس کمزوری کی طرف بھی ارباب تذکرہ اشارہ کرتے ہیں۔[۴] اسی طرح جو عالم و کاتب نقل میں جملے اور عبارت چھوڑ جاتا تھا اس کی اس کوتاہی کو بھی بتاتے ہیں۔[۵]

عہد عباسی میں کتب خانوں میں انتخاب و خرید کتب میں کتابوں کے کامل نسخوں کی خریداری پر زور دیا جاتا تھا، لیکن بعض شوقین اور قدردان علم و فن محترم (سوراخ زدہ) کٹی ہوئی اور معیوب کتابیں بھی خرید کر محفوظ کرتے تھے، اس لیے بعض اوقات محقق کو تحقیق

---

[۱] الانساب، للسمعانی، ورق ۵۵۱، [۲] فوات الوفیات للکتبی، ج ۱ ص ۲۱۰، العبر للذہبی ج ۵ ص ۶
[۳] الوافی بالوفیات للصفدی، ج ۲ ص ۱۰۳، [۴] معجم الادباء لیاقوت ج ۴ ص ۲۴۲، [۵] ایضاً ج ۵ ص ۲۳

طلب امور ان میں بھی مل جاتے تھے، اور مکمل نسخوں کی غیر موجودگی میں ناقص نسخے بھی فائدے سے خالی نہیں ہوتے تھے، قاضی فاضل نے اسی مقصد کے پیش نظر اپنے کتب خانے میں مخروطات خرید کر محفوظ کی تھیں، لیکن یہ عمل دائمی نہ تھا، اگر کتاب صحیح و سالم اور نقائص سے مبرا میسر آنے کا کوئی امکان ہوتا تو مخروطات کو نظر انداز کیا جاتا تھا۔

عہد عباسی میں انتخاب و خرید کتب کی یہ دو خصوصیات ہیں جن کی ہم نے تاریخی شواہد کی روشنی میں پہلی مرتبہ نشاندہی کی اُن کا احاطہ کیا، اور انھیں مرتب کیا ہے، یہ دو خصوصیات اور رہنما اصول ہیں جن میں بعض کو اس دور میں بھی (Acquisition) میں اہمیت حاصل ہے۔[۲]

مذکورہ بالا امور سے ثابت ہوتا ہے کہ انتخاب و خرید کتب میں مذکورہ بالا رہنما اصول کو بھی ملحوظ رکھا جاتا تھا، چنانچہ مندرجہ بالا مباحث سے عہد عباسی میں کاغذ سازی، خوشنویسی کتاب سازی و بازار کتب کی علمی و ثقافتی حیثیت تجارت کتب کے فروغ کے اسباب، عہد عباسی کے معیاری ناشرین، ارزاں و گراں قیمت کتابوں کے عوامل، انتخاب کتب کے اصول و مبادی سے بحث کی گئی ہے، جن سے عہد عباسی میں کتاب سازی کے ان مراحل کا بخوبی علم ہو جاتا ہے، جن سے کتاب کو کتب خانہ میں پہنچنے سے پہلے تیاری میں گزرنا پڑتا تھا، اس سے عہد عباسی میں کتاب سازی کے معیار پر روشنی پڑتی ہے، اس کی استنادی و تحقیقی حیثیت بھی واضح ہو جاتی ہے، اور یہ حقیقت بھی نمایاں ہو جاتی ہے کہ مسلمانوں کی صنعت کاغذ سازی نے علوم کے ذخائر کو عام کیا، اور کتابیں عوام کے پاس ارزاں و مناسب داموں میں پہنچنے لگیں،

---

[۱] کتاب السلوک للمقریزی، ج ۱، ص ۹، ۲۸۰

[۲] Wright Howch, A rare book its essential qualifications, library Trends, Vol No. 4. April, 1957. P493-

جہالت کی تاریکیاں چھٹنے لگیں تعصب و اوہام پرستی کا خاتمہ ہوا۔

مسلمانوں نے علم کو مقدس فریضہ سمجھا، صنعت وراقت کو عبادت کا درجہ دے کر پروان چڑھایا، اور ٹیکس سے آزاد کرکے ہر کوہ مہ کے استفادہ کے لئے کھلے بازاروں میں فروخت کے لیے رکھا، اس سے کتابوں کی پیداوار میں غیر معمولی ترقی ہوئی۔ علم گھر گھر پہنچ سکا اور بلا امتیاز مذہب و ملت ہر ایک کو اس سے فائدہ پہنچا، بنی نوع انسان کی علمی اور تحقیقاتی سرگرمیاں پروان چڑھتی رہیں، علمی و ثقافتی ورثہ بآسانی نسلاً بعد نسل تیزی سے سینوں سے سفینوں میں منتقل ہوتا، اقلیموں اور شہروں میں پھیلتا اور پروان چڑھتا رہا، عہد عباسی میں اس کی کثرت ہوگئی۔ تو کتب خانوں میں اس کو جدا جدا رکھنے کے لیے انھیں مختلف درجوں میں تقسیم کرکے رکھا گیا، تاکہ اس سے استفادہ آسان ہوسکے اور ذخائر میں ہم آہنگی کے ساتھ ترتیب قائم رہے، اس ضرورت کے لیے عہد عباسی میں اسلامی قلمرو میں وقتاً فوقتاً علوم میں جو تنظیم و تنسیق کی گئی، اور علوم کو حسب ضرورت جن اہم شعبوں میں تقسیم کیا گیا تعمیم و تخصیص، تنویع و تقسیم کا جو عمل رونما ہوا وہ تنظیم (classification) کے نام سے موسوم ہے۔

(دار المصنفین کی نئی کتاب)

مولانا شبلی نعمانیؒ پر ایک نظر

اس میں حیات شبلی مولفہ مولانا سید سلیمان ندوی کی روشنی میں مولانا شبلی کے مختصر سوانح حیات کے علاوہ ان کی تمام اہم تصنیفات، ان کے مذہبی، ادبی، تعلیمی، تنقیدی، سیاسی اور فلسفیانہ مضامین کے مجموعوں، انکی زندگی کی اہم ترین مقدس کتاب سیرۃ النبیؐ خطبات، مکاتیب، کلیات فارسی و اردو کا جائزہ لیا گیا ہے اور ان میں سے ہر ایک پر تبصرہ کیا گیا ہے،

از۔ سید صباح الدین عبد الرحمٰن۔ قیمت ۱۵ روپے

اساتذۂ مولانا فراہیؒ

از۔ ڈاکٹر شرف الدین اصلاحی، اسلام آباد

یہ درست ہے کہ جب تک کسی کے اندر جوہر ذاتی نہ ہو فقط اوپر کی تعلیم و تربیت سے کچھ نہیں ہوتا، شعاع مہر شبنم کو اوپر اٹھا لیتی ہے، مگر نہال چمن کی ایک نونہال پتی کو نہیں اٹھا سکتی۔

نہ اٹھا جذبۂ خورشید سے اک برگ گل تک بھی
ہے یہ رفعت کی تمنا جو اڑا لیتی ہے شبنم کو

لیکن یہ بھی غلط نہیں کہ کتنے ہی جوہر قابل ذاتی صلاحیت کے باوجود اس لیے برباد ہو جاتے ہیں کہ ان کو پرورش و پرداخت اور تعلیم و تربیت کا صحیح ماحول میسر نہیں آتا۔ اگر یہ بات نہ ہوتی تو نیساں سے برسنے والے پانی کی ہر بوند سیپ کے پیٹ میں پرورش پانے سے پہلے خود بخود موتی بن جاتی لیکن معلوم ہے کہ ایسا نہیں ہوتا۔

آغوش صدف جسکے نصیبوں میں نہیں ہے
وہ قطرۂ نیساں کبھی بنتا نہیں گوہر

مولانا فراہیؒ کو مبدا ر فیاض نے ایک طرف دل و دماغ کی فطری صلاحیتوں سے نوازا تو دوسری طرف انھیں اپنے وقت کے بہترین اساتذہ کی مدد اور رہنمائی انتہائی سازگار ماحول میں حاصل ہوئی بچپن سے لے کر عنفوان شباب تک کا زمانہ جو تعلیم و تربیت کے لحاظ سے انسان کی زندگی کا بہترین زمانہ ہوتا ہے اس لحاظ سے قابل رشک حالات میں گذرا، انھوں نے ایک مثالی طالب علم کی حیثیت سے مثالی اساتذہ کے سامنے زانوے تلمذ تہہ کر کے یہ وقت بسر کیا جیسا کہ ہم تعلیم کے باب میں تفصیل سے ذکر کر آئے ہیں، ان کی تعلیم کا یہ دور محض اس لحاظ سے ممتاز نہیں تھا، کہ اس کے ہر ہر مرحلے پر انھیں اپنے فن میں یکتا و یگانہ مشاہیر علماء ہند کی شاگردی کا شرف حاصل رہا، بلکہ اس کا ایک امتیازی وصف یہ بھی تھا کہ

اوّل سے آخر تک انھوں نے انفرادی توجہ کے سایہ عاطفت میں اپنی تعلیم مکمل کی، ابتدا سے لیکر تکمیل تک وہ اپنے ہر استاد کی بارگاہ ادب میں تنہا بیٹھے نظر آتے ہیں تعلیم و تعلم کے اس طریقے میں جو خیر و برکت ہے وہ ظاہر ہے، اس سے تعلیم کی ترقی کی رفتار ہی نہیں اس کے معیار پر بھی خوشگوار اثر مرتب ہوتا ہے اور انسان اجتماعی تعلیم کی جملہ خرابیوں سے یکسر محفوظ رہتا ہے، اس کے لیے اچھی بری صحبت کا کوئی مسئلہ پیدا نہیں ہوتا، اس لیے ہم دیکھتے ہیں کہ مولانا سن رشد کو پہنچنے تک اپنے لائق اور شفیق اساتذہ کی نگرانی میں زیور تعلیم سے آراستہ ہوکر ایک صالح نوجوان کا روپ دھار لیتے ہیں، ان میں دل و دماغ کی اعلیٰ صلاحیتیں ان کے روشن مستقبل کی غمازی کرتی ہیں، طالب علم کی حیثیت سے وہ اپنے اساتذہ کے لیے سرمایہ افتخار ثابت ہوتے ہیں، جہاں وہ اپنے اساتذہ پر فخر کرتے ہیں، ان کے اساتذہ ان پر فخر کرتے ہیں۔

مولانا ایک ذہین طالب علم تھے، ذہانت کے ساتھ ان کے مزاج میں سنجیدگی بھی تھی۔ ایسے طالب علم معمولی صلاحیت کے استاذوں سے مطمئن نہیں ہوتے، مولانا کو شروع سے آخر تک جو اساتذہ ملے ان میں کوئی بھی دوسرے یا تیسرے درجے کا استاد نہیں تھا، ان میں سے بعض کے علم و فضل کے بارے میں مولانا کی اپنی شہادتیں بھی ملتی ہیں، جن کے بارے میں مولانا کی شہادت موجود نہیں، ان کے حالات بتاتے ہیں کہ وہ اوّل درجے کے استاد تھے، مولانا کے اساتذہ میں سے جن کے نام کا علم ہے، ان میں سے ہر ایک نہ صرف یہ کہ اپنے وقت کی ممتاز علمی شخصیت تھا، بلکہ اس کے پیچھے علمی روایات کی ایک تاریخ ہے جس کے باعث تاریخ میں اس کو شہرت عام اور بقائے دوام کا رتبہ حاصل ہوا، پوری صدی گذرنے کے بعد آج بھی دنیائے علم و ادب میں ان اساتذہ کی عزت و عظمت کا سکہ رواں ہے۔

جیسا کہ تعلیم کے باب میں ذکر کیا گیا، طالب علم کی حیثیت سے مولانا کی زندگی کے دو دور ہیں،

تعلیم کے دوسرے دور میں تصورِ تعلیم مقصدِ تعلیم اور منہجِ تعلیم ہر چیز پہلے دور سے اتنی مختلف ہے، کہ لفظ تعلیم کے سوا شاید ہی دوسری چیز ان دونوں کے درمیان قدرِ مشترک کہی جاسکے تعلیم کے اس دور میں استاد و شاگرد کا وہ تصور بھی مفقود ہے، جس کو انفرادی حیثیت میں زیرِ بحث لایا جاسکے۔ خاص مشرقی تصور کے مطابق تعلیم کے اس دور میں ایسی کوئی شخصیت نظر نہیں آتی جس کو پہلے دور کے اساتذہ کے دوش بدوش ہم اس باب میں جگہ دے سکیں، دوسرے دور کے برعکس پہلے دور کے تمام اساتذہ بلا استثنا مسلمان تھے، عالمِ دین تھے، وہ محض استاد نہیں دین اور علمِ دین کے داعی اور نقیب تھے، مولانا کے ذہنی ارتقاء اور فکری نشوونما میں ان کا حصہ وقیع ہے، مولانا کی شخصیت کا ہیولیٰ تیار کرنے میں انھوں نے نمایاں کردار ادا کیا، مولانا کے سیرت و کردار پر ان کے دیرپا بلکہ مستقل اثرات ہیں، یہ اثرات مثبت اور تعمیری ہیں، ان میں تواتر اور تسلسل ہے، ان کے ماضی حال اور مستقبل میں کوئی فرق و اختلاف نہیں، ان اثرات نے ملتِ بیضاء کے ساتھ مولانا کے رابطے کو نہ صرف قائم رکھا بلکہ اس کو اور استوار کیا، مولانا اسلامی دنیا کے لیے ایک امام اور فکری مجدد کی صورت میں جلوہ گر ہوئے تو یہ انہی اساتذہ کرام کا فیضان بے احسان تھا، انہیں کے فیضِ تربیت سے مولانا کے کردار میں وہ پختگی آئی کہ وہ اپنی تعلیم کے دوسرے دور میں مخالف ماحول کی مخالف اثرات سے نہ صرف یکسر محفوظ رہے، بلکہ وہاں سے نکلے تو اپنے رنگ میں پختہ تر ہو کر نکلے، اگر یہ مقولہ درست ہے کہ درخت اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہے، تو تعلیم کے پہلے دور کے اثرات و نتائج جہاں مولانا کی پوری زندگی پر محیط نظر آتے ہیں، وہاں دوسرے دور کے اثرات و نتائج معدوم نہیں تو موہوم نظر آتے ہیں، یہ بات ہم نے مولانا کی شخصیت کے حدودِ اربعہ کے اندر رہ کر اور ان کی داستانِ حیات کے اوراق پڑھ کر کہی ہے، جس کے شواہد بابِ تعلیم میں بکھرے پڑے ملیں گے، لیکن اگر کہیں ہم مولانا کی اپنی تصریحات کی میزان میں رکھ کر ان دونوں ادوار کی قدر و قیمت معلوم کریں

تو ہیں وہ حضرات دور کو شاید مولانا کی زندگی ہی سے خارج کرنا پڑے، اس لیے اس دور کے اساتذہ کا ذکر اگر اس باب میں نظر نہ آئے تو کمی محسوس کرنے کے باوجود ہم پر ایک سوانح نگار کی حیثیت سے غیر ذمہ داری یا بے انصافی کا الزام عائد نہ کیا جائے۔

حافظ احمد علی سکروری | مولانا فراہی کے معلوم اساتذہ میں سب سے پہلا نام حافظ احمد علی صاحب ساکن سکرور کا ہے، جن کی بارگاہ ادب میں بیٹھ کر مولانا نے قرآن حفظ کیا، اور حافظ ہوئے، نام کے علاوہ حافظ صاحب کے بارے میں خبر اور اثر کی حیثیت سے کچھ نہیں معلوم، حافظ صاحب کا گاؤں میرے گاؤں سے صرف تین میل دور ہے، پہلے اور دوسرے سفر میں مجھے اس کا موقع نہ تھا، بعد میں ہندوستان جانے کی صورت نہ بن سکی، ورنہ ممکن تھا، کہ ان کے گاؤں جا کر ان کے حالات معلوم کیے جاتے، تاہم قیاس کی مدد سے ان کے بارے میں کچھ نہ کچھ اندازہ لگایا جاسکتا ہے، آج کے زمانے میں حفظ اور حافظ کے متعلق جو تصورات ہیں وہ ہم لوگوں کے بچپن میں نہیں تھے، اور مولانا کے بچپن میں تو صورت حال اور بھی مختلف رہی ہوگی، اور پھر صوبہ یوپی کے ضلع اعظم گڈھ میں مسلمانوں کی کسی بستی میں، روایات اور اقدار کا جو نظام صد ہا برس سے قائم ہے، اس میں حافظ اور مولوی کا مقام بہت بلند ہے، مولانا رئیس زادے تھے، مگر انھوں نے سب سے پہلے حفظ کیا اور ایک حافظ کے سامنے زانوے ادب تہ کیا، یہ بات معلوم نہ ہونے کے باوجود یقینی ہے، کہ حافظ صاحب نے مولانا کو ان کے گھر پڑ کر تعلیم دی، میں نے اپنے بچپن میں بھی اس کی متعدد مثالیں دیکھی ہیں کہ شرفا کے ہاں بچوں کی تعلیم کے لیے جو اساتذہ رکھے جاتے تھے، ان کو استاد کا روایتی ادب و احترام دیا جاتا تھا، انھیں خادم یا ملازم نہیں بلکہ گھر بھر کا استاد سمجھا جاتا تھا، وہاں کی معاشرت میں حافظ ہونا اس بات کی ضمانت تصور کیا جاتا تھا، کہ وہ نیک صالح اور دیندار آدمی ہوگا، حافظ احمد علی صاحب کی شہرت ضلع میں عام ہوگی، ورنہ مولانا کے والد فاصلے کے باوجود ان کا انتخاب نہ کرتے۔

حافظ کی اور حفظ کرانے والے استاد کی جو فضیلت ہے، سب کو معلوم ہے، قرآن کی محبت جو مولانا فراہی کی کتاب حیات کا سب سے جلی عنوان ہے، اس کا بیج سب سے پہلے حافظ احمد علی صاحب نے بویا، مولانا نے اس وقت تک عربی نہیں پڑھی تھی، وہ قرآن کو سمجھ نہیں سکتے تھے، مگر قرآن کے تیس پارے جس شخص کے سینے میں محفوظ ہوں اس کا اثر اس کی زندگی پر نہ پڑے ناممکن ہے۔

مولوی محمد مہدی چاروی | مولوی محمد مہدی چاروی مولانا فراہی کے فارسی کے استاد تھے، ضلع اعظم گڈھ کی ایک بستی موضع چارہ کے رہنے والے تھے، جس کا فاصلہ مولانا فراہی کے گاؤں پھریہا سے نسبتہً زیادہ تھا، چارہ ضلع کی ایک معروف بستی ہے، اس کی خاک سے کئی ایسے فاضل اٹھے جن کے نام تذکروں میں ملتے ہیں، لیکن مولوی مہدی صاحب کے حالات بہت کم معلوم ہو سکے، اپنے شاگرد مولانا فراہی کی طرح وہ بھی گوشۂ گمنامی میں رہے۔ مولانا فراہی کی شہرت کے بعد ان کے استاد کی حیثیت سے اگر کسی نے اس طرف توجہ کی ہوتی تو اب بھی ان کے حالات کچھ نہ کچھ معلوم ہو سکتے ہیں[1] مولوی اور عالم ہونے کے علاوہ وہ ایک قادر الکلام شاعر بھی تھے، ان کے فارسی کلام کا کچھ نمونہ ہم نے تعلیم کے باب میں درج کیا ہے جس سے نہ صرف ان کی شاعرانہ عظمت بلکہ علمی تبحر خاص کر فارسی زبان و ادب میں ان کی استادانہ مہارت کا اندازہ ہوتا ہے، اب تک میری نظر میں ان کی سب سے بڑی فضیلت یہی تھی کہ وہ مولانا فراہی کے استاد تھے، مگر ان کی بیاض اور ان کا کلام دیکھ کر یہ احساس پیدا ہوتا ہے، کہ اگر وہ مولانا فراہی کے استاد نہ ہوتے تو بھی ان کا علمی و ادبی مقام اتنا بلند ہے کہ انھیں کم از کم اعظم گڈھ کے عام علماء اور شعراء میں خاص جگہ دی جائے۔ یہ ذکر تو ملتا ہے کہ انھوں نے مولانا فراہی کو فارسی پڑھائی، اور ہمارا خیال ہے کہ مولانا کی فارسیت تمام تر انھیں کے فیض تربیت کا نتیجہ ہے

---

[1] بہرحال مجھے اس کا موقع نہیں ملا۔ آئندہ مجھے ہندوستان جانے کا موقع ملا اور حالات نے اجازت دی تو امید ہے کہ کچھ کامیابی ہو۔

مگر مولانا کو شاعر بنانے میں یا ان کے ذوق شاعری کو ابھارنے اور نکھارنے میں ان کا کتنا ہاتھ ہے اس کی کوئی شہادت دستیاب نہیں، مگر عقلاً اور عادۃً یہ محال معلوم ہوتا ہے کہ ان جیسا باکمال مولانا کا استاد ہو اور ان پر مطلق اثر انداز نہ ہو، مولانا نے جس عمر میں ان سے پڑھا اثر پذیری کے اعتبار سے وہ زندگی کا بہت فعال زمانہ ہوتا ہے، لوہا پارس کو چھو جائے اور اس پر سونے کا رنگ نہ چڑھے، یہ ممکن نہیں، مولانا نے ۱۶ برس کی عمر میں متقدمین شعرائے فارسی کے رنگ میں قصیدہ کہنا شروع کر دیا، اس میں مولانا شبلی کی صحبت کے اثر کا اعتراف کر کے بھی یہ کہا جا سکتا ہے، کہ مولوی مہدی صاحب کی تعلیم و تربیت کو بھی ضرور اس میں دخل رہا ہوگا۔ مولانا کی شخصیت کے دو پہلو نہایت نمایاں ہیں علمی اور ادبی، علمی حیثیت سے فائدہ و استفادہ کو غیر یقینی کہہ سکتے ہیں، مگر ادبی حیثیت سے مولانا کی شخصیت کا ہیولیٰ تیار کرنے میں مولوی مہدی صاحب کے اثر و نفوذ کا انکار نہیں کیا جا سکتا۔

مولوی مہدی صاحب سے استفادہ کا زمانہ اگرچہ کم عمری کا ہے، اس وقت مولانا کی عمر گیارہ بارہ برس سے زیادہ نہ تھی، لیکن اگر سیکھنے والا اور سکھانے والا بیک وقت دونوں اپنی جگہ مستعد اور فعال ہوں تو نتیجہ ہمیشہ غیر معمولی صورت میں ظاہر ہوتا ہے، مولانا کی تعلیمی سرگذشت میں اس کی مثالیں کثرت سے ملتی ہیں، فارسی زبان میں مولانا کی مہارت اور ان کے شاعرانہ کمالات کا جائزہ بعد کے ابواب میں مناسب مقام پر لیا جائے گا، یہاں موقع کی مناسبت سے ہم اتنا کہنے پر اکتفا کرتے ہیں، کہ مولانا کی زباندانی اور شعر گوئی کی صلاحیت کو پروان چڑھانے میں مولوی مہدی صاحب کا حصہ بنیادی اہمیت کا حامل ہے، فی زمانہ جب کہ فارسی کا ذوق ختم ہو چکا ہے، اس کی اہمیت کا صحیح اندازہ شاید نہ لگایا جا سکے مگر آج سے سو سال پہلے جب کہ فارسی برصغیر کی علمی زبان تھی، پڑھا لکھا کہلانے کے لیے فارسی جاننا لازمی تصور کیا جاتا تھا، شرفاء کے گھروں میں

فارسی بولی جاتی تھی، بقول سجاد صاحب کے لوگ فارسی عربی پڑھ کر وکیل منصف اور جج بن جاتے تھے، اور انگریزی کی نمدا بھی اس کا سکہ رواں تھا، صورت حال آج سے بہت مختلف تھی، مجھے موقع ملا تو میں استاد فراہی مولوی محمد مہدی چتاردی کے حالات جمع کرنے کی کوشش کروں گا۔ انشاء اللہ[1]

مولانا شبلی نعمانی | مولانا فراہی کے اساتذہ میں مولانا شبلی کا نام اتنا بڑا ہے کہ ان کے وصف میں کچھ لکھتے ہوئے مجھے اپنی کوتاہ قلمی کا احساس ہوتا ہے، اس میں بڑائی کی جہتیں دو ہیں ایک تو خود مولانا شبلی کی بھاری بھرکم شخصیت کا حجم معنوی دوسرے مولانا فراہی کے ساتھ باعتبار کم وکیف ان کے تعلق کی خصوصی نوعیت، سو پہلی جہت کے متعلق یہاں کچھ لکھنا تحصیل حاصل ہے، کہ کتابی صورت میں ان کے حالات سے واقفیت کے لیے "حیات شبلی" کے ہزار صفحات پر کوئی اضافہ نہیں کیا جا سکتا، اور ان کے کارناموں سے براہ راست واقفیت کے لیے تشنگی داماں سے گلہ کرنے کی ضرورت پیش آتی ہے، علاوہ ازیں میرا خیال ہے کہ اس کتاب کے قارئین کی اکثریت جامع الصفات مولانا شبلی کی گوناگوں علمی جہات سے پہلے ہی بخوبی واقف ہوگی البتہ دوسری جہت کے تعلق سے کچھ نہ کچھ ضرور کہا جا سکتا ہے لیکن چونکہ اس نوع کے مطالب کے لیے ہم نے "فراہی اور شبلی" یا "شبلی اور فراہی" کے عنوان سے ایک علیحدہ باب مختص کر دیا ہے۔ کہ مواد کی افراط اسی کی مقتضی تھی، اس لیے اس باب میں محض خلا کو پر کرنے کے لیے مختصر ذکر ضروری سمجھا گیا، چونکہ اس باب میں مولانا شبلی کا ذکر فراہی کے استاد کی حیثیت سے ہے، اس لیے گفتگو کو اس دائرے تک محدود رکھنا ضروری ہے، مولانا شبلی نے

---

[1] جس وقت مجھے یہ منصوبہ تفویض کیا گیا تھا، خود فراہی سے مجھے کوئی دلچسپی نہ تھی، مگر اب میرا جی چاہتا ہے کہ مولوی مہدی صاحب پر بھی زیادہ نہیں تو ایک اچھا سا سوانحی مضمون لکھ کر ان کی فضیلت مآبی کو خراج تحسین پیش کروں،

فراہی کو بالکل نجی طور پر پڑھایا، درسیات کی تکمیل کے بعد جب تک عملی مشغلہ کا سلسلہ شروع نہیں ہوئی، مولانا شبلی کنبے اور قرابت کے لڑکوں کو پڑھاتے تھے، ان پڑھنے والوں میں سب سے نمایاں نام مولانا فراہی کا ہے، مولانا شبلی نے اپنے نامور اساتذہ کی نگرانی میں درس نظامیہ کی تکمیل کی، اور وہی متداول علوم انھوں نے مولانا فراہی کو پڑھائے، عربی اور اسلامی علوم کی بنیادی تعلیم تقریباً مکمل کرائی، مولانا شبلی خود ایک ذہین اور طباع انسان تھے ان کو شاگرد بھی ویسا ہی ذہین اور طباع ملا، خوش آئند نتیجہ نکلنا لابدی تھا، مولانا شبلی کی تربیت میں مولانا نے تیزی سے ترقی کے مدارج طے کیے، مولانا شبلی کی ذات میں مولانا کو ایک فاضل استاد ہی نہیں شفیق مربی بھی ملا، اساتذہ فراہی میں صرف مولانا شبلی کی ایک ذات ایسی ہے، جس سے انھوں نے کسی ایک مضمون میں نہیں کئی مضمونوں میں استفادہ کیا، اور اس اعتبار سے مولانا شبلی کی مدت افادہ بھی دوسرے اساتذہ کے مقابلے میں زیادہ ہے، مولانا فراہی نے اپنے جن اساتذہ کا نام لیا ہے ان میں مولانا شبلی کا نام سب سے نمایاں ہے، مولانا شبلی کا نام جس طرح مولانا فراہی کی زبان پر آتا ہے، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے دل میں ان کے لئے انتہائی عزت اور احترام کے جذبات رکھتے تھے، اسی طرح استاد کو شاگرد کے ساتھ جو تعلق خاطر تھا، اس کی مثالیں بھی کم ملتی ہیں، مکاتیب شبلی میں اس کے شواہد موجود ہیں۔

مولانا شبلی کی تعلیم نے مولانا کو ایک عالم دین کے قالب میں ڈھالا اور وہ بنیادیں استوار کیں جن پر فکر فراہی کی عظیم الشان عمارت تعمیر ہوئی، مولانا فراہی مولانا شبلی کے ساختہ پرداختہ ہیں، مولانا شبلی کی شاگردی میں رہ کر مولانا نے جو کچھ جس طرح پڑھا اس نے بڑی حد تک مولانا کی آئندہ زندگی کی راہیں متعین کر دیں، المعلم الامام عبدالحمید الفراہی کی مفکرانہ شخصیت

کہ داغ بیل ہیں پڑی، ممتاز عالم دین ہونے کے ساتھ مولانا شبلیؒ اعلیٰ درجے کے شاعر اور ادیب بھی تھے، یہ نہیں معلوم کہ مولانا نے مولانا شبلیؒ سے کبھی اصلاح بھی لی یا نہیں لیکن اتنا معلوم ہے کہ دونوں ایک دوسرے کو اپنا کلام بھیجتے تھے بعض واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ ابتدائی مشق کے زمانے میں مولانا فراہیؒ غالباً ان کو اپنا کلام دکھاتے بھی تھے۔ ۱۶ برس کی عمر میں مولانا فراہیؒ نے جب پہلا فارسی قصیدہ کہا تو اس وقت وہ اعظم گڈھ میں مولانا شبلیؒ سے پڑھتے تھے، اس لیے لازم ہے کہ وہ مولانا شبلیؒ سے مشورہ سخن بھی کرتے رہے ہوں گے، بہر حال اتنا طے ہے کہ مولانا شبلیؒ کی صحبت سے مولانا کو فائدہ پہنچا، مولوی مہدی صاحب کے بعد مولانا شبلیؒ بھی ان کو ایک ایسے استاد ملے جو اپنی جگہ ایک مانے ہوئے شاعر ادیب اور نقاد تھے، جس زمانہ میں مولانا طالب علم کی حیثیت سے ان کے پاس مقیم تھے، ان کی شعری و ادبی صلاحیتوں کو آپ سے آپ اشتعال مل ملی ہوگی۔

مولانا عبد الحیٔ فرنگی محلی | مولانا عبد الحیٔ فرنگی محلیؒ کے درس میں مولانا فراہیؒ کی شرکت خود مولانا کی تصریحات سے ثابت ہے، اس کی مدت خواہ کتنی ہی قلیل رہی ہو مولانا نے اپنے اساتذہ میں ان کا ذکر کیا ہے، مولانا عبد الحیٔ فقہ اور اصول فقہ کے استاد تھے، فقہ بہر حال ہماری دینی تعلیم کا ایک اہم جزء ہے۔ مولانا شبلیؒ سے متوسطات پڑھنے کے بعد مولانا کو تکمیل کا خیال ہوا تو مختلف علوم کے اہل کمال کی تلاش میں رخت سفر باندھا، لکھنؤ پہنچ کر مولانا عبد الحیٔؒ کے حلقہ درس میں بیٹھے، لیکن زیادہ دن وہاں نہیں رہے، مولانا عبد الحیٔؒ کے تلامذہ کی فہرست میں مولانا فراہیؒ کا نام نہیں آتا، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے باقاعدہ تکمیل نہیں کی اور فراغت سے پہلے چلے آئے۔ یہ اندازہ لگانا مشکل ہے، کہ مولانا فراہیؒ نے فرنگی محل سے کیا اثرات قبول کئے، اور وہاں سے وہ کس قسم کے تاثرات لیکر رخصت ہوئے، مولانا کے مسودات میں فقہ اور اصول فقہ سے متعلق بعض ناتمام کتابوں کے نام ملتے ہیں مثلاً، "الرائع فی اصول الشرائع" اور "فقہ القرآن" وغیرہ،

فراہی کو باقاعدہ بھی علوم پڑھایا، درسیات کی تکمیل کے بعد جب تک عملی زندگی کا آغاز نہیں ہوا تھا، مولانا شبلی کنبے اور قرابت کے لڑکوں کو پڑھاتے تھے، ان میں سب سے نمایاں نام مولانا فراہی کا ہے، مولانا شبلی نے اپنے نامور اساتذہ کی نگرانی میں درس نظامیہ کی تکمیل کی، اور وہی متداول علوم انھوں نے مولانا فراہی کو پڑھائے، عربی اور اسلامی علوم کی بنیادی تعلیم تقریباً مکمل کرائی، مولانا شبلی خود ایک ذہین اور طباع انسان تھے ان کو شاگرد بھی ویسا ہی ذہین اور طباع ملا، خوش آئند نتیجہ نکلنا لابدی تھا، مولانا شبلی کی تربیت میں مولانا نے تیزی سے ترقی کے مدارج طے کیے، مولانا شبلی کی ذات میں مولانا کو ایک فاضل استاد ہی نہیں شفیق مربی بھی ملا، اساتذہ فراہی میں صرف مولانا شبلی کی ایک ذات ایسی ہے، جس سے انھوں نے کسی ایک مضمون میں نہیں کئی مضمونوں میں استفادہ کیا، اور اس اعتبار سے مولانا شبلی کی مدت افادہ بھی دوسرے اساتذہ کے مقابلے میں زیادہ ہے، مولانا فراہی نے اپنے جن اساتذہ کا نام لیا ہے ان میں مولانا شبلی کا نام سب سے نمایاں ہے، مولانا شبلی کا نام جس طرح مولانا فراہی کی زبان پر آتا ہے، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے دل میں ان کے لیے انتہائی عزت اور احترام کے جذبات رکھتے تھے، اسی طرح استاد کو شاگرد کے ساتھ جو تعلق خاطر تھا، اس کی مثالیں بھی کم ملتی ہیں، مکاتیب شبلی میں اس کے شواہد موجود ہیں۔

مولانا شبلی کی تعلیم نے مولانا کو ایک عالم دین کے قالب میں ڈھالا اور وہ بنیادیں استوار کیں جن پر فکر فراہی کی عظیم الشان عمارت تعمیر ہوئی، مولانا فراہی مولانا شبلی کے ساختہ پرداختہ ہیں، مولانا شبلی کی شاگردی میں رہ کر مولانا نے جو کچھ جس طرح پڑھا اس نے بڑی حد تک مولانا کی آئندہ زندگی کی راہیں متعین کر دیں، المعلم الامام عبدالحمید الفراہی کی مفکرانہ شخصیت

کر اداغ بیں بیہیں پڑی، ممتاز عالم دین ہونے کے ساتھ مولانا شبلیؒ اعلیٰ درجے کے شاعر اور ادیب بھی تھے، یہ نہیں معلوم کہ مولانا نے مولانا شبلیؒ سے کبھی اصلاح بھی لی یا نہیں لیکن اتنا معلوم ہے کہ دونوں ایک دوسرے کو اپنا کلام بھیجتے تھے، بعض واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ ابتدائی مشق کے زمانے میں مولانا فراہیؒ غالباً ان کو اپنا کلام دکھاتے بھی تھے۔ ۱۶ برس کی عمر میں مولانا فراہیؒ نے جب پہلا فارسی قصیدہ کہا تو اس وقت وہ اعظم گڑھ میں مولانا شبلیؒ سے پڑھتے تھے، اس لیے لازم ہے کہ وہ مولانا شبلیؒ سے مشورۂ سخن بھی کرتے رہے ہوں گے، بہرحال اتنا طے ہے کہ مولانا شبلیؒ کی صحبت سے مولانا کو فائدہ پہنچا، مولوی مہدی صاحب کے بعد مولانا شبلیؒ بھی ان کو ایک ایسے استاد ملے جو اپنی جگہ ایک مانے ہوئے شاعر، ادیب اور نقاد تھے، جس زمانہ میں مولانا طالب علم کی حیثیت سے ان کے پاس مقیم تھے، ان کی شعری و ادبی صلاحیتوں کو آپ سے آپ اشتعال ملی ہوگی۔

مولانا عبدالحیؒ فرنگی محلی | مولانا عبدالحیؒ فرنگی محلیؒ کے درس میں مولانا فراہیؒ کی شرکت خود مولانا کی تصریحات سے ثابت ہے، اس کی مدت خواہ کتنی ہی قلیل رہی ہو مولانا نے اپنے اساتذہ میں ان کا ذکر کیا ہے، مولانا عبدالحیؒ فقہ اور اصول فقہ کے استاد تھے، فقہ بہرحال ہماری دینی تعلیم کا ایک اہم جزء ہے۔ مولانا شبلیؒ سے متوسطات پڑھنے کے بعد مولانا کو تکمیل کا خیال ہوا تو مختلف علوم کے اہل کمال کی تلاش میں رخت سفر باندھا، لکھنؤ پہنچ کر مولانا عبدالحیؒ کے حلقۂ درس میں بیٹھے، لیکن زیادہ دن وہاں نہیں رہے، مولانا عبدالحیؒ کے تلامذہ کی فہرست میں مولانا فراہیؒ کا نام نہیں آتا۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے باقاعدہ تکمیل نہیں کی اور فراغت سے پہلے چلے آئے۔ یہ اندازہ لگانا مشکل ہے، کہ مولانا فراہیؒ نے فرنگی محل سے کیا اثرات قبول کیے، اور وہاں سے وہ کس قسم کے تاثرات لیکر رخصت ہوئے، مولانا کے مسودات میں فقہ اور اصول فقہ سے متعلق بعض ناتمام کتابوں کے نام ملتے ہیں مثلاً "الرائع فی اصول الشرائع" اور "فقہ القرآن" وغیرہ،

جن کا ذکر تصانیف میں اور افکار کے ذیل میں آئے گا، اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ مولانا فراہیؒ فقہ کی اہمیت سے پوری طرح آگاہ تھے، لیکن یہ کہنا مشکل ہے کہ علمائے فرنگی محل اور ان کے فقہی مسلک کے بارے میں ان کے خیالات کی نوعیت کیا تھی؟ مولانا امین احسن اصلاحی کے خیال میں جیسا کہ تعلیم کے باب میں گزر چکا ہے، وہ فرنگی محل اور علمائے فرنگی محل سے متاثر نہیں تھے۔

مولانا ارشاد حسین رام پوری | مولانا ارشاد حسین رام پوری کا شمار وقت کے مشہور اساتذہ میں ہوتا ہے، مولانا شبلیؒ نے ان سے پڑھا تھا، مگر مولانا فراہیؒ کا استفادہ کسی دلیل قطعی سے ثابت نہیں، بعض راویوں نے بربنائے قیاس اس خیال کا اظہار کیا ہے، اس لیے جب تک تحقیق سے یہ ثابت نہ ہو جائے، کہ مولانا نے کچھ وقت ان کی خدمت میں بھی گزارا ان کا ذکر اس باب میں برائے بیت بھی ہو سکتا ہے۔

مولانا فیض الحسن سہارنپوری | مولانا فراہیؒ کے اساتذہ میں مولانا فیض الحسن سہارنپوریؒ بھی اپنے دور کے اہل کمال میں سے تھے، اور اپنے فن میں تو وہ یکتائے روزگار تھے، ان کا خاص میدان عربی ادب اور قرآن مجید ہے، ان کی تصانیف میں یہی دو مضمون نمایاں ہیں، پڑھاتے وہ عربی ادب تھے، خاص کر ادب جاہلی پر ان کی نظر وسیع اور گہری تھی، برصغیر میں شعرائے جاہلیت اور کلاسیکی ادب کو متعارف کرانا ان کا خاص کارنامہ ہے، مولانا فراہیؒ نے ان سے عربی ادب کی تکمیل کی، انھوں نے اعظم گڈھ سے لاہور تک کا سفر اسی مقصد سے کیا۔ مولانا فراہیؒ میں کلام جاہلیت سے دلچسپی ان ہی کی پیدا کی ہوئی ہے، مولانا فراہیؒ استاد کی حیثیت سے ان کا نام نہایت ادب و احترام سے لیتے ہیں، مولانا سہارنپوری کو شعر و شاعری سے بھی لگاؤ تھا، وہ عربی میں بے تکلف شعر کہتے تھے، ان کا عربی دیوان موجود ہے، جس میں ہر طرح کا کلام ہے، اغلب ہے کہ ان کی صحبت کے اثر سے مولانا فراہی عربی شاعری کی طرف مائل ہوئے،

لاہور جانے سے پہلے وہ فارسی میں شعر کہتے تھے، مولانا سہارنپوری کی خدمت میں کچھ وقت گزارنے کے بعد وہ عربی میں بھی طبع آزمائی کرنے لگے، ان کا عربی دیوان چھپ گیا ہے استاد اور شاگرد کے کلام کے تقابلی مطالعہ سے کچھ مفید باتیں معلوم ہو سکتی ہیں۔

پروفیسر آرنلڈ

تعلیم کے دوسرے دور میں مولانا فراہیؒ کے اساتذہ میں صرف یہی ایک نام ہم تک پہنچ سکا، مڈل اور میٹرک کا زمانہ تو یوں ہی مجہول ہے، ایم اے او کالج علی گڑھ کی چار سالہ مدت تعلیم بھی، اس لحاظ سے سپاٹ ہے، کہ اس زمانے کے اساتذہ بالکل مفقود الخبر ہیں، مولانا نے اس دور کی تعلیم کا تو ذکر ایک آدھ جملے میں کہیں کیا ہے، مگر اس دور کے اساتذہ میں سے کسی ایک کا بھی ذکر ان کی اپنی زبان سے سننے میں نہیں آیا حتی کہ پروفیسر آرنلڈ کا بھی انھوں نے استاد کی حیثیت سے کہیں نام نہیں لیا ہے۔ مولانا کے زمانہ طالب علمی میں مولانا شبلیؒ علی گڑھ کالج کے پروفیسر تھے، لیکن چونکہ وہ عربی فارسی پڑھاتے تھے، اور مولانا ان مضامین سے مستثنیٰ کر دیئے گئے تھے، اس لیے کالج میں مولانا شبلیؒ کی شاگردی کا اتفاق نہیں ہوا، پروفیسر ٹی ڈبلیو آرنلڈ کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ کالج میں فلسفہ کے استاد تھے، اور مولانا فراہیؒ نے ان سے فلسفہ جدیدہ میں استفادہ کیا، لیکن اس روایت کو ماننے میں کچھ اشکالات ہیں، جن کا ذکر ہم نے تعلیم کے باب میں کیا ہے، جن لوگوں نے آرنلڈ سے مولانا کے استفادہ کا ذکر کیا ہے، نہیں معلوم یہ ان کا قیاس ہے یا کسی سند سے ان تک یہ بات پہنچی۔ پروفیسر آرنلڈ کا ذکر اساتذہ فراہی کے باب میں ہم نے ایک مسئلہ کے طور پر شامل کر دیا ہے، جو تحقیق طلب ہے۔

تعلیم اور اساتذہ فراہی کے ذکر کے بعد عملی زندگی کے حالات سے پہلے بعض ان واقعات کا ذکر ضروری ہے جو اسی زمانے سے تعلق رکھتے ہیں۔

<u>بیٹے کی پیدائش ۱۸۹۳ء</u> | مولانا کے صاحبزادے حماد صاحب کے بیان کے مطابق ۱۸۹۳ء میں مولانا فراہیؒ کے یہاں پہلا لڑکا پیدا ہوا، جس کا نام حماد تھا، شادی کے نو سال بعد بیٹے کی پیدائش ہوئی جو یقیناً خوشی کا باعث ہوئی ہوگی، مولانا فراہیؒ اس وقت علی گڈھ میں زیر تعلیم تھے، علی گڈھ میں وہ صاحب کتاب پہلے ہی بن چکے تھے، اب صاحب اولاد بھی ہوگئے، مولانا کے والد حاجی عبد الکریم صاحب زندہ تھے، انھوں نے پوتے کا عربی نام مرزا رکھا جو بعد میں سماد ہوگیا۔

<u>استاد کی وفات ۱۸۸۷ء</u> | اسی زمانے میں مولانا فراہیؒ کے استاد مولانا فیض الحسن سہارنپوری کا انتقال ہوا، شاگرد کو استاد سے جو تعلق خاطر تھا، اس کا اظہار ایک مرثیے کی صورت میں ہوا۔ افسوس کہ یہ مرثیہ نایاب ہے۔

معارف :- ڈاکٹر شرف الدین اصلاحی ترجمان القرآن مولانا حمید الدین فراہیؒ کے حالات اور کارناموں پر ایک مستقل کتاب لکھ رہے ہیں، یہ مضمون اسی کا ایک حصہ ہے اس لیے اس میں کہیں کہیں گذشتہ اور آئندہ ابواب کے حوالے بھی مذکور ہیں۔

وفیات

آہ! مولوی محمود الحسن

از

سید صباح الدین عبدالرحمٰن

اس مہینہ کے معارف کی طباعت ختم ہو رہی تھی کہ یکایک خبر ملی کہ مولوی محمود الحسن ناظم انجمن تعلیمات دین اپنے بچوں، عزیزوں اور قدردانوں کو چھوڑ کر اب وہاں ہیں جہاں نیکوں، پاکبازوں، مصائب کشوں کو سرور جاودانی اور حیات ابدی ملتی ہے، ان کی دائمی جدائی پر کچھ آنکھیں نمناک اور اشکبار ہوں گی لیکن انجمن تعلیمات دین کے کارکنوں اور ہمدردوں کی آنکھوں سے خون کے آنسو بھی جاری ہوں گے تو اس سے ان کی دائمی رحلت کی غمناکی اور دردناکی دور نہ ہو سکے گی، ان کی وفات کچھ ایسا ہی جاں گسل سانحہ ہے۔

وہ انجمن تعلیمات دین کے بانیوں میں سے تھے، ۱۹۴۷ء کے انقلاب کے بعد چند مردان خدا کی بدولت یہ انجمن قائم ہوئی تو زبان حال سے یہ کہہ رہی تھی ؎

یہ دور اپنے براہیمؑ کی تلاش میں ہے

اس انجمن نے اترپردیش میں جو کام انجام دیئے ہیں، وہ مسلمانوں کی ملی تاریخ کا ایک زریں کارنامہ

ہے، اس کے ذریعہ سے بے شمار دینی مکاتب قائم ہوئے جس سے اترپردیش کے مسلمان بچوں کی دینی حمیت اور ایمانی غیرت کے ثبات ویقین کا سامان فراہم ہوا، جناب عدیل عباسی مرحوم نے اس کارواں کے یکہ تاز بن کر جس طرح رجز خوانی کی، اس سے انجمن کا کام بہت آگے بڑھا، ان کے یمین ویسار میں مولوی ظفر احمد صدیقی مرحوم وکیل اور مولوی محمود الحسن رہے، جس سے اس کے کام کو غیر معمولی فروغ ہوا، مصلحت خداوندی سے جناب عدیل عباسی مرحوم اور جناب ظفر احمد صدیقی مرحوم، مولوی محمود الحسن کو تنہا چھوڑ گئے، مگر وہ اس کے لیے عمل پیہم اور یقین محکم بلکہ سوز دروں، درد پنہاں اور روح جاں گسل بنے رہے، وہ کسی مجلس میں بیٹھ جاتے تو معلوم ہوتا کہ انجمن تعلیمات دین بیٹھی ہے، وہ بولتے تو انجمن بولتی دکھائی دیتی، سفر کرتے تو انجمن ہی متحرک نظر آتی، ان کی کبر سنی، صحت کی کمزوری، سفر کی دشواری، ان کے عزم بالجزم میں رکاوٹ کبھی نہیں رہی، وہ ہر جگہ پہونچتے، للّٰہیت ان کی راہ نما ہوتی، اخلاص ان کے جلو میں ہوتا، ان کی حرکی قوتیں ان کا ساتھ دیتی رہتیں، جہاں گئے کامران اور کامیاب بن کر واپس ہوئے، ان کے بعد انجمن کی نرگس اپنی بے نوری پر ضرور روئے گی، لیکن اس کے موسسوں کی پاکیزہ نیت، مخلصانہ جذبہ اور خود اس کی افادیت، اس کے کام کو برقرار رکھنے کی ضامن ہے، اور اسی سے اس کے کارکنوں کو نیا حوصلہ ملتا رہے گا، جس سے امید ہے کہ یہ انجمن اپنی پرانی روایات کے ساتھ پہلے ہی کی طرح سرگرم عمل رہے گی، اس کی آواز ویسی ہی نوا ن بن کر رہے گی جس سے دل کہسار ہل جاتا ہو، انجمن تعلیمات دین کی جب تاریخ قلمبند کی جائے گی تو مولوی محمود الحسن کی بھی تاریخ لکھی جائے گی، جنھوں نے لالہ صحرائی بن کر اپنی

خاموشی و دل سوزی و سرمستی و رعنائی

کے ساتھ اس کی خدمت کی، وہ بستی کے ایک معزز خاندان سے تھے، جناب عدیل عباسی کے سگے بہنوئی تھے، مگر ان کی اصلی سوانح عمری یہ ہے کہ وہ انجمن تعلیمات دین کے لیے زندہ رہے، اس کے لیے وفات پائی، اب وہ نہیں رہے، مگر ان کی نیکیوں کی بدولت ان کی ابدی خوابگاہ پر کرم الٰہی کا ابر برابر چھایا رہے گا، ان کے کاموں کی نوعیت مغفرت کے پھول ان پر نچھاور کرتی رہے گی، آمین۔ اور ان کی یادیں اس وقت تک باقی رہیں گی، جب تک انجمن کا کام جاری رہے گا۔

مطبوعات جدیدہ

معدن المعانی مترجمہ جناب سید شاہ نسیم الدین احمد شرفی مجیبی فردوسی، متوسط تقطیع، کاغذ، کتابت و طباعت عمدہ، صفحات ۴۲۴، مجلد مع دلکش گرد پوش، قیمت ۶۰ روپے، پتے (۱) مکتبہ شرف بیت الشرف، خانقاہ معظم بہار شریف، نالندہ (۲) خانقاہ فردوسیہ، ۵۰۔ا لنٹن اسٹریٹ کلکتہ ۱۴ (۳) دار الاشاعت اسلامیہ ۱۵۲، کولوٹولہ اسٹریٹ، کلکتہ ۷۳۔

مخدوم الملک حضرت شیخ شرف الدین احمد بن یحییٰ منیریؒ، برگزیدہ، عالی مرتبت اور کثیر التصانیف صوفیائے کرام میں وہ پہلے بزرگ ہیں جو صاحب ملفوظات اور صاحب تصنیفات دونوں تھے، ان کا زیادہ اہم بالشان کارنامہ اور ان کے علوم و کمالات اور معارف و حقایق کی اصلی یادگار ان کے مکتوبات ہیں جن کے بعد ملفوظات میں معدن المعانی کا خاص اور اہم درجہ ہے، یہ واقعی اسم بامسمیٰ اور علم و معرفت کے اسرار و حقایق اور سلوک و تصوف کے رموز و نکات کا گنجینہ ہے، اس سے شیخ کے علوئے مرتبت، شریعت و طریقت کی جامعیت، علم و تحقیق کی گہرائی، غوامض و مشکلات کی عقدہ کشائی، مجتہدانہ بصیرت اور کتاب و سنت کے وسیع و عمیق مطالعہ کا اندازہ ہوتا ہے، ملفوظات کا یہ مجموعہ حضرت کے ایک مرید باصفا حضرت زین بدر عربیؒ نے دو جلدوں میں مرتب کیا تھا، پہلی جلد میں چوبیس (۲۴) اور دوسری میں انتالیس (۳۹) ابواب ہیں، ان ابواب میں صرف تصوف کے رموز و نکات ہی کا ذکر نہیں ہے، بلکہ توحید، اسرار دین، تفسیر، حدیث، سیرت نبوی اور فقہ و کلام کے

مباحث بھی آگئے ہیں، چنانچہ ابتداء کے چار ابواب میں علم کلام کے مسائل باری تعالیٰ کے وجود و وحدانیت کے اثبات، ذات وصفات الٰہی، بعض متشابہات مثلاً ید (خدا کا ہاتھ) وجہ (اس کا چہرہ) وغیرہ اور ایمان، اسلام اور کفر کا ذکر ہے، چھٹا باب قرآن مجید کی تفسیر اور اس کے حفظ کے بیان میں ہے، اس کے بعد کے تین ابواب میں حدیث و سیرت کے بعض مباحث اور چند حدیثوں کے مفہوم و مطلب کی دلنشین اور محققانہ تشریح کی گئی ہے، چند ابواب میں طہارت اور اسلامی عبادات وارکان نماز، روزہ اور حج و جہاد کے لطیف مباحث پر گفتگو فرمائی ہے، اس سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت مخدوم الملک کی دکان معرفت میں ہر طرح کے مریضوں کی دوائے دل کا سامان ہوتا تھا، اور وہ اپنی مجلسوں میں تصوف کے لاینحل عقدے بھی حل کرتے تھے، اور وعظ و پند اور رشد و ہدایت کے موتی بھی بکھیرتے تھے، اور لوگوں کو اوصاف حمیدہ اور اخلاق حسنہ کی تعلیم اور رذائل و مکارہ سے بچنے کی تلقین بھی فرماتے تھے، اس مجموعہ کی یہ خوبی بھی ہے کہ حضرت شیخ ملفوظات کے آخر میں مناسب اور برمحل اشعار پڑھ کر انھیں نہایت موثر اور دلپذیر بنا دیتے تھے، ان کے دور میں فارسی علمی زبان تھی، اس لیے ان کی تصنیفات اور ملفوظات کی زبان بھی فارسی ہے، خانقاہ معظم نے ان کے اردو ترجمے کا بیڑا اٹھایا ہے، چنانچہ مکتوبات صدی کا اردو ترجمہ اس سے پہلے چھپ چکا ہے، اب جناب سید شاہ تسیم الدین احمد صاحب نے اردو خواں طبقہ کے لیے معدن المعانی کا ترجمہ شائع کیا ہے، اس کے شروع کے ۹ ابواب کا ترجمہ ان کے استاذ حافظ سید شاہ محمد شفیع مرحوم نے کیا تھا، باقی ابواب کے ترجمہ کی سعادت ان کے حصہ میں آئی ہے، ان کو اللہ تعالیٰ نے اچھی صلاحیتوں سے نوازا ہے، اور وہ صاحب علم و قلم ہونے کے علاوہ صاحب دل بھی ہیں، اور اسی کے ساتھ حضرت مخدوم شرف الدین احمد بن یحییٰ منیریؒ سے گہری عقیدت بھی رکھتے ہیں، اور اس سے پہلے وہ ان کے بعض ملفوظات شرح آداب المریدین، مونس المریدین اور فوائد المریدین وغیرہ کے اردو ترجمے کر کے ان کی تعلیمات کو پھیلا چکے ہیں، امید ہے کہ وہ اپنی خداداد صلاحیتوں سے کام لے کر آیندہ بھی حضرت مخدوم صاحبؒ کی تصنیفات کے اردو ترجمے کر کے مزید علمی و دینی خدمت انجام دیں گے، اس برصغیر کے دور دراز گوشوں تک حضرت مخدوم بہاریؒ کی تعلیمات کی جس قدر اشاعت

ہونا چاہیے تھا وہ نہیں ہوسکی، امید کہ فاضل مترجم کی مساعی جمیلہ سے یہ کمی پوری ہوجائے گی جس کے لیے ارباب علم و عرفان ان کے ممنون ہوں گے۔

ممکن ہے اصل کتاب میں خال خال ایسی چیزیں بھی نظر آئیں جو عام لوگوں کی سمجھ سے بالاتر ہوں، لیکن ملفوظات کا یہ بیش بہا مجموعہ ہر شخص کے مطالعہ کے لایق ہے، اس کو پڑھ کر ایمان و یقین میں اضافہ اور قلب و روح میں بالیدگی اور تازگی پیدا ہوتی ہے، کتاب کے آخر میں حضرت مخدوم الملک کی وفات کے سبق آموز واقعات و حالات بھی درج ہیں، جو مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی تصنیف تاریخ دعوت و عزیمت حصہ سوم سے ماخوذ ہیں۔

سیرت شیخ ابن سینا کے بعض پہلو اور القانون فی الطب کا مطالعاتی جائزہ } از مولانا حکیم محمد زماں حسینی، تقطیع کلاں، کاغذ، کتابت و طباعت اچھی، صفحات مجموعی ۱۰۰، مجلد، قیمت ۵ روپئے

ناشر: مجلس القرآن والحدیث ۸۰ کولوٹولا اسٹریٹ، کلکتہ ۷۳۔

مولانا حکیم محمد زماں صاحب کلکتہ کے ایک مشہور و مقبول عالم اور بڑے ماہر و حاذق طبیب ہیں، زیر نظر کتاب ان کے دو محققانہ مضامین کا مجموعہ ہے، پہلا مقالہ جشن ہزار سالہ یوم پیدایش شیخ بوعلی ابن سینا کے موقع پر ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ کے سمینار کے لیے لکھا گیا تھا، اور دوسرا مقالہ شیخ کی ہزار سالہ یوم پیدایش کی تقریب کی مناسبت سے ایران سوسائٹی کلکتہ کے سمینار میں پڑھا گیا تھا، ان دونوں مضامین میں نامور حکیم و فلسفی شیخ بوعلی ابن سینا کے علم و فضل اور سیرت و کردار کے بعض پہلوؤں کو نمایاں کیا گیا ہے، اور ان کی شہرۂ آفاق اور فن طب کی مہتم بالشان کتاب "القانون فی الطب" پر مفید بحث و گفتگو کی گئی ہے، پہلے مقالہ میں شیخ اور ان کی مذکورہ بالا مایۂ ناز تصنیف کی اہمیت و عظمت دکھائی ہے، پھر القانون کی روشنی میں شیخ کی سیرت و شخصیت کی نمایاں اور سبق آموز خوبیاں پیش کی ہیں، آخر میں شیخ کی مے نوشی کی مشہور روایت کی دلائل سے تردید کی ہے، اور بتایا ہے کہ وہ ایک مرد مومن کے اوصاف و خصوصیات کے مالک تھے، دوسرے مقالہ میں "القانون فی الطب" کے متعلق ضروری اور مفید معلومات تحریر کرکے اس کی اہمیت دکھائی ہے، اور اس کے بارے میں بعض لوگوں کے اعتراضات کا

مقدمہ جواب دیا ہے، پھر نفس کتاب کے مندرجات سے علامہ معاصر شیخ کی جدت فکر، نادر بیماریوں کی تشخیص اور فن طب کی دوسری مفید اور قیمتی باتوں کا تذکرہ کیا ہے، آخر میں شیخ کی طبی تصانیف کی ایک اجمالی فہرست دی گئی ہے، اور قانون کی مختلف اشاعتوں، اس کے مختلف زبانوں میں تراجم، اس کی شروح تلخیصات و تعلیقات کے شروح و تراجم کا ذکر کیا ہے، یہ دونوں مقالے علمی و تحقیقی حیثیت سے بلند پایہ ہیں، اور ان سے جہاں شیخ کی عظمت، عبقریت، جودت طبع، عمدہ سیرت اور ان کی فاضلانہ تصنیف "القانون فی الطب" کے بارے میں اہم معلومات فراہم ہوتے ہیں، وہاں علم الادیان و علم الابدان میں خود مصنف کی مہارت کا بھی پتہ چلتا ہے، ان کے خلف الرشید مولوی حکیم محمد عرفان حسینی ان مقالوں کی اشاعت پر اہل علم خصوصاً فن طب سے اشتغال رکھنے والوں کے شکریہ کے مستحق ہیں۔

نئی عرب دنیا:۔ مرتبہ ڈاکٹر محمد یونس نگرامی ندوی تقطیع خورد، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، صفحات ۲۷۲ مجلد مع گرد پوش، قیمت تیس روپیے، پتہ:۔ مکتبہ طیبہ، سی ۲۰۷/۲ ڈیوڑھی آغا میر، لکھنؤ ۳

اس کتاب میں جدید عرب دنیا کا مختصر تعارف چھ ابواب میں کرایا گیا ہے، پہلے باب میں عرب دنیا کی اہمیت کو واضح کرنے کے لیے عرب کی جغرافیائی، تاریخی، معاشی، تمدنی اور مذہبی اہمیت دکھائی گئی ہے، اسی باب میں مصر پر نپولین کے حملہ کے اثرات کا ذکر بھی آگیا ہے، جس کی بنا پر عربوں میں قومی و سیاسی بیداری پیدا ہوئی، دوسرے باب کے ایک حصہ میں ایشیائی عرب ملکوں سعودی عرب[۱]، شمالی و جنوبی یمن[۲،۳]، عمان[۴] متحدہ عرب امارات[۵]، قطر[۶]، بحرین[۷]، کویت[۸]، اردن[۹]، لبنان[۱۰]، عراق[۱۱] اور فلسطین[۱۲] کے بارے میں نئے معلومات پیش کیے گئے ہیں، اور دوسرے حصہ میں آٹھ افریقی عرب ملکوں کا تذکرہ ہے، مصر[۱]، لیبیا[۲]، تونس[۳]، الجزائر[۴]، مراکش[۵]، سوڈان[۶]، جمہوریہ موریتانیہ[۷] اور صومالیہ[۸]، لائق مرتب نے پہلے ان سب ملکوں کے موجودہ مکمل نام دیے ہیں، اور ان کی مختصر قدیم تاریخ بیان کی ہے، پھر ان کے سربراہ مملکت اور دارالسلطنت کے نام، ان کا رقبہ، ان کی آبادی اور اہم شہروں کا ذکر کرکے ان کے علمی، تعلیمی اور دینی حالات و کوائف تحریر کیے ہیں، اسی باب میں عام اسلامی ملکوں کی پیداوار

اور عالمی پیداوار میں ان کے حصہ کا ذکر بھی ہے، اس سلسلہ میں عرب کے علاوہ مسلم اکثریت کے غیر عرب ملکوں اور ان کے دارالسلطنت کے نام، ان کا رقبہ، مسلم آبادی کا تناسب اور عربوں کی خاص پیداوار پٹرول کا تخمینہ دیا ہے، ایک باب میں جدید دنیائے عرب کی چار بڑی تحریکوں وہابی، سنوسی، الاخوان المسلمون اور مہدوی کے مقاصد و خدمات اور اثرات و نتائج وغیرہ کی تفصیل درج ہے، ایک اور باب میں جدید عہد کے ان اصحاب علم و ادب کے حالات و خدمات پیش کیے گئے ہیں، جن کے فکری رجحانات و میلانات بڑی حد تک عربوں پر اثر انداز ہوئے یعنی شیخ عبدالوہاب، جمال الدین افغانی، خیرالدین تونسی، علی پاشا مبارک، عبداللہ ندیم، سید عبدالرحمٰن کواکبی اور شیخ محمد عبدہ، پانچواں باب موجودہ اہم اداروں اور درسگاہوں کے ذکر کے لیے مخصوص ہے، اس میں جامع ازہر، عرب لیگ، رابطہ عالم اسلامی، تنظیم اسلامی کانفرنس، خلیجی تعاون کونسل کی نوعیت اور خدمات کا تذکرہ ہے، چھٹے باب میں مغربی ملکوں کی ریشہ دوانی سے فلسطین پر اسرائیل کے جارحانہ تسلط کا ذکر ہے، اس کتاب سے جدید عرب دنیا کے متعلق گوناگوں ضروری اور مفید باتیں معلوم ہوتی ہیں، اور اس سے ان کے موجودہ رجحانات اور سیاسی، دینی، علمی، تعلیمی، ادبی، فکری، اقتصادی اور معاشرتی حالات سے واقفیت ہوتی ہے، یہ موضوع اب بعض ہندوستانی یونیورسٹیوں کے نصاب میں داخل ہے، ڈاکٹر محمد یونس نگرامی نے ان کی نصابی ضرورت کو پورا کرنے کے لیے یہ کتاب لکھی ہے، اس لیے اس میں اختصار کو مدنظر رکھا ہے، وہ لکھنؤ یونیورسٹی کے شعبۂ عربی سے وابستہ ہیں، اور ایک عرصہ تک عرب میں قیام پذیر رہ چکے ہیں، اس لیے وہ موجودہ عرب دنیا سے یک گونہ باخبر ہیں، اور انھوں نے یہ کتاب خوش سلیقگی سے لکھی ہے۔

فارسی ادب بعہد تغلق سلاطین | مرتبہ ڈاکٹر شعیب اعظمی تقطیع خورد، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر صفحات ۳۲۳ قیمت ۵۰ روپیے۔ پتہ:۔ (۱) اردو بازار جامع مسجد دہلی (۲) یونیورسٹی مارکیٹ، علی گڑھ۔

یہ ڈاکٹر شعیب اعظمی ریڈر شعبۂ فارسی جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کا تحقیقی مقالہ ہے، جس کو انھوں نے حذف و اضافہ کے

[illegible] شائع کیا ہے، یہ چھ ابواب پر مشتمل ہے، پہلے باب میں تغلق حکومت کے قیام سے لے کر اس کے خاتمہ تک کے عام واقعات و حالات اجمال کے ساتھ قلمبند کیے گئے ہیں، اس میں سلطان غیاث الدین تغلق کے برسر اقتدار آنے کی روداد بھی بیان کی گئی ہے، اور اس کے اور دوسرے تغلق سلاطین کے علمی و ادبی ذوق اور علم و ادب کی سرپرستی، نیز سیاسی، تاریخی اور تمدنی کارناموں کا جائزہ لیا گیا ہے، اسی باب میں عہد تغلق کی خود مختار ریاستوں کا ذکر بھی ہے، دوسرے باب میں تغلق سلاطین کے دور کے مذہبی حالات کا جائزہ لیا گیا ہے، اس علماء اور مذہبی طبقوں سے ان کے تعلقات کا خاص طور پر تذکرہ ہے، تیسرا باب تصوف پر لکھی جانے والی اس دور کی اہم کتابوں کے تعارف و تبصرہ کے لیے خاص ہے، اس ضمن میں متعدد کبار صوفیہ خواجہ نظام الدین اولیاءؒ، حضرت امیر خسروؒ، شیخ حسن سجزیؒ، برہان الدین غریبؒ، شیخ نصیر الدین چراغ دہلویؒ، حمید قلندرؒ، امیر خوردؒ، شرف الدین احمد یحییٰ منیریؒ، ضیاء الدین نخشبیؒ، اور سید جلال الدین جہانیاں جہاں گشتؒ وغیرہ کا تذکرہ بھی قلمبند کیا ہے، اور ان کی تصنیفات اور مجموعۂ ملفوظات پر سیر حاصل بحث بھی کی ہے، چوتھے باب میں فارسی کی اہم نثری تصنیفات کا تعارف کرایا گیا ہے، اور پانچواں باب اس عہد کی شاعری کے جائزہ پر مشتمل ہے، اس میں اہم شعری مجموعوں کی خصوصیات دکھائی گئی ہیں، چھٹے باب متفرقات میں مختلف عمارتوں کے کتبات پر درج اشعار نقل کیے گئے ہیں، یہ کتاب عہد تغلق میں فارسی زبان و ادب کی نمایاں اور اہم خدمات کا مرقع ہے، لائق مصنف نے اس دور کے اکابر صوفیہ، ممتاز نثر نگاروں اور مشہور شعراء کے حالات و کمالات کا مختصر خاکہ بھی دیا ہے، اور ان کی اہم مصنفات و کتب پر تبصرہ کر کے ان کی قدر و قیمت اور اہمیت بھی دکھائی ہے، اس سے دور تغلق کے عام علمی، تعلیمی اور سیاسی و تمدنی حالات کے علاوہ گوناگوں قسم کے مفید معلومات بھی حاصل ہوتے ہیں، یہ کتاب مصنف کی تلاش و محنت اور فارسی زبان و ادب سے دلچسپی اور شیفتگی کا نتیجہ ہے،

ض ص ۱۲

حیات سلیمان

یہ حضرت مولانا سید سلیمان ندوی کی [illegible] سوانح عمری ہی نہیں ہے بلکہ ان کے گوناگوں علمی، [illegible] سیاسی خدمات اور کارناموں کا ایک دلآویز مرقع ہے جس میں سید صاحبؒ کے دور کی نصف صدی کی ملی و قومی سیاسی، علمی، ادبی و لسانی تحریکیں مثلاً ہنگامۂ مسجد کانپور، تحریک خلافت، تحریک ترک موالات، جنگ آزادی، مسئلہ ترکیت حجاز وغیرہ کی تفصیل بھی ضمناً آگئی ہے، اسی کے ساتھ دارالمصنفین جو سید صاحبؒ کی زندگی کا سب سے بڑا کارنامہ ہے اس کی تاسیس، سال بہ سال اس کی ترقی کی روداد کے ساتھ ان کے قیام بھوپال، سفر پاکستان، قیام پاکستان کے دوران ان کی علمی خدمات کا تذکرہ اور مختلف وفود کے رکن و صدر کی حیثیت سے سفر یورپ، سفر حجاز، سفر افغانستان وغیرہ کی مفصل روداد بھی سید صاحبؒ کے خطوط اور تحریروں کی روشنی میں قلمبند ہوگئی ہے، یہ کتاب اپنے اسلوب و طرز انشاء کے لحاظ سے بالکل حیات شبلی کا مثنیٰ ہے، ویسی ہی دلکش، دلچسپ اور دلنشین۔

مؤلفہ مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی قیمت ۴۲ روپے

سلوک سلیمانی

مولانا سید سلیمان ندویؒ کے عزیز ترین پاکستانی مسترشد مولانا سید سلیمان اشرف خان صاحب سلیمانی صدر شعبۂ عربی پشاور یونیورسٹی نے سلوک سلیمانی پر ایک اجمالی نظر کے عنوان سے ایک طویل مقالہ لکھا تھا جو معارف میں ستمبر ۱۹۵۸ء سے جنوری ۱۹۵۹ء تک مسلسل نکلتا رہا، یہ علمی حلقوں میں بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھا گیا، اسی مضمون کو مزید اضافوں کے ساتھ مولانا اشرف صاحب نے کتابی صورت میں سلوک سلیمانی کے نام سے دو جلدوں میں شائع کیا ہے، ان میں حضرت سید صاحبؒ کی سلوک و معرفت سے متعلق تعلیمات کو مرتب کر کے توضیحات و تعبیرات کی روشنی میں پیش کیا گیا ہے، ان دونوں جلدوں کو افادۂ عام کی خاطر دارالمصنفین نے بھی چھاپ کر شائع کیا ہے

قیمت جلد اول ۳۰ روپے   قیمت جلد دوم ۲۵ روپے

VOL. No. 5 MAARIF No.

مصنفات مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ

۱۔ سیرۃ النبی جلد سوم: معجزہ کے امکان و وقوع پر علم و عقل اور قرآن مجید کی روشنی میں مفصل بحث۔ ۴۸/-

۲۔ سیرۃ النبی جلد چہارم: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے منصب نبوت کی تشریح کے فرائض۔ ۴۸/-

۳۔ سیرۃ النبی جلد پنجم: فرائض خمسہ نماز، زکوٰۃ، روزہ، حج، جہاد پر سیر حاصل بحث۔ ۴۲/-

۴۔ سیرۃ النبی جلد ششم: اسلامی اخلاقیات، فضائل و رذائل اور اسلامی آداب کی تفصیل۔ ۴۸/-

۵۔ سیرۃ النبی جلد ہفتم: معاملات پر مشتمل متفرق مضامین و مباحث کا مجموعہ۔ ۱۶/-

۶۔ رحمت عالم ؐ: مدرسوں اور اسکولوں کے چھوٹے بچوں کے لیے سیرت پر ایک مختصر اور جامع رسالہ۔ ۵

۷۔ خطبات مدراس: سیرت پر آٹھ خطبات کا مجموعہ جو مسلمانان مدراس کے سامنے دیے گئے تھے۔ ۱۱

۸۔ سیرۃ عائشہ ؓ: حضرت عائشہ صدیقہ ؓ کے حالات و مناقب و فضائل۔ ۱۹/-

۹۔ حیات شبلی ؒ: مولانا شبلی ؒ کی بہت مفصل اور جامع سوانح عمری۔ ۴۸/-

۱۰۔ ارض القرآن ج۱: قرآن میں جن عرب اقوام و قبائل کا ذکر ہے ان کی اثری اور تاریخی تحقیق۔ ۱۸/-

۱۱۔ ارض القرآن ج۲: بنو ابراہیم کی تاریخ، قبل از اسلام عربوں کی تجارت اور مذاہب کا بیان۔ ۱۳/-

۱۲۔ خیام: خیام کے سوانح و حالات اور اس کے فلسفیانہ رسائل کا تعارف۔ ۳۳/-

۱۳۔ عربوں کی جہاز رانی: بمبئی کے خطبات کا مجموعہ۔ ۱۲/-

۱۴۔ عرب و ہند کے تعلقات: ہندوستان اکیڈمی کے تاریخی خطبات (طبع دوم عکسی) ۳۰/-

۱۵۔ نقوش سلیمانی: سید صاحب ؒ کے منتخب مضامین کا مجموعہ، جن کا انتخاب خود موصوف نے کیا تھا۔ ۴۴/-

۱۶۔ یاد رفتگاں: ہر شعبۂ زندگی کے مشاہیر کے انتقال پر سید صاحب کے تاثرات۔ (طبع دوم عکسی زیر طبع) ....

۱۷۔ مقالات سلیمان اول: ہندوستان کی تاریخ کے مختلف پہلوؤں پر مضامین کا مجموعہ۔ ۲۶/-

۱۸۔ مقالات سلیمان دوم: تحقیقی اور علمی مضامین کا مجموعہ۔ ۲۳/-

۱۹۔ مقالات سلیمان سوم: مذہبی و قرآنی مضامین کا مجموعہ (بقیہ جلدیں زیر ترتیب ہیں) ۲۳/-

۲۰۔ بریدِ فرنگ: سید صاحب کے یورپ کے خطوط کا مجموعہ۔

۲۱۔ دروس الادب حصہ اول و دوم: جو عربی کے ابتدائی طالب علموں کے لیے مرتب کیے گئے۔ ۲-۴

جلد ۱۱۲

دسمبر

معارف

مجلس دار المصنفین کا ماہوار علمی رسالہ

مرتبہ

سید صباح الدین عبد الرحمن

قیمت تیس روپیے سالانہ

دفتر دار المصنفین اعظم گڈھ

(پن ۔ ۲۷۶۰۰۱)

ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کی مذہبی رواداری

تاریخ ہند دستان کا سلسلہ ایک اٹھائیس کتابوں تک پہونچ چکا ہے، اس ضمن میں ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کی مذہبی رواداری کا بھی ایک سلسلہ شروع کیا گیا ہے، جس کی اب تک تین ۳ جلدیں شایع ہو چکی ہیں۔

جلد اوّل

اس میں مغل دور سے پہلے کے سلمان حکمرانوں کی مذہبی رواداری، فراخ دلی اور وطن دوستی، رعایا پروری کے دلچسپ واقعات مستند ماخذوں کی مدد سے پیش کیے گئے ہیں، قیمت ۱۲ روپے۔

جلد دوم

اس میں مغل فرماں روا بابر، ہمایوں، سوری خاندان کے شیر شاہ اور اسلام شاہ، پھر مغل شہنشاہ اکبر، جہانگیر اور شاہجہان کی مذہبی رواداری، فراخ دلی، وطن دوستی، رعایا پروری کے سبق آموز واقعات پیش کیے گئے ہیں، قیمت ۲۳ روپے۔

جلد سوم

اس میں جدو ناتھ سرکار کی کتاب کا جواب خود اس کی کتاب کے حوالوں سے اس طرح پیش کیا گیا ہے کہ اورنگزیب عالمگیر اور اسکے بعد کے مغل بادشاہوں کی مذہبی رواداری، فراخ دلی، وطن دوستی اور رعایا پروری کی تفصیلات آگئی ہیں　مرتبہ سید صباح الدین عبد الرحمٰن۔ قیمت ۳۰ روپے

جلد ۱۳۶ ماہ ربیع الاول و ربیع الآخر ۱۴۰۶ھ مطابق ماہ دسمبر ۱۹۸۵ء عدد ۶

مضامین

مقالات

ادبیات

نوٹ:- معارف کا زر سالانہ اور ڈرافٹ یا چیک دار المصنفین شبلی اکیڈمی کے نام سے روانہ فرمائیں۔

"منیجر"

شذرات

یہ معلوم کرکے بڑا دکھ ہوا کہ پٹنہ میں تحفظ شریعت کے پرامن جلوس پر نہایت بے رحمانہ فائرنگ کی گئی جس سے بہت سارے لوگ زخمی ہوگئے۔

اس وقت ملک کے طول وعرض میں مسلم پرسنل لا کے سلسلہ میں جلسے جلوس اور مظاہرے ہورہے ہیں، اس سے اس بارے میں مسلمانوں کی غیر معمولی تشویش، اضطراب، نازک احساس، ملی بیداری اور دینی حمیت کا پتہ چلتا ہے، یہ بھی بہت خوش آیند پہلو ہے کہ اس مسئلہ میں تمام مسلمان متحد ہیں، ایک ہی جلسہ میں ان کے مختلف الخیال افراد دوش بدوش شرکت کرتے ہیں، اور ایک ہی پلیٹ فارم سے مختلف طبقوں اور جماعتوں کے نمایندے خطاب کرتے ہیں۔

وزیر اعظم مسٹر راجیو گاندھی نے ۳ر دسمبر کو نئی دہلی میں آل انڈیا مومن کانفرنس کا افتتاح کرتے ہوئے کہا کہ "ان کی حکومت کسی ایسے قانون پر نظر ثانی کی مخالف نہیں ہے جو کسی مذہبی گروہ کے پرسنل لا سے ٹکراتا ہو، موجودہ قوانین کی تیاری اس احتیاط کے ساتھ کی گئی ہے کہ ان سے کسی فرقہ کے پرسنل لا کی خلاف ورزی نہ ہو" وزیر اعظم نے اپنی حقیقت پسندی کی بنا پر ہندوستانی سماج کو مختلف اکائیوں پر مبنی ایک دولت مشترکہ بتایا، اور کہا کہ ان تمام اکائیوں کی اپنی بنیادی خصوصیات کا احترام کیا جانا چاہیے، مسلمانوں کی جانب سے ان کے بیان کا عام طور پر خیر مقدم کیا جارہا ہے، آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے صدر مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے وزیر اعظم کی اس یقین دہانی پر اطمینان ظاہر کیا ہے، اور اس کی مجلس عاملہ نے بھی اسے حکومت کے اب تک کے تمام بیانات سے بہتر اور واضح بتایا ہے۔

اس میں شبہہ نہیں کہ وزیر اعظم کے اس حوصلہ افزا بیان سے مسلمانوں کی بے چینی اور بے اطمینانی میں کمی ہوئی ہے، اور حکومت کے رویہ کے بارے میں جو شکوک و شبہات ظاہر کیے جارہے تھے، وہ بھی ایک حد تک رفع ہوئے ہیں، لیکن اس سلسلہ میں مسلمانوں کو مکمل اطمینان اسی وقت ہوگا جب ایسی کارروائی عمل میں لائی جائے جس سے آیندہ اس قسم کے عدالتی فیصلہ کا کوئی امکان ہی باقی نہ رہے، اور اس کی صورت یہی ہے کہ حکومت کسی پس و پیش کے بغیر جلد از جلد سی۔ آر۔ پی۔ سی کی دفعہ ۱۲۵ اور دستور ہند کے رہنما اصول کے آرٹیکل ۴۴ میں ترمیم کردے، یا مسلمانوں کو اس سے مستثنیٰ قرار دے دے، تاکہ اس طرح کے خدشات کا ہمیشہ کے لیے سد باب ہوجائے، اسی مقصد سے لوک سبھا میں مسلم لیگ کے ممبر مسٹر بنات والا نے ایک ترمیمی مسودہ قانون بھی پیش کیا ہے، جس پر بحث و مباحثہ بھی ہوا، لیکن اب یہ بحث ۲۰ر دسمبر تک کے لیے ملتوی کردی گئی ہے۔

وزیر اعظم کو دونوں ایوانوں میں بھاری اکثریت حاصل ہے، مگر اس کے باوجود انھوں نے یہ صحت مند جمہوری روایت قائم کی ہے کہ وہ اہم قومی و بین الاقوامی معاملات پر اپوزیشن پارٹیوں سے بھی رائے و مشورہ کرتے ہیں، ان کی نیک نیتی سے یہ خواہش ہوتی ہے کہ اہم امور و مسائل میں حکومت اور اپوزیشن پارٹیوں کے درمیان اتفاق رائے ہو جائے، چنانچہ اس معاملہ میں بھی انھوں نے مخالف پارٹیوں کو اعتماد میں لینے کے لیے جب ان سے مشورہ کیا تو توقع کے مطابق بھارتیہ جنتا پارٹی اور دونوں کمیونسٹ پارٹیوں نے سخت مزاحمت کی، اور مشترکہ سول کوڈ کو ملک کے تمام فرقوں کے لیے ضروری قرار دیا، اور تعزیرات ہند کی دفعہ ۱۲۵ میں ترمیم کی شدید مخالفت کی۔

در اصل اس معاملہ میں وزیر اعظم کو مخالف پارٹیوں سے رائے و مشورہ لینے کی ضرورت ہی نہیں ہے، یہ تو مسلمانوں کا داخلی معاملہ ہے، اس لیے اس میں تمام تر انہی کے احساسات و جذبات کو مد نظر رکھنے کی ضرورت ہے، بہار کے ایک سابق وزیر اعلیٰ ڈاکٹر جگن ناتھ مسرا نے ایک پریس کانفرنس میں کہا ہے کہ "مسلم پرسنل لا قطعی طور پر مسلمانوں کا داخلی معاملہ ہے، اس میں عورتوں کے تحفظ کا خاص خیال رکھا گیا ہے، لہٰذا یہ ضروری ہے کہ اس سلسلہ میں کوئی بھی اقدام اور فیصلہ خود مسلمانوں ہی پر چھوڑ دیا جائے اور جو رائے مسلمانوں کی ہو اسی پر عمل کیا جائے، اور اس میں کسی دوسرے کو مداخلت نہیں کرنی چاہیے"

حقیقت یہ ہے کہ یہ مسلمانوں کا داخلی ہی نہیں، ایک مذہبی معاملہ بھی ہے، اس لیے اگر مسلمان بھی اس میں کسی قسم کی ترمیم کے خواہشمند ہوں جب بھی کوئی ترمیم نہیں ہو سکتی، کیونکہ کتاب و سنت سے ثابت شدہ احکام میں کسی ترمیم و تغیر کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، ہمیں وزیر اعظم سے ان کے اخلاص اور نیک نیتی کی بنا پر یہی توقع ہے کہ وہ اس معاملہ میں کسی لیت و لعل کا شکار ہونے کے بجائے سراسر حقیقت پسندانہ رویہ اختیار کریں گے، مخالف پارٹیوں کو بھی چاہیے کہ وہ اس معاملہ کی نزاکت و شدت کو محسوس کریں اور مسلمانوں کے جذبات کو مجروح کرنے اور ان کے مذہبی معاملات میں دخل در معقولات سے باز رہیں، ملک کے اتحاد و سالمیت کو برقرار رکھنے کے لیے بھی ضروری ہے کہ مسلم پرسنل لا کے تحفظ کی مناسب و معقول ضمانت دی جائے، اور اس معاملہ میں مسلمانوں کے جذبات کو کسی حال میں بھی نظر انداز نہ کیا جائے۔

حضرت مولانا شاہ ہدایت علی جے پور (راجستھان) کے ایک عالم ربانی اور سلسلۂ نقشبندیہ مجددیہ کے صاحب کمال

شیخ طریقت تھے ان کی ذات سے مدتوں رشد و ہدایت کا چراغ روشن رہا، اور اس علاقہ کے لوگوں کو بڑا فیض پہونچا، انھوں نے چند تصنیفات بھی یادگار چھوڑی ہیں، جن میں حضرت مجدد الف ثانیؒ کے مکتوبات کا اردو ترجمہ "دُرِ ثانی" بھی ہے، ان کے انتقال کے بعد ان کے سعادت مند پوتے مولانا محمد عبدالرحیم صاحب ان کے نا تمام کاموں کی تکمیل میں لگے ہوئے ہیں، ان کی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ زمانہ کے حالات و مسائل اور وقت کے تقاضوں سے بھی باخبر ہیں، اس لیے مسلمانوں میں دینی تعلیم کے ساتھ سائنس اور ٹکنالوجی کی تعلیم کو بھی فروغ دینے کے لیے انھوں نے جامعۃ الہدایۃ کی داغ بیل ڈالی ہے، جس کا سنگ بنیاد ۷ راکتوبر ۱۹۷۶ء کو مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے دست مبارک سے رکھا گیا تھا، اور اب ۹ برس بعد پھر انہی کی صدارت میں ۸ ردسمبر کو جامعہ کے جشن افتتاح کی شاندار تقریب ہوئی، جس میں ملک کے دوسرے حصّوں کے اصحاب علم کے علاوہ جناب اے۔ یو۔ شیخ، ریٹائرڈ آئی۔ اے۔ ایس، ایم پی جے پور کے ممبر پارلیمنٹ اور مرکزی وزیر مسٹر نول کشور شرما، راجستھان ہائی کورٹ کے ڈپٹی جج صاحبان بھی شریک ہوئے اور جلسہ کو خطاب کیا، اور مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے علم و تعلیم کے موضوع پر بڑی پُرمغز اور موثر تقریر فرمائی۔

اسی روز شب میں سیرت کا ایک جلسہ ہوا، جس میں مولانا سید محمد رابع ندوی، مولانا سید محمد سلمان حسینی ندوی، اور صدر جلسہ مولانا حکیم مفتی احمد حسن خاں صاحب (جے پور) کی تقریریں ہوئیں، دوسرے دن ۹ ردسمبر کو مولانا مفتی محمد رضا انصاری فرنگی محلی چیرمین اترپردیش اردو اکاڈمی کی صدارت میں مقالات کا جلسہ ہوا، جس میں راقم الحروف، مولانا ابو العرفان ندوی (ندوۃ العلماء) جناب منظور احمد (جامعہ ملیہ اسلامیہ) جناب سید حامد سابق وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی، اور صدر جلسہ نے مضامین پڑھے، اور جناب سید محمد ہاشم وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی نے تقریر کی، یہ پروگرام بھی بہت کامیاب رہا، دونوں جلسوں کا اختتام مولانا شاہ عبدالرحیم صاحب کی تقریر و دعا پر ہوا، وہ بڑے خاموش مگر نہایت عملی اور مخلص شخص ہیں، انھوں نے جے پور شہر سے آٹھ کیلو میٹر کے فاصلہ پر رام گڑھ روڈ کے دونوں جانب جامعۃ الہدایۃ کے لیے تقریباً دو سو ایکڑ زمین حاصل کرلی ہے جس پر مین بلڈنگ اور ہوسٹل کی تعمیر مکمل ہوچکی ہے لیکن ابھی بہت سارے منصوبے زیر تکمیل ہیں، جو ان شاء اللہ مولانا عبدالرحیم صاحب اور ان کے رفقاء کی سرگرمی، اخلاص اور ایثار کی بدولت ضرور پایۂ تکمیل کو پہونچیں گے۔

مقالات

اسلامی علوم وفنون اور مستشرقین یورپ

از۔ مولانا عبد السلام ندوی مرحوم

یہ مضمون تقریباً پون صدی پہلے علامہ شبلیؒ کی زندگی میں لکھا گیا تھا، اور اپریل ۱۹۱۱ء کے الندوہ میں چھپا تھا، اس موقع پر پھر اس کی اشاعت مناسب ہوگی۔ (معارف)

اس وقت یورپ اس قدر متمدن دنیا پر چھایا ہوا ہے کہ جب یہ کہا جاتا ہے کہ ایک زمانے میں یورپ نے مسلمانوں کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا تھا، اپنی زبان میں اسلامی علوم وفنون کے ترجمے کیے تھے، تو لوگوں کو تعجب ہوتا ہے، بلکہ اس کو مبالغہ سمجھتے ہیں، لیکن واقعہ یہ ہے کہ یورپ کو ابتدا ہی سے مسلمانوں سے علمی تعلقات پیدا ہوگئے تھے، آٹھویں صدی عیسوی میں جب کہ تمام یورپ جہالت، تعصب، توہمات اور خرافات کا مرکز بنا ہوا تھا مسلمانوں کی علمی وتمدنی ترقی کا عنفوانِ شباب تھا، بغداد میں حکماء، فلاسفر، شاعر، متکلم سب کے سب علمی ترقی میں مصروف تھے، ہارون رشید کا قصر خلافت علوم وفنون کی اکاڈیمی بنا ہوا تھا، اس ترقی کی شہرت کی بنا پر اکثر سلاطین وقت ہارون رشید سے دوستانہ تعلقات پیدا کرنا چاہتے تھے، انہی میں ایک شارلیمان بھی تھا، یہ اگرچہ اپنی ملکی وسعت کے لحاظ سے بڑے جاہ وجلال کا بادشاہ تھا، پھر بھی علمی وتمدنی حیثیت سے اس کو یورپ اور اسلامی ملکوں میں زمین آسمان کا فرق نظر آتا تھا، یورپ میں اس وقت صرف مذہبی تعلیم جاری تھی اور وہ بھی صرف گرجوں تک محدود تھی، اس تعلیم کے ذریعہ خرافات، واوہام کی تلقین کیجاتی تھی، شارلیمان پہلا شخص ہے جس نے اس دماغی تنزل کو محسوس کیا، اور خلیفۂ اسلام ہارون رشید کی تقلید میں اپنے دربار میں علماء، حکماء، اور

شعراء کو جمع کیا، ان میں کورین سب سے زیادہ نامور ہے، یہ شاعر بھی تھا، اور عالم بھی، اس نے خود عرب
سے یا اون یہودیوں سے جنھوں نے عرب علمار سے تعلیم حاصل کی تھی، اسلامی علوم و فنون پڑھے تھے،
عبرانی اور لاطینی زبانوں کا بہت بڑا ماہر تھا، اس کے ذریعہ یورپ میں علمی دور شروع ہوا۔

یورپ میں اگرچہ اس سے بہت پہلے مسلمانوں کا علمی و تمدنی اثر قائم ہو چکا تھا، مسلمان پہلی ہی
صدی میں جنوبی فرانس میں اقامت گزیں ہو گئے تھے، انھوں نے پورے یورپ میں آزادی و حریت کی روح پیدا
کر دی تھی، لیکن کلیسا کی سخت گیریاں بھی قائم تھیں، اس لیے وہاں کوئی آزادانہ صدا بلند نہیں ہو سکتی تھی،
پھر بھی شارلیمان نے روشن خیال علمار کی مدد سے تمام گرجوں میں مذہبی علوم کے ساتھ موسیقی، ہندسہ،
نجوم اور منطق وغیرہ کی کتابیں داخل نصاب کیں، لیکن شارلیمان کے بعد اس کی علمی اصلاحات کا خاتمہ
ہو گیا، اور کلیسا کی جابرانہ حکومت پھر قائم ہو گئی اور وہ ان اصلاحات کو گوارا نہیں کر سکتا تھا شارلیمان کے پوتے
شارل نے نویں صدی میں جب اپنے دادا شارلیمان کے نقش قدم پر چلنا چاہا تو ایک انگریز عالم سے جو عبرانی، یونانی
عربی زبانوں اور طب اور فلسفہ کا بڑا ماہر تھا مسلمانوں کے علوم و فنون کا اپنی زبان میں ترجمہ کرنے کی خواہش کی
تو اس سے تمام یورپ گونج گیا، اور کلیسا نے اس پر کفر کا فتویٰ لگایا، تاہم ان رکاوٹوں کے باوجود آزادی
کی روح برابر ترقی کرتی گئی، اور جب اندلس میں مسلمانوں نے اپنے عظیم الشان مدارس قائم کیے اور
وہ تمام دنیا کی علمی ترقیوں کا کعبۂ امید بن گیا، تو اس کا اثر یورپ پر پڑے بغیر نہیں رہا، چنانچہ بہت سے
لوگوں نے مسلمانوں کے ان مدرسوں میں علوم و فنون حاصل کیے جن میں ایک جربرٹ بھی تھا، جو نویں
صدی کے آخر میں پوپ ہو گیا تھا، اس نے اسلامی علوم و فنون کے تراجم کو اس قدر وسعت دی کہ
یورپ میں علمی بہار آگئی، لیکن خود یہاں کے لوگوں نے اسلامی علوم و فنون کی تعلیم کے لیے کوئی مدرسہ
قائم نہیں کیا تھا، شارلیمان نے قائم کرنے کی کوشش کی، تو کامیاب نہیں ہوا، فریڈرک ثانی پہلا
شخص ہے، جس نے یورپ میں اسلامی علوم و فنون کے مدارس قائم کیے، فریڈرک ثانی ۲۶ر دسمبر سنہ ۱۱۹۴ء

میں پیدا ہوا، اور بلرمو میں تعلیم و تربیت پائی، بلرمو اس وقت عرب حکما سے بھرا ہوا تھا، اس بنا پر اس کو ابتدا ہی سے بے تعصبی کے ساتھ علمی ذوق کو ترقی دینے کا موقع ملا، اس کی بے تعصبی کا اظہار اس کے علمی کارناموں ہی سے نہیں ہوتا، بلکہ اوس کی ذاتی زندگی بھی اس کا بہترین مظہر تھی، چنانچہ اس کے باڈی گارڈ مسلمان ہوتے تھے، اوس نے جو قلعے اور عمارتیں تعمیر کرائی تھیں، اون میں اندلس کی عمارتوں کی طرح عربی طرز تعمیر کا خاص لحاظ رکھا گیا تھا، پھر خوش قسمتی سے بے تعصبی سے کام لینے کے لیے زمانہ نے پہلے ہی سے اوس کے لیے راستہ صاف کر دیا تھا، چنانچہ جب مسلمانوں نے اندلس کو فتح کیا اور فرانس میں داخل ہوئے تو آزاد خیالی اور لٹریچر نے فرانس پر بھی بہت نمایاں اثر ڈالا، بالخصوص شاعری پر اس کا خاص اثر پڑا، فرانس کے شعرا پہلے جو اشعار کہتے تھے، ان میں قافیہ کی پابندی نہیں ہوتی تھی، لیکن عرب شعرا کی تقلید اور تتبع میں وہ بھی قافیہ کی پابندی کرنے لگے۔ خود عربی اشعار اور رجز وہاں کے لوگوں کی زبانوں پر اسقدر چڑھ گئے کہ وہاں کے فقرا عربی اشعار پڑھ پڑھ کر بھیک مانگتے تھے صلیبی لڑائیوں نے بھی مسلمانوں کے شاندار تمدن و تہذیب کا جو نمونہ یورپ کے سامنے پیش کیا تھا، اوس نے بھی اچھا خاصا اثر ڈالا، اور یورپ کے لوگ اس سے متاثر ہوئے۔

جب اندلس میں مسلمانوں کی سلطنت کا خاتمہ ہوا، اور ان کے بڑے بڑے شہر عیسائیوں کے قبضہ میں آگئے، تو مسلمان وہاں سے نکل کر جنوبی فرانس میں پھیل گئے، مسلمانوں کے اس انتقال مکانی سے مونپلیہ یونیورسٹی پر خاص اثر پڑا، اہل یورپ نے مونپلیہ میں ایک طبی مدرسہ کی بنیاد ڈالی تھی جب ان کو اندلس کے عرب علماء سے فائدہ اٹھانے کا موقع ملا، تو یہ مدرسہ مذہبی اور علمی آزادی فکر کے لحاظ سے تمام یورپ کی دماغی ترقی کا مرکز بن گیا،

سسلی کو بھی جب مسلمانوں نے فتح کیا تو اس پر بھی اون کے تمدن کا رنگ چڑھ گیا، سسلی چونکہ وسط یورپ میں واقع تھا، اس بنا پر یورپ کی مختلف قومیں اسی رنگ میں رنگ گئیں، نورمانیوں نے

جب سسلی کو فتح کیا، تو یہاں کے تمدن میں کسی قسم کا تغیر نہیں پیدا ہوا، بلکہ اس زمانہ میں مسلمان علمی دائرے سے نکل کر سیاست کے میدان میں بھی آ گئے، خصوصاً فوجی اور انتظامی معاملات میں ان پہ پورا بھروسہ کیا جاتا تھا، جنگی جہاز تو بالکل اون کے ہاتھ میں تھے، ان کے اثر سے جہاز سے متعلق بہت سے الفاظ اور اصطلاحات یورپ کی زبانوں میں آ گئے، جو اب تک موجود ہیں، مثلاً امیرال یورپ کی کی زبانوں کا ایک متداول لفظ ہے، حالانکہ یہ لفظ امیر البحر کی بگڑی ہوئی شکل ہے، بہر حال سسلی کے شہروں سے لیکر دیہات تک میں عربی تمدن کا اثر نمایاں تھا، خصوصاً اوس کے دو شہر بلرم اور سالرن تو عربی تمدن کا مرکز تھے۔

ان تمام قدرتی اسباب سے فریڈرک ثانی کو فائدہ اٹھانے کا خوب موقع ملا، چنانچہ اوس نے دو عظیم الشان مدرسوں کی بنیاد ڈالی ان میں پہلا مدرسہ ناپولی کا ہے، فریڈرک نے اس میں وہاں کے مقامی علماء کے علاوہ عرب پروفیسر بھی مقرر کیے، کتب خانوں سے بھی اوسکو مسلمانوں سے دوستانہ تعلقات پیدا ہوئے، چنانچہ اوس نے مصر، اندلس، شام اور گرجوں کے تمام کتب خانوں کو ملا کر ایک عظیم الشان کتب خانہ قائم کیا، ناپولی بحر متوسط کے وسط میں تھا، اس بنا پر پورے براعظم یورپ کے تمام اطراف وجوانب سے نہایت کثرت سے طالب العلم آتے تھے، اور تعلیم حاصل کرتے تھے، غربا کو مفت تعلیم دی جاتی تھی، سالرن کا مڈیکل کالج بہت وسیع اور بلند تھا، اوس کے مقابلہ میں ناپولی کا مدرسہ کوئی وقعت نہیں رکھتا تھا، سالرن کے اس کالج کو سب سے پہلے آٹھویں صدی میں بعض عرب اور یہود علماء نے قائم کیا تھا، لیکن اس کی اصلی ترقی فریڈرک ثانی کے عہد میں ہوئی، اس میں اس وقت کی تمام مروجہ زبانوں مثلاً لاطینی، یونانی، جرمن، عربی، عبرانی میں تعلیم دی جاتی تھی، تاکہ کسی زبان کا جاننے والا بھی تعلیم سے محروم نہ رہے، تعلیم کا طرز یہ تھا، کہ تمام علوم وفنون پر لکچر دیے جاتے تھے، علم التشریح کی بھی تعلیم ہوتی تھی، چونکہ عیسائی مردہ آدمیوں کے جسموں کو چھونا ناجائز سمجھتے تھے،

اس لئے اس قسم کے تجربات بجائے انسانی جسموں کے بندروں کے جسموں پر کیے جاتے تھے، جو تمام جانوروں میں انسانوں سے سب سے زیادہ مشابہ ہیں لیکن کبھی کبھی پوشیدہ طور پر انسان کے جسم کی بھی تشریح کیجاتی تھی، داخلہ کے لیے کسی خاص مذہب کی قید نہ تھی، ہر مذہب کے اساتذہ بھی اس میں رکھے جاتے تھے، اور ہر مذہب کے طلبہ بھی اس میں داخل ہو سکتے تھے۔

اس مڈیکل کالج میں خاص طور سے ہر مرض کے اسپشلسٹ بھی تیار کیے جاتے تھے بعض صرف آنکھ کے امراض کا علاج کرتے تھے بعضوں کو مثانہ کے امراض میں کمال ہوتا تھا بعض صرف نباتات کے خواص کی واقفیت رکھتے تھے، ان کے تمام تجربات ایک کتاب کی صورت میں جمع کر دیے گیے ہیں، جس کا نام رجمین سینٹیلنس ہے، محققین کا بیان ہے کہ یہ کتاب اسحاق بن سلیمان کے تجربات سے ماخوذ ہے، جو قرطبہ کا مشہور حکیم تھا، اس کتاب میں امراض کی تشخیص، اعضاے انسانی کی تشریح، اصول حفظان صحت، کو الکب کا تعلق صحت و مرض کے ساتھ غرض اس قسم کے مفید مباحث درج ہیں، اس مدرسہ نے اس قدر ترقی کی، کہ خود حکومت نے عطاروں کی نگرانی اپنے ذمہ لے لی، کہ وہ عطاری کے ساتھ طبابت نہ کرنے پائیں، جس سے خاص اطبار کے حقوق میں دست اندازی ہوتی تھی، اس مدرسہ کی سرپرستی میں متعدد شفاخانے قائم تھے، جن پر بڑی بڑی جائدادیں وقف تھیں، ان میں پہلا شفاخانہ خاص ان اصولوں کے مطابق قائم کیا گیا تھا، جو اندلس میں خلفاے بنی امیہ کے شفاخانوں کا سنگ بنیاد تھے، لیکن یورپ کو ان مدارس کے علاوہ مسلمانوں کی تصنیفات کے تراجم سے بہت زیادہ فائدہ پہنچا، یورپ میں تراجم کا ذوق سب سے پہلے جربرٹ نے پیدا کیا، اور پھیلایا، جو ۹۹۹ء میں عیسائیوں کا سب سے بڑا پوپ گذرا ہے، اور جو پاپا سلوسٹر ثانی کے نام سے مشہور ہے، اس نے تراجم کی اشاعت میں ایسی سرگرمی دکھائی، کہ اہل یورپ نے اس پر یہ تہمت لگائی کہ اس نے اپنی روح شیطانوں کے ہاتھ بیچ ڈالی ہے، اس کے بعد ہرمان مقفع قسطنطین

افریقی، افلاطون طیبوری، اڈلاو باطی، یوحنا شبیلی گندیسالفی ہرمان الدالی، مرقس الیطلی، کریمونی فیلنوف، ارمنکو، اسکاٹ، فراغوث غرض کہ نہایت کثرت سے مترجمین پیدا ہوگئے، ان مترجمین میں اگرچہ اطالین، فرانسیسی، اور انگریز سبھی تھے، لیکن عربی تصنیفات کا ترجمہ عموماً لیٹن زبان میں کیا جاتا تھا، ان مترجمین نے جن کتابوں کے ترجمے کیے، ان کی تعداد تقریباً ۳۰۰ تک پہنچی ہے، جن کی تفصیل حسب ذیل ہے،

علم	تعداد
فلسفہ وطبیعات	۹۰
ریاضی ونجوم	۷۰
طب	۹۰
کیمیا ونجامہ	۴۰

تراجم کا یہ ذوق روز بروز بڑھتا گیا، یہانتک کہ سنہ ۱۱۳۰ء میں لارڈ بشپ رائمونڈ کی سرپرستی میں طلیطلہ میں تراجم کا ایک خاص محکمہ قائم ہوا، جس کے ذریعہ یورپ میں تراجم کی نہایت کثرت سے اشاعت ہوئی، ڈاکٹر لوکلرک نے اپنی کتاب تاریخ علم طب عربی میں لکھا ہے کہ عربی کی صرف ۳۰۰ طبی کتابوں کا ترجمہ لیٹن زبان میں کیا گیا، پندرہویں صدی تک یورپ میں کوئی کتاب تصنیف نہیں ہوئی، اوس کی تمام دماغی ترقیوں کا دار ومدار انہی تراجم پر رہا، ڈاکٹر گسٹاولی بان کا بیان ہے کہ یورپ میں چھ سو برس تک انہی تراجم کے ذریعہ سے تعلیم ہوتی رہی، بالخصوص طب میں ابن سینا کی تصنیفات اٹھارہویں صدی تک مونٹپلیہ کی یونیورسٹی میں پڑھائی جاتی تھیں،

عربی زبان سے جن کتابوں کا ترجمہ یورپ میں کیا گیا، اون کی دو قسمیں ہیں،

ایک تو وہ کتابیں ہیں، جن کو خود اہل عرب نے یونانی زبان سے ترجمہ کیا تھا، یورپ میں

اگرچہ ان کتابوں کا ترجمہ عربی تراجم کے ذریعہ ہوا لیکن یہ کتابیں اصل مصنفین کی طرف منسوب کر دی گئیں، یہ کتابیں زیادہ تر ارسطو، افلاطون، بقراط، جالینوس، اقلیدس، ارشمیدس کی تصنیفات تھیں، دوسری وہ کتابیں ہیں جن کو ان علوم میں مہارت حاصل کرنے کے بعد خود علمائے اسلام نے تصنیف کیا تھا، ہم اس موقع پر ان مصنفین کی ایک فہرست درج کرتے ہیں جن کی تصنیفات کا ترجمہ یورپ کی زبانوں میں کیا گیا۔

شمار	نام مصنف	کیفیت
۱	ابوالحسن فلکی	اس کی تمام تصنیفات علم الفلک میں تھیں، اس کی کتاب اوائل و اواخر کے بعض اجزاء کا ترجمہ مورخ سیدیو نے کیا، اور سنہ ۱۸۳۴ء میں شائع ہوا۔
۲	ابوالوفا جوزجانی بتانی	یہ بہت بڑا ہیئت داں تھا، سیدیو نے اس کی تمام تصنیفات کا ترجمہ کیا، اور یہ تمام ترجمے سنہ ۱۸۴۰ء میں پیرس سے شائع ہوئے۔
۳	یعقوب کندی	اس کی ایک طبی تصنیف کا لیٹن زبان میں ترجمہ ہوا، اور سنہ ۱۵۳۱ء اور سنہ ۱۶۰۳ء کے درمیان متعدد بار شائع ہوا۔
۴	موسیٰ خوارزمی	اس نے جبر و مقابلہ میں ایک رسالہ لکھا تھا، جس کا ترجمہ علامہ روزن نے سنہ ۱۸۳۱ء میں انگریزی زبان میں کیا، اس سے پہلے بارھویں صدی میں بھی

کیفیت	مصنف	نمبر شمار
علامہ رود ولف دی برونے نے اس کا ترجمہ لیٹن میں کیا تھا۔		
اس نے علم الفلک میں ایک کتاب لکھی تھی جس کے لیٹن میں تین ترجمے کیے گئے، ایک ترجمہ یوحنا اشبیلی نے بارھویں صدی میں کیا تھا، جو ۱۴۹۳ء میں فراری سے شائع ہوا، اور اخیر میں ۱۶۹۹ء میں بھی چھاپا گیا۔	ابوالحسن الفرغانی	۵
اس کی کتابوں کا عبرانی زبان میں ترجمہ ہوا لیکن ان کی اشاعت نہیں ہوئی۔	ابونصر فارابی	۶
وہ طب، فلسفہ، ہیئت، تمام فنون کا جامع تھا، اس کی اکثر طبی تصنیفات کا لیٹن میں ترجمہ ہوا، اور ۱۵۵۲ء میں یہ تراجم مختلف عنوانات سے شائع کیے گئے۔	ابن رشد	۷
قانون اس کی مشہور تصنیف ہے، لاطینی زبان میں یہ کتاب ترجمہ ہوکر بار بار چھپی، اسکی پہلی اشاعت مقام بندقیہ سے ۱۴۸۳ء میں ہوئی تھی، ابن سینا کی تصنیفات کی شرحیں تو اٹھارہویں صدی کے آخر تک شائع ہوتی رہیں۔	ابن سینا	۸

شمار	مصنف	کیفیت
۹	قسطنطین افریقی	یہ وہ شخص ہے جس نے اٹلی میں عربی طب کو رواج دیا اوس نے اپنی تمام کتابیں لیٹن زبان میں لکھی تھیں جنکا ماخذ طب عربی تھی، یہ کتابیں ۱۵۳۶ء میں مقام باسل سے شائع ہوئیں۔
۱۰	جابر بن حیان	کیمسٹری کا بہت بڑا عالم تھا، پیرس کے پبلک کتب خانہ میں لیٹن زبان میں اس کی چھ کتابیں موجود ہیں، اس کی اکثر کتابوں کی اشاعت ہوئی، سب سے پہلے اس کی کتابیں سنہ ۱۴۹۰ء میں چھاپی گئیں، اس کے بعد سنہ ۱۶۷۲ء میں لیٹن سے فرنچ میں انکا ترجمہ ہوا، اسکی کتابوں کے انگریزی میں ترجمے ہوئے، اور سنہ ۱۶۷۸ء میں ان کی اشاعت ہوئی،
۱۱	جابر فلکی	یہ دوسرا شخص ہے، اشبیلیہ میں رہتا تھا، ہیئت میں اس نے ایک مفید کتاب لکھی تھی جس کا لیٹن میں ترجمہ ہوا،
۱۲	عباس	اس نے طب میں پچاس اجزاء میں ایک کتاب لکھی تھی، جس کا نام مالکی تھا، لیٹن میں اس کا ترجمہ ہوا اور مقام وینس سے سنہ ۱۴۹۲ء میں شائع ہوا،
۱۳	حسن بن الہیثم	یہ ریاضی کا بہت بڑا عالم تھا، اس کی کتابوں کا لیٹن میں ترجمہ ہو کر سنہ ۱۵۷۱ء میں شائع ہوا، اس نے ہندسہ میں ایک کتاب لکھی تھی، سیدیو نے اس

شمار	مصنف	کیفیت
		کا خلاصہ شائع کیا۔
۱۴	ابن العوام اندلسی	علم النباتات کا ماہر تھا، اس نے فن زراعت پر ایک کتاب لکھی تھی، موسیو کلیمان مولیہ نے فرنچ میں اس کا ترجمہ کردیا اور ۱۸۶۶ء میں شائع ہوا،
۱۵	قزوینی	ہیئت، جغرافیہ، تاریخ طبیعی کا عالم تھا، اس کی کتاب عجائب المخلوقات کا فرنچ میں ترجمہ ہوا، اور ۱۸۰۵ء میں پیرس سے شائع ہوا، حال میں اس کے ہیئت کے ایک رسالہ کا جرمن زبان میں ترجمہ ہوا ہے۔
۱۶	ضیاء ابن بیطار اندلسی	علم النباتات میں مہارت رکھتا تھا، اس کی ایک کتاب مفردات کا ترجمہ ڈاکٹر لوکلرک نے دو جلدوں میں کیا، اور ۱۸۷۷ء میں پیرس سے شائع ہوا۔
۱۷	ابن یونس	یہ ہیئت داں تھا، زیج حاکمی جو ہیئت میں بے مثل تصنیف ہے، اس کی تالیف ہے، علامہ کوسان دو برسفال نے اس کے بعض اجزاء کا ترجمہ کیا اور ۱۸۰۴ء میں پیرس سے شائع ہوا۔
۱۸	یحییٰ بن ماسویہ	بہت بڑا طبیب تھا، خواص ادویہ میں اس کی بہت سی کتابیں ہیں، جو بار بار چھپ چکی ہیں، لیٹن میں اس کی کتابوں کا ترجمہ ہوا اور مقام بندقیہ سے ۱۴۷۱ء

شمار	مصنف	کیفیت
		میں شائع ہوا۔
۱۹	محقق طوسی	اس نے ایک زیچ مرتب کی تھی، اس کا خلاصہ لیٹن زبان میں ۱۶۴۸ء میں شائع ہوا، اور ۱۶۵۲ء میں بھی چھاپا گیا۔
۲۰	الغ بیگ	یہ تیمور لنگ کا پوتا اور ریاضی کا بہت بڑا عالم تھا، اس نے ایک زیچ مرتب کی تھی، . . . . ، جو اوسی کے نام سے مشہور ہے لیٹن میں اس کا ترجمہ ہوا، اور ۱۶۶۵ء میں آکسفورڈ سے اور ۱۸۴۷ء میں پیرس سے اس کی اشاعت ہوئی،
۲۱	زکریا رازی	طبیب اور بہت بڑا مصنّف تھا اوس کی تصنیفات کی تعداد ۲۲۶ تک پہنچی ہے اسکی اہم کتابوں کا لیٹن میں ترجمہ ہوا، اور ۱۴۸۶ء میں ان کی اشاعت ہوئی، چیچک کے متعلق اس کا ایک رسالہ تھا، جو ۱۴۹۸ء و ۱۷۶۶ء میں لیٹن زبان میں چھاپا گیا، آج تک علم کیمیا میں اس کی تین کتابوں کے ترجمے متداول ہیں۔
۲۲	ثابت بن قرہ	یہ پہلا شخص ہے کہ جس نے جبر و مقابلہ اور ہندسہ میں

شمار	مصنف	کیفیت
		تطبیق دی، سیدیو نے اس کی تصنیفات کا خلاصہ شائع کیا ہے۔

مصنفین کی صراحت کے ساتھ ہم ان تمام تصنیفات کی ایک مفصل فہرست درج کرتے ہیں۔ جن کا ترجمہ یورپ کی زبانوں میں ہوا، یہ فہرست اگرچہ جامع اور مکمل نہیں ہے، تاہم اس سے اس امر کا اندازہ ہوگا کہ یورپ کس قدر مسلمانوں کا گراں بار احسان ہے۔

شمار	نام کتاب	مصنف	مترجم	شمار	نام کتاب	مصنف	مترجم
۱	السمع والبصر	یعقوب کندی	کریمونی	۱۲	العلوم	فارابی	کریمونی
۲	الغایہ	ر	ر	۱۳	العقل والمعقول	ر	نامعلوم
۳	الاحکام	ر	ر	۱۴	الکیمیا	ر	ر
۴	التوحید	ر	ر	۱۵	الحادی	زکریا رازی	فراغوت
۵	الاسباب المختلفہ	ر	نامعلوم	۱۶	المنصوری	ر	کریمونی
۶	مستقبل المعرفہ	ر	ر	۱۷	الضوء	ر	ر
۷	خصائص العناصر	فارابی	ر	۱۸	الاقسام	ر	ر
۸	السمع الطبیعی	ر	کریمونی	۱۹	المدخل فی الطب	ر	ر
۹	المنطق	ر	ر	۲۰	الاغذیہ	ر	ر
۱۰	مطلع العلم	ر	کندیا لقی	۲۱	علل المفاصل	ر	نامعلوم
۱۱	اقسام الفلسفہ	ر	ر	۲۲	امراض الجلد	ر	ر

شمار	کتاب	مصنف	مترجم	شمار	کتاب	مصنف	مترجم
۲۳ -	الترياق	زکریا رازی	نامعلوم	۴۱ -	الکلیات	ابن رشد	ارمنگو
۲۴ -	الجدری والحصبہ	،،	،،	۴۲ -	شرح ارجوزہ ابن سینا	ابن رشد	،،
۲۵ -	القانون	ابن سینا	کریمونی	۴۳ -	الادویۃ المفردہ	ابن سینا	مائن
۲۶ -	قلب الانسان	،،	فیلنوف	۴۴ -	الترياق	،،	نامعلوم
۲۷ -	الارجوزہ فی الطب	،،	ارمنگو	۴۵ -	السموم	،،	،،
۲۸ -	شرحہا	،،	،،	۴۶ -	شرح السماء والعالم	،،	اسکاٹ
۲۹ -	الشراب	،،	البانو ابن	۴۷ -	شرح النفس	،،	،،
۳۰ -	النفس اشبیلی	،،	اشبیلی	۴۸ -	القوی الطبیعیہ	،،	،،
۳۱ -	مابعد الطبیعیہ	،،	گوندیسالفی	۴۹ -	الرجم	،،	،،
۳۲ -	الطبیعیات	،،	،،	۵۰ -	المجسطی	ثابت بن قرہ	،،
۳۳ -	اسماء العالم	ابن سینا	،،	۵۱ -	الاوزان	،،	،،
۳۴ -	مختصر الحیوان	،،	اسکاٹ	۵۲ -	ترکیب الدوائر	،،	،،
۳۵ -	التعریفات	،،	نامعلوم	۵۳ -	التصور	،،	اشبیلی
۳۶ -	الکیمیا	،،	،،	۵۴ -	السیارات	،،	نامعلوم
۳۷ -	الحجر الفلسفی	،،	،،	۵۵ -	الثوابت	،،	،،
۳۸ -	الحدود	،،	،،	۵۶ -	التقارب والتباعد	،،	،،
۳۹	المنطق	،،	،،	۵۷ -	الدائرۃ المشمسہ	،،	،،
۴۰	الفلسفۃ الاولیٰ	،،	،،	۵۸ -	التناسب	،،	،،

شمار	کتاب	مصنف	مترجم
۵۹ ـ	احکام النجوم	ماشاء اللہ	اشبیلی
۶۰ ـ	احکام القرانات و المازجات	،،	،،
			،،
۶۱ ـ	الاسطرلاب	،،	نامعلوم
۶۲ ـ	الدائرہ	،،	کریمونی
۶۳ ـ	البول	اسحاق الاسرائیلی	قسطنطین
۶۴ ـ	الحمیات	،،	،،
۶۵ ـ	العناصر	،،	کریمونی
۶۶ ـ	الاغذیہ	،،	،،
۶۷ ـ	الحدود	،،	،،
۶۸ ـ	الجراحۃ	زہراوی	،،
۶۹ ـ	الرق	،،	سمعان الجنوی
۷۰ ـ	النظر والعمل	،،	نامعلوم
۷۱ ـ	التصریف	،،	،،
۷۲ ـ	الملکی	علی بن عباس	قسطنطین
۷۳ ـ	تقویم الابدان	ابن جزلہ	فراغوث
۷۴ ـ	الصحۃ	ابن بطلان	،،
۷۵ ـ	تذکرۃ الکحالین	عیسیٰ بن علی	نامعلوم

شمار	کتاب	مصنف	مترجم
۷۶ ـ	التیسیر ابن زہر	ابن زہر	پرافینوس
۷۷ ـ	البسائط	سرائیون	سمعان الجنوی
۷۸ ـ	صناعۃ جالینوس	ابن رضوان	کریمونی
۷۹ ـ	الکتب الاربعہ		یامرالفونس
۸۰ ـ	الطبیعۃ وما وراءہا	امام غزالی	کوندیسالفی
۸۱ ـ	الزیج	الخوارزمی	ادلارالہاملی
۸۲ ـ	المدخل	،،	،،
۸۳	الجبر	،،	کریمونی
۸۴	الہندسہ	اولاد شاکر	،،
۸۵ ـ	ینبوع الحیاۃ	ابن جبرئیل	کوندیسالفی
۸۶ ـ	حرکات النجوم	البتانی	الطیبوری
۸۷ ـ	مائۃ مسالہ	،،	نامعلوم
۸۸ ـ	الزیج	،،	بینی ادیہرت الترنس
۸۹ ـ	القانون	،،	یا مرلفو
۹۰ ـ	الجبر	ابو کامل شجاع	کریمونی
۹۱ ـ	الاسطرلاب	ابن صفا	نامعلوم
۹۲ ـ	المثلثات الکرویہ	جابر بن افلح	،،
۹۳ ـ	النصرانیۃ والاسلام	الہتروجی	اسکاٹ

شمار	کتاب	مصنف	مترجم	شمار	کتاب	مصنف	مترجم
۹۴ -	زلوالمسافر	ابن الجزار	قسطنطین	۱۰۳ -	التعاویذ	قسطا بن لوقا	فیلنوف
۹۵ -	المدخل فی النجوم	القبیصی	اشبیلی	۱۰۴ -	اللاہوت	جابر	کریمونی
۹۶ -	الشفق	ابن ہیثم	کریمونی	۱۰۵ -	الانوار	ابن العوام	،،
۹۷ -	المختصر	سرابیون	،،	۱۰۶ -	الزیج	للزرقانی	،،
۹۸ -	الحمیات	ماسویہ	نامعلوم	۱۰۷ -	السموم	المیمونی	السینی
۹۹ -	الجراحۃ	،،	فراغوت	۱۰۸ -	النجوم	الفرغانی	کریمونی و اشبیلی
۱۰۰ -	الایساغوجی	حنین	نامعلوم	۱۰۹ -	زہرالنجوم	البلخی	اشبیلی
۱۰۱ -	المنطق	السرخسی	،،	۱۱۰ -	الاختیار	،،	نامعلوم
۱۰۲ -	النفس والروح	قسطا بن لوقا	اشبیلی	۱۱۱ -	الرمد	،،	،،

یہ ان کتابوں کی فہرست ہے، جن کو خود مسلمانوں نے تصنیف کیا تھا لیکن وہ کتابیں جن کا مسلمانوں نے یونانی سے عربی زبان میں ترجمہ کیا تھا، مثلاً المجسطی، کتاب الحواس وغیرہ، اس سے الگ ہیں، شاید یہ کہا جائے کہ یہ کتابیں اگرچہ مسلمانوں کی تصنیف ہیں لیکن یہ مسلمانوں کی کتابیں نہیں ہیں، مسلمانوں کے اصلی علوم وفنون، حدیث، تفسیر، فقہ، ادب، بلاغت، فصاحت وغیرہ ہیں، اور ان تمام کتابوں میں ایک کتاب بھی اس موضوع پر نہیں ہے لیکن یہ ایک بہت بڑی غلطی ہے، مسلمانوں نے صرف یونانی زبان کی کتابوں کے ترجمے ہی نہیں کیے، بلکہ ان پر اضافہ کیا، ان کی حک و اصلاح کی، جدید مسائل پیدا کیے، مختصر یہ کہ ان علوم کو گویا خاص اپنا فن بنالیا، اس بنا پر ان تراجم کے ذریعہ سے یورپ میں جو عقلی علوم کا ذخیرہ پہنچا وہ گویا خاص مسلمانوں کی تحقیقات کا لب لباب تھا، اس کے علاوہ مسلمانوں نے جن کتابوں کے لفظی ترجمے کیے تھے ان میں بعض کتابوں کی اصل ضائع ہوگئی، حکمائے یونان میں ثموفارس ارسطوس، منیلادس، ثاددن کی

کتابوں کے ترجمے عربی میں ہوئے، اور ان کی اصل کتابیں ضائع ہوگئیں، کلیلہ ودمنہ کا ترجمہ ابن مقفع نے فارسی سے عربی میں کیا، اور اصل نسخہ غائب ہوگیا، کتاب الفلاحۃ النبطیہ کا ترجمہ ابن وحشیہ نے سریانی سے کیا، اور اصل کتاب برباد ہوگئی، اس بنا پر یورپ کو ان حکماء کے اصول اور ان کتابوں کی اطلاع صرف مسلمانوں ہی کے تراجم سے ہوئی، بہرحال یورپ مسلمانوں کے بار احسان سے سبکدوش نہیں ہوسکتا،

لیکن اس زمانے میں مسلمانوں کے لیے صرف اسی پر فخر کافی نہیں ہے، بلکہ مسلمانوں کا فرض ہے کہ جس طرح زمانۂ قدیم میں ہم سے یورپ نے سیکھا تھا، اسی طرح ہم اس زمانہ میں یورپ سے سیکھیں، قدیم زمانہ میں فلسفہ کا دائرہ محدود تھا، اب یورپ نے ہر چیز کو فلسفہ بنا دیا ہے، اس لیے فلسفہ کے ان تمام اقسام کو اپنی زبان میں لانا چاہئے، ہندوستان میں جدید تعلیم روز بروز ترقی کررہی ہے، لیکن ابھی تک تراجم کے سلسلہ میں بہت کم وسعت ہوئی ہے، اردو میں صرف چند کتابیں انگریزی سے ترجمہ ہوئی ہیں جن کا شمار انگلیوں پر کیا جاسکتا ہے، مصر میں بلاشبہ تراجم نے ترقی کی ہے، اور انگریزی کے علاوہ فرنچ اور جرمن زبان کی کتابوں کے بھی ترجمے ہوئے ہیں، بالخصوص محمد علی پاشا کے زمانہ میں اس صیغہ نے خاص وسعت حاصل کی، اگر یہی حالت قائم رہتی تو یورپ کا تمام سرمایہ عربی زبان میں منتقل ہوگیا ہوتا، محمد علی پاشا کے زمانہ میں جدید علوم وفنون کی جو کتابیں ترجمہ وتالیف کے ذریعہ عربی میں آئیں، ان کی ایک فہرست ہم درج کرتے ہیں، تاکہ یہ معلوم ہوجائے، کہ ہماری علمی کوششوں کو یورپ کی علمی کوششوں سے کیا نسبت ہے،

شمار	کتاب	مولف	سنہ اشاعت
۱	الآیات البینات فی علم النباتات	محمود نوزی	سنہ ۱۸۸۸ء
۲	الظواہر البدیعہ فی علم الطبیعیہ	”	سنہ ۱۳۰۹ء
۳	منافع الحیوانات	”	سنہ ۱۳۰۶ء
۴	علم طبقات الارض	احمد زے	سنہ ۱۲۸۸ء

شمار	کتاب	مولف	اشاعت
۵ -	بنیۃ الکرۃ الارضیہ	احمد ندے	سنہ ۱۲۵۶ھ
۶ -	حسن الصناعہ فی علم الزراعہ	"	سنہ ۱۲۹۱ھ
۷ -	علم النبات	"	سنہ ۱۲۸۳ھ
۸ -	علم الحیوانات	"	سنہ ۱۲۸۴ھ
۹ -	الکیمیاء الزراعیہ	ابوالسعود	سنہ ۱۲۹۰ھ
۱۰ -	الجواہر البدیعۃ فی علم الطبیعیہ	محمد کامل الکفروی	سنہ ۱۳۰۵ھ
۱۱ -	الکیمیاء العمومیہ لہ اجزاء	ابراہیم لطفی	سنہ ۱۳۰۳ھ
۱۲ -	مبادی الطبیعیہ	"	سنہ ۱۳۰۵ھ
۱۳ -	علم الحیوانات اللافقریۃ	"	سنہ ۱۳۰۳ھ
۱۴ -	الیاتولوجیا	محمد شافعی	سنہ ۱۲۵۹ھ
۱۵ -	الحصون النقیہ	"	سنہ ۱۲۰۵ھ
۱۶ -	التذکرۃ الطبیہ	ابراہیم مصطفیٰ	سنہ ۱۸۸۱ھ
۱۷ -	التصریح الخاص	محمود صدیقی و محمد امین	سنہ ۱۳۰۴ھ
۱۸ -	المادۃ الطبیعیہ جزآن	علی ریاض	سنہ ۱۲۹۷ھ
۱۹ -	جراحۃ الاقسام	محمد الدری	سنہ ۱۳۰۴ھ
۲۰ -	امراض النسا	احمد الرشیدی	سنہ ۱۲۶۰ھ
۲ -	امراض الجلدیہ جزآن	"	سنہ ۱۲۶۲ھ
۲۱ -	فی علی الادویۃ والعلاج ۴ جلد	"	سنہ ۱۲۸۳ھ

شمار	کتاب	مؤلف	سنہ اشاعت
۲۳	امراض الاطفال	احمد الرشیدی	سنہ ۱۲۶۱ھ
۲۴	قواعد التحضیر	محمد الشیاسی	سنہ ۱۲۶۲ھ
۲۵	الاقرباذین	حسن الرشیدی	سنہ ۱۲۶۵ھ
۲۶	الطب السیاسی	ابراہیم حسن	سنہ ۱۲۹۳ھ
۲۷	العلمیات الجراحیۃ الکبری	محمد علی البقلی	سنہ ۱۲۵۹ھ
۲۸	فن الجراحۃ (۲ جلد)	"	سنہ ۱۲۸۲ھ
۲۹	اعمال الجراح (۲ جلد)	محمد علی البقلی	سنہ ۱۲۶۲ھ
۳۰	الامراض الجلدیہ	حسن محمود	سنہ ۱۲۹۲ھ
۳۱	السیاسۃ الصحیۃ	محمد صفوت	سنہ ۱۳۰۳ھ
۳۲	علم التشریح	حسن عبد الرحمٰن	سنہ ۱۲۸۳ھ
۳۳	فن الولادۃ	عیسیٰ حمدی	سنہ ۱۲۹۷ھ
۳۴	مختصر الطب الباطنی والعلاج	"	سنہ ۱۳۰۲ھ
۳۵	صحۃ الحوامل والاطفال	"	سنہ ۱۲۹۹ھ
۳۶	امراض الاطفال	"	سنہ ۱۳۰۰ھ
۳۷	التسمیع والقرع	"	سنہ ۱۳۰۴ھ
۳۸	مختصر فن العلاج	"	سنہ ۱۳۰۱ھ
۳۹	مختصر الطب الباطنی (۲ جلد)	"	سنہ ۱۲۹۸ھ
۴۰	الطب الباطنی والعلاج (۴ جلد)	سالم سالم	سنہ ۱۲۳۹ھ
۴۱	المیاہ المعدنیہ	سالم سالم	سنہ ۱۳۰۰ھ

[illegible]

حیاتِ امام مالکؒ

از

سید صباح الدین عبدالرحمٰن

یہ حضرت مولانا سید سلیمان ندویؒ کی کوئی مستقل تصنیف نہیں، بلکہ اس کو ان کے مضامین کا ایک مجموعہ سمجھنا چاہیے، جب وہ ابھی تیئیس۲۳ برس کے تھے تو دارالعلوم ندوۃ العلماء کے ترجمان الندوہ میں سنہ ۱۹۰۷ء میں "حیات امام مالکؒ" کے عنوان سے کئی قسطوں میں ایک مضمون لکھا تھا، اس میں اضافہ کرکے اس کو ایک مستقل تصنیف بنانے کا ارادہ رکھتے تھے، لیکن اپنی اور مشغولیتوں کی وجہ سے یہ نہ کرسکے، ان کے قلم کا ساز جہاں رکا تھا' وہیں رکا رہ گیا، اس کی افادیت کا خیال کرکے دارالمصنفین کے ابتدائی دور میں اس کو اگست سنہ ۱۹۱۷ء میں کتاب ہی کی صورت میں شایع کردیا گیا، جس کے اب تک متعدد اڈیشن نکل چکے ہیں۔

اس وقت اس کے لکھنے کا اولین مقصد تو ان کے سامنے یہ تھا کہ اکابر اسلام کی سوانح عمریوں کے پردے میں علوم اسلامیہ کی تاریخ لکھی جائے اور اسی ضمن میں ضروری مسائل کی تشریح ہو، اس کے علاوہ امام ابوحنیفہؒ اور امام شافعیؒ کے حالات تو اردو میں منتقل ہوچکے تھے، لیکن امام مالکؒ کے متعلق ایک حرف بھی اردو میں موجود نہیں تھا، حالانکہ وہ فقیہ مدینۃ الرسول، امام دارالہجرۃ اور بانیٔ اول فن حدیث تھے، اسی کے ساتھ مسلک حنفی کے علاوہ فقہ کے بقیہ تین مذاہب کے سلسلے ان ہی کی شاخیں ہیں، سید صاحبؒ یہ بھی لکھتے ہیں کہ مجھ کو

علم حدیث کی ابتدائے طلب سے امام موصوف اور ان کی موطا سے بدرجۂ غایت عقیدت رہی ہے، اسی کا اثر تھا جس نے مجھے اس فرض کے انجام دینے پر آمادہ کیا (دیباچہ حیات امام مالک)

اس کے لکھنے میں حسب ذیل کتابوں سے مدد لی گئی ہے:

(۱) الاصابہ فی تمیز الصحابہ (۲) تزیین الممالک، سیوطی (۳) تاریخ ابن خلکان (۴) اسعاف المبطا برجال الموطا سیوطی (۵) تذکرۃ الحفاظ ذہبی (۶) کتاب الانساب سمعانی (۷) طبقات ابن سعد (۸) جامع بیان العلم ابن عبدالبر (۹) کتاب العلل ترمذی (۱۰) بستان المحدثین شاہ عبدالعزیزؒ (۱۱) توالی التاسیس بمناقب ابن ادریس ابن حجر (۱۲) مناقب مالک ابن سود الزواوی (۱۳) تقریب التہذیب (۱۴) خطیب بغدادی (۱۵) مسند امام ابوحنیفہ (۱۶) دارقطنی کتاب الذبائح بدرالدین زرکشی (۱۷) مقدمہ ابن صلاح (۱۸) مقدمہ اعلام الموقعین ابن حزم اندلسی (۱۹) الاخبار الطوال ابوحنیفہ دینوری (۲۰) کتاب الام (۲۱) کتاب العبر ابن خلدون ج ۱ (۲۲) کتاب الفہرست ابن ندیم (۲۳) مرأت الاوراق ابن حجر (۲۴) طبقات سبکی (۲۵) مرآۃ الجنان یافعی، (۲۶) کشف الظنون (۲۷) تہذیب الکمال۔

کتاب کی ضخامت کل ۱۰۹ صفحہ ہے، مگر اس کے لکھنے میں ۲۷ کتابوں کو ماخذ بنایا گیا ہے، جو اس بات کی دلیل ہے کہ مولانا سید سلیمان ندویؒ کو اپنی طالب علمی کے زمانہ ہی سے تلاش، جستجو، محنت اور ریاضت کرنے کی عادت تھی۔

پہلے ذکر آیا ہے کہ سید صاحبؒ نے یہ کتاب ۲۲ سال کی عمر میں لکھی، لیکن اس کا جو انداز بیان ہے، اس سے یہ طالب علمانہ کوشش نہیں معلوم ہوتی، اور اگر یہ نہ بتایا جائے کہ مصنف نے کس سن میں یہ لکھی تو اس کی تحریر کی متانت اور اسلوب کے وقار سے بظاہر یہ معلوم ہوگا کہ کسی سن رسیدہ اور تجربہ کار مصنف کی محنت و کاوش کا نتیجہ ہے۔

سوانح نگاری کے فن کے لحاظ سے پہلے امام مالکؒ کا نام اور نسب لکھا گیا ہے، پھر ان کے خاندان کا ذکر

ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے پردادا ابو عامرؓ عہد نبویؐ میں مشرف بہ اسلام ہوئے، یہ خاندان یمن سے آکر مدینۃ النبیؐ میں آباد ہوا، حضرت امام مالکؒ کے دادا مالک بن ابی عامر ایک جلیل القدر تابعی تھے، حضرت عثمانؓ سے قریبی تعلق رکھتے تھے، ام المؤمنین حضرت عائشہؓ اور دیگر صحابۂ کبار سے شرف تلمذ حاصل تھا، مالک بن ابی عامر کے تین بیٹے تھے، انس، ربیع اور ابوسہیل نافع، امام مالکؒ کے والد ماجد انس تھے، جو وراثت علمی سے محروم تو نہ تھے، لیکن اپنے بھائی ابوسہیل نافع کی طرح ایک بلند پایہ محدث نہ تھے۔

امام مالک ۹۳ھ میں پیدا ہوئے، وہ امام ابوحنیفہ سے تیرہ[۱۳] سال چھوٹے تھے، یہ اموی خلیفہ ولید بن عبد الملک کا زمانہ تھا، امام صاحبؒ نے جب ہوش سنبھالا تو مدینۃ النبیؐ کو قرآن اور سنت کا بہت بڑا خزینہ دار پایا، سید صاحبؒ نے اس وقت کے فقہاء صحابہؓ، تلامذہ صحابہؓ اور تابعینؒ کے نام لکھے ہیں جن کی وجہ سے مدینہ علم کا باغ و بہار بنا تھا، سید صاحبؒ لکھتے ہیں:

"امام صاحبؒ نے ان میں سے اکثر سے استفادہ کیا، اس طرح مدینہ کا جو علم متفرق سینوں میں پراگندہ تھا وہ اب صرف ایک سینہ میں مجتمع ہو گیا، اس لیے امام دار الہجرۃ ان کا لقب ہوا۔" (ص ۸)

امام مالکؒ نے جن شیوخ سے حدیث سیکھی ان کے اسمائے گرامی بھی سید صاحبؒ نے تلاش کر کے درج کر دیے ہیں، جو یہ ہیں:

نافع، محمد بن شہاب الزہری، جعفر صادق بن محمد بن منکدر، محمد بن یحییٰ، یحییٰ الانصاری، ابو حازم اور یحییٰ بن سعید، ان کے حالات اور کارناموں کا بھی مختصر طریقے سے احاطہ کیا گیا ہے، جن سے مفید معلومات حاصل ہوتے ہیں، ان کے علاوہ انھوں نے مکہ، بصرہ، خراسان اور جزیرہ کے شیوخ سے بھی احادیث کی روایت کی، جن کی تعداد سید صاحبؒ نے چورانوے[۹۴] بتائی ہے، اور ان کے نام بہ ترتیب یکجا لکھ دیے ہیں، اور جو شیوخ غیر مدنی تھے ان کی بھی تصریح کر دی ہے، اس سے سید صاحبؒ کی علمی تلاش و تجسس کا اندازہ ہوتا ہے۔

امام مالکؒ نے فقہ کی تعلیم ربیعہ رائے سے حاصل کی، جو مسجد نبویؐ میں درس دیتے تھے، امام حسن بصریؒ،

شعبہ، اوزاعی، لیث مصری اور یحییٰ انصاریؒ جیسے علمائے افاضل بھی ان کے حلقۂ درس میں شریک ہوتے تھے، علامہ سید صاحبؒ نے اس حصہ کو بہت مفید بنا دیا ہے، جس میں وہ یہ بتاتے ہیں کہ کن کن اساتذہ سے کن کن اسباب کی بنا پر درس حاصل کیا، اس کو یہاں پر دُہرا دینا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

وہ ان ہی کے حلقۂ درس میں بیٹھے جو صدق و طہارت میں معروف اور حفظ و فقہ میں ممتاز تھے، کبھی کسی غیر فقیہ (سفیہ) کی مجلس میں نہیں بیٹھے، مدینہ میں بیسیوں اشخاص ایسے تھے جن سے لوگ حدیث سیکھتے تھے، لیکن انھوں نے کبھی ان سے اخذ علم نہیں کیا، کیونکہ ان کے متعلق ان کی یہ رائے تھی کہ ان میں بعض نادانستہ جھوٹ بولتے، بعض فن سخن سے ناواقف تھے، اور بعض پورے جاہل تھے، مدینہ میں ایسے مقدس لوگ بھی تھے جو بارش کی دعا مانگتے تو ان کی برکت سے آسمان سے پانی برس پڑتا، ان کو بہت سے احادیث اور مسائل کی سماعت بھی حاصل تھی، لیکن امام صاحبؒ نے ان سے استفادہ نہیں کیا، کیونکہ ان کے خیال میں وہ متقی، و زاہد ضرور تھے لیکن اتقاء اور پرہیزگاری کے ساتھ علم اور فہم کی پختگی ان میں نہ تھی، اگر یہ نہ ہو تو اس راہ میں وہ مفید نہیں، اور نہ وہ حجت ہیں، ان سے بھی کچھ نہ سیکھنے کی کوشش کی جو ایماندار تو تھے لیکن اس فن کے آدمی نہ تھے، ان سے بھی حدیث کی سماعت نہیں کی جو نیک و صالح تھے لیکن جو کہتے تھے وہ سمجھتے نہ تھے، انھوں نے اہل عراق سے بھی روایت نہیں کی، اس لیے کہ ان کے بزرگوں نے ان کے بزرگوں سے روایت نہیں کی، اور ان کے پچھلوں نے بھی ان کے پچھلوں سے روایت نہیں کی، جب وہ کسی غیر مدنی شیخ سے اخذ حدیث کرنا چاہتے تو پہلے ان کا تجربہ اور نقد کر لیتے، انھوں نے اپنے بوڑھے دادا سے بھی کوئی روایت نہیں کی، اس لیے کہ ان کا خیال تھا کہ عمر کے ضعف کا اثر حافظہ و عقل پر بھی پڑتا ہے۔

امام صاحبؒ کی مجلس درس کی جو تصویر سید صاحبؒ نے کھینچی ہے، اس کا مطالعہ اس حیثیت سے کیا جائے کہ اس زمانہ میں درسی درسگاہ کی کیا نوعیت تھی اور اس کے کیا آداب ہوتے تھے، اس کے کچھ اقتباسات یہاں پر ہم سید صاحب ہی کی تحریر میں اس لیے دینا چاہتے ہیں کہ یہ بھی معلوم ہو کہ تیئس (۲۳) سال کے ایک اہل قلم کا انداز تحریر

اپنی اس کمسنی میں کیا تھا، پہلے مجلس درس کی تہذیب کی مرقع آرائی اس طرح کرتے ہیں :

”امام صاحبؒ کی مجلس درس ہمیشہ پرتکلف فرش اور بیش قیمت قالینوں سے آراستہ رہتی تھی، وسط مجلس میں شہ نشین تھی، جس پر امام صاحبؒ املائے حدیث کے موقع پر رونق افروز ہوتے تھے، جا بجا شرکائے مجلس کے لیے پنکھے پڑے رہتے تھے، جب حدیث کا درس ہوتا تو مجمر میں عود اور لوبان جلایا جاتا، صفائی و نزاہت کا یہ عالم ہوتا کہ فرش پر ایک تنکا بھی بار خاطر ہوتا، جب حدیث نبویؐ کے املا کا وقت آتا پہلے وضو یا غسل کر کے عمدہ اور بیش قیمت پوشاک زیب تن فرماتے، بالوں میں کنگھی کرتے، اس اہتمام کے بعد مجلس علمی کی صدارت کرتے۔“ (ص ۳۲)

جب امام صاحبؒ درس دیتے تو اس موقع کا نقشہ سید صاحبؒ نے اس طرح کھینچا ہے :

”تمام لوگ سرنگوں خاموش، مؤدب بیٹھتے تھے، یہاں تک کہ امام ابو حنیفہؒ بھی جب امامؒ کی مجلس درس میں آکر شریک ہوتے تو وہ بھی اسی طرح مؤدب ہوکر بیٹھتے، اس وقت امام صاحبؒ کی ادائے شکوہ اور وقار کا اظہار ہوتا تھا، تمام مجلس پر ایک مقدس سکوت طاری رہتا تھا، امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ ہم لوگ کتاب کے ورق بھی اتنا ڈر سے نہیں الٹتے تھے کہ کھڑکھڑاہٹ کی آواز نہ ہو، جاہ و جلال اور شان و شکوہ سے کاشانۂ امامت پر بارگاہ شاہی کا دھوکہ ہوتا تھا، طلبہ کا ہجوم، مستفتیوں کا ازدحام، امراء کا ورود، علماء کی تشریف آوری، سیاحوں کا گذر، حاضرین کی مؤدب نشست، دولت خانہ پر سواریوں کا انبوہ دیکھنے والوں پر رعب و وقار طاری کر دیتا تھا۔“ (ص ۳۲)

مدینہ کے والی اور خود خلیفہ وقت ہارون رشید اپنی شان و شوکت کے باوجود ان کی مجلس درس میں کس قدر اپنے کو ہیچ سمجھتے، اس کی کہانی بھی سید صاحبؒ کے قلم کی زبانی سنیے :

”امامؒ صاحب حکومت نہ تھے لیکن صاحب حکومت اس آستانہ پر جھکتے تھے، امام شافعیؒ نے اپنی تعلیم کے لیے والیٔ مدینہ کو بغرض سفارش جب در امامت پر لانا چاہا تو اس نے کہا: میرا کہاں وہاں گذر“ ہارون رشید

جب مدینہ آیا تو امام صاحبؒ سے موطا کی سماعت کی خواہش ظاہر کی، امام صاحبؒ نے فرمایا کل کا وقت اس کے لیے ہے، ہارون رشید منتظر رہا کہ امام صاحبؒ خود دربار میں آئیں گے، کل کا وقت آیا تو امام صاحبؒ اپنی مجلس درس میں تشریف فرما رہے، ہارون رشید نے پوچھا تو فرمایا کہ علم کے پاس لوگ آتے ہیں، لوگوں کے پاس علم نہیں جاتا، اور آخر ہارون رشید کو باایں ہمہ جاہ و جلال خود امام کی مجلس میں حاضر ہونا پڑا، مجلس میں عام و خاص کی تمیز نہ تھی، ہارون نے جب درس کی شرکت کا ارادہ کیا تو کہا کہ عام لوگوں کو باہر کر دیجیے، امام صاحبؒ نے فرمایا: شخصی منفعت کے لیے عام افادہ کا خون نہیں کیا جا سکتا، اللہ اکبر! کیا پاک مدعیں تھیں" (ص ۳۴)

اس مجلس درس کی شہرت بڑھی، ذرا اس کا حال بھی سید صاحبؒ کے قلم سے سن لیجیے جو اس وقت تو نہیں لیکن آگے چل کر عنبریں رقم ہونے والا تھا، مگر اس کے آثار اسی زمانہ سے ظاہر ہونے لگے تھے:

"ایک تو مدینہ خود اسلام کا گہوارہ اور نسلاً بعد نسلٍ علم دین کا مرکز تھا، دوسرے یہ کہ امام ہمام کا خاندان ابتدا سے علم کے ساتھ ایک خاص نسبت رکھتا تھا، ان اضافی اوصاف کے ساتھ خود ذاتی جوہر نے وہ پر و بال نکالے کہ دنیائے اسلام مشرق سے مغرب تک امام کے آوازۂ شہرت سے معمور ہو گئی، اور امام کی درسگاہ اختلاف مرز و بوم کی قلمرو نزاع بن گئی، ایک طرف سیستان اور دوسری صدی کی مملکت اسلام کا مشرقی گوشہ اور دوسری طرف قرطبہ خلافت اسلام کا مغربی گوشہ، دونوں کے ڈانڈے مدینۃ الرسولؐ کی سرحد میں آ کر مل گئے۔" (ص ۳۶)

اس کے بعد سید صاحبؒ امام صاحبؒ کے مسترشدین، مستفیدین اور تلامذہ کی فہرست دیتے ہیں جن میں خلفائے اسلام، امرائے بلاد، تابعین، شیوخ، ائمہ محدثین، ائمہ مجتہدین، قضاۃ، زہاد، صوفیائے کرام، ادبا، شعرا، مورخین، مفسر اور فلسفی وغیرہ سب ہی شامل تھے۔

سید صاحبؒ نے امام مالکؒ کا جائزہ ایک فقیہ کی حیثیت سے بھی لیا ہے انھوں نے اس سلسلہ میں فقیہ اور محدث کی تعریف اپنی اس کمسنی کے زمانہ میں جس موثر اور طاقتور انداز میں کی تھی اس پر بڑے سے

بڑے علماء، فقہاء اور محدثین اب بھی غور کرکے استفادہ کرسکتے ہیں، لکھتے ہیں:

"ایک مفتی اور فقیہ کا فرض ایک محدث سے زیادہ ہے، محدث صرف ایک سرمایہ دار ہے، فقیہ اسس سرمایہ کو لےکر عالم کا روبار میں آتا ہے، کھرے کھوٹے کی تمیز، احکام کی تصریح، عموم کی تخصیص، خصوص کی تعمیم، مطلق کی تقیید، مقید کا اطلاق، ناسخ و منسوخ کی تفریق، اوامر و سنن کی ترتیب، احکام غیر منصوصہ کا قیاس، احکام کے علل و مصالح کی تلاش، ضروریات انسانی کے مطابق احکام شرعیہ کا اعلان، رعایا و حکومت کے لیے قوانین کی تدوین، یہ ایک فقیہ و مفتی کے عام فرائض ہیں، جو ایک محدث محض کے رتبہ سے بلند تر ہیں" (ص ۴۳)

سید صاحبؒ نے اس سلسلہ میں عہد رسالت سے حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے دور تک فقہ کی تدوین کی جو کوشش ہوئی اس کی مختصر لیکن جامع تاریخ بھی لکھ دی ہے، جس سے مفید معلومات حاصل کیے جاسکتے ہیں، وہ لکھتے ہیں کہ "امام مالکؒ کے فقہ و فتاویٰ کی بنیاد فقہ مدینہ پر ہے، ان کے پاس مدینہ، حجاز، بلکہ اطراف ملک کے سائلین کا ازدحام ہوتا تھا، موسم حج میں تمام علماء سمٹ سمٹ کر حرم مکہ میں جمع ہوجاتے تھے، تو حکومت کی طرف سے اعلان ہوتا تھا کہ امام مالکؒ اور ابن ابی ذئب کے سوا کوئی اور فتویٰ نہ دے" (ص ۴۴)

امام صاحبؒ فتاویٰ دینے میں جن اصول کے پابند تھے، سید صاحبؒ نے ان کی بھی تصریح کردی ہے، اور وہ یہ تھے:

ان سے جب کوئی فتویٰ پوچھا جاتا اور اس وقت اس جزئیہ کی اطلاع نہ ہوتی تو نہایت کشادہ پیشانی کے ساتھ فرمادیتے کہ لا ادری (میں نہیں جانتا)۔

دور کے شہروں کے مستفتی کو جواب دینے سے احتراز کرتے، اس کی وجہ یہ تھی کہ قرب وجوار میں مستفتی کو اپنی غلطی کی اطلاع دے سکتے تھے لیکن ملک بعیدہ میں تغلیط کی اطلاع مشکل تھی۔

مسائل و فتاویٰ کا جواب ہمیشہ نہایت دقت نظر اور کاوش فکر سے دیتے، اگر کسی مسئلہ میں غلطی ہوجاتی،

اور کوئی اصلاح کر دیتا تو فوراً تسلیم کر لیتے تھے۔

مگر جس بات کو صحیح سمجھتے، اس کا اعلان کرنے اور اس پر جمے رہنے میں ہر قسم کی مصیبت اور آزمائش کو گوارا کر لیتے، مثلاً اگر کوئی شخص زبردستی مجبور کیا جائے کہ وہ اپنی بیوی کو طلاق دے دے اور اس نے ڈر کر بجبر واکراہ طلاق دے دی تو امام صاحبؒ کے نزدیک طلاق واقع نہ ہوگی، گو امام ابوحنیفہؒ اور بعض دیگر ائمہ کے نزدیک طلاق واقع ہو جائے گی، اس زمانہ میں مدینہ کا والی جعفر بن سلیمان تھا، جو خلیفہ منصور کا چچا زاد بھائی بھی تھا، اس نے امامؒ کو حکم دیا کہ وہ ایسا فتویٰ نہ دیں، لیکن امام صاحبؒ نے علی الاعلان اس رائے کا اظہار کیا، جعفر نے غضب ناک ہو کر ان کو ستر کوڑے مارنے کا حکم دیا، تمام پیٹھ خون آلود ہوگئی، پھر اونٹ پر بٹھا کر شہر میں ان کی تشہیر کرائی، مگر اس حالت میں بھی وہ کہتے جاتے کہ جو مجھ کو جانتا ہے وہ جانتا ہے، جو مجھ کو نہیں جانتا وہ جان لے کہ میں مالک ابن انس ہوں، فتویٰ دیتا ہوں کہ طلاق جبری درست نہیں، خلیفہ منصور کو اس کی خبر ہوئی تو جعفر والی مدینہ کی یہ حرکت اس کو پسند نہ آئی، اور اس کو معزول کر کے گدھے پر سوار کر کے بغداد طلب کیا، اور امامؒ کو معذرت کا خط لکھا، لیکن امام صاحب کو جعفر سے کوئی کد نہیں ہوئی اور فرمایا کہ پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی خاطر اس کو معاف کرتا ہوں؟

اس سلسلہ میں سید صاحبؒ نے مختلف عباسی خلفاء سے امام صاحبؒ کے جو تعلقات رہے، اس کا ذکر کر کے اپنی کتاب کے اس حصہ کو دلچسپ بنا دیا ہے، جس سے امام صاحب کا رتبہ بھی بلند ہو گیا ہے۔

خلیفہ منصور کے خلاف محمد نفس زکیہ نے مدینہ میں علم بغاوت بلند کیا تو امام صاحبؒ اس کے حق میں تھے، مگر وہ میدان جنگ میں لڑ کر مارے گئے، تو منصور نے لوگوں سے جبراً بیعت لی، امام صاحبؒ نے اس پر اعلان کیا کہ جو کام جبراً کرایا جائے شرعاً اس کا اعتبار نہیں (ص ۵۰۰) منصور نے ان کو اپنے یہاں طلب کیا اور اپنی خلافت کے متعلق رائے پوچھی تو امام صاحبؒ نے فرمایا: میں اپنی زندگی سے مایوس ہو کر یہاں آیا ہوں، یہ سن کر منصور نے کہا: سبحان اللہ! ابو عبداللہ! میں خود اپنے ہاتھ سے اسلام کا ستون گراؤں گا؟

محمد المہدی کا زمانہ آیا تو وہ جب مدینہ منورہ آیا تو امام صاحبؒ سے مل کر ان کو سینے سے لگایا، اور پھر تین ہزار دینار امام صاحبؒ کو بھیج کر ان سے خواہش ظاہر کی کہ وہ اس کے ساتھ بغداد چلیں، مگر انھوں نے قاصد سے کہلا بھیجا کہ تھیلیاں سربستہ ہی پڑی ہیں، جی چاہے لے جاؤ، لیکن مالک مدینہ نہیں چھوڑ سکتا، پھر مہدی نے سواری بھیجی کہ اس پر سوار ہوکر بارگاہ خلافت میں آئیں، سواری واپس کر دی کہ وہ مدینہ میں سوار ہوکر نہیں نکلتے کہ ان ہی گلیوں میں حضرت سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم پیدل پھرتے تھے، (ص ۶۳) مہدی نے اپنے دونوں شہزادوں موسیٰ اور ہارون کو امام صاحبؒ کے درس میں شریک ہونے کے لیے ان کے پاس بھیجا۔

ہارون رشید تو ان کا ایسا گرویدہ ہوگیا تھا کہ اس کی خواہش ہوئی کہ موطا کو خانہ کعبہ میں آویزاں کیا جائے اور مسلمانوں کو فقہی احکام میں اس کی پیروی کرنے پر مجبور کیا جائے، لیکن امام صاحبؒ نے یہ کہہ کر روکا کہ ایسا نہ کیا جائے، کیونکہ خود صحابہؓ فروعات میں اختلاف رکھتے ہیں، اور وہ ممالک میں پھیل چکے ہیں، اور ان میں ہر شخص راہ صواب پر ہے۔ (ص ۶۸)

سید صاحبؒ نے امام صاحب کے اخلاق وعادات کے جتنے واقعات ایک ساتھ درج کر دیے ہیں وہ اس قدر ایمان افروز ہیں اور یہ اس لائق ہیں کہ نصاب کی کتابوں میں درج کرکے ان کو درس میں پڑھایا جائے تاکہ ایک مسلمان کی سیرت کی تشکیل میں یہ معاون ہوں، سید صاحبؒ ہی کے الفاظ میں ان میں سے کچھ واقعات بہت ہی اختصار سے یہاں پر دہرا دیے جائیں تو فائدہ سے خالی نہ ہوگا۔

ان کے دو کام تھے: المصحف والتلاوۃ، وہ جمعہ کی شب عبادت واطاعت میں مشغول رہتے، مہینہ کی پہلی تاریخ کو شب زندہ دار رہتے، مسجد نبویؐ میں شور وغل پسند نہ فرماتے، کلام نبویؐ اس وقت تک زبان پر نہیں لاتے جب تک وضو یا غسل فرماکر باادب نہ بیٹھ جاتے، اصطبل میں کثرت سے گھوڑے اور خچر تھے مگر کبھی مدینہ کی گلیوں میں ان پر سوار ہوکر نہ نکلے، فرماتے کہ مجھے شرم آتی ہے کہ جو سرزمین قدوم نبویؐ سے مشرف ہوئی ہے اس کو میں جانوروں کے سموں سے روندوں، ذات نبویؐ کی محبت اور حدیث نبویؐ کے شغل وانہماک کے

سبب سے کوئی شب ایسی نہیں گذری جس میں عالم رویا میں زیارت نبویؐ کا شرف حاصل نہ ہوتا، ان کی فیاضی کا یہ حال تھا کہ ایک بار امام شافعیؒ کو لے کر اصطبل کا ملاحظہ کر رہے تھے، امام شافعیؒ نے بعض گھوڑوں کی تعریف کی تو تمام اصطبل ان کی نذر کر دیا، امام شافعیؒ کو وہ ہر سال گیارہ ہزار دینار مرحمت کرتے تھے، ایک بار کا واقعہ ہے کہ موزہ میں بچھو تھا، بے خبری میں پہن لیا، مجلس درس میں آکر بیٹھ گئے، بچھو نے متواتر سترہ بار ڈنک مارا لیکن آداب مجلس کے خیال سے پہلو تک نہ بدلا۔

وہ برابر خلفاء کے دربار میں آتے جاتے رہے، بعض لوگوں نے اس پر اعتراض کیا تو فرمایا: اگر نہ جاؤں تو نطق حق کا موقع کہاں ملے، اعلان حق کی خاطر منصور اور ہارون رشید کو ڈانٹ دینے میں تامل نہ کرتے منصور کے دربار کا یہ قاعدہ تھا کہ جب کوئی دربار میں آتا خلیفہ کے ہاتھوں کا بوسہ دیتا، امام صاحبؒ نے کبھی یہ ذلت گوارا نہیں کی، مزاج میں صفائی اور نزاہت حد درجہ تھی، ہمیشہ نفیس اور بیش قیمت پوشاک زیب تن فرماتے، خوشبو کا استعمال ہمیشہ کرتے، عود کی انگیٹھیاں برابر جلتی رہتی تھیں، ان کے اخلاق و عادات کی اور تفصیلات لکھ کر سید صاحبؒ آخر میں لکھتے ہیں:

"امام کو جو خصوصیات حاصل تھیں، ان میں یہ کیا کم ہے کہ مدینہ مطہرہ کی خاک پاک جسم مبارک کا عنصر تھی، لیکن اس سے بھی زیادہ مزید شرف یہ ہے کہ مسکن وہ تھا جو حضرت عبد اللہ ابن مسعودؓ کا مکان تھا، اور مجلس نشست گاہ وہ تھی، جو حضرت عمر فاروقؓ کا دولت خانہ تھا، یہیں اکثر املائے حدیث کی مجلسیں منعقد ہوتی تھیں، اس بنا پر امام مالک نہ صرف علم و معارف فاروقی کے وارث تھے، بلکہ ان کی جائداد ظاہری کا بھی خدا نے انہیں وارث بنایا۔" (ص ۸۰)

سید صاحبؒ نے اپنی تحریر کا یہ ٹکڑا جس کیفیت قلبی کے ساتھ لکھا ہے، امید کہ ہمارے ناظرین بھی اسی کیفیت قلبی کے ساتھ اس کو پڑھیں گے۔

آخر میں سید صاحبؒ نے امام صاحبؒ کی تصنیفات کا ذکر کیا ہے، اور بتایا ہے کہ ان سے

حسب ذیل کتابیں منسوب ہیں:

(۱) موطا (۲) رسالۃ مالک الی الرشید (۳) احکام القرآن (۴) المدونۃ الکبریٰ (۵) رسالۃ مالک الی ابن مطرف (۶) رسالۃ مالک الی ابن وہب (۷) کتاب الاقضیہ (۸) کتاب المناسک، (۹) تفسیر غریب القرآن (۱۰) کتاب المجالسات عن مالک (۱۱) تفسیر القرآن (۱۲) کتاب المسائل،

سید صاحبؒ نے ان کتابوں کا تعارف کراتے ہوئے ان کے امام صاحبؒ کی تصانیف ہونے نہ ہونے کے متعلق بھی توجہ دلائی ہے، لیکن اس حصہ میں بہت ہی پرمغز بحث موطا پر ہے، اور اپنی طالب علمی اور کمسنی میں اس کی اہمیت کو جس طرح اپنی کاوش فکر سے سمجھایا ہے، اس سے بہت سے لوگ آج بھی استفادہ کر سکتے ہیں، ہم اپنے ناظرین کی خاطر اس کو مختصر طریقہ سے پیش کیے بغیر نہیں رہ سکتے۔

اس سے اپنی بحث کی ابتدا سید صاحبؒ نے اس طرح کی ہے:

امامؒ کی اصلی تصنیف موطا ہے جو قرآن پاک کے بعد کتب خانۂ اسلام کی دوسری کتاب ہے، اول کلام خدا، اور ثانی کلام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (ص ۸۴)

پھر بلاد اسلامیہ میں جن مجموعہ ہائے حدیث کی تدوین ہوئی اس کا ذکر کرنے کے بعد لکھتے ہیں کہ مرکز نبوت اور مہبط وحی مدینہ میں جو علوم نبویؐ کا سب سے بڑا گنجینہ تھا جس سعادت اندوز کی قسمت میں تھی وہ امام مالکؒ ہیں۔ (ص ۸۶)

سید صاحبؒ اس کی تالیف کا صحیح زمانہ تو متعین نہیں کر سکے، لیکن یہ لکھ گئے ہیں کہ ایک روایت ہے کہ امام مالکؒ نے منصور ہی کے حکم سے موطا کی تالیف شروع کی تھی اور فرمایش کی تھی کہ اس مجموعۂ احکام میں نہ ابن عمرؓ کی سختیاں ہوں، نہ ابن عباسؓ کی رخصتیں ہوں، اور نہ ابن مسعودؓ کے شواذ۔ (ص ۸۷)

سید صاحبؒ اس کے معترف ہیں کہ یہ حسن نیت کے ساتھ لکھی گئی، اس لیے یہ مقبول ہوئی، لکھتے ہیں کہ:

" امام صاحبؒ موطا کی تالیف میں مشغول ہوئے، اور اس کی خبر دوسرے لوگوں کو پہونچی تو مدینہ کے

اور علماء بھی اپنے احادیث کا مجموعہ تیار کرنے لگے، لوگوں نے امام سے جاکر عرض کیا، تو آپ نے فرمایا صرف

حسن نیت کو بقا ہے، یہ پیشین گوئی کس قدر صحیح اتری" (ص ۸۷)

جب یہ کتاب لوگوں کے ہاتھوں میں پہونچی تو یہ بہت مقبول ہوئی، اس کی مقبولیت کو ظاہر کرنے میں سید صاحبؒ نے سعدون نامی ایک شاعر کی نظم نقل کر دی ہے، جس کے آخر میں وہ لکھتا ہے کہ موطا آفتاب ہے، اس کے علاوہ دوسری کتابیں ستارے ہیں۔ (ص ۸۸)

موطا کی وجہ تسمیہ بہت سی بتائی جاتی ہے، لیکن سید صاحب کا خیال ہے کہ موطا سے مراد وہ پامال راستہ ہے جس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے بعد تمام صحابہ گذرے، یہ ان مسائل پر مشتمل ہے جن پر صحابہؓ کا عمل رہا، اور جمہور سلف جن پر چلے ہیں۔ (ص ۸۹)

موطا کی نوعیت کیا ہے، اس کی وضاحت کرتے ہوئے سید صاحب لکھتے ہیں کہ ابتداً اس میں دس ہزار حدیثیں تھیں لیکن امام کے خامہ صحت پسند نے تقریباً آٹھ ہزار قلم زد کر دیں، باقی ۱۷۲۰ میں جن میں مسند اور مرفوع ۶۰۰ ہیں، مرسل ۲۲۵، موقوف ۶۱۳، تابعین کے اقوال و فتاوی ۲۸۵، بلاغات مالک ۵،

(ص ۸۹)

اس کی نوعیت کی تصریح یہ لکھ کر بھی کرتے ہیں کہ موطا کا موضوع صرف احکام فقہیہ ہیں، اس لیے وہ دیگر طول ابواب و فصول جو بخاری، مسلم اور ترمذی وغیرہ میں نظر آتے ہیں، موطا ان سے خالی ہے، کیونکہ فقہیات سے ان کو کوئی تعلق نہیں، اس بنا پر محدثین کی اصطلاح کے مطابق اس کو کتاب السنن کہنا چاہیے۔ (ص ۸۹)

سید صاحبؒ موطا کی یہ خصوصیت بھی بتاتے ہیں کہ اس کے مقابلہ میں مسند ابی حنیفہ، مسند شافعی اور مسند ابن حنبل ضرور ہیں، لیکن یہ ان ایمہ کی خود لکھی ہوئی نہیں ہیں، ان کے بعد مرتب ہوئیں، موطا کو خود امام مالکؒ نے لکھا۔

سید صاحبؒ نے موطا کی امتیازی حیثیت یہ بھی بتائی ہے کہ (۱) موطا سے پہلے جو حدیث کی کتابیں لکھی

گئیں ان کا بھی زیادہ تر صحابہ و تابعین کے آثار و فتاوی تھے، موطا میں احادیث صحاح و مسند یا منقطع و مرسل کو جائے اول اور آثار و فتاوی کو جائے ثانی قرار دیا گیا ہے (۲) موطا میں صرف اسی حدیث یا نقوش نے جگہ پائی ہے جس کو صحت کا شرف حاصل ہے، (۳) موطا مدینہ میں تالیف ہوئی، اس کے رواۃ حجازی ہیں، دیگر مسانید اور موطائیں کوفہ، بصرہ، شام اور یمن وغیرہ میں تالیف ہوئیں، اور اس پر تمام علمائے حدیث کا اتفاق ہے کہ حجاز کی حدیثیں صحت، قوت اور جودت میں سب پر فائق ہیں۔ (ص ۹۱)

سید صاحبؒ نے طبقات کتب حدیث میں موطا کا درجہ متعین کرتے ہوئے ابن اثیر جزری (المتوفی سنہ ۶۰۶ھ) کے حوالہ سے اس کو صحاح ستہ میں شمار کیا ہے، ان کے نزدیک موطا، بخاری، مسلم، ترمذی، ابوداؤد اور نسائی صحاح ستہ ہیں، لیکن کچھ ایسے محققین بھی ہیں جو موطا کو صحاح ستہ میں داخل نہیں کرتے، موطا کا درجہ متعین کرنے میں سید صاحبؒ لکھتے ہیں کہ عام علماء تو اس کو مسلم بلکہ ترمذی کے بعد جگہ دیتے ہیں لیکن محققین قدماً اور عموماً متاخرین اس کو بخاری سے بھی مقدم سمجھتے ہیں، ان ہی میں شاہ ولی اللہؒ اور شاہ عبدالعزیزؒ بھی ہیں، سید صاحبؒ ان ہی کے ہم خیال ہو کر لکھتے ہیں کہ خود میں بھی بدو طلب حدیث سے یہی اعتقاد جازم رکھتا ہوں، (ص ۹۲) یہ رائے ان کی کمسنی کے زمانہ کی تھی، مگر بعد میں بھی اس میں ترمیم نہیں کی۔

اس کمسنی کے زمانے میں انھوں نے یہ بھی لکھا تھا کہ یہ صحیح ہے کہ موطا میں مرسل، موقوف اور منقطع حدیثیں ہیں، جو صحیح کے لیے قادح ہیں، لیکن ان کا ارسال، وقف اور انقطاع موطا کی روایت کے لحاظ سے درست ہے، اگر حقیقت کی رو سے یہ تمام مراسیل و موقوفات و منقطعات، متصل، مرفوع اور مسند ہیں، اس بنا پر درحقیقت موطا میں کوئی مرسل، موقوف یا منقطع حدیث نہیں، اس میں جو حدیث بھی ہے اس پر الا ماشاء اللہ بخاری و مسلم و ترمذی وغیرہ کی مہر تصدیق لگی ہوئی ہے، اس سے موطا کی صحت کے درجہ کا اندازہ کیا جا سکتا ہے، سید صاحبؒ نے اپنی کمسنی میں یہ سب کچھ جو لکھا ہے، وہ بڑے سے بڑے علماء کے لیے آج بھی قابل غور ہے۔

سید صاحبؒ موطا کی امتیازی خصوصیات کو اس طرح بتاتے ہیں (۱) مسلمانوں کے ہاتھ میں کلام اللہ کے بعد جو کتاب آئی وہ کلام الرسول کا یہی صحیح ترین مجموعہ تھا (۲) اس کی روایت کرنے والے جس پایہ کے لوگ ہیں وہ بخاری اور مسلم کے نہیں ہیں (۳) بخاری و مسلم کی روایتیں عموماً پانچ چھ واسطوں سے مروی ہیں، موطا کی حدیثیں تین چار واسطوں سے زیادہ کی نہیں ہیں، امام بخاریؒ کو اپنی بیسؒ ثلاثیات پر ناز ہے، اور موطا کی بنیاد ہی ثلاثیات پر ہے، اس کے علاوہ اس کے چالیس ثنائیات ہیں

آخر میں سید صاحبؒ نے شروح موطا، تجرید واسناد موطا کے عنوانات سے بہت سے مفید معلومات فراہم کیے ہیں، اسے پڑھ کر یہ اندازہ ہوگا کہ وہ اپنی مختصر تحریروں میں بھی زیادہ سے زیادہ معلومات فراہم کرنے میں فطری ذوق رکھتے تھے۔

اس کتاب میں سید صاحبؒ نے امام مالکؒ سے جس غیر معمولی عقیدت کا اظہار کیا ہے اس بنا پر شبہہ کیا جا سکتا ہے کہ وہ مالکی تھے یا اپنی کمسنی میں مالکی ہی رہے ہوں گے لیکن یہ صحیح نہیں جن لوگوں کو ان کے ساتھ رہنے کا اتفاق ہوا، یا جو ان کی نجی زندگی سے اچھی طرح واقف رہے، وہ جانتے ہیں کہ شروع سے آخر تک وہ امام ابوحنیفہؒ کے مسلک کے پیرو رہے، یہ ان کی رواداری اور فراخ دلی تھی کہ دوسرے مسلک کے ائمہ میں جو خوبیاں تھیں، ان کا اعتراف برابر کرتے رہے، ڈاکٹر حمید اللہ نے پیرس میں ایک تقریر کرتے ہوئے یہ کہا کہ:

اس کتاب کو لکھے ہوئے تقریباً ۷۰ برس ہوگئے، لیکن یہ اب بھی مفید معلومات کا ماخذ بنی ہوئی ہے، اگر کوئی اس سے بہتر کتاب لکھنے کی کوشش کرے گا تو وہ اسی کے ایجاز کا اطناب ہوگا۔

تذکرۃ المحدثین جلد اول

اس میں صاحب تصنیف محدثین کے علاوہ امام مالکؒ صاحبِ موطا کا بھی تذکرہ ہے جو "حیات امام مالکؒ" کی پوری تلخیص ہے، مولفہ مولانا ضیاء الدین اصلاحی، قیمت ۲۳ روپیے۔　"منیجر"

رُوداد اقبالؒ

از

پروفیسر جگن ناتھ آزاد، کشمیر

"پروفیسر جگن ناتھ آزاد علامہ اقبالؒ کی ایک مبسوط سوانح حیات مرتب کر رہے ہیں، یہ مضمون اس کا حرف اول ہے جو ناظرین کی خدمت میں پیش کیا جا رہا ہے" ——— معارف

علامہ اقبالؔ کے سوانح حیات کے سلسلہ میں خود ان کے خیالات کا ذکر کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ اقبالؔ کے نیاز مندوں مثلاً سید نذیرؔ نیازی یا محمد شفیعؔ (م۔ش) نے جب کبھی علامہ سے ان کے حالاتِ زندگی کا ذکر کیا یا ان سے ان کی زندگی کے واقعات کی کوئی تفصیل پوچھی تو انھوں نے ہمیشہ یہ کہا کہ اس بات کی کوئی اہمیت نہیں ہے کہ میں کب پیدا ہوا، اور کہاں پیدا ہوا، یا کون سا امتحان کس سنہ میں پاس کیا، یہ سب فروعی اور غیر ضروری باتیں ہیں، جہاں تک میرا تعلق ہے، اصل اہمیت میرے افکار اور خیالات کی ہے ضرورت اس بات کی ہے کہ میں نے جس طرح اپنے خیالات کو پیش کیا، اسے دریافت کیا جائے، اور میری اس ذہنی کشمکش کا سراغ لگایا جائے جو میرے خیالات کے ارتقار کا باعث بنی۔

چنانچہ میں نے اس کتاب میں کوشش یہ کی ہے کہ اقبالؔ کے واقعات زندگی کے ساتھ ہی ساتھ عہد بہ عہد ان کے افکار کا ارتقار بھی ان کے سوانح حیات کا جزو بناتا چلا جاؤں، اس ضمن میں ان کے ارتقائے افکار کے ہر پہلو پر میں نے روشنی ڈالنے کی کوشش کی ہے، اور ان کے سیاسی، سماجی اور مذہبی افکار کے ساتھ ہی میں نے ادب اور خود ان کی شاعری کے متعلق بھی ان کے افکار کو نظر انداز نہیں کیا، کیونکہ اپنی

شاعری کے متعلق ان کی خود تنقیدی کے رویہ کا مطالعہ ان کی شخصیت کی تشکیل اور ارتقاء کے افکار کو سمجھنے میں خاصی مدد دے سکتا ہے۔

اب جہاں تک علامہ کا تعلق ہے آج دنیا بھر میں ان کے فکر و فن پر کام ہو رہا ہے، فکر پر زیادہ، فن پر کم، اور فکر پر کام کی صورت یہ ہے کہ ع ملتی نہیں زیادہ سے زیادہ کسی کی۔

خیر علمی اور ادبی کاموں میں اختلاف رائے کی تو بڑی گنجائش ہے، لیکن اس بات کی گنجائش نہیں ہے کہ ہندوستان میں ایک طبقہ اقبال کو قوم پرست کہے اور دوسرا طبقہ فرقہ پرست کہے، یا پاکستان میں ان کے ایک ہی کام یعنی آل انڈیا مسلم لیگ کے صدارتی خطبہ پر بات ختم کر دی جائے، اور فکر اقبال کے باقی پہلوؤں کو کم اہم سمجھ کر نظر انداز کر دیا جائے۔

یہ ہمارے ادب کی بدقسمتی ہے کہ اقبال اپنے بعض قدر دانوں کے ہاتھوں کچھ اس انداز سے پیش ہوئے ہیں کہ عامۃ الناس میں اقبال کے متعلق غلط فہمیوں کی خلیج وسیع سے وسیع تر ہوتی چلی جا رہی ہے۔

تقسیم ہند کے بعد جہاں پاکستان نے اقبال کو اپنا ملی ہیرو قرار دیا وہاں ہندوستان نے اقبال سے ایک طرح کی بے اعتنائی برتی، یہ بے اعتنائی ان ہی غلط فہمیوں کا نتیجہ تھی جو بعض پرستاران اقبال نے اقبال کے بارے میں پیدا کی ہیں، اور ابھی تک جن کا سلسلہ جاری ہے۔

اسلام کی محبت اقبال کے رگ و ریشہ میں رچی ہوئی تھی، یہ کیفیت اقبال کے کلام میں اول سے آخر تک نمایاں ہے، لیکن یہ اقبال اور کلام اقبال سے بے اعتنائی برتنے کی کوئی وجہ نہیں ہے، نہ ہی اس بنا پر ہم اقبال کے نظریات کو رد کرنے کا حکم صادر فرما سکتے ہیں، ملٹن اور دانتے عیسائیت کی محبت سے سرشار تھے، اور تلسی داس اور رابندر ناتھ ٹیگور کے کلام میں ہندو دھرم سے عشق بے پایاں کا جذبہ کار فرما نظر آتا ہے، عشق مذہب، عشق بنی نوع انسان تک پہونچنے کا ایک صالح ذریعہ ہے، ان دونوں میں اگر دیکھنے والوں کو تضاد نظر آئے تو اسے کم نظری کے سوا اور کس بات پر محمول کیا جا سکتا ہے۔

یہاں اپنا نقطۂ نگاہ پوری وضاحت سے بیان کرنے کے لیے میں اپنے ایک سفرِ پاکستان کا ذکر ضروری سمجھتا ہوں سنہ ۱۹۸۱ء کی بات ہے، پشاور یونیورسٹی پشاور نے مجھے ایک لیکچر کی دعوت دی، جب میں پشاور جانے کے لیے لاہور پہونچ چکا تھا تو یونیورسٹی کی طرف سے مجھے لیکچر کا عنوان موصول ہوا، اور وہ عنوان یہ تھا "کیا اقبال صرف مسلمانوں کے شاعر ہیں؟" مجھے یہ عنوان دیکھ کر یک گونہ مسرت ہوئی کیونکہ یہ ایک ایسا موضوع تھا جس پر ہندوستان اور پاکستان میں بعض دوستوں کے ساتھ بات چیت تو اکثر ہوئی تھی لیکن اس پر باقاعدہ لکھنے کی یا لیکچر دینے کی نوبت نہیں آئی تھی۔

یہ سوال کہ "کیا علامہ اقبال صرف مسلمانوں کے شاعر ہیں؟" مطالعۂ اقبالیات میں ایک بڑی اہمیت رکھتا ہے، ہندوستان میں تو یہ سوال (اگرچہ سوال کی صورت میں نہیں، بلکہ ایک مسئلہ کی صورت میں) اکثر میرے سامنے آیا، بالخصوص سنہ ۱۹۷۳ء سے سنہ ۱۹۷۷ء تک، جب کہ علامہ اقبال کی صدسالہ تقاریب ہندوستان کے گوشے گوشے میں منائی جارہی تھیں، اس سے قبل جس زمانہ میں کشمیر یونیورسٹی سری نگر کے لیے میں اقبال نمائش مرتب کر رہا تھا اور علامہ مرحوم کے اساتذہ کی تصاویر کی تلاش کے سلسلہ میں میرے خطوط ہندوستان کے اردو، انگریزی اور دوسری زبانوں کے اخبارات میں چھپ رہے تھے، اس وقت مجھے زیادہ تو نہیں، لیکن دو ایک عتاب نامے موصول ہوئے تھے، جن کے مطالعہ سے میرا ذہن اسی سوال کی جانب منتقل ہوا تھا، یہی سوال مجھ سے سنہ ۱۹۷۹ء میں رنگون (برما) کی ایک محفل میں بھی کیا گیا تھا، جہاں میں نے ایک خالص ادبی موضوع پر تقریر کی تھی، وہ موضوع تھا "مسجد قرطبہ کے شعری محاسن"

دراصل اس سوال کے اندر دو اور سوال مضمر ہیں، میں سمجھتا ہوں کہ بات چیت کی ابتداء ان ہی مضمرات سے کی جائے، اس ضمن میں پہلا سوال یہ ہے کہ اقبال کا بنیادی سرچشمۂ افکار کیا ہے، اور دوسرا یہ کہ اقبال کے مخاطب کون ہیں؟ جہاں تک پہلے سوال کا تعلق ہے اس میں کسی شک و شبہہ کی گنجائش نہیں کہ اقبال کا بنیادی سرچشمۂ افکار قرآن اور حدیث ہیں، لیکن اس سے یہ مراد لینا کہ اس کے علاوہ مشرق و مغرب

کے تمام فکری دھاروں سے اقبال بے نیاز رہے ہیں، اقبال کے فکر و فن کے بغور مطالعہ کا نتیجہ نہیں ہے صرف یہی نہیں کہ اقبال نے مختلف نظام ہائے فکر کا بغور مطالعہ کیا، بلکہ ان کے اپنے نظامِ فکر میں ان نظام ہائے فکر کے اکثر پہلوؤں کے رد و قبول کا سلسلہ بھی برابر جاری رہا، چنانچہ ان کی شخصیت کی تشکیل و تعمیر میں اسلامی فکر کے ساتھ ہی ساتھ ہندو فلسفہ، مغربی فلسفہ اور مارکس اور اینگلز کا جدلیاتی مادی نظامِ فکر بھی شامل ہے، اگر ہم کلامِ اقبال سے یہ تمام فکری عناصر خارج کر دیتے ہیں تو ان کی نظم و نثر کا اکثر حصہ مفہوم سے عاری ہو کے رہ جاتا ہے، اور فکرِ اقبال کی محض ایک ادھوری تصویر ہمارے سامنے آتی ہے، مطالعۂ کلامِ اقبال میں ہندو فلسفے، مغربی فلسفے اور مارکس اور اینگلز کے جدلیاتی مادی نظامِ فکر میں سب سے زیادہ اہمیت میں مغربی فلسفے کو دوں گا، اگرچہ فلسفۂ مغرب کے تعلق سے کلامِ اقبال کا ذکر کرتے ہوئے اکثر افراط و تفریط سے کام لیا گیا ہے، اہلِ قلم کی ایک جماعت نے یہ ثابت کرنے کے لیے پورا زور لگا دیا ہے کہ علامہ اقبال نے قدم قدم پر مختلف فلسفیانہ نظریات کی تردید اور تغلیط کی ہے، اور دوسری جماعت ان حضرات پر مشتمل ہے جن کے نزدیک علامہ اقبال کے افکار مغربی مفکرین کے افکار کا پرتو ہیں، یہ حضرات اس ضمن میں نیتشے اور برگسان کا ذکر خاص طور سے کرتے ہیں، یہ دونوں نظریے انتہا پسندانہ ہیں، اور حقیقت سے دور ہیں، حقیقت ان کے بین بین ہے، اور اس پر سے اقبال نے خود اپنی نثر و نظم میں اکثر پردہ اٹھایا ہے۔

علومِ مغرب کے تعلق سے فکرِ اقبال کا ذکر کرتے ہوئے ڈاکٹر تاثیر مرحوم نے ایک بڑی کام کی بات کہی ہے، Aspect of Iqbal کے دیباچہ میں وہ لکھتے ہیں:

"انھوں (اقبال) نے یورپی کلچر کے اندرون تک پہونچنے کی کوشش کی، اور اسلام کو جدید مغربی فکر کی روشنی میں سمجھا اور اس کی تاویل پیش کی، اقبال کوئی متعصب فرقہ پرست نہیں تھے، جیسا کہ ان کے اکثر نام نہاد مداح بھی انھیں پیش کرتے رہتے ہیں، انھوں نے اعتراف کے ساتھ یورپی فضل و کمال کے سرچشموں سے علم حاصل کیا[1]"

---

[1] Aspect of Iqbal از ڈاکٹر محمد دین تاثیر (دیباچہ) ص ۲، ناشر قومی کتب خانہ، ریلوے روڈ، لاہور، ۱۹۳۸ء۔

دراصل جو کچھ ڈاکٹر تاثیر مرحوم نے کہا ہے وہ خود علامہ کے اپنے افکار ہی کا پرتو ہے، اقبال اپنی تصنیف "The Reconstruction of Religion Thought in Islam" میں لکھتے ہیں:

"تاریخ جدید کا سب سے اہم پہلو یہ ہے کہ آج دنیائے اسلام روحانی اعتبار سے بڑی تیزی کے ساتھ مغرب کی طرف گامزن ہے، مغرب کی طرف اس جادہ پیمائی میں کوئی خرابی نہیں ہے اندیشہ صرف یہ ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو ہم مغرب کی ظاہری چمک دمک ہی سے مسحور ہو جائیں، اور مغربی تہذیب کی حقیقی گہرائی تک رسائی حاصل کرنے میں ناکام رہ جائیں"۔[۱]

جس زمانہ میں اقبال اپنی مذکورہ کتاب The Reconstruction of Religion Thought in Islam کے مختلف ابواب لکھنے کا ارادہ کر رہے تھے، تو انھوں نے صوفی غلام مصطفےٰ تبسم مرحوم کو ایک خط میں لکھا تھا کہ میں ان دنوں ایک کتاب لکھنے کا خیال کر رہا ہوں جس کا نام ہوگا Islam As I Under Stand it، اس ضمن میں انھوں نے مذکورہ خط میں لکھا:

"میری زندگی کا بیشتر حصہ مغربی فلسفے کے مطالعہ میں صرف ہوا ہے، اور یہ نقطۂ نگاہ میری فطرت ثانیہ بن گیا ہے، شعوری یا غیر شعوری طور پر میں اسلام کے حقائق اور صداقتوں کا مطالعہ اسی نقطۂ نگاہ سے کرتا ہوں"!

یہ تو خیر ایک پرائیویٹ نوعیت کا خط ہے (۲ ستمبر ۱۹۲۵ء کا۔ اگرچہ میں علامہ مرحوم کے ان افکار کو جو ان کے خطوط میں مندرج ہیں کم اہمیت نہیں دیتا) لیکن یہی بات انھیں نے The Reconstruction of Religious Thought in Islam —

[۱] The Reconstruction of Religious Thought in Islam, Shaikh Muhammad Ashraf Kashmiri Bazar Lahore Reprinted 1965 -

میں مسلمانوں کے سامنے ایک لائحۂ عمل کے طور پر پیش کی، جب انھوں نے لکھا :

" ہمارے سامنے واحد راستہ یہی ہے کہ ہم علوم جدیدہ کی جانب ایک مودبانہ اور آزادانہ رویہ اختیار کریں، اور اُن ہی علوم کی روشنی میں تعلیم اسلام کو سمجھیں خواہ اپنی اس کوشش میں ہمیں اپنے پیش رؤوں سے اختلاف ہی کیوں نہ کرنا پڑے ۔[1]"

یہ جو انھوں نے لکھا کہ ہم علوم جدید کی جانب ایک مودبانہ اور آزادانہ رویہ اختیار کریں اور ان ہی علوم کی روشنی میں تعلیم اسلام کو سمجھیں، خواہ اپنی اس کوشش میں ہمیں اپنے پیش رؤوں سے اختلاف ہی کیوں نہ کرنا پڑے تو یہ بات انھوں نے محض گفتار کی حد تک ہی محدود نہیں رکھی، بلکہ اپنی نظم و نثر میں اسے ایک عملی صورت بھی دی اپنی نظم و نثر میں اگرچہ انھوں نے قدم قدم پر اپنے نظریات مغربی مفکرین کے نظریات کی تردید میں پیش کیے، اور مغربی فلسفے کو فرنگی شیشہ گری کے نام سے یاد کرتے ہوئے جا بجا مغرب کی نارسائی کی جانب اشارے کیے ہیں، مثلاً ؎

مے از مے خانۂ مغرب چشیدم		بہ جانِ من کہ دردِ سر خریدم
نشستم با نکویانِ فرنگی		ازاں بے سوز تر روزے ندیدم[2]

یا

کہا اقبال نے شیخِ حرم سے		تہِ محراب مسجد سو گیا کون

The Re Construction of Religious Thought in Islam - Sheikh [1] Muhammad Ashraf - Kashmiri Bazar. Lahore 1965 - P.P. 97-

[2] (ترجمہ) میں نے مغرب کے میخانے سے شراب چکھی، میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میں نے دردِ سر مول لیا۔ میں فرنگستان کے مفکرین اور مدبرین کے ساتھ بیٹھا، (اور حقیقت یہ ہے) کہ اس سے زیادہ بے سود دن میں نے اور کوئی نہیں دیکھا

خدا مسجد کی دیواروں سے آئی — فرنگی بت کدے میں کھو گیا کون

یا

اٹھا نہ شیشہ گرانِ فرنگ کے احساں — سفالِ ہند سے مینا و جام پیدا کر

یا

پڑھ لیے میں نے علومِ شرق و غرب — روح میں باقی ہے اب تک درد و کرب

مگر مغربی علم و فن کے جن چشموں سے انھوں نے پیاس بجھائی ہے، ان کا ذکر انھوں نے بڑی کشادہ دلی اور احسان مندانہ انداز سے کیا ہے، اور اپنے نظریاتی اختلاف کے باوجود وہ مغربی علوم کا ذکر ایک طالب علمانہ خلوص سے کرتے ہیں، مثلاً

ع خرد افزود مرا درسِ حکیمانِ فرنگ[1]

یا ع علومِ تازہ کی سرمستیاں گناہ نہیں

یا ع کیمیا سازی او ریگِ رواں را زر کرد

لیکن اس کی روشن ترین مثال دینے کے لیے میں ایک بار پھر The Reconstruction of Religious Thought in Islam کی طرف رجوع کروں گا، جس میں وہ لکھتے ہیں:

"لہٰذا ہم مسلمانوں کو ایک بہت بڑا کام درپیش ہے، ہمارا فرض ہے ماضی سے اپنا رشتہ منقطع کیے بغیر اسلام پر بحیثیت ایک نظامِ فکر از سرِ نو غور کریں۔" (ترجمہ از سید نذیر نیازی، تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ)

---

[1] مغربی فلسفیوں کے دیے ہوئے درس میری عقل میں اضافہ کا باعث ہوئے۔ [2] بزمِ اقبال، نرسنگھ داس گارڈن کلب روڈ، لاہور، ۱۹۵۸ء (ص ۱۷۰) The Reconstruction of Religious Thought in Islam — Shaikh Muhammad Ashraf Lahore 1965 - p 97

اور مذکورہ کتاب اول سے آخر تک اسی کوشش اور کاوش پر مبنی ہے، جب ہم یہ کہتے ہیں کہ اقبال کا بنیادی سرچشمہ افکار قرآن اور حدیث ہے یعنی اسلام ہے تو ہمیں اس بات سے خالی الذہن نہیں ہونا چاہیے کہ اقبال اسلام سے مراد لیتے ہیں، اسلام میں افکار الٰہیہ کی تشکیل نو، یا دوسرے لفظوں میں "Islam as I Under Stand it"

اس ضمن میں نقادان اقبال کے دو انتہا پسندانہ نظریوں کا ذکر تو میں نے کیا ہے، ایک تیسرا انتہا پسندانہ نظریہ اور بھی ہے، اور وہ ہمیں مس ماریا سٹی پٹیننس کے یہاں نظر آتا ہے، لیکن اس کا ذکر کرنے سے قبل میں ایک چھوٹا سا واقعہ بیان کرنا چاہوں گا۔ سنہ ۱۹۷۰ء کے وسط میں میری ملاقات ماسکو (یو۔ ایس۔ ایس۔ آر) میں پریگاردینا ناتاشا سے ہوئی، پریگاردینا ناتاشا کو کلام اقبال سے عشق ہے، اور اس وقت تک وہ کلام اقبال کے متعلق دو کتابیں لکھ چکی ہیں، ایک اقبال کے فکر پر، دوسری اقبال کی شعریات پر، پریگاردینا نے دوران گفتگو میں "بانگ درا" کھول کے اقبال کی نظم "میں اور تو" نکالی، اور مجھ سے پوچھا کہ کیا تو سے مراد "ہندو" ہے؟ میں نے نظم کے ایک ایک شعر کی تشریح کی اور بتایا کہ "تو" سے مراد ہندو نہیں ہے بلکہ اس "تو" سے مراد ایک مخاطب نہیں، کئی مخاطب ہیں، بنیادی طور پر اقبال نے اس نظم میں اپنا فلسفۂ حرکت اور فلسفۂ ارتقاء بیان کیا ہے، یہ آپ کہہ سکتی ہیں کہ "تو" سے مراد Have ہے، اور "میں" سے مراد Have - not ہے، لیکن Have not بھی ہمیشہ Have-not نہیں رہے گا کیونکہ تغیر اصول فطرت ہے، ایک ہی مقام پر قرار یا قیام، اصول ارتقاء کے خلاف ہے، اقبال حرف کن سے بھی یہی مراد لیتے ہیں، کہ آ رہی ہے دمادم صدائے کن فیکون، یعنی کائنات ہر لمحہ ارتقاء پذیر ہے، پریگاردینا نے میری بات غور سے سننے کے بعد کہا کہ اسی عنوان کی ایک نظم اور بھی ہے، کیا وہاں "تو" سے مراد ہندو ہے؟ میں نے اس نظم کے دو تین اشعار سنائے ؎

ع نہ سلیقہ مجھ میں کلیم کا نہ قرینہ تجھ میں خلیل کا

کہنے لگیں، الہ یہی نظم ہے، میں نے کہا اس میں بھی "تو" سے مراد ہندو نہیں ہے، بلکہ اس نظم میں بحیثیت مجموعی

خطاب مسلمانوں سے ہے، ان مسلمانوں سے جنھوں نے غیر اسلامی طریقے اپنا لیے ہیں، میں نے اس نظم کے اکثر اشعار کی تشریح کی، بالخصوص اس شعر کی ؎

جو صنم کدے میں بیاں کروں تو صنم پکار سے ہری ہری
گلۂ وفائے حجازنما کروں تو اہلِ حرم سے ہے

اس پر تماشا کہنے لگیں کہ ہاں اب بات سمجھ میں آگئی ہے، پہلے ان دونوں نظموں کے متعلق میرا خیال کچھ اور تھا۔

معلوم نہیں اقبال کے بعض غیر ملکی طلبہ کے دل میں یہ بات کیوں گھر کر گئی ہے کہ اقبال کی شاعری ہندو، اور مسلمان کے دائروں میں محصور ہے، ہو سکتا ہے کہ اس کا سبب اقبال پر وہ بیسیوں کتابیں ہوں جن میں اقبال کو ایک بہت ہی محدود انداز میں پیش کیا گیا ہے، جہاں تک نئی نسل کا تعلق ہے اقبال اس وقت دوراہے پر ہیں، اس حقیقت کو کہ اقبال کا سرچشمۂ افکار بنیادی طور پر قرآن اور حدیث ہیں، اس طرح سے پیش کرنا کہ اقبال ہندو اور مسلمان کے تنگ دائروں سے باہر نہ نکل سکیں، کلام اقبال اور فکر اقبال کے انتہائی بے احتیاط اور غیر ذمہ دارانہ مطالعہ کا نتیجہ ہے، اقبال کو اس طرح محدود کر دینے سے اقبال اور اسلام دونوں کے ساتھ انصاف نہیں ہو سکے گا، ڈاکٹر تاثیر نے جب ۱۹۳۸ء میں یہ لکھا تھا کہ :

" وہ مذہبی جنون رکھنے والے ذرّہ پرست نہ تھے، جیسا کہ ان کے نام نہاد مداح کہتے ہیں۔"

تو وہ دراصل اسی خطرے کی طرف اشارہ کر رہے تھے جس کی ایک جھلک مجھے بریگا رینا کے ساتھ بات چیت میں نظر آئی،

اوپر جس تیسرے انتہا پسندانہ نظریہ کا ذکر آیا تھا، یہ نظریہ ہمیں مس سیمی ٹیننٹس کے یہاں نظر آتا ہے، وہ اپنی کتاب Philosophy and Sociology میں لکھتی ہیں :

" وہ مغربی فلسفے اور سائنس سے خوب واقف تھے، اور جانتے تھے کہ مذہبی جدت پسندی کے خیالات کو نظری یا علمی مطابقت کے ساتھ کیسے پیش کیا جا سکتا ہے، ان کی یہ خواہش تھی کہ تعلیمات اسلام کو مغربی فلسفے سے قریب تر لایا جائے، جدید سائنس اور علم کے نتائج نئی نسل کے اس طبقۂ متوسط

طبقے اور دانشوروں کی مزاجی کیفیت میں گونج پیدا کر رہے تھے جو پرانے خرافات لالی اعتقادوں اوہام کا بوجھ اپنی گردن سے اتار پھینکنا چاہتے تھے، اور نئے خیالات کو اپنانے کے آرزومند تھے "۔

خدا جانے مس میسی پٹینٹس اقبال اور اسلام دونوں کے متعلق کیا سوچ رہی تھیں جب انھوں نے اقبال کے بارے میں مندرجۂ بالا جملے لکھے، مس میسی پٹینٹس کی یہ بات کہ اقبال تعلیم اسلام کو مغربی فلسفے کے قریب تر لانا چاہتے تھے، میری سمجھ سے باہر ہے کیونکہ اقبال نے خود اپنے لیکچروں کے دیباچے میں اس موضوع پر جو کچھ لکھا ہے وہ یہ ہے :

" چنانچہ یہی مطالبہ ہے جسے ان خطبات میں جو مدراس مسلم ایسوسی ایشن کی دعوت پر مرتب ہوئے اور مدراس، حیدرآباد اور علی گڑھ میں دیے گئے، میں نے اسلام کی روایات فکر، علی ہذا ان ترقیات کا لحاظ رکھتے ہوئے جو علم انسانی کے مختلف شعبوں میں حال ہی میں رونما ہوئیں، الٰہیات اسلامیہ کی تشکیل جدید سے ایک حد تک پورا کرنے کی کوشش کی ہے، یوں بھی یہ وقت اس طرح کے کسی کام کے لیے بڑا ساعد ہے " (ترجمہ از سید نذیر نیازی تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ۔ بزم اقبال لاہور ۱۹۵۸ء صفحہ ح The Reconstruction of Religious Thought in Islam P.P. 1)

اس طویل اقتباس سے میرے نزدیک یہ معنی بالکل نہیں نکلتے کہ اقبال تعلیمات اقبال کو مغربی فلسفے کے قریب لانا چاہتے تھے، اقبال کی متذکرۂ بالا تحریر کا مطلب میں یہ سمجھتا ہوں کہ اقبال الٰہیات اسلامیہ میں عقلی اساسات کی اہمیت بیان کر رہے ہیں، اگر علامہ نے ان ہی لیکچروں میں یہ کہا ہے کہ ہم علوم جدیدہ کی جانب ایک مودبانہ اور آزادانہ رویہ اختیار کریں اور ان ہی علوم کی روشنی میں تعلیم اسلام کو سمجھیں، خواہ اس کوشش میں ہمیں اپنے پیش روؤں سے اختلاف ہی کیوں نہ کرنا پڑے "۔ تو اس کی تاویل اس طرح سے کرنا کہ اقبال تعلیمات اسلام کو مغربی علوم کے قریب تر لانا چاہتے تھے کئی طرح کی غلط اندیشیوں کے لیے رستہ بنانے کے مترادف ہے، کیونکہ مس میسی پٹینٹس کی تاویل کے پیش نظر تو مغربی علوم ہی معیار یا کسوٹی

بن جائیں گے، حالانکہ اقبال کے سارے سلسلۂ فکر میں کسوٹی یا معیار یا مطمحِ نظر خود اسلام ہے، نہ کہ مغربی علوم مغربی علوم والی بات سمجھنے میں مس مسی پیٹیٹس سے سہو ہوا ہے، اور انھوں نے فکر اقبال کی تاویل پیش کرنے کے لیے بہت ہی غلط اور خطرناک جادہ پر قدم رکھا ہے، اقبال نے اپنے اس نظریہ کی وضاحت 'Knowledge and Religion Experience' (علم اور مذہبی مشاہدات) میں یہ کہہ کر کی ہے:

"اب جہاں تک اسلام کا تعلق ہے ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس کی عقلی اساسات کی جستجو کا آغاز آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مبارک ہی سے ہو گیا تھا، آپ ہمیشہ دعا فرماتے: "اے اللہ! مجھ کو اشیاء کی اصل حقیقت سے آگاہ کر" (ترجمہ از سید نذیر نیازی تشکیل جدید الہیات اسلامیہ صفحہ ۴،
The Reconstruction of Religious Thought in Islam P.p. 3

یعنی بقول اقبال ؎

یارب درونِ سینہ دلِ باخبر بدہ　　　　در بادہ نشہ را نگرم آں نظر بدہ[1]

اب اس سوال کا دوسرا حصہ ہمارے سامنے آتا ہے، اور وہ یہ کہ اقبال کے مخاطب کون ہیں؟ اس معاملہ میں دو رائیں نہیں ہو سکتیں کہ کلامِ اقبال میں اکثر و بیشتر مواقع پر اقبال کے اولین مخاطب مسلمان ہیں، لیکن اسی تخاطب میں بسا اوقات اقبال نے مسلمانوں کے پردے میں سارے عالمِ انسانیت سے بات کی ہے، 'ارمغانِ حجاز' میں قارئین نے دیکھا ہوگا "حضور ملت" اور "حضور عالم انسانی" کے عنوان سے جو دو ابواب قائم کیے گئے ہیں ان میں مضامین اور مباحث قریب قریب ایک ہی طرح کے ہیں، پہلے چند رباعیات "حضور حق" کے عنوان سے پیش ہیں:

---

[1] اے خدا مجھے سینے کے اندر ایک باخبر دل عطا کر، مجھے ایسی نظر دے کہ میں شراب کے اندر نشے کو دیکھ سکوں۔

پرد در وسعتِ گردون یگانہ — نگاہِ او بہ شاخِ آشیانہ
مہ و انجم گرفتارِ کمندش — بدستِ اوست تقدیرِ زمانہ[1]

جوان مردے کہ خود را فاش بیند — جہانِ کہنہ را باز آفریند
ہزاراں انجمن اندر طوافش — کہ او با خویشتن خلوت گزیند[2]

نخستیں لالۂ صبحِ بہارم — بیا پے سوزم از داغے کہ دارم
بچشمِ کم مبیں تنہائیم را — کہ من صد کاروانِ گل در کنارم[3]

جواناں را بد آموز است ایں عصر — شبِ ابلیس را روز است ایں عصر
بدامانش مثالِ شعلہ پیچم — کہ بے نور است و بے سوز است ایں عصر[4]

ز علمِ چارہ سازے بے گدازے — بسے خوشتر نگاہِ پاکبازے
نکوتر از نگاہِ پاکبازے — دلے از ہر دو عالم بے نیازے[5]

---

۱ وہ آسمان کی وسعت میں یگانہ انداز سے پرواز کرتا ہے، (لیکن) اس کی آنکھ ہمیشہ آشیانے میں اپنی شاخ پر رہتی ہے، چاند اور ستارے اس کی کمند میں گرفتار ہوتے ہیں، اور زمانہ کی تقدیر اس کے ہاتھ میں ہوتی ہے ۲ وہ جوانمرد جو اپنے آپ کو نمایاں طور پر دیکھتا ہے یعنی اپنی خودی سے آگاہ ہو جاتا ہے، پرانے جہان کو دوبارہ پیدا کرتا ہے، اور چونکہ وہ اپنی ذات کے ساتھ تنہائی اختیار کر لیتا ہے (یادِ خدا میں) اس لیے ہزار انجمنیں اس کا طواف کرتی ہیں، (یعنی ساری کائنات اس کے دروازے پر دستک دیتی ہے) ۳ میں بہار کی صبح کے لالہ کا پہلا پھول ہوں، اور اس داغ کی وجہ سے جو مجھ میں ہے میں سراپا سوز و گداز ہوں، تو میری تنہائی کو کم نگاہی سے نہ دیکھ کہ میں اپنے پہلو میں پھولوں کے سو کارواں لیے ہوئے ہوں، ۴ یہ دور (عصرِ حاضر) جوانوں کو بدی سکھانے والا دور ہے یہ آج کا دور شبِ ابلیس کی صبح ہے، میں شعلے کی طرح اس کے دامن سے الجھ رہا ہوں (یعنی اس کے خلاف نبرد آزما ہوں) کیونکہ وہ بے نور بھی ہے اور بے سوز بھی ۵ اس علم کے مقابلہ میں جو دنیاوی آسائش کے لیے چارہ سازی تو کر سکتا ہے لیکن دلوں میں گداز نہیں پیدا کر سکتا ایک پاکباز نگاہ کہیں بہتر ہے اور دونوں جہانوں سے بے نیاز دل پاکباز نگاہ سے بھی بہتر ہے۔

اب "حضورِ عالمِ انسانی" کے زیرِ عنوان دی ہوئی چند رباعیات دیکھیے :

نگہ دید و خرد پیمانہ آورد — کہ پیماید جہانِ چار سو را
بہ آشامے کہ دل کردند نامش — بخویش اندر کشید ایں رنگ و بو را[1]

دلے چوں صحبتِ گل می پذیرد — ہماں دم لذتِ خوابش بگیرد
شود بیدار چوں "من" آفریند — چو "من" محکومِ تن گردد بمیرد[2]

بہ روما گفت با من راہبِ پیر — کہ دارم نکتۂ از من فراگیر
کند ہر قوم پیدا مرگِ خود را — ترا تقدیر و ما را کشتِ تدبیر[3]

شنیدم مرگ با یزداں چنیں گفت — چہ بے نم چشمِ آں کز گل بزاید
چو جانِ او بگیرم شرمسارم — ولے او را ز مردن عار ناید[4]

---

[1] نظر نے (اس جہان کو) دیکھا، اور عقل ایک پیمانہ لے کر آگئی کہ جہانِ چار سو کی پیمائش کرے، لیکن اس مے آشام نے کہ جسے دل کہتے ہیں، اس تمام عالمِ رنگ و بو کو اپنے اندر سمولیا [2] دل جب جسم کی صحبت اختیار کر لیتا ہے، تو اسی وقت نیند کی لذت اسے اپنی گرفت میں لے لیتی ہے، (لیکن) وہ جب اپنے اندر "میں" کا جذبہ پیدا کر لیتا ہے' تو وہ بیدار ہو جاتا ہے، اور "میں" جب تن کا غلام ہو جاتا ہے تو ہمیشہ کی نیند سو جاتا ہے [3] روم میں مجھ سے راہبِ پیر (پوپ) نے کہا کہ میرے پاس ایک "نکتہ" ہے، جو تو مجھ سے حاصل کر لے، ہر قوم اپنی موت (کا سامان) خود ہی پیدا کر لیتی ہے، تجھے (یعنی اہلِ مشرق کو) تقدیر نے، اور ہمیں (یعنی اہلِ مغرب کو) تدبیر نے موت کے گھاٹ اتار دیا۔ [4] میں نے سنا کہ موت نے خدا سے یہ کہا: وہ شخص جو مٹی سے پیدا ہوتا ہے (یعنی جو مادی آسائش اور آلائش میں گرفتار رہتا ہے' اس کی آنکھ کتنی بے نم ہوتی ہے (یعنی اس کی شخصیت سوز و گداز سے کس قدر خالی ہوتی ہے) جب میں اس کی روح قبض کرتی ہوں تو مجھے شرم محسوس ہوتی ہے، لیکن اس (بے غیرت انسان) کو مرنے سے شرم نہیں آتی۔

ویسے بھی مومن اور کافر کے بیان کا جہاں تک تعلق ہے، اقبال نے بنیادی اہمیت عمل کو دی ہے، مثلاً:

کافرے بیدار دل پیشِ صنم　　بہ ز دیں دارے کہ خفت اندر حرم[1]

اس نظریہ کی ایک بہت خوبصورت مثال "اسرارِ خودی" میں ملتی ہے، جب کہ شیخ، برہمن سے کہتا ہے: ؎

تا شدی آوارۂ صحرا و دشت　　فکرِ بے باکِ تو از گردوں گذشت
با زمیں دمساز اے گردوں نورد　　در تلاشِ گوہرِ انجم مگرد
من نگویم از بتاں بیزار شو　　کافری؟ شائستۂ زنّار شو
اے امانت دارِ تہذیبِ کہن　　پشت پا بر مسلکِ آبا مزن
گر ز جمعیت حیاتِ ملت است　　کفر ہم سرمایۂ جمعیت است
تو کہ ہم در کافری کامل نۂ　　در خورِ طوفِ حریمِ دل نۂ
ماندہ ایم از جادۂ تسلیم دور　　تو ز آزر من ز ابراہیم دور
قیسِ ما سودائیِ محمل نہ شد　　در جنونِ عاشقی کامل نہ شد
مردہ چوں شمعِ خودی اندر وجود　　از خیالِ آسماں پیما چہ سود[2]

---

[1] مورتی کے سامنے (بیٹھا ہوا) بیدار دل کافر اس دیندار (مسلمان) سے بہتر ہے جو حرم میں آ کے سو گیا ہو۔

[2] تو کہ صحرا و دشت میں آوارہ پھر رہا ہے تیرا فکر (فلسفیانہ خیال) آسمان سے بھی آگے نکل گیا ہے، اے آسمان کی سیر کرنے والے! تو زمین کے ساتھ رفاقت اختیار کر، اور ستاروں کے موتیوں کی تلاش میں آوارہ نہ پھر، میں یہ نہیں کہتا کہ تو مورتیوں سے بیزار ہو جا، تو کافر ہے اس لیے جنیو پہننے کے قابل ہو جا، اے پرانی تہذیب کے امانت دار! اپنے اجداد کے مسلک کو ترک نہ کر، اگر ملت کی زندگی جمعیت کی بدولت ہے تو کفر بھی جمعیت ہی کا سرمایہ ہے، تو کہ کافری کے عمل میں بھی پختہ نہیں ہے، اس قابل نہیں ہے کہ حریم دل کا طواف کر سکے (بقیہ اگلے صفحہ پر)

"جاوید نامہ" میں اس طرح کی متعدد روشن مثالیں ملتی ہیں، مثلاً "خطاب بہ جاوید" میں کہ اقبال کے اپنے الفاظ میں "خطاب بہ نژاد نو" ہے، علامہ کہتے ہیں ؎

گر خدا سازد ترا صاحب نظر — روزگارے را کہ می آید نگر
عقل ہا بے باک و دل ہا بے گداز — چشم ہا بے شرم و غرق اندر مجاز
علم و فن، دین و سیاست، عقل و دل — زوج زوج اندر طواف آب و گل
آسیا، آں مرز و بوم آفتاب — غیر بین از خویشتن اندر حجاب[1]

اب دیکھیے بات سارے ایشیا کی ہو رہی ہے، اس میں بسنے والی کسی ایک قوم کی نہیں، اس میں مسلمان بھی ہیں، ہندو بھی ہیں، عیسائی بھی ہیں، لا مذہب لوگ بھی ہیں، اس سارے ایشیا کو اقبال پہلے تو مرز و بوم آفتاب کہتے ہیں، اس کے بعد بہ حیثیت مجموعی سارے ایشیا کو

؎ غیر بین از خویشتن اندر حجاب

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۴۵۰) ہم (دونوں) جادۂ تسلیم و رضا سے بھٹک گئے ہیں، تو اپنے بزرگوں سے (جو مورتی پوجا کرتے تھے) دور اور میں حضرت ابراہیمؑ کی پیروی سے دور ہو گیا ہوں، ہمارے اندر جو مجنوں (یعنی جذبۂ عشق) موجود ہے وہ لیلیٰ کے محل کا دیوانہ نہیں بن سکا ہے، اور یہ مجنوں جنون عاشقی میں کامل نہیں ہو سکا ہے، جب وجود کے اندر خودی کی شمع ہی بجھ گئی تو آسمان کی پیمائش کرنے والے فلسفے سے کیا حاصل ہے؟

[1] اگر خدا تجھے نظر کی دولت عطا کرے تو اس زمانے کو دیکھ جو آنے والا ہے، عقل بے باک اور دل بے گداز ہو کر رہ گئے ہیں، آنکھیں بے شرم ہو گئی ہیں، اور (حقیقت کے عوض) مجاز میں غرق ہیں، سائنس اور آرٹ، دین اور سیاست، عقل اور دل، یہ سب جوڑے جوڑے کی صورت میں آب و گل (کائنات کے مادی پہلو) کے طواف میں مصروف ہیں، ایشیا جو آفتاب کی جنم بھومی ہے اپنے آپ سے حجاب کر رہا ہے، اور دوسروں کو دیکھ رہا ہے (یعنی اپنی تہذیب و تمدن سے بے گانہ ہو رہا ہے اور مغرب کی کورانہ تقلید میں محو ہے) (اقبال کے یہاں یہ لفظ کتابت کی غلطی سے "مرز و بوم" چھپ گیا ہے، صحیح لفظ اضافت او عطف کے بغیر ہے "مرز بوم"۔

قرار دیتے ہیں، اور پھر اس موضوع پر شمشیر برہنہ بن کر سامنے آتے ہیں اور فرماتے ہیں :

قلبِ او بے واردات نو بہ نو — حاصلش را کس نگیرد با دو جو
روزگارش اندریں دیرینہ دیر — ساکن و یخ بستہ و بے ذوقِ سیر
صیدِ ملّایان و نخچیرِ ملوک — آہوئے اندیشۂ او لنگ و لوک
عقل و دین و دانش و ناموس و ننگ — بستۂ فتراکِ مردانِ فرنگ
تاختم بر عالمِ افکارِ او — بر دریدم پردۂ اسرارِ او
در میانِ سینہ دل خون کردہ ام — تا جہانش را دگرگوں کردہ ام

اس کے بعد وہ خوبصورت اشعار آتے ہیں جن کا ذکر اقبال کے فکر و فن کے تعلق سے اکثر ہوتا رہتا ہے۔

من بہ طبعِ عصرِ خود گفتم دو حرف — کردہ ام بحرین را اندر دو ظرف
حرفِ پیچا پیچ و حرفِ نیش دار — تا کنم عقل و دلِ مرداں شکار
حرفِ تہ دارے بہ اندازِ فرنگ — نالۂ مستانۂ از تارِ چنگ
اصلِ ایں از ذکر و اصلِ آں ز فکر — اے تو بادا وارثِ ایں فکر و ذکر
آبجویم از دو بحر اصلِ من است — فصلِ من فصل است و ہم وصلِ من است

لہ اس کا دل واردات نو بہ نو کے بغیر ہے، اور اس کے حاصل کو کوئی دو جو کے بدلے میں بھی لینے کو تیار نہیں۔

س دیر کہن میں اس کے حالات ساکن، یخ بستہ اور بے حرکت ہو چکے ہیں، آج یہ نام نہاد ملاؤں کا صید اور بادشاہوں کا شکار ہے، اور اس کے فکر کا ہرن آج لولا اور لنگڑا ہو چکا ہے، اس کی عقل و دین و دانش، ناموس اور ننگ یہ سب مغربی آقاؤں کی وابستہ فتراک ہو چکی ہیں، میں نے اس کے عالم افکار پر حملہ کیا، اور اس کے رازوں کے پردوں کو چاک کر دیا۔

تا مزاجِ عصرِ من دیگر فتاد طبعِ من ہنگامۂ دیگر نہاد[1]

یہاں دو[2] نکتے خاص طور سے قابل ذکر ہیں، ایک تو یہ کہ اتنی اہم بات وہ سارے زمانہ سے کہہ رہے ہیں، صرف مسلمانوں سے نہیں کہہ رہے ہیں، دوسرے یہ کہ "با انداز فرنگ" سے مراد ہے مغربی فلسفے کے انداز پر، گویا دوسرے لفظوں میں فلسفۂ مغرب کو ایک خراج تحسین ادا کر رہے ہیں، اور پھر جاوید سے یا جاوید کے بس پردہ ساری نسلِ نو سے کہہ رہے ہیں کہ خدا تجھے میرے اس سارے فلسفے کا بھی وارث بنائے اور میرے جذبۂ عشق کا بھی۔

یہ حصہ سارے کا سارا، اول سے آخر تک نئی نسل کے نام پند و نصائح سے لبریز ہے، اور یوں تو اس کا ہر شعر حکمت اور وجدانی کیفیت سے مملو ہے، لیکن میں صرف چند اشعار پیش کروں گا

منکر حق نزد ملا کافر است منکر خود نزد من کافر تر است

---

[1] میں نے اپنے زمانہ کے مزاج کے ساتھ دو طرح سے بات کی ہے، اور دو سمندروں کو میں نے دو کوزوں میں بند کر دیا ہے، ایک تو میں نے بیچا پیچ طریقے سے بات کی ہے، اور دوسرا نیش دار طریقے سے، تاکہ مردوں کے عقل و دل دونوں شکار کروں (لفظ بیچاپیچ سے اشارہ ہے اپنی فلسفیانہ کتاب ——— The Re Construction of Religious Thought in Islam کی طرف، اور "حرف نیش دار" سے مراد ہے شعری تصانیف) بیچاپیچ والی بات تو مغربی فلسفے کے انداز میں تہ دار زبان میں بیان کی ہے، اور حرف نیش دار ایک نالۂ مستانہ ہے جو رباب کے تاروں سے پھوٹا ہے، حرف نیش دار کا اصل "ذکر" ہے، اور حرف بیچ دار کی اصل "فکر"، خدا کرے تو میرے ذکر و فکر دونوں کا وارث بن جائے۔ میں ایک ندی ہوں اور میری اصل دو سمندروں سے ہے، میرا حاصل فراق بھی ہے اور وصال بھی چونکہ میرے زمانے کا مزاج مختلف واقع ہوا ہے، اس لیے میری طبیعت نے ایک نئے ہنگامے کی بنیاد ڈالی ہے۔

سرِ دیں صدقِ مقال، اکلِ حلال — خلوت و جلوت تماشائے جمال

آدمیت احترامِ آدمی — باخبر شو از مقامِ آدمی

آدمی از ربط و ضبطِ تن بہ تن — بر طریقِ دوستی گامے بزن

کفر و دیں را گیر در پہنائے دل — دل اگر بگریزد از دل وائے دل[1]

"جاوید نامہ" کا ذکر آگیا ہے تو یہ بات بھی بے محل نہ ہوگی کہ اس آسمانی سفر کی ابتدا فلکِ قمر سے ہوتی ہے، جہاں اقبال وشوامتر مہاراج سے ملتے ہیں، اور وہ "زندہ رود"[2] کو ہنگامِ طلوعِ خاور کا مژدہ دیتے ہیں۔ اسی جاوید نامہ میں وادیٔ طواسین، طاسین گوتم سے شروع ہوتی ہے اور طاسین زرتشت، طاسین مسیح سے ہوتی ہوئی طاسین محمدؐ تک پہونچتی ہے۔ "زبورِ عجم" کے ایک حصہ میں تمام غزلوں کا مخاطب انسان ہے۔ اصولی طور پر مذہب اور قطعی طور پر اسلام یقیناً اقبال کے لیے بڑی اہمیت کا حامل ہے، لیکن غالبؔ کی شاعری کا ذکر کرتے ہوئے اقبال نے یہ بھی کہا ہے کہ "غالب یقیناً ان شعراء میں سے ہیں جن کا ذہن اور تخیل انھیں مذہب اور قومیت کے تنگ حدود سے بالاتر مقام عطا کرتا ہے"۔[3]

---

[1] ملا کے نزدیک منکرِ حق کافر ہے لیکن جو اپنے آپ سے منکر ہے وہ میرے نزدیک کافر تر ہے، دین کا راز راست گفتاری، حلال کی کمائی اور خلوت و جلوت میں خدا کو دیکھنے میں ہے، آدمیت انسان کے احترام کا نام ہے، تو آدمی کے مقام سے باخبر ہو جا، آدمی جب ہی آدمی ہیں جب کہ وہ ایک دوسرے کے ساتھ ربط ضبط رکھتے ہیں، (اس لیے) تو دوستی کے رستے پر اپنا پاؤں رکھ، اپنے دل کی وسعتوں میں کفر و دین دونوں کو سنبھال لے، دل ہی اگر دل سے بھاگ جائے تو اس دل پر افسوس ہے۔

[2] جاوید نامہ میں اقبال کا نام "زندہ رود" (Living Stream) ہے جو انھیں اس آسمانی سفر کے رہنما مولانا روم نے دیا ہے (من ز شوخی گویم او را زندہ رود) [3] شذرات فکر اقبال (مرتبہ ڈاکٹر جاوید اقبال) ترجمہ ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی، مجلس ترقی ادب کلب روڈ، لاہور ۱۹۷۳ء، ص ۱۰۲۔

جہاں تک کلامِ اقبال کے مخاطب کا تعلق ہے بقول ڈاکٹر نکلسن اس کا شاعرانہ پیغام محض ہندی مسلمانوں کے لیے نہیں ہے، بلکہ اس نے عالمِ اسلام کو مخاطب کیا ہے، لیکن میرے نزدیک ڈاکٹر نکلسن کی نذکوہ رائے پر مراکش کے پروفیسر ایس۔ آئی فہد کی رائے ایک اضافہ کی حیثیت رکھتی ہے، جس میں وہ کہتے ہیں :

"اقبال ایک ہمہ گیر شہری ہیں، ان کی ہمدردیاں اتنی وسیع ہیں کہ ان میں تمام دنیا کے انسان بلا امتیازِ نسل و ملک سما جاتے ہیں، آپ عظمتِ انسانی کے علمبردار ہیں، اس لیے اقبال کو مشرق و مغرب میں یکساں عزت حاصل ہے[1]" اٹلی کے پروفیسر جی توچی (G. Tucci) لکھتے ہیں "..... لہٰذا ہم اس عظیم الشان شاعر کو خراجِ عقیدت پیش کرنے میں کسی طرح پیچھے نہیں رہ سکتے، جس کو شاید ہم دوسرے لوگوں سے زیادہ اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں، اور جن کا زوردار پیغام صرف مہذب ذہنوں ہی کے لیے نہیں بلکہ ان سب کے لیے بھی ہے جو ابھی تک انسانیت کی تقدیر سے مایوس نہیں ہوئے[2]"

اقبال نے مادی موت سے بلند ہو کر زندگی جاوداں کا راز صرف ملتِ اسلامیہ کو نہیں بتایا بلکہ سارے عالمِ انسانیت کو بتایا ہے، اور انفرادی سطح پر انھوں نے یہ بات انسان ہی سے کہی ہے، ان کی آخری نظم 'قطعی طور پر آخری نظم' بھی انسان ہی کے متعلق ہے ؎

کسی کو کیا خبر، یہ خاکداں کس کا نشیمن ہے غرض انجم سے ہے کس کے شبستاں کی نگہبانی

(ارمغانِ حجاز)

۱۹۷۷ء میں جب ہم لوگ دنیا کے مختلف حصوں سے پہلی اقبال عالمی کانگریس میں شرکت کے لیے لاہور اور سیالکوٹ گئے تھے، تو سری لنکا سے آئے ہوئے نمایندے تیسا آوجے رتن نے اپنے مقالہ میں کہا تھا :

"..... یہی وہ پیغام تھا، جس کی انسانی دوستی نے اس کی شاعرانہ کشش کو عالمگیر بنا دیا یہی

---

[1] و [2] مترجمہ از ڈاکٹر سلیم اختر۔

وجہ ہے کہ جہاں کہیں بھی محفل سخن گرم ہو، خواہ وہ مسلم پاکستان ہو یا ہند و بنگال، ایران ہو، یا روس کی کوئی اسلامی جمہوریہ، چین ہو یا یورپ کی یونیورسٹیوں کے مسلم طلبہ کا کوئی اجتماع یا بدھ طالب علموں کی کوئی ایسی محفل، ہر جگہ وہ نغمے خاص توجہ سے سنے جائیں گے جنھیں اسلامی احیاء کے داعی محمد اقبال کے قلم نے غیر فانی بنا دیا ہے[1]"

اس ضمن میں یہ بھی عرض کر دینا مناسب ہوگا کہ یہاں ہندوستان میں بعض دفعہ ایک عجیب و غریب صورت حال میری نظر سے گذری ہے، اور وہ یہ کہ اقبال پر لکھنے والے چند اہل قلم نے فکر اسلام سے اقبال کی وابستگی کو ایک معذرتی انداز میں پیش کیا ہے، یہ ایک افسوسناک صورت حال ہی نہیں ہے، بلکہ اس سے ادبی دیانت پر بھی حرف آتا ہے۔ اس صورت حال پر میں اپنے ایک انگریزی مقالے[2] "Iqbal Poet and Politician" میں جو میں نے چند برس قبل میسور یونیورسٹی میں اور اس کے بعد لاس اینجلس (امریکا) کے ایک ادبی اجتماع میں پڑھا تھا، کسی حد تک بحث کر چکا ہوں، جس میں یہ کہنے کی میں نے کوشش کی ہے کہ ہماری یہ روش ہمیں کلام اقبال کے دیانت دارانہ مطالعہ سے دور لے جائیگی'

اس کے برعکس ولیم او ڈگلس ایسوشی ایٹ جسٹس سپریم کورٹ یو۔ ایس۔ اے کی یہ رائے، جو حفیظ ملک کی کتاب "Iqbal: Poet Philosopher of PAKISTAN" میں ان کے لکھے ہوئے پیش لفظ میں موجود ہے، زیادہ وسیع ہے، اور حقیقت پر مبنی ہے:

"ان دنوں زیادہ ضرورت مشرق و مغرب میں افہام و تفہیم کے پلوں کی ہے، افہام و تفہیم اور مفاہمت کے ان پلوں کی ضرورت دانشوری کی بلند ترین سطح پر ہے، تاکہ مختلف النوع تہذیبیں، جو

---

[1] ترجمہ از ڈاکٹر سلیم اختر [2] "Iqbal: Poet and Politician" شمولہ بہ کتاب Iqbal: hind and Arab مصنفہ جگن ناتھ آزاد، ص ۹۷ تا ۱۲۲ (مطبوعہ نیشنل بک ہاؤس اردو بازار، لاہور، پاکستان، ۱۹۸۳ء)

اپنی اپنی جگہ پر عظیم تہذیبیں ہیں، ایک دوسرے کو جان سکیں اور سمجھ سکیں، اقبال مشرق سے ایک ایسی آواز تھی جس نے مغرب کے ساتھ ایک مشترکہ انداز کی ہم نفسی کا تصور پیدا کیا، اور جس نے ایک ایسی عالمگیر برادری کو تشکیل دینے میں اپنا حصہ ادا کیا، جو نسل، مذہب اور زبان کے اختلافات کو برداشت کرتی ہے۔

چنانچہ دلی انکسار کے ساتھ ہم اقبال کے نام کو اپنا ہدیۂ عقیدت پیش کرتے ہیں، اور اس جذبۂ احسان مندی کے تحت خدا کے شکر گزار ہیں کہ ایک ایسا انسان ہم لوگوں میں بھی موجود تھا، اسی بنا پر میں کہتا ہوں کہ اگرچہ اقبال فرزند پاکستان تھے لیکن ہم اہل امریکا بھی اسے اپنا ہی سمجھتے ہیں"

اب آخر میں یہاں اقبال کے کلام سے اس قسم کی مثالیں پیش کرنے کے عوض

ع اٹھو مری دنیا کے غریبوں کو جگا دو!

ع مبتلائے درد کوئی عضو ہو روتی ہے آنکھ،

ع شمع کی طرح جئیں بزم گہِ عالم میں

ع چھوڑ دں گا نہ میں ہند کی تاریک فضا کو

ع ترے صوفے ہیں افرنگی ترے قالین ہیں ایرانی

ع درویشِ خدا مست نہ شرقی ہے نہ غربی

یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ سورج اگرچہ مشرق سے طلوع ہوتا ہے اور مشرق سے اس کی مناسبت ازلی اور ابدی ہے، لیکن اس کے باوجود خورشید کی روشنی صرف مشرق تک محدود نہیں ہے، وہ اپنے انوار سے مشرق، مغرب، شمال، جنوب، افلاک، زمین ہر ایک کو منور کرتا ہے، اور اس مثال کی روشنی میں اس سوال کا جواب کہ کیا اقبال مسلمانوں کے شاعر ہیں، میرے نزدیک یہ ہے کہ اقبال مسلمانوں کے شاعر بھی ہیں، ہندوستان بلکہ ہندوستان کی بیداری کے شاعر بھی ہیں، ایشیا کی بیداری کے شاعر بھی ہیں اور عالم انسانیت کے شاعر بھی ہیں۔ (باقی)

ماقبل عہد مغلیہ میں طب کا فروغ

از جناب حکیم الطاف احمد اعظمی (علیگ)

مغل سلاطین کی آمد سے بہت پہلے ہندوستان میں آیورویدک طریقۂ علاج کے پہلو بہ پہلو یونانی طریقۂ علاج بھی رائج ہو چکا تھا، سب سے پہلا طبیب جو وسط ایشیا سے ہندوستان آیا، اس کا نام حکیم ضیاء الدین عبدالرافع ہروی ہے، جو ہرات کا رہنے والا تھا، غزنہ میں خانوادۂ آل سبکتگین کا آخری تاجدار خسرو ملک (پسر خسرو شاہ) جب سنہ ۱۱۶۰ء میں لاہور کو دار السلطنت قرار دیکر حکمراں ہوا تو ضیاء الدین عبدالرافع ایک طبیب کی حیثیت سے اس کے دربار سے وابستہ ہو گیا، مولف مآثر الامراء کے بیان کے مطابق اس بادشاہ کے بعد جب تک زمام حکومت شہاب الدین الملقب بہ ابوالمظفر سلطان معز الدین غوری (متوفی سنہ ۶۰۲ھ/۱۲۰۶ء) کے ہاتھ میں رہی، اس وقت تک ضیاء الدین عبدالرافع ایک طبیب حاذق کی حیثیت سے نمایاں رہا۔[۱] نورالدین محمد عوفی اس کے فضل و کمال کے متعلق لکھتا ہے۔

"عبدالرافع، جہانِ فضل و کمال، صاحب ہنر مندی و بزرگی کا آسمان، اور نفس و لطف کے اعتبار سے نادرۂ روزگار تھا، طب میں کامل مہارت کے ساتھ فن لغت میں بھی اسے ید طولیٰ حاصل تھا، نفس عیسیٰ اور طبیعت، دست موسیٰ کی مانند تھی، سلطان خسرو ملک کے دربار میں نہایت معزز و محترم تھا"[۲]

بادشاہان غزنہ کے بعد طب کی ترقی و اشاعت کے اعتبار سے عہد خلجی اور عہد تغلق زیادہ اہمیت

۱؎ نیر واسطی، تاریخ روابط پزشکی ایران و پاکستان، راولپنڈی سنہ ۱۹۷۵ء، ص ۱۲ ۲؎ نورالدین محمد عوفی، لباب الالباب، بریل لیڈن سنہ ۱۹۰۶ء، ج ۲، ص ۱۲۰۔

رکھتا ہے، عہد علائی میں جس کثیر تعداد میں علماء و فضلا موجود تھے، اس کا ذکر کرتے ہوئے ضیاء الدین برنی لکھتا ہے۔

"دہلی میں وہ یگانۂ عصر علماء و فضلاء موجود ہیں، جن کی نظیر سمرقند، بغداد، مصر، خوارزم، دمشق، تبریز، اصفہان، رے غرضے کہ ربع مسکون میں موجود نہیں ہے"[1]

اطباء کے ذکر میں مولف مذکور لکھتا ہے:۔

"عصر علائی کے اطباء علم طب میں مہارت کامل رکھتے تھے، اور علاج امراض میں بقراط و جالینوس بھی ان کے آگے ہیچ تھے، اور ایسے سرآمد روزگار اطباء نہ تو اس عہد میں موجود تھے، اور نہ کسی دوسرے عہد میں دیکھے گئے"[2]

علاء الدین خلجی (متوفی ۷۱۶ھ ۱۳۱۶ء) کے عہد میں جو نامور اطباء موجود تھے، ان میں حکیم مولانا بدر الدین دمشقی، حکیم حسام الدین ماریکلی، حکیم مطرز، حکیم صدر الدین ماریکلی (پسر حکیم حسام الدین ماریکلی)، حکیم علم الدین، مینی طبیب، حکیم اعز الدین بدایونی، مہ چند طبیب، جاجا جراح، اور علم الدین کحال کے نام قابل ذکر ہیں، یہ اطباء اپنے علم و فن میں سارے ہندوستان میں بے نظیر تھے[3]، استاد الحکماء مولانا بدر الدین دمشقی کے متعلق برنی لکھتا ہے۔

"مولانا بدر الدین دمشقی، عہد علائی کے طبیب تھے، شہر کے تمام اطباء، ان سے کتب طب کا درس لیتے تھے، باری تعالیٰ نے ان کو علم طب میں وہ لیاقت و مہارت عطا فرمائی تھی کہ محض مریض کی نبض دیکھ کر سبب مرض معلوم کر لیتے تھے، اور یہ بھی جان لیتے تھے کہ مریض شفا پا سکے گا یا نہیں"[4]

---

[1] تاریخ فیروز شاہی (ضیاء الدین برنی، انجمن آسیائی بنگال کلکتہ ۱۸۶۲ء، ص ۳۵۲ [2] تاریخ فیروز شاہی ص ۳۶۲ [3] ایضاً ص ۳۶۳ [4] ایضاً ص ۳۶۲

حکیم مولانا بدر الدین دمشقی کو امتحانِ بول میں اس درجہ مہارت حاصل تھی کہ وہ قارورہ دیکھ کر جان لیتے تھے، کہ اس میں انسان کا پیشاب ہے یا جانور کا اور اگر جانور کا ہے، تو کس جانور کا ہے، فرشتہ لکھتا ہے:۔

از اطبای مسیح نفس استاد الحکماء مولانا بدر الدین	استاد الحکماء مولانا بدر الدین دمشقی ان
دمشقی آنچناں بود کہ اگر در شیشہ بول چند جانور	مسیحا نفس اطباء میں تھے، جن کے پاس اگر
انداختہ نزد او آوردندی، او بدیہہ حکم کردی	لوگ چند جانوروں کا ملا جلا پیشاب بھی
کہ بول فلاں و فلاں جانور درین شیشہ کردہ[1]	لاتے تو وہ فوراً بتادیتے تھے کہ فلاں فلاں
	جانوروں کا پیشاب اس شیشی میں ہے۔

صاحب نزہۃ الخواطر، مولانا دمشقی کے غیر معمولی علم و فضل کا اعتراف ان لفظوں میں کرتے ہیں:

"حذاقت، تدبیر اور نبض و بول کی شناخت میں اپنے عہد کے بے نظیر طبیب تھے، بیان کیا جاتا ہے کہ ایک بار قارورہ میں مختلف جانوروں کا پیشاب مخلوط کرکے ان کے سامنے لایا گیا، دیکھتے ہی پہچان گئے، اور تبسم فرمایا، اور کہا کہ اس قارورہ میں چند جانوروں کا پیشاب مخلوط کرکے لایا گیا ہے، مولانا تقریر و افہام میں منفرد تھے، طب کے دقیق معانی کو بسہولت طلبہ کے ذہن نشین کرا دیتے تھے، بالخصوص شیخ کی کتاب "القانون" کی شرح و توضیح میں تو انھیں درجۂ کمال حاصل تھا۔[2]"

حکیم صدر الدین (پسر حسام الدین ماریکلہ) کے بارے میں صاحب نزہۃ الخواطر لکھتے ہیں:۔

"علوم الٰہی میں ید طولیٰ رکھتے تھے، سلطان علاء الدین محمد شاہ خلجی کے عہد میں دار السلطنت دہلی میں مطب کرتے تھے، اور درس بھی دیتے تھے، نہایت نیک نفس، ذکی و فطین اور حاذق

---

[1] محمد قاسم ہندو شاہ فرشتہ، تاریخ فرشتہ، منشی نولکشور ۱۸۶۴ء ج ۱ ص ۱۳۲، [2] مولانا عبد الحی، نزہۃ الخواطر و بہجۃ المسامع والنواظر، حیدر آباد دکن ۱۹۵۵ء ج ۲ ص ۱۶۔

طبیب تھے، مریض کو دیکھتے ہی اسبابِ مرض جان لیتے تھے۔ اور بہت جلد مریض ان کے علاج سے صحت یاب ہوجاتے تھے۔"[۱]

برنی لکھتا ہے:۔

"پسر و پدر دونوں علم طب میں مہارت رکھتے تھے، حکیم صدرالدین نہایت نیک نفس تھے، اور مریض کو دیکھتے ہی اس کا مرض اور سبب مرض جان لیتے تھے۔"[۲]

حکیم مطرز کے بارے میں ضیاء الدین برنی لکھتا ہے:۔

"حکیم بدرالدین دمشقی کی طرح نبض و بول کی معرفت میں کوئی دوسرا طبیب شہر دہلی میں حکیم مطرز کا ہمسر نہ تھا۔ باری تعالیٰ نے انہیں حسن تقریر کی دولت سے نوازا تھا، قانون و قانونچہ اور دیگر کتب طب کے مسائل و مطالب کو وہ اس طرح مشرح کر دیتے تھے کہ طلبہ ان کے حسن تقریر اور بدائع بیان پر انگشت بدنداں رہ جاتے تھے۔"[۳]

حکیم مینی کے متعلق صاحب نزہۃ الخواطر لکھتے ہیں:۔

"نہایت حاذق طبیب تھے، سلطان علاء الدین محمد شاہ خلجی کے عہد میں دارالسلطنت دہلی میں درس و افادہ کا کام انجام دیتے تھے۔"[۴]

حکیم علم الدین شیرازی کے بارے میں مؤلف مذکور لکھتے ہیں۔

"علوم حکمت اور فن طب میں ید طولیٰ رکھتے تھے، علاء الدین خلجی کے عہد میں دہلی میں درس دیتے تھے۔"[۵]

عہد علائی کی طرح عہد تغلق میں بھی طب یونانی نے نمایاں ترقی کی، بانی سلطنت سلطان غیاث الدین

---

[۱] مولانا عبدالحئی، نزہۃ الخواطر و بہجۃ المسامع والنواظر، حیدرآباد دکن ۱۹۰۴ء ج ۲ ص ۷۲ [۲] تاریخ فیروز شاہی، ص ۳۶۳ [۳] ایضاً ص ۳۶۲ [۴] نزہۃ الخواطر، ج ۲ ص ۱۰۰، [۵] ایضاً ص ۸۵۔

تغلق شاہ (متوفی ۷۲۵ھ/۱۳۲۵ء) کو نہ صرف علم طب سے دلچسپی تھی، بلکہ اس میں اسے عملی مہارت بھی حاصل تھی، جب خسرو خان کے مقابلے میں اسے فتح حاصل ہوئی، تو اس نے دشمن کے مجروحین کی مرہم پٹی کی اور ان کا علاج کیا، فیروز واسطی لکھتے ہیں :۔

"در بارۂ غیاث الدین تغلق	غیاث الدین تغلق کے بارہ میں بیان کیا جاتا
مذکور است کہ وی چوں در مقابل خسرو خاں[1]	ہے کہ جب اس نے خسرو خان کے مقابلہ میں فتح
پیروز گر دید، مجروحان دشمن را خود شخصاً	پائی تو دشمن کے زخمیوں کا خود علاج معالجہ
درمان و معالجہ و پرستاری نمود، در میں	کیا، ان مجروحین میں ایک آدمی قمر نام کا تھا،
ایں مجروحین مردی بود، قمر نام غیاث الدین	جس کے زخموں کی مرہم پٹی خود غیاث الدین
تغلق زخمہائش را بدست خود بست و مرہم	تغلق نے اپنے ہاتھوں سے کی تھی، امیر خسرو
نہاد، امیر خسرو در ایں بارہ می گوید[2]	اسی کے متعلق فرماتے ہیں۔
بدست خود جراحتہاش می بست	دوا با مہر راحتہاش می بست

غیاث الدین تغلق کے بعد اس کا بیٹا سلطان محمود عادل تغلق شاہ معروف بہ محمد بن تغلق (متوفی ۷۵۲ھ/۱۳۵۱ء) سریر آرائے سلطنت ہوا، یہ نہایت صاحب علم و فضل بادشاہ تھا، اور جملہ علوم و فنون کے ساتھ علم طب سے بھی گہری واقفیت رکھتا تھا، بالخصوص معالجات امراض میں اسے بڑی مہارت حاصل تھی، کثیر التعداد مریض اس کے علاج سے شفایاب ہوئے، وہ اکثر و بیشتر ماہرین فن اطباء سے طبی مسائل میں بحث و مباحثہ بھی کرتا تھا، اور اپنے خیالات کی صحت و صداقت کا ان کو قائل بنا دیتا تھا،[3]

محمد بن تغلق کے بعد فیروز شاہ تغلق (متوفی ۷۹۰ھ/۱۳۸۸ء) تخت نشین ہوا، اسے مذہبی علوم کے علاوہ

---

[1] تاریخ روابط، پزشکی ایران و پاکستان، ص ۱۱، [2] تغلق نامہ، ص ۱۰۲ [3] تاریخ فیروز شاہی، ص ۴۶۳، ۴۶۴۔

طب اور علم ہیئت میں بھی مہارت حاصل تھی، اس کی لائبریری میں ان علوم سے متعلق کتابوں کا بڑا ذخیرہ موجود تھا، علم طب سے اس کی دلچسپی اور واقفیت کا بدیہی ثبوت "طب فیروز شاہی"[رح] ہے، جس میں ان امراض کے علاج لکھے ہوئے ہیں جو "قانون شیخ" اور "ذخیرۂ خوارزم شاہی (اسماعیل جرجانی) میں بھی مذکور نہیں ہیں، وہ استخوان شکستہ کے جوڑنے میں مہارت رکھتا تھا، چنانچہ مختلف مہمات میں اس نے لوگوں کی ٹوٹی ہوئی ہڈیوں کو حیرت انگیز طور پر درست کر دیا، وہ امراض چشم کا بھی ماہر تھا، اس نے ایک ایسا سرمہ ایجاد کیا تھا، جو متعدد امراض چشم میں نہایت نافع ثابت ہوا، یہ سرمہ کحل فیروز شاہی کے نام سے معروف تھا۔[۱]

عہد لودی میں بھی طب یونانی کو بڑا فروغ نصیب ہوا، سکندر شاہ لودی (متوفی ۹۲۳ھ / ۱۵۱۷ء) نہایت صاحب علم و فضل اور دور اندیش بادشاہ تھا، وہ فارسی زبان سے گہری واقفیت رکھتا تھا، اور فارسی میں شاعری بھی کرتا تھا، گل رخ اس کا تخلص تھا، موسیقی سے بھی دلچسپی تھی "گنجینۂ سکندر شاہی" اس کا واضح ثبوت ہے، اسے طب سے غیر معمولی شغف تھا، چنانچہ اس نے اپنے ذی علم وزیر میاں بھوا بن خواص خاں کو حکم دیا کہ وہ ہندی طب (آیورویدا) کے اصول و نظریات اور طریقۂ علاج پر مشتمل ایک کتاب تالیف کرے، تعمیل حکم میں بھوا بن خواص خاں نے معروف درباری اطبار کی مدد سے "معدن الشفا سکندر شاہی"[۲] نام کی کتاب تالیف کی، جس پر مزید گفتگو آگے آرہی ہے۔

سکندر لودی کے ایک دوسرے وزیر امیر میاں طٰہٰ اسلامی علوم کے ساتھ طب ہندی اور موسیقی میں ید طولیٰ رکھتے تھے، ہندی طب سے متعلق ۲۲ ہزار اشلوک انھیں زبانی یاد تھے، اس فن میں ان کی مہارت کا یہ عالم تھا کہ خود ہندو ماہرین طب ان سے طب ہندی کا درس لیا کرتے تھے۔[۳]

---

[۱] سیرت فیروز شاہی (مخطوطہ بانکی پور لائبریری، پٹنہ) فصل ۴، اوراق ۱۶۱-۱۷۰، دیکھیں، کیٹلاگ آف عربک اینڈ پرشین مینسکرپٹ، بانکی پور لائبریری، جلد، ص ۲۰، ۳۳ [۲] یہ کتاب (صفحات ۲۹۲) منشی نولکشور پریس سے ۱۲۹۲ھ میں شائع ہو چکی ہے۔ [۳] تاریخ مشتاقی (مخطوطہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ) اوراق ۶۹ (ب) تفصیل کے لیے دیکھیں اسٹڈیز ان عربک اینڈ پرشین میڈیکل لٹریچر (ڈاکٹر زبیر صدیقی) کلکتہ یونیورسٹی ۱۹۵۹ء ص ۳۹

تصانیف | ماقبل عہد مغلیہ میں علم طب سے متعلق متعدد اہم اور نادر کتابیں لکھی گئیں، جن کے مطالعے سے اس دور میں طب کی ترقی کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے، اس دور کی چند معروف طبی کتابوں کا یہاں اختصار کے ساتھ تعارف کرایا جاتا ہے،

(۱) طب فیروز شاہی :- اس کتاب کا تذکرہ پچھلے صفحات میں ہو چکا ہے۔

(۲) راحت الانسان :- اس کتاب کا مولف الیاس بن شہاب ملقب بہ ضیا ہے، یہ ۷۸۶ھ میں مرتب کی گئی، اور فیروز شاہ کے نام معنون کی گئی ہے۔[1]

(۳) مجموعۂ شمسی :- یہ خواجہ شمس الدین مستوفی کی تالیف ہے، مولف نے اسے سنسکرت کتابوں کی مدد سے لکھا ہے، اس کے زمانۂ تالیف اور دوسرے متعلقہ امور کے بارہ میں کچھ علم نہیں ہو سکا، اس کے متعلق معلومات کا تنہا ماخذ عہد تغلق کے معروف طبیب حکیم ضیا محمد کی کتاب "مجموعۂ ضیائی" ہے۔ ضیا محمد نے اس کتاب کے مقدمہ میں مجموعۂ شمسی کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے:-

"دریں سال نوبت زحمت دو بار بود چنانچہ بیشتر آدمیان کہ در صحبت برابر بندہ بودہ اند برحمت حق پیوستند و بندہ را مدت دو سال و چہار ماہ بانواع زحمت مشغول بود و ہر لحظہ و ہر لمحہ طبیبان ماہر احوال خود باز نمودہ می شد و ہر چہ می گفتند علاج کردہ می آمد تا گران زحمت بصحت انجامد و درد دل بیار آمد، بہیچ سبیل فائدہ نبود بلکہ ہر روز زحمتے مزید

یہ ایسی بیماری و وبا کا سال تھا کہ بہت سارے لوگ بیمار ہو کر انتقال کر گئے، میں دو سال چار ماہ تک طرح طرح کی بیماریوں میں مبتلا رہا ہر وقت اپنا حال ماہر اطباء سے بیان کرتا، اور وہ جو کچھ کہتے، اس کے مطابق علاج کرتا مگر کسی طرح افاقہ نہ ہوتا بلکہ روزانہ کسی نئی بیماری میں مبتلا ہوتا رہا، ایک رات صبح کے قریب اللہ تعالیٰ کے حضور میں نالہ و فریاد کر رہا تھا کہ اسی بات میں

[1] جرنل اسٹڈیز ان ہسٹری آف میڈیسن ج ۳ نمبر ۲ جون ۱۹۶۹ء ص ۱۲۰ (ہمدرد نگر، دہلی)

در علتے مستزیدی شدتا شبے بصبح دسے در حضرت
عزت کہ شفا بخش دردمندان و علیلان بنالیدم
ہماں شب عم خویش خواجہ شمس متوفی را
بخواب دیدم کہ می گوید من کتاب جمع کردہ ام
در طب مجموعۂ شمسی نام و تو درین کار در توقف داری
آں را پیش گیر و دوائے خویش ساز تا حق
تعالے ترا صحت بخشد۔"[5]

اپنے چچا خواجہ شمس متوفی کو خواب میں دیکھا
کہ فرمارہے ہیں کہ میں نے طب میں مجموعۂ شمسی
کے نام سے ایک کتاب مرتب کی ہے، تمھیں
اس کی واقفیت ہے، اسے پیش نظر رکھواور
اپنا علاج کرو، اللہ تعالے شفادے گا۔

(۴) مجموعۂ ضیائی :- اس اہم طبی کتاب کا مولف ضیاء محمد محمود مسعود رشید زنگی عمر غزنوی معروف بہ مبارکباد ہے، یہ محمد تغلق (متوفی ۷۵۱ھ/۱۳۵۱ء) کا درباری طبیب تھا، عربی اور فارسی کے ساتھ سنسکرت زبان سے بھی پوری واقفیت رکھتا تھا، محمد ضیاء نے اس کتاب کو تیلنگ (دیوگری یا دولت آباد) کے زمانۂ قیام میں لکھا تھا، جہاں وہ سلطان کے حکم سے شہر دلی کے دوسرے ارباب کمال کے ساتھ منتقل ہو گیا تھا، ضیاء محمد نے منتقلی کا حال ان الفاظ میں لکھا ہے :-

می گوید بندۂ ضعیف اضعف العباد ضیاء محمد
محمود مسعود رشید زنگی عمر غزنوی عرف مبارکباد
کہ در شہور سنہ سبع وثلثون وسبع مأۃ بحکم
فرمان خداوند عالم المخصوص بعنایۃ الرحمٰن ابو
المجاہد محمد بن تغلق شاہ سلطان کہ با نفع
صدو جاری باد رسیدم در شہر سلطان بود کہ

بندہ ضعیف ضیاء محمد محمود مسعود رشید زنگی
عمر غزنوی عرف مبارکباد عرض کرتا ہے، کہ
۷۳۷ھ میں شہنشاہ محمد بن تغلق کے
فرمان کے مطابق ہم لوگ اس کے شہر
تلنگ میں پہنچے، یہ بہت بڑا، زرخیز، دلکش
اور خوشنما شہر تھا، جس میں انواع واقسام

---

[5] اے کیٹلاگ آف عربک اینڈ پرشین میڈیکل مینسکرپٹ، آئی، ایچ، ایم، آر، ہمدرد نگر دہلی، مخطوطہ نمبر ۱۱۹۶۳

آن را تلنگ گویند، و دیدم شہرے معظم، و | کی نعمتیں اور میوے تھے، نیز اس شہر میں
سوادے خوش و ولایتے دل کش، نعمتہائے | حوض اور نہریں تھیں۔
فراوان و میوہ ہائے بے پایان، و درون
شہر حوضہا و جویہائے آب رواں"[1]

یہ کتاب فارسی میں ہے، اور اس کا سنہ تالیف ۷۳۳ھ / ۱۳۳۳ء ہے، محمد ضیاء نے اس کتاب میں یونانی دواؤں کے ساتھ آروید طریقۂ علاج اور ادویہ کا بھی تفصیل سے ذکر کیا ہے، اعمال سرجری اور سونا و چاندی اور تانبہ سے کشتہ سازی کے طریقوں کے علاوہ بسلسلۂ علاج علم نجوم اور علم ہیئت سے بھی اس میں بحث کی گئی ہے، (فصل ۴۰، ۴۱، ۴۲) ایک فصل (۴۶) گھوڑوں کے علاج سے متعلق ہے

اس کتاب سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ عہد تغلق کے اطباء علاج و معالجہ میں طب یونانی کے ساتھ آروید طریقۂ علاج سے بھی استفادہ کرتے تھے، جس سے طب یونانی کے معالجاتی ذخیرے میں بیش بہا اضافہ ہوا، یہ کتاب ابھی تک غیر مطبوعہ ہے، اس کا ایک نسخہ آصفیہ لائبریری (حیدر آباد دکن) اور دوسرا نسخہ میڈیکل لائبریری (ہمدرد نگر، دلی) میں محفوظ ہے۔

(۵) طب شہابی و طب شفاء الخانی:: یہ دونوں کتابیں مظفر خاں اول ملقب بہ مظفر شاہ کے عہد میں لکھی گئیں، ان کے مولف کا نام شہاب الدین عبد الکریم ناگوری ہے، انھوں نے ان کتابوں کی تالیف میں عربی و فارسی کی طبی کتابوں کے علاوہ سنسکرت کتابوں سے بھی مدد لی ہے، ان میں بعض دواؤں کے نام سنسکرت اور سندھی میں بھی لکھے ہوئے ہیں۔

اول الذکر یعنی طب شہابی[2] جس کا دوسرا نام شفاء المرض بھی ہے، ایک منظوم طبی رسالہ ہے، اس کا

---

[1] اے کیٹلاگ آف عربک اینڈ پرشین میڈیکل مینسکرپٹ، ہمدرد نگر، دہلی، مخطوطہ نمبر ۱۹۶۳ [2] یہ منظوم رسالہ حکیم ٹیکم داس طبیب، وید او، مولوی اختر خان کے زیر اہتمام سنہ ۱۹۳۰ء میں شائع ہو چکا ہے، لیکن ضرورت ہے کہ مناسب تصحیح و تنقیح کے بعد اسے دوبارہ شائع کیا جائے، کیونکہ طبع اول اغلاط سے پر ہے، اور کتابت و طباعت بھی کتاب کے شایان شان نہیں ہے۔ (الطاف)

سنہ تالیف ۱۲۸۳ھ ہے، اس میں بقول مولف انہی دواؤں کا ذکر ہے، جو تجربہ کی کسوٹی پر پوری اتر چکی ہیں، اس منظوم رسالے میں جملہ جسمانی امراض کے اسباب، علامات اور ان کے علاج کو اختصار کے ساتھ بیان کیا گیا ہے، بعض دواؤں اور غذاؤں کے خواص و افعال پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے، آخر میں "کیفیت حال خود" کے عنوان سے مولف نے اپنی سرگذشت حیات بیان کی ہے، اس میں بعض باتیں دلچسپ بھی ہیں، اور عبرت انگیز بھی، بالخصوص مولف کے وہ تاثرات جو ہندوں اور مسلمانوں کے طرز فکر و عمل سے متعلق ہیں، چند اشعار ملاحظہ فرمائیں:-

زہندو وفا در جہاں یافتم — زمسلم جزا از خدا خواستم
نہ کافر مراد او گنجے نہاں — کہ در مال من شد زمسلم زیاں
ولیکن چو رنجی بہ ہندو شود — نیز ز اطباے واثق رود
ز فرمان او بر نتابد عناں — ز پرہیز دارد دگر غیر آں
پس از چند روزے چو بہتر شود — ہمہ عمر مولائے آں در شود
باتنہاے دارو بمیرد اگر — ننوشش کند خدمتِ بیشتر
کہ تا در سے طاقت ازیں مرد بود — پی صحتِ او چہ کوشش نمود
ولیکن چو تقدیر پروردگار — در آمد نیامد دوائے بکار
چوں رنجی بمسلم در آید بمن — بیارند پیشاب آں سوئے من
زبہر خدا گویم از جان و دل — دوائی مجرب دپرہیز آں
اگر شہد گویم خورد دوغ را — برنج ار بگویم خورد شوربا
اگر زیست گویند فضل حبیب — دگر مرد گویند کشتہ طبیب
دریں خطہ اسلام را حال نیست — ندانم کہ جائی دگر حال چیست

مذکورہ کتاب یعنی طب شفائی فارسی نثر میں ہے، اس کی تالیف سنہ [illegible] میں ہوئی تھی، اس میں سب سے پہلے اعضاء کی تشریح اور ان کے منافع بیان کیے گئے ہیں، پھر امراض، اسباب اور طریقۂ تشخیص و علاج پر روشنی ڈالی گئی ہے، اس کے بعد مجرب نسخے بیان کیے گئے ہیں، ان نسخوں میں وہی دوائیں شامل کی گئی ہیں، جو آسانی کے ساتھ مل جاتی ہیں، دواؤں کے عربی اور فارسی نام کے ساتھ ان کے مترادف ہندی نام بھی دیئے گئے ہیں، اس کے علاوہ کتاب میں وہی دوائیں لکھی گئی ہیں، جو کم قیمت ہیں تاکہ غربا و بھی آسانی کے ساتھ انھیں خرید سکیں۔

۶۔ الکلیات والجزئیات :۔ اس کتاب کے مولف شیخ ضیاء الدین نخشبی (متوفی ۷۵۱ھ/۱۳۵۰ء) ہیں، یہ بدایوں کے باشندہ تھے، اس کتاب میں انھوں نے یونانی دواؤں کے ساتھ ان دواؤں کے ذکر کا بھی التزام کیا ہے، جو ہندوستان میں پیدا ہوتی ہیں۔

۷۔ شفاء محمودی :۔ یہ مشہور ہندی طبیب واگ بھٹ[1] کی مشہور کتاب "اشٹنگ ہردے" کا فارسی ترجمہ ہے، مترجم کا نام علی بن محمد بن اسماعیل اساولی اصیلی ہے، گجرات کے فرماں روا سلطان محمود شاہ[2] (متوفی ۹۱۷ھ/۱۵۱۱ء) نے عربی اور سنسکرت کی مشہور کتابوں کے فارسی ترجمہ کے لیے ایک محکمہ قائم کیا تھا، واگ بھٹ کی مذکورہ کتاب کا ترجمہ اسی محکمہ کے تحت اس کے حکم سے کیا گیا تھا۔

۸۔ معدن الشفاء سکندر شاہی :۔ اس کتاب کے مولف میاں بھوا[3] ابن خواص خاں ہیں جن کا تذکرہ

---

[1] یہ طبیب حیدر آباد سندھ (پاکستان) کا رہنے والا تھا، [2] محمود شاہ کو محمود بیگڑا بھی کہا جاتا ہے، یہ سلطان احمد شاہ بانی احمد آباد کا پوتا تھا، اس نے ۵۴ سال تک گجرات پر نہایت عدل و امن کے ساتھ حکومت کی، تفصیل کے لیے دیکھیں فرشتہ ج ۲ ص ۱۹۳-۲۰۵، منشی نولکشور پریس کانپور ۱۳۰۱ھ/۱۸۸۴ء [3] ان کے والد خواص خاں ان کو پیار سے بھوا کے نام سے پکارتے تھے، اور بالآخر یہی ان کا نام پڑ گیا، میاں بھوا ابن خواص خاں سکندر شاہ لودی کے عہد میں ممتاز مناصب پر فائز رہے، مثلاً حاجب خاص، میر عدل (چیف جسٹس) اور وزیر اعظم وغیرہ، سلطان نے ان کے غیر معمولی علم و فضل کی وجہ سے انھیں مسند علی کے خطاب سے نوازا تھا، دیکھیں اسٹڈیز ان عربک اینڈ پرشین میڈیکل لٹریچر (ڈاکٹر زبیر صدیقی) ص ۹۰۔

پہلے ہو چکا ہے، انھوں نے ۹۱۸ھ (۱۵۱۲ء) میں سکندر شاہ کے حکم سے درجنوں سنسکرت کتابوں بالخصوص چرکا اور شسرتا کی مدد سے اس کتاب کو تالیف کیا اور اسے بادشاہ کے نام معنون کیا۔ فی الواقع یہ کتاب طب ہندی سے متعلق سنسکرت لٹریچر کا خلاصہ ہے۔[۱]

شفاخانے: ماقبل عہد مغلیہ میں مختلف شہروں میں بہت سے شفاخانے قائم تھے، الیٹ کے بیان کے مطابق محمد بن تغلق کے عہد میں تنہا دلّی شہر میں ۷۰ اسپتال موجود تھے،[۲] فیروز شاہ تغلق نے اپنے عہد میں چند مزید شفاخانوں کا اضافہ کیا، فرشتہ لکھتا ہے۔

"بادشاہ نے ۵۰ ڈیم، چالیس مسجدیں، ۳۰ دار العلوم، ۲۰ خانقاہیں، ۱۰۰ محل ۵ اسپتال، ۱۰۰ مقبرے، ۱۰ حمام، ۱۵۰ کنویں اور ۱۰۰ پل بنوائے اور بکثرت باغ لگوائے اور ان کی دیکھ بھال کے لیے عطیات مقرر کیے۔"[۳]

فیروز شاہ نے فتوحات میں ایک اسپتال کا ذکر کیا ہے، اس میں ہر طرح کے مریضوں کا مفت علاج کیا جاتا تھا، اور اس مقصد کے لیے تجربہ کار اطبا متعین تھے۔[۴]

عفیف نے فیروز شاہ کی طب سے دلچسپی اور مریضوں سے دلی ہمدردی کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے۔

"بادشاہ نے مریضوں کے علاج کے لیے ایک اسپتال بنوایا تھا جس میں بلا امتیاز حسب نسب سب کا علاج کیا جاتا تھا، اس میں فاضل اطبا مقرر کیے گئے تھے، بادشاہ کا حکم تھا کہ جیسے ہی کوئی مریض آئے فوراً اس کا معاینہ کیا جائے، اور اس کی مرض کی صحیح صحیح تشخیص کرکے موزوں دوائیں دی جائیں اور مریضوں کے ساتھ پوری ہمدردی کا رویہ اختیار کیا جائے، اس میں عام اطبا کے

---

[۱] تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو اسٹڈیز ان عربک اینڈ پرشین میڈیکل لٹریچر، ص ۹۹-۱۰۰۔ [۲] الیٹ اینڈ ڈاسن ج ۳ ص ۵۰۷۔ [۳] تاریخ فرشتہ، ج ۱، ص ۱۵۱ (نولکشور ۱۸۶۴ء)۔ [۴] فتوحات فیروز شاہی صفحہ ۱۵-۱۶۔

علاوہ خاص خاص بیماریوں کے ماہرین، سرجن اور امراض چشم کے ماہرین، اطباء اور دوسرے خدمت گار متعین تھے، مریضوں کو غذا اور دوا دونوں مفت فراہم کی جاتی تھیں، مریض صحت یاب ہونے کے بعد خدا کا شکر بجا لاتے اور نماز شکرانہ ادا کرتے تھے، اور ساتھ ہی خدا سے سلطان کی درازیٔ عمر اور خوش اقبالی کی دعائیں مانگتے تھے، اور خوشی خوشی اپنے گھروں کو جاتے تھے، سلطان نے اس اسپتال کے اخراجات کو پورا کرنے کے لیے بہت سے دیہات وقف کر دیئے تھے، جن کی سالانہ آمدنی ۳۶ لاکھ تنکہ تھی۔[1]

مولف "سیرت فیروز شاہی"[2] نے چوتھے باب میں ان تمام مفرد اور مرکب دواؤں کی تفصیلات دی ہیں، جو اسپتال میں موجود رہتی تھیں، اور جن سے سر سے پیر تک کے امراض کا علاج کیا جاتا تھا، اس نے یہ بھی لکھا ہے کہ بادشاہ خود ان اسپتالوں کا معائنہ کرتا تھا، اور مریضوں کے لیے نسخے تجویز کرتا تھا، بادشاہ نے حکم دے رکھا تھا کہ مجنونوں کو پکڑ کر پابہ زنجیر اس اسپتال میں رکھا جائے اور اس کی تجویز کردہ دواؤں سے ان کا علاج کیا جائے، چنانچہ اس قسم کے مریضوں کو اسی کی تجویز کردہ دوائیں اور غذائیں دی جاتی تھیں،[3] اس کتاب کے مطالعہ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ بادشاہ نے مریضوں کے علاج کے لیے جو اسپتال قائم کیے تھے، ان میں حاذق اطباء مریضوں کا علاج کرتے تھے۔[4]

سطور بالا میں ماقبل عہد مغلیہ میں طب یونانی کی ترقی کا جو اجمالی خاکہ پیش کیا گیا ہے اس سے واضح ہوتا ہے کہ مغل سلاطین کی آمد سے بہت پہلے ہندوستان میں طب یونانی نہ صرف رائج تھی بلکہ اس کی بنیادیں کافی مستحکم ہو چکی تھیں۔

---

[1] عفیف (شمس سراج)، تاریخ فیروز شاہی، پندرہواں مقدمہ، ص ۳۴۴، حیدرآباد دکن ۱۹۳۸ء۔
[2] یہ کتاب سلطان فیروز شاہ کے عہد میں ۷۷۲ھ میں لکھی گئی، تفصیل کے لیے دیکھیں عبدالمقتدر، کیٹلاگ آف عربک اینڈ پرشین مینسکرپٹ، ج ۷، ص ص ۲۸ - ۳۳، بانکی پور لائبریری [3] سیرت فیروز شاہی (مخطوطہ بانکی پور لائبریری) نمبر ۵۴۹ اوراق ۱۶۱ - ۱۶۰ [4] ایضاً اوراق ۱۱۸

ادبیات

غزل

از چندر پرکاش جوہر بجنوری الہ آباد

رسن و دار سے یا کوئے بتاں سے اٹھے
فتنہ ہر حال میں فتنہ ہے جہاں سے اٹھے

کتنے جاں سوز و دلآویز ہیں وہ نغمے
شعلہ بن کر جو مرے حسنِ بیاں سے اٹھے

دونوں عالم میں کہیں ان کو ٹھکانا نہ ملا
جو تری بزم سے اٹھے وہ جہاں سے اٹھے

ہائے وہ نالے کہ جو عرشِ بریں تک پہونچے
اُف وہ طوفاں جو مرے اشکِ رواں سے اٹھے

کششِ حسن نے اک گام بھی چلنے نہ دیا
پھر وہیں بیٹھ گئے لوگ جہاں سے اٹھے

کام کچھ کر نہ سکا واعظِ ناداں کا طلسم
کتنے طوفان مری خاموش فغاں سے اٹھے

ان حجابات کی عظمت کو کہوں کیا جوہر!
جو یقیں بن کے مرے وہم و گماں سے اٹھے

غزل

از

وارث ریاضی، ایم۔ اے مغربی چمپارن

کبھی تو میری جانب التفاتِ یار ہو جائے
کہ بحرِ غم سے میری کشتیٔ دل پار ہو جائے

تری چشمِ کرم ساقی اگر اک بار ہو جائے
فروغِ مے سے دل "میخانۂ انوار" ہو جائے

وہ مے کش کیا جو ہو بیگانۂ آدابِ میخانہ
وہ کیا ساقی ہے مے خواروں سے جو بیزار ہو جائے

الجھنا اپنے ہم جنسوں سے حیوانوں کی خصلت ہے
وہ انساں کیا جو باہم برسرِ پیکار ہو جائے

سکونِ دل میسر ہے جسے ان کے تغافل سے
نگاہ لطف ہو تو زندگی دشوار ہو جائے

....

نہ آیا عمر بھر کوئی بھی "حرفِ آرزو" لب پر
کہیں ایسا نہ ہو برہم مزاجِ یار ہو جائے

پگھل کر گاہے گاہے موم ہو جاتا ہے پتھر بھی
تعجب کیا جو شاخِ گل کبھی تلوار ہو جائے

یہ شامت ہے حقیقت میں برے اعمال کی ورنہ
مسلماں اور دنیا میں ذلیل و خوار ہو جائے

کوئی کچھ بھی کہے لیکن کبھی ممکن نہیں وارث
زبانِ شوق سے شرحِ جمالِ یار ہو جائے

مطبوعات جدیدہ

تصور ریاست اسلامی، مقالات مذاکرۂ ملی تعلیمات نبوی ۱۔ مرتبہ، جناب حکیم محمد سعید صاحب تقطیع کلاں، کاغذ عمدہ، بہترین ٹائپ، صفحات ۶۱۲ مع خوبصورت ٹائٹل، قیمت ۱۔ سو روپیہ، ناشر ہمدرد فاؤنڈیشن پریس، ہمدرد سنٹر، ناظم آباد، کراچی ۱۸ ۔

حکیم حافظ محمد سعید صاحب کی سرگرمی و فیض رسانی کا دائرہ بہت وسیع ہے، انکی مستعدی، ہمت عالی، جذبہ خدمت اور جوش عمل کی بدولت پاکستان میں گوناگوں مفید علمی، تعلیمی، دینی، اصلاحی، تعمیری، قومی اور ملی کام انجام پا رہے ہیں، ان کو ملک بیرون ملک کے متعدد بین الاقوامی سمیناروں اور عظیم الشان کانفرنسوں میں شرکت کا موقع بھی ملا ہے، اور وہ خود بھی کئی اہم بین الاقوامی اجتماع اپنی نگرانی و اہتمام میں بڑی خوش اسلوبی سے کرا چکے ہیں، انکے دردمند دل میں دین و مذہب، قوم و ملت اور ملک و وطن کی پرخلوص ہمدردی اور خیر خواہی کا جذبہ بھی موجزن ہے اور وہ اپنی قوم کی فلاح و بہبود اور دین کے احیاء و سربلندی کے لیے نہایت فکرمند بھی رہتے ہیں، اسی لیے وہ پاکستان کو نظری، فکری اور عملی حیثیت سے ایک اسلامی ریاست بنانے کی مخلصانہ جد و جہد میں برابر سرگرم اور متحرک نظر آتے ہیں، سنہ ۱۴۰۲ھ کی تیسری ہمدرد سیرت کانفرنس اسی سلسلہ کی کڑی ہے، یہ پنج روزہ کانفرنس تصور ریاست اسلامی کے موضوع پر ہمدرد فاؤنڈیشن پاکستان میں بڑی کامیابی سے ہوئی تھی، زیر نظر کتاب اس میں پڑھے گئے اردو مقالات کا مجموعہ ہے، ان مقالات میں اسلامی ریاست کے خط و خال کو نمایاں کیا گیا ہے، اور اس کے تصورات و نظریات اور اہم عناصر و اجزا کی وضاحت کی گئی ہے، نیز اس کے طرز حکومت، طریقہ انتخاب، داخلی و خارجی مسائل، قومی و بین الاقوامی امور، ذمہ داریوں اور فرائض پر بحث و گفتگو کی گئی ہے، اس کے پہلے اور دوسرے حصہ میں قرآن مجید

اور تعلیماتِ نبوی کی روشنی میں اسلامی ریاست کا تصور پیش کیا گیا ہے، دوسرے حصہ کے ایک مضمون میں ریاست مدینہ میں پیغمبر اسلامؐ کے چند انتظامی اقدامات کا تذکرہ ہے، اس کے بعد اسلامی ریاست کے بنیادی تصورات کا جائزہ لیا گیا ہے، چوتھے حصہ میں اسلامی ریاست کے آئین، طرز حکومت، طریق انتخاب، امیر کے تصور و انتخاب اور حکام کے اوصاف وغیرہ کا ذکر ہے، ایک حصہ میں اسلامی ریاست کے ان تصورات و نظریات پر بحث و تبصرہ ہے، جو علما و مفکرین نے تحریر کئے ہیں، اس ضمن میں امام سرخسی، شیخ محمد عبدہ، مولانا عبید اللہ سندھی، ڈاکٹر اقبال، علامہ عنایت اللہ مشرقی اور مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودی کے افکار کی روشنی میں اسلامی ریاست کے خد و خال بیان کیے ہیں اور حضرت سید احمد شہیدؒ کی اسلامی تحریک کی خصوصیات و اثرات دکھائے ہیں، آخر میں اسلامی ریاست کے مختلف پہلوؤں پر مضامین درج ہیں جن میں بین الاقوامی قانون، معاشی فرائض، نظام تعلیم و تربیت، سائنس و ٹکنالوجی کی اہمیت، ذرائع ابلاغ کے کردار، نوجوانوں، آجر و اجیر، علم و علما، مسجد، سیاست اور تجارت کا مقام واضح کیا گیا ہے اور معاشرہ، افراد، سیاسی جماعتوں کی نوعیت اور قائد اعظم کے تصور پاکستان کا جائزہ لیا گیا ہے، یہ مجموعہ تمام تر پاکستانی فضلا اور ماہرین قانون کی نگارشات پر مشتمل ہے، ہندوستان کی نمائندگی تنہا جناب سید صباح الدین عبد الرحمن صاحب ناظم دار المصنفین نے کی ہے، ان کا فاضلانہ مضمون "تصور ریاست اسلامی" لائق مطالعہ ہے، گو سب مضامین یکساں نوعیت کے نہیں ہیں اور نہ سب کے تمام مندرجات سے اتفاق کیا جا سکتا ہے، جیسے ایک مضمون میں کہا گیا ہے "اسلامی ریاست کا تصور قطعی جمہوری ہے اور اس کی بنیاد حکومت میں عوام کی شرکت ہے" (صفحہ ۱۰۳) اسی مضمون میں "مروجہ طرز انتخاب کو جو اس وقت جمہوری ملکوں میں رائج ہے عین اسلامی بتایا گیا ہے" (صفحہ ۱۰۹)، یہ دونوں باتیں کلیتہً درست نہیں ہیں، خود اس مجموعہ کے اکثر مضامین میں ان کی تردید موجود ہے، صفحہ ۱۵۹ و ۱۶۰ پر جلیل القدر اور کبار صحابہ کیلئے کبائر کا لفظ استعمال کیا ہے جو درست نہیں، کبائر کبیرہ کی جمع ہے جو اردو میں بڑے گناہوں کے معنی میں استعمال ہوتا ہے، تاہم اکثر مضامین مفید اور معلوماتی ہیں اور ان سے اسلامی ریاست کے تصورات، اس کی نوعیت و ہیئت، خط و خال، حدود و ثمرات، فرائض اور ذمہ داریاں وغیرہ پوری طرح واضح ہو جاتے ہیں، حکیم صاحب نے اس مجموعہ کو سلیقہ و اہتمام سے شائع کر کے

ایک مفید علمی خدمت انجام دی ہے جس کیلئے وہ قابل مبارکباد ہیں۔

انفاس العارفین ا۔ مترجم جناب سید محمد فاروق قادری صاحب تقطیع خورد، کاغذ کتابت طباعت

بہتر صفحات ۴۱۰۔ قیمت ۲۸ روپیہ۔ مکتبہ الفلاح دیوبند۔ یو۔پی

حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی کی علمی و دینی یادگاروں میں انفاس العارفین اس لحاظ سے بڑی اہم تصنیف ہے کہ اس میں انھوں نے اپنے ذاتی اور خاندانی بزرگوں اور اساتذہ و مشائخ کے حالات اور علمی و روحانی کمالات قلمبند کیے ہیں، یہ تصنیف لطیف دراصل سات حصوں پر مشتمل ہے اس کے بعض حصے علحدہ اور بعض شاہ صاحب کی دوسری تصنیفات کے ساتھ بھی چھپے ہیں اور یہ مکمل کتاب بھی چند بار شائع ہو چکی ہے، اس کو شاہ صاحب نے اپنے دور کی علمی زبان فارسی میں لکھا تھا جس کا اب رواج نہیں رہا، اس لیے جناب سید محمد فاروق صاحب نے عام فائدے کے لیے انفاس العارفین کا سلیس و شگفتہ اردو ترجمہ کیا ہے، اس کے پہلے حصہ بوارق الولایت میں حضرت شاہ صاحب نے اپنے والد بزرگوار حضرت شاہ عبدالرحیم کے سوانح، روحانی تصرفات، مکاشفات اور اقوال و ملفوظات قلمبند کئے ہیں، پہلے ان کے پیرومرشد خواجہ حافظ سید عبداللہ اور حضرت خواجہ باقی باللہ کے فرزند حضرت خواجہ خورد کا تذکرہ ہے، اس کے بعد شیخ ابوالقاسم اکبرآبادی کے واقعات و کمالات کا ذکر ہے جن کی جانب شاہ عبدالرحیم حضرت خواجہ حافظ سید عبداللہ کی وفات کے بعد رجوع کرتے تھے، انکے ضمن میں میر ابوالعلی کے حالات و کمالات اور سلسلہ ابوالعلائیہ کی خصوصیات بھی تحریر کی گئی ہیں، ان دونوں کے علاوہ شاہ عبدالرحیم کو اپنے زمانہ کے دوسرے مشائخ و اولیا اور مجاذیب سے ملاقاتوں اور ان سب کی ان کی جانب خاص توجہ کے متعدد واقعات لکھے ہیں، اور پھر شاہ عبدالرحیم کے کشف و کرامات اور تصرفات کا مفصل حال بیان کیا ہے، اور آخر میں ارشادات و ملفوظات نقل کئے ہیں، دوسرے حصہ شوارق المعرفۃ میں شاہ صاحب نے اپنے عم بزرگوار حضرت شیخ ابوالرضا محمد کے حالات، باطنی کمالات اور ملفوظات درج کئے ہیں، اس کے آخر میں شیخ ابوالرضا، اور حضرت شیخ احمد سرہندی کے پوتے اور نامور بزرگ حضرت شیخ عبدالاحد کے ایک دوسرے کے نام کے مکاتیب دئے ہیں جو بڑی اہمیت کے

حال ہیں، یہ دونوں حصے زیادہ اہم ہیں اور کتاب کا بڑا حصہ انہی پر مشتمل ہے، ان دونوں میں گویا گوں عالمانہ معارف نکات و اسرار، اور تصوف و سلوک کے حقائق و لطائف قلمبند کیے گئے ہیں، تیسرا حصہ الامداد فی مآثر الاجداد ہے جو شاہ صاحب کے اجداد کا تذکرہ ہے، اس میں انھوں نے اپنا نسب نامہ بھی بیان کیا ہے، ایک حصہ النبذۃ الابریزیہ فی اللطیفۃ العزیزیہ ہے، اس میں اپنے والد کے نانہالی جد اعلی شیخ عبد العزیز دہلوی اور انکے اسلاف و اخلاف کے حالات تحریر کیے ہیں، ایک اور حصہ العطیۃ الصمدیۃ فی انفاس المحمدیۃ میں اپنے جد مادری حضرت شیخ محمد پھلتی کے احوال و مناقب اور کرامات بیان کئے ہیں، چھٹے حصہ کا نام انسان العین فی مشائخ الحرمین ہے، اس میں شاہ صاحب نے حرمین کے اپنے اساتذہ و مشائخ کے حالات و واقعات دیے ہیں، آخری حصہ الجزء اللطیف فی ترجمۃ العبد الضعیف حضرت شاہ صاحب کے خود نوشت حالات پر مشتمل ہے، انکا خاندان علمی و دینی حیثیت سے بہت ممتاز تھا، مگر شاہ صاحب کی عظمت و شہرت کے سامنے دوسرے بزرگوں کی شہرت و عظمت ماند پڑ گئی تھی، اس کتاب سے اس خانوادہ کے مختلف بزرگوں کے علمی و باطنی کمالات کا مرقع سامنے آجاتا ہے، اس حیثیت سے اس کم یاب کتاب کے اردو ترجمہ کی اشاعت پر مترجم و ناشر تحسین و تبریک کے مستحق ہیں، لائق مترجم نے جابجا مفید حواشی بھی تحریر کئے ہیں، شروع میں انکے قلم سے ایک مقدمہ بھی ہے، اس میں شاہ صاحب کے حالات و کمالات تحریر کئے ہیں، اور انفاس العارفین کا تعارف کرایا ہے، اس سے انکی عظمت اور انکے اہل خاندان کے تصوف میں کمال و امتیاز کا پتہ چلتا ہے، مقدمہ میں ان لوگوں کا تعاقب بھی کیا ہے جنھوں نے شاہ صاحب کے تصوف میں درجہ و مرتبہ کو نظر انداز کر کے انکی صوفیانہ تصنیفات کی جانب سے بے اعتنائی کی ہے، لیکن اس سلسلہ میں ان کا لب و لہجہ تیز ہو گیا ہے، اور حضرت شاہ اسمٰعیل شہیدؒ اور انکی مقبول ترین تصنیف تقویۃ الایمان کا ذکر نامناسب انداز میں کیا ہے، گویا جس انتہا پسندی کی مترجم کو دوسروں سے شکایت ہے، اس میں وہ خود بھی مبتلا ہو گئے ہیں، انفاس العارفین کو نظر انداز کرنے کی شکایت بھی بیجا ہے، دراصل شاہ صاحب کی خارق عادت ذہنی و علمی کمالات کا اصل ثبوت اور زیادہ اہم باشان کارنامہ ان کی اصلاحی و تجدیدی تصانیف ہیں جن سے انکی اصلی عظمت کا اندازہ ہوتا ہے، اسلئے انکی جانب بجا طور پر زیادہ اعتنا کیا گیا، انفاس العارفین کے بعض مباحث کا فہم و ادراک بھی اس زمانہ کے لوگوں کے لئے مشکل ہے، اس لیے کلموا الناس علی قدر عقولہم کو بھی مد نظر رکھنا ضروری تھا۔

فتاویٰ احیاء العلوم جلد اوّل :- مرتبہ مولوی مفتی جمیل احمد نذیری صاحب تقطیع کلاں، کاغذ، کتابت وطباعت عمدہ، صفحات ۳۵۲ مجلد قیمت درج نہیں، پتہ: شعبہ نشر واشاعت جامعہ عربیہ احیاء العلوم مبارکپور۔ اعظم گڈھ۔

مولانا مفتی محمد یٰسین مبارکپوری مرحوم جامعہ عربیہ احیاء العلوم کے لائق استاذ تھے، وہ تقریباً پچپن برس تک درس و تدریس کے ساتھ جامعہ میں افتا کی خدمت بھی انجام دیتے رہے، اور ان کے فتوے ماہنامہ البلاغ بمبئی میں شائع بھی ہوتے تھے، اب ان کی وفات کے بعد جامعہ کے شعبۂ نشر و اشاعت کی طرف سے انکے فتاویٰ کی یہ پہلی جلد اہتمام سے شائع ہوئی ہے جس کو جامعہ کے ایک ہونہار استاذ اور موجودہ مفتی مولوی جمیل احمد نذیری نے سلیقہ سے مرتب کیا ہے، انھوں نے شروع میں جامعہ عربیہ احیاء العلوم کی مختصر تاریخ بھی قلمبند کی ہے، اس کے ضمن میں اس کے بانی، سابق اور موجودہ مہتمم کے سوانح اور احیاء العلوم میں فتاویٰ نویسی کی تاریخ بھی تحریر کی ہے، آخر میں صاحب فتاویٰ کا بھی مختصر تذکرہ ہے، اس جلد میں مندرجہ ذیل فقہی ابواب کے تحت فتوے درج ہیں، کتاب الایمان والکفر، کتاب الشرک والبدعات، کتاب ما یتعلق بالقرآن والحدیث والآثار، کتاب الاکل والشرب، کتاب الحظر والاباحۃ، کتاب المتفرقات، یہ سب فتوے احتیاط، تحقیق اور چھان بین کے بعد لکھے گئے ہیں، جن سے مفتی صاحب کی جزئیات و فروع میں دقتِ نظر اور فقہ و افتا میں مہارت کا اندازہ ہوتا ہے، گو اس مجموعۂ فتاویٰ میں عموماً قدیم طرز کے مسائل کا تذکرہ ہے تاہم جدید نوعیت کے بعض مسائل بھی آگئے ہیں، جیسے فیملی پلاننگ، نسبندی، چین والی گھڑی پہن کر نماز پڑھنے کا حکم، سودی رقم سے انکم ٹیکس ادا کرنا، جاسوسی کی صورتیں اور ان کا حکم، انکم ٹیکس میں چوری، پراویڈنٹ فنڈ، نماز میں مائک کا استعمال، اسقاط حمل کی دوا فروخت کرنا، ڈبل تنخواہ، بھوک ہڑتال، ریڈیو، سینما، کسٹم افیسر کو رشوت دینا، حکومت کی مقرر کردہ شرحوں کے خلاف کرنسیوں کی تبدیلی، کمیشن پر چندہ کرنا، وصولی چندہ کی مخصوص مقدار پر انعام اور پنشن کا حکم وغیرہ، اس زمانہ کے مفتی کو موجودہ حالات کی نزاکتوں اور فقہا کے

یا قاعدے کو ملحوظ رکھنا چاہیے کہ حالات کے بدلنے سے حکم بدل جاتا ہے" زیر نظر مجموعہ میں سورہ ہود کی آیت "ولا ترکنوا الی الذین ظلموا۔ الخ" کے موقع و محل اور سیاق و سباق کو نظر انداز کر کے جو استدلال کیا گیا ہو وہ بڑی حد تک محل نظر ہے، کفو کے مسئلہ میں مفتی صاحب کی رائے منفرد ہو گئی ہے، ان کا یہ خیال بجا ہے کہ شریعت میں ذات پات کا اعتبار نہیں لیکن یہ کفارت کے عدم اعتبار کی کوئی دلیل نہیں، ممکن ہے ان کی یہ تحقیق بھی صحیح ہو کہ کتب فقہ میں مذکور کفو کی روایتیں ضعیف بلکہ موضوع اور ساقط الاعتبار ہیں، لیکن اس سے قطع نظر کفارت کا اعتبار عقل و مصلحت کا اقتضا اور بعض حالتوں میں ضروری ہے، اس سلسلہ میں حضرت زیدؓ اور حضرت زینبؓ کے نکاح سے استدلال صحیح نہیں ہے، کیونکہ ان دونوں کے عقد میں کفارت کا اعتبار نہ کرنے سے جدائی ہو گئی تھی، اس لیے اس واقعہ سے مفتی صاحب کی تائید کے بجائے تردید ہوتی ہو۔

چمنستان فارسی :۔ از۔ پروفیسر نکہت شاہجہانپوری، تقطیع خورد، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر،
صفحات ۸۰ مجلد مع گرد پوش، قیمت۔ اندرون ملک ۱۰ روپیہ۔ بیرون ملک ڈیڑھ ڈالر، طلبہ کے لیے
۵ روپیہ۔ پتہ (۱) ڈاکٹر محمد افضال الرحمن خاں نکہت منزل، ہمند روڈ شاہجہانپور (۲) دانش محل
امین الدولہ پارک، لکھنؤ۔

پروفیسر محمد عبدالسمیع خاں نکہت شاہجہانپوری کو نثر و نظم پر یکساں دسترس ہے اور جس درجہ انھیں اردو شعر و سخن سے مناسبت ہے، اسی درجہ فارسی شعر و سخن سے بھی دلچسپی ہے چمنستان فارسی ان کے منظوم فارسی کلام مجموعہ ہے جو چھ حصوں پر مشتمل ہے، پہلے حصہ "روحانی" میں مذہبی نظمیں ہیں، دوسرے حصہ "زمانہ" میں حکیمانہ و فلسفیانہ کلام درج ہے تیسرا حصہ سیاسی نظموں کا مجموعہ ہے، چوتھا حصہ تہنیتی، تعزیتی اور معاشرتی نظموں پر مشتمل ہے پانچویں حصہ میں غزلیں اور چھٹے میں ظریفانہ کلام دیا گیا ہے، پروفیسر صاحب کی زندگی فارسی زبان کی تدریس اور اس کی خدمت میں بسر ہوئی ہے، اس مجموعہ سے ان کی اس زبان سے دلچسپی و مناسبت کے علاوہ شعر و سخن کے ستھرے اور اچھے ذوق کا پتہ چلتا ہے امید ہے کہ اصحاب ذوق اس بادۂ شیراز سے سرمست اور لطف اندوز ہوں گے۔

غالب کے خطوط جلد دوم: مرتبہ ڈاکٹر خلیق انجم صاحب، متوسط تقطیع، کاغذ کتابت و طباعت عمدہ، صفحات ۴۸۶، مجلد مع خوبصورت ٹائٹل، قیمت ۵۰ روپیے، ناشر غالب انسٹی ٹیوٹ، ایوان غالب مارگ، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲۔

اردو کے مشہور ادیب و محقق ڈاکٹر خلیق انجم کو مرزا غالب اور انکی تحریروں سے بڑا شغف ہے، اور متن کی ترتیب و تصحیح کے کام کا بھی ان کو خاص سلیقہ ہے، ان موضوعات پر "غالب کی نادر تحریریں" "غالب اور شاہان تیموریہ" اور "متنی تنقید" کے نام سے انکی کتابیں کئی برس پہلے چھپ چکی ہیں، اب انھوں نے برسوں کی محنت شاقہ کے بعد غالب کے خطوط کو چار جلدوں میں مرتب کیا ہے، اسکی پہلی جلد مارچ ۱۹۸۴ء میں شائع ہوئی تھی جو ہماری نظر سے نہیں گذری، زیر نظر کتاب اس سلسلہ کی دوسری جلد ہے، اس میں ۲۸ اشخاص کے نام کے مرزا کے خطوط درج ہیں، غالب کے خطوط کے کئی مجموعے پہلے شائع ہو چکے ہیں اور مختلف کتب و رسائل میں بھی چھپے ہیں، فاضل مرتب نے ان سب دستیاب خطوط کو تلاش و جستجو کے بعد یکجا کر دیا ہے، اگر وہ اسی پر اکتفا کرتے تب بھی یہ کام کم اہم نہ ہوتا مگر انھوں نے ان مکاتیب کے ماخذ کی نشاندہی، ان کے متن کی تصحیح، نسخوں کے فرق و اختلاف کی تصریح اور خطوط کے متعلق مفید محققانہ حواشی بھی لکھے ہیں جن سے انکے کام کی قدر و قیمت کئی گنا بڑھ گئی ہے، اور وہ اس میں اپنے پیش رؤوں سے بازی لے گئے ہیں، جن خطوط کی اصل دستیاب ہوئی ہے، انکے عکسی فوٹو دے ہیں، اور جن پر تاریخیں درج نہ تھیں تحقیق و جستجو کے بعد مختلف قرائن و شواہد سے انکی صحیح تاریخیں متعین کی ہیں، اور کہیں کہیں ان کے مندرجات کی توضیح اور اغلاط کی تصحیح بھی کی ہے، یہ مکاتیب جدید اصول تدوین کے مطابق مرتب کئے گئے ہیں، اس لیے ابتک کے دوسرے مجموعوں سے یہ مجموعہ زیادہ معیاری اور مستند ہے، اس سے غالبیات پر لائق مرتب کی وسیع نظر، متن کی تصحیح و تنقید میں مہارت اور سنجیدہ و متوازن ادبی و تحقیقی ذوق کا پتہ چلتا ہے، یہ کتاب اردو ادب اور غالبیات کے ذخیرہ میں مفید اور قیمتی اضافہ ہے، جس کے لیے مرتب اردو کے شیدائیوں اور غالب کے قدر دانوں کے شکریے کے مستحق ہیں، کتاب صوری حیثیت سے بھی بے مثال ہے، اتنی صاف ستھری اور عمدہ کتابیں اردو میں بہت کم چھپتی ہیں، ص ۵۹۹ پر محمد زکریا خاں زکی دہلوی کے نام کا ایک خط درج ہے، اور ص ۸۲۱ پر محمد زکی زکی کے نام کا جس کا عکسی فوٹو بھی دیا ہے، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ دو شخص ہیں، گو متن کے آخذ کے زیر عنوان ص ۸۰۰ پر دونوں کا جس طرح ذکر ہے،

... نسخے ... بعد معلوم ہوتے

تاریخ ناگپور :- مرتبہ ڈاکٹر محمد شرف الدین ساحل، تقطیع خورد، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر صفحات ۱۲۰، قیمت ۱۰ روپیے۔ پتہ۔ ڈاکٹر محمد شرف الدین ساحل محمد علی روڈ، مومن پورہ ناگپور۔

ڈاکٹر محمد شرف الدین ساحل ناگپور کے ایک صاحب علم اور خوش ذوق شخص ہیں، انھیں تحریر و تصنیف کا بھی سلیقہ ہے، انھوں نے ناگپور میں اردو کے موضوع پر مقالہ لکھکر پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری لی ہے، زیر نظر کتاب اسی تحقیقی مقالہ کا پہلا باب ہے جو اضافہ کے بعد علحدہ کتابی صورت میں شائع کیا گیا ہے، اس میں پہلے ناگپور کی وجہ تسمیہ اور اسکی قدیم اجمالی تاریخ بیان کی ہے پھر گونڈ اور بھونسلہ خاندانوں کے مختلف راجاؤں کے دور کے مختصر حالات و واقعات اور انکے نظم حکومت وغیرہ کا تذکرہ کیا ہے، لائق مصنف نے دونوں خاندانوں کے حکمرانوں کا شجرہ بھی دیا ہے اور شروع میں ناگپور کا مختصر تعارف کرایا ہے جس میں اسکے حدود اربعہ، رقبہ، آبادی اور وہاں کی تحصیلوں اور ندیوں کے نام لکھے ہیں اور پیداوار میں اناج، پھلوں، لکڑیوں اور بعض معدنیات کے علاوہ وہاں پائے جانے والے جنگلی جانوروں کے نام دئے ہیں، یہ کتاب متوسط درجہ کی ہے اور ناگپور سے متعلق بعض ضروری معلومات پر مشتمل ہے کہیں کہیں املائی غلطیاں بھی ہیں جو ممکن ہے کتابت کی وجہ سے ہوں جیسے نسبت شجو نصب عنہ ... علاوہ کے۔

انتخاب کلام خسرو کاکوروی :- مرتبہ جناب مسعود انور علوی کاکوروی، تقطیع خورد، کاغذ قدرے بہتر، کتابت و طباعت اچھی، صفحات ۱۰۰، مجلد مع گرد پوش، قیمت ۲۵ روپیے، پتے (۱) کتب خانہ انوریہ تکیہ شریف کاظمیہ کاکوری ضلع لکھنؤ، (۲) دانش محل بک ڈپو، امین آباد، لکھنؤ،

نواب حسین نواز جنگ بہادر منشی معراج الدین خسرو کاکوروی لکھنؤ کے ایک معزز خانوادہ کے فرد اور پرگو شاعر تھے انھوں نے مختلف اصناف سخن میں طبع آزمائی کی ہے مگر انکو غزل گوئی سے زیادہ مناسبت ہے، ابھی تک انکے کلام کا کوئی مجموعہ شائع نہیں ہوا تھا، اب جناب مسعود انور علوی کاکوروی نے اس کی جانب توجہ کی اور خسرو صاحب کے چند قلمی دواوین کی مدد سے انکی غزلوں کا یہ انتخاب پہلی مرتبہ شائع کیا ہے، اسکے شروع میں مسعود صاحب کے قلم سے ایک طویل مقدمہ ہے، اس میں کاکوری کے علمی و ادبی ماحول، خسرو صاحب کے حالات کا ذکر بھی ہے اور انکی شاعری کی خصوصیات پر بحث و تبصرہ بھی ہے، زیر نظر مجموعہ کی ابتدا حمد و نعت سے ہوئی ہے اور آخر میں چند سہرے، قطعات اور رباعیات درج ہیں، درمیان کا طویل حصہ غزلوں پر مشتمل ہے جناب خسرو کا تغزل کیفیت و اثر آویزی اور لطافت سے معمور ہے، اس میں تصوف کے علاوہ شیرینی اور عشق کی مستی و سرشاری کے علاوہ زبان و بیان کی شستگی و بندش کی چستی بھی ہے، انتخاب خوش مذاقی سے کیا گیا ہے۔ "ض"

حیات سلیمان

یہ محض جانشین شبلی مولانا سید سلیمان ندوی کی سادہ سوانح عمری ہی نہیں ہے بلکہ ان کے گوناگوں مذہبی، علمی، قومی، ملی، سیاسی حالات اور کارناموں کا ایک دلآویز مرقع ہے جس میں سید صاحبؒ کے دور کی نصف صدی کی ملی و قومی سیاسی و علمی، ادبی و لسانی تحریکوں مثلاً ہنگامۂ مسجد کانپور، تحریک خلافت، تحریک ترک موالات، جنگ آزادی، مسئلۂ ملوکیت حجاز وغیرہ کی تفصیل بھی ضمناً آگئی ہے، اسی کے ساتھ دارالمصنفین جو سید صاحبؒ کی زندگی کا سب سے بڑا کارنامہ ہے، اس کی تاسیس سال بہ سال اس کی ترقی کی روداد کے ساتھ ان کے قیام بھوپال، سفر پاکستان، قیام پاکستان کے دوران کی علمی خدمات کا تذکرہ اور پھر مختلف وفود کے رکن و صدر کی حیثیت سے سفر یورپ، سفر حجاز، سفر افغانستان وغیرہ کی مفصل روداد بھی سید صاحبؒ کے خطوط اور تحریروں کی روشنی میں قلمبند ہوگئی ہے، یہ کتاب اپنے اسلوب و طرز انشاء کے لحاظ سے بالکل حیات شبلی کا مثنیٰ ہے، ویسی ہی دلکش، دلچسپ اور دلنشین۔

مولفہ مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی قیمت ۴۲ روپے

سلوک سلیمانی

مولانا سید سلیمان ندویؒ کے عزیز ترین پاکستانی مسترشد مولانا سید سلیمان اشرف خان صاحب سلیمانی صدر شعبۂ عربی پشاور یونیورسٹی نے "سلوک سلیمانی پر ایک اجمالی نظر" کے عنوان سے ایک طویل مقالہ لکھا تھا جو معارف میں ستمبر ۱۹۵۵ء سے جنوری ۱۹۵۷ء تک مسلسل نکلتا رہا، یہ علمی حلقوں میں بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھا گیا، اسی مضمون کو مزید اضافوں کے ساتھ مولانا اشرف صاحب نے کتابی صورت میں سلوک سلیمانی کے نام سے دو جلدوں میں شائع کیا ہے، ان میں حضرت سید صاحبؒ کی سلوک و معرفت سے متعلق تعلیمات کو مرتب کی توضیحات و تعبیرات کی روشنی میں پیش کیا گیا ہے، ان دونوں جلدوں کو افادۂ عام کی خاطر دارالمصنفین نے بھی چھاپ کے شائع کیا ہے۔

قیمت جلد اول ۳۰ روپیے　　　　قیمت جلد دوم ۲۵ روپیے

[illegible]

۱۔ سیرۃ النبی [illegible]

۲۔ سیرۃ النبی جلد [illegible] [illegible]

۳۔ سیرۃ النبی جلد [illegible] پر مکمل بحث۔ ۳۳

۴۔ سیرۃ النبی جلد ششم: اسلامی تعلیمات، فضائل و رذائل اور اسلامی آداب کی تفصیل۔ ۲۸ ۔

۵۔ سیرۃ النبی جلد ہفتم: معاملات کے متعلق مضامین و مباحث کا مجموعہ۔ ۔

۶۔ رحمتِ عالم: مدرسوں اور اسکولوں کے چھوٹے بچوں کے لیے سیرت پر ایک مختصر جامع کتاب۔

۷۔ خطباتِ مدراس: سیرت پر آٹھ خطبات کا مجموعہ جو مدراس کے جلسے میں دیے گئے۔

۸۔ سیرۃ عائشہؓ: حضرت عائشہ صدیقہؓ کے حالات و مناقب و فضائل۔ ۱۹

۹۔ حیاتِ شبلیؒ: مولانا شبلیؒ کی بہت مفصل اور جامع سوانح عمری۔

۱۰۔ ارض القرآن اول: قرآن میں جن عرب اقوام و قبائل کا ذکر ہے ان کی تاریخی تحقیق۔ ۱۸ ۔

۱۱۔ ارض القرآن دوم: ... قبل از اسلام عربوں کی تجارت و مذہب کا بیان۔ ۳ ۔

۱۲۔ خیام: خیام کے سوانح و حالات اور اس کے فلسفیانہ رسائل کا ترجمہ۔ ۳۳ ۔

۱۳۔ عربوں کی جہاز رانی: بمبئی کے خطبات کا مجموعہ۔ ۱۲ ۔

۱۴۔ عرب و ہند کے تعلقات: ہندوستانی اکیڈمی کے تاریخی خطبات (طبع دوم عکسی) ۴۰ ۔

۱۵۔ نقوشِ سلیمانی: سید صاحبؒ کے منتخب مضامین کا مجموعہ جن کا انتخاب خود مصنف نے کیا تھا۔ ۲۴ ۔

۱۶۔ یادِ رفتگاں: ہر طبقہ کے مشاہیر کے انتقال پر سید صاحبؒ کے تاثرات۔ (زیر طبع عکسی) ....

۱۷۔ مقالاتِ سلیمان اول: ہندوستان کی تاریخ کے مختلف پہلوؤں پر مضامین کا مجموعہ۔ ۳۶ ۔

۱۸۔ مقالاتِ سلیمان دوم: تحقیقی و علمی مضامین کا مجموعہ۔ ۳۳

۱۹۔ مقالاتِ سلیمان سوم: مذہبی و قرآنی مضامین کا مجموعہ (زیر ترتیب ہیں) ۳۳

۲۰۔ بریدِ فرنگ: سید صاحبؒ کے خطوط کا مجموعہ۔

۲۱۔ [illegible] حصہ اول و دوم: [illegible] کے لیے ترتیب کیے گئے۔ ۲.۴